





شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ





نگارشات

مرتب

حافظ شاہد رفیق

فاضل مدینہ یونیورسٹی



نگارشات جلد دوم

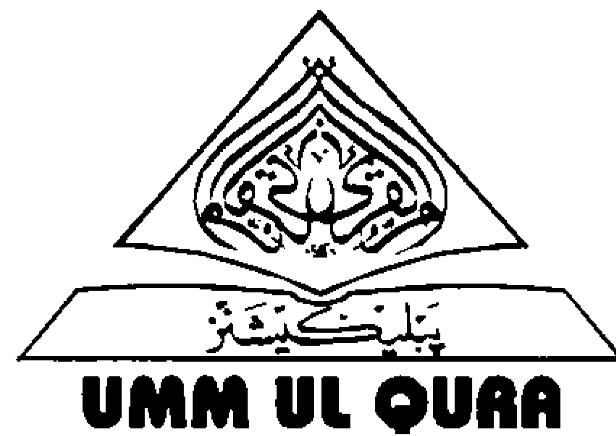
تحریکِ آزادیِ فکر

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

مرتب: حافظ شاہد رفیق
فاضل مدینہ یونیورسٹی

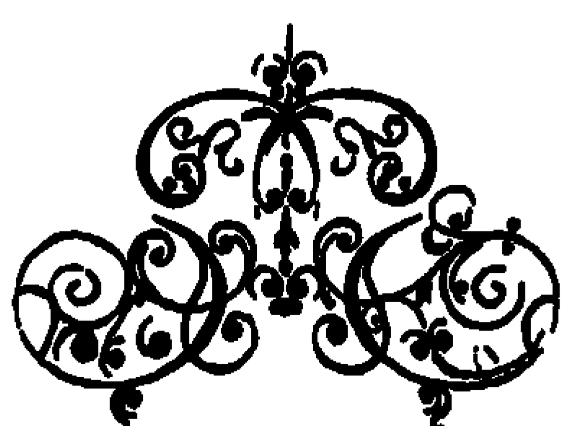
اشاعت ———— جنوری 2024ء

ناشر



جامع مسجد سلمان فارسی، لودھی ٹاؤن۔ سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ 0321-6466422

بسم الله الرحمن الرحيم



نگارشات جلد دوم

تحریک آزادیِ فکر

فہرست مضامین

1۔ تحریک اہلِ حدیث کا مد و جزر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی کے اثرات

2۔ ایک مقدس تحریک جو مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی

3۔ تحریک اہلِ حدیث کا تاریخی موقف اور اس کی خدمات

4۔ برصغیر پاک وہند میں اہلِ توحید کی سرگرمیاں

5۔ تحریکِ اہلِ حدیث کے تین دَور

6۔جماعت کے ماضی اور حال پر ایک نظر اور مستقبل کے لیے ایک لمحہ فکریہ کی ضرورت

7۔آج کل کے مناظروں کی افادی اور شرعی حیثیت پر ایک نظر اور جماعت کے لائحۂ عمل میں ایک اہم تبدیلی کی ضرورت

8۔ اقامتِ دین اور آزادی کی پہلی انقلابی جدوجہد

9۔ تحریکِ جہاد میں علمائے اہلِ حدیث کا حصہ

10۔ جماعت اہلِ حدیث اور ''نوائے پاکستان'' کا ایک خط

11- تحریکِ مجاہدین اور مجلّہ رضوان

12- مدیر رضوان اور عدالتی چیلنج

13- فقہ اور تفقّہ

14- اختلاف اور حدود وادب

15۔ اسلافِ کرام کا مطلوب احترام اور تقلیدِ جامد کے کرشمے

16۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مسئلہ فاتحہ خلف الامام

17۔ ترکِ تقلید اور اہلِ حدیث

18۔ اہلِ حدیث کی اقتدا
جناب ابوالخیرات محمود احمد صاحب رضوی بریلوی رضا خانی کے جواب میں

19۔ ہماری سرگزشت
آیندہ تبلیغی مساعی گذشتہ حوادث کی روشنی میں

20- ہمارے تعلقات... حضراتِ دیوبند سے

21۔ قابلِ ضبط کتابیں
بریلوی حضرات سے مودبانہ گزارش

22۔ آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدائش اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ

23۔ مسلکِ اہلِ حدیث کے بارے میں چند اہم سوالات اور ان کے جوابات



بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ ہر دور میں ایک حق پرست جماعت نصرتِ خداوندی کی بدولت غالب و منصور ہوگی جسے ہر نوع کی مخالفت کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گی۔ ائمۂ محدثین کی تعبیر کے مطابق اس طائفہَ منصورہ سے مراد اہلِ حدیث کا گروہ ہے جو ہر آلایش سے پاک خالصتاً اسی جادۂ مستقیم پر گامزن ہے جس کی بنیاد کاملاً وحیِ الٰہی پر استوار ہے۔ اس جماعتِ حقہ کا یہی وہ امتیازی وصف ہے جو ایک طرف اگر اپنوں کے لیے باعثِ فخر اور قابلِ رشک ہے تو دوسری طرف مخالفین کی ہمہ قسم کی یورش اور طعنہ زنی کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔

اسلامی تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک رونما ہونے والے مختلف فرق و فتن کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ایک صاحبِ بصیرت شخص بہ آسانی پہچان لے گا کہ ہر زمانے میں پیدا ہونے والے اعتقادی و نظریاتی تصادم اور مختلف عقائد و افکار کی باہمی آویزش میں اہلِ حدیث ہی کا ایک گروہ ہے جو کبھی راہِ مستقیم سے نہ ہٹا، بلکہ دوسروں کے لیے بھی وہی مینارۂ نور ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خوارج، روافض، نواصب، جہمیہ، معتزلہ اور مرجیہ جیسے گمراہ فرقوں کے پیروکار سلفِ امت صحابۂ کرام کے متعین کردہ فکر سے انحراف کرتے گئے اور جس فرقے میں جتنا زیادہ فکری انحراف و اعراض پھیلتا گیا وہ اتنا ہی راہِ حق سے دور ہوتا گیا۔

یہ سعادت صرف اسی ایک پاک باز گروہ اصحاب الحدیث کا مقدر ٹھہری کہ جب بھی فتنوں کی تیز و تند آندھی چلی تو انھوں نے اس پگڈنڈی پر اپنا سفر جاری رکھا جس پر چل کر ان کے اسلاف جنت کی راہ سدھار گئے تھے۔ اس استقامت کی بدولت نہ صرف وہ خود ہدایت یافتہ رہے بلکہ دوسروں کو بھی اسی روشن شاہراہ کی طرف بلاتے رہے، جو دنیوی واخروی سرفرازی کے ہر خواہشمند کا مقدر تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

دعوت و ارشاد کے مختلف مراحل میں اس مقدس طائفہ کو ہمہ نوع کی تکالیف و مصائب کا سامنا

کرنا پڑا، جسے وہ خندہ پیشانی سے جھیلتے گئے۔ مثالب و مطاعن کا شاید ہی کوئی تیر ہو جس کا یہ لوگ نشانہ نہ بنے ہوں، لیکن اپنے مقصد کی لگن اور منہج کی عظمت کی خاطر وہ ہر وار سہتے رہے اور اپنے مشن پر کبھی مداہنت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

برصغیر کی مذہبی تاریخ کا معمولی درک رکھنے والا ہر شخص بہ خوبی آگاہ ہے کہ منہجِ سلف کی طرف دعوت و تبلیغ اور توحید و سنت کی نشر و اشاعت میں ہمارے ائمہ ہدیٰ اور وارثانِ علوم نبوت کو کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسی کون سی مشقِ ستم ہوگی جس کا یہ غرباء نشانہ نہ بنے ہوں لیکن یہ ساری آزمایشیں بھی اس دعوت کا راستہ روک نہ سکی بلکہ یہی ستم ظریفیاں دعوت کے ارتقا اور نشو و نما کا سبب بن گئیں۔

برصغیر کے ظلمت کدے میں دعوتِ توحید اور سلفی منہج و فکر کے احیا کے لیے ائمہ اہلِ حدیث کی طرف سے جس جانفشانی کا مظاہرہ کیا گیا، بلاشبہہ وہ قرونِ اولیٰ کی قرین و سہیم تھی جس کی بدولت نہ جانے کتنے نفوس راہِ حق سے شناسا ہوئے۔ تقبل اللّٰہ جهودهم وشكر مساعيهم.

دعوتی جہود و مساعی کے ضمن میں علمائے اہلِ حدیث کی دور رس نگاہیں تمام اسالیبِ دعوت پر مرتکز رہیں اور انھوں نے ہر باب میں اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں۔

- عوام الناس کی ذہنی سطح کے مطابق دعوتی دروس میں وسیع پیمانے پر توحید و سنت کی اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں اس مقصد کی خاطر ایک طرف اگر اجتماعی پروگراموں کا سلسلہ جاری تھا تو دوسری جانب انفرادی دعوت کی ذمے داریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں داعیانِ حق کے ذاتی کردار اور شخصی اخلاق نے حیران کن نتائج پیدا کیے۔
- تصنیف و تالیف اور صحافت کے میدان میں ائمہ اہلِ حدیث نے ایسا گراں قدر ورثہ چھوڑا ہے کہ ایک عالم تا ابد ان کی مساعیِ جمیلہ کا ممنون رہے گا۔
- مدارس و جامعات کی صورت میں تدریسی خدمات اور تعلیمی اصلاحات کی ایسی روشن مثالیں قائم کی گئیں جنھیں مخالف و موافق ہر ایک نے سراہا اور اپنے معاہد و جامعات کے مناہج میں ان سے استفادہ کیا۔
- مناظرات و مباحثات میں بھی علمائے اہلِ حدیث نے ایسی بے مثال خدمات انجام دیں کہ اپنے تو ایک طرف رہے، مخالفین بھی بسا اوقات ہمارے علماء ہی کو آواز دیا کرتے تھے۔

❁ نصرتِ حق کی خاطر مختلف فرق و احزاب کی تردید میں علمائے اہلِ حدیث نے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور ہر مخالف نظریے اور فتنے کی خوب خبر لی۔

علاوہ ازیں اس دور میں کتاب و حکمت کی نشر و اشاعت اور توحید و سنت کی دعوت میں جتنے ذرائع و وسائل مہیا تھے سب سے استفادہ کیا گیا اور انھیں خلقِ خدا کی ہدایت و راہنمائی کے لیے بروئے کار لایا گیا۔

ان مساعیِ حسنہ کے نتیجے میں ایسے ایسے رجالِ کار پیدا ہوئے جنھوں نے ساری زندگی اسی مقدس فریضے کی خاطر تگ و دو کی اور اسی گلشن کی آبیاری میں اپنی عمریں کھپا دیں۔

حضرۃ العلام شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ بھی اسی قافلۂ دعوت و ارشاد کے رکن رکین بلکہ اپنے عہد میں اس کے قائد و سرخیل تھے جن کی ساری توانائیوں کا محور و مرکز اس دبستان ہی کی نگہبانی تھا جو انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی خدماتِ جلیلہ پر نظر ڈالنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ایک تنہا شخص ایسی ذمے داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک مسجد و مدرسے کے نظم ونسق سے لے کر ملکی و قومی مسائل تک اپنی ذمے داریاں محسوس کرتا اور مقدور بھر انھیں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا سلفی رحمہ اللہ ایک مقام پر خود فرماتے ہیں:

> ”میری مشغولیتوں کا یہ حال ہے کہ مدرسہ کی تدریس اور اہتمام دونوں میرے متعلق ہیں۔ مقامی جماعت میں بھی کافی حد تک دخل دینا پڑھتا ہے۔ شہری اور مقامی حوادثات سے بالکل بے تعلق رہنے کی عادت نہیں۔ سیاسیات سے بھی تھوڑا بہت تعلق رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اپنی ذاتی مشغولیتیں اس کے علاوہ ہیں۔ قوت قدسی کا بھی دعویٰ بالکل نہیں....“

(نگارشات، ص: ۵۵۹)

غرض انھوں نے حسبِ استطاعت ہر ذمہ داری کو باحسن طریق نبھایا اور اپنی تدریسی، تحریری اور مسلکی مساعی کے ذریعے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

تحریری خدمات:

مولانا سلفی رحمہ اللہ کثرتِ مشاغل کے سبب بہت تھوڑا لکھ سکے لیکن جتنا لکھا وہ ہزاروں صفحات پر

بھاری اور اتنا زود اثر تھا کہ ہر قدر شناس نگاہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور ان کی تحریرات کو سلفی منہج وفکر کے احیا اور مسلکی و جماعتی بیداری کے لیے نعمت غیر مترقبہ قرار دیا۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ کی زندگی ہی میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور کا ایک قاری مدیر الاعتصام کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

''مقامِ مسرت ہے کہ آپ کا اخبار ہفت روزوں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ الاعتصام کی تقریباً چار مہینوں کی کاپیاں زیرِ نظر ہیں۔ ان کا ہر مضمون بغور پڑھا۔ دیگر مضامین کے علاوہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مضامین نہایت اہم اور قیمتی ہیں۔

''مولانا صاحب کا مضمون ''تحریک اہلِ حدیث کا مدو جزر'' اپنی عمدگی اور جامعیت کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے لیکن افسوس کہ مولانا صاحب نے باوجود مطالبوں کے اسے آگے نہ بڑھایا۔ مولانا صاحب کا مضمون اس قابل ہے کہ اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جائے۔ کچھ دیر بعد ہی اعلان ہوا کہ مولانا صاحب کی وہ تقریر جو انھوں نے جامعہ سلفیہ کانفرنس میں کی تھی، مزید اضافے کے ساتھ الاعتصام میں قسط وار شائع ہوگی، جو چار پانچ قسطوں میں ختم ہوجائے گی۔

''اس وقت تک (احکام شریعت میں حدیث کا مقام) اس کی دس قسطیں آچکی ہیں اور ہم (قارئین) کو مزید تشنگی محسوس ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اس کو مزید جاری رکھتے ہوئے ہر پہلو کی اچھی طرح وضاحت کر دینی چاہیے اور اس کے ختم ہونے کے بعد اس کو بھی چھپوا کر عوام الناس میں تقسیم کیا جائے۔''

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ص: ۱۱، ۲۵ مئی، ۱۹۶۴ء)

سال ۲۰۰۹ء جب حجیتِ حدیث اور دفاعِ سنت سے متعلقہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کے مضامین کا مجموعہ ''مقالاتِ حدیث'' کے نام سے شائع کیا گیا تو کراچی سے ایک بھائی محمد ثاقب صاحب نے کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں ایک خط لکھا جس سے ہمارے حوصلے بھی دو چند ہو گئے اور ہمیں یک گونہ توانائی حاصل ہوئی۔ وہ بھائی اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''ابھی میں مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی کتاب ''مقالاتِ حدیث'' پڑھ کر فارغ ہوا ہوں۔

یقین کریں میں نے جس دلچسپی سے اس کتاب کو پڑھا ہے شاید ہی کسی کتاب کو پڑھا ہو۔ اور اس کتاب کے بعد مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کا جو مقام میرے سامنے آیا ہے اس کے بعد مجھے اپنے اہلِ حدیث ہونے پر جو فخر تھا اس میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور جو محنت انھوں نے اس باطل فرقے (منکرین حدیث) کے رد میں کی ہے اُسے قبول کرے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس کتاب کا انگلش میں ترجمہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین اور قرآن و حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ میں اس کتاب کے بارے میں خاص طور پر اس لیے یہ کہہ رہا ہوں کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ منکرینِ حدیث کا زیادہ ٹارگٹ ہماری اشرافیہ ہے، اور ساتھ ہی پڑھے لکھے اذہان کو یہ لوگ زیادہ اپیل کرتے ہیں، اس لیے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ دعوتی نقطۂ نظر سے انتہائی مفید رہے گا۔‘‘

مولانا سلفی رحمہ اللہ نے جس موضوع پر بھی لکھا اس میں علمی رسوخ، منہجِ سلف کی پاسداری، ادبی کمال، طعن و تشنیع سے احتراز، ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے سے گریز اور مخالفین کی قدر و منزلت ملحوظ رکھی اور اپنی بات کو خوش کن اسلوب و تعبیر سے بیان کر دیا۔

ایک اندوہناک حقیقت:

چاہیے تو یہ تھا کہ ایسا علمی ذخیرہ اور مسلکی ورثہ حرزِ جان بنایا جاتا، جماعتی و تنظیمی سطح پر اس کی اشاعت کا انتظام ہوتا، جماعتِ اہلِ حدیث کے ذمہ داران اور کارکنان اسے اپنے جماعتی نصاب کا حصہ بناتے، ہر اہلِ حدیث فرد قیمتی متاع کے مانند اس کی حفاظت کرتا اور اسے غور و خوض سے پڑھتا تاکہ جماعتی شعور اور مسلکی بیداری کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہوتا لیکن اس سب کے عکس ان انمول موتیوں کو دیگر مہمات کی طرح غفلت کے دبیز پردوں نے ڈھانپ لیا اور ہمارے افراد و جماعت، خصوصاً جس جماعت کی مولانا سلفی رحمہ اللہ نے اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی، انھوں نے اس فریضے سے پہلو تہی کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھا۔ اگرچہ بعض حضرات کی انفرادی کاوشوں سے کچھ حصہ دست بردِ زمانہ سے بچ گیا لیکن ان لآلی منثورہ اور درر مکنونہ کے شایانِ شان ان کی اشاعت کا قابلِ قدر اہتمام نہ ہوا۔

جماعتی لٹریچر کی ضرورت و اہمیت:

مولانا سلفی رحمہ اللہ اپنے کثیر مشاغل اور بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ مسلکی و جماعتی شعور کے احیا کے لیے مفید علمی لٹریچر کی کتنی اہمیت ہے۔ چنانچہ عموماً وہ اپنے دروس و خطابات اور مضامین و تحریرات میں جماعتی لٹریچر کی اشاعت پر زور دیتے اور ہمہ وقت اس کی طباعت کی فکر ان کے دامن گیر رہتی۔ چنانچہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:

''بحث اور مناظرات کا دور گزر چکا۔ اب اس کی افادی حیثیت مشتبہ ہے۔ آپ اب سنجیدہ اور مدلل لٹریچر شائع فرمائیے جسے لوگ گھروں میں بیٹھ کر سکون سے پڑھیں۔ وہ دلوں پر اثر کرے۔ مفید لٹریچر بڑی مؤثر قوت ہے۔ آپ اس سے دماغوں میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ اذہان کو درست کر سکتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا عبدالستار فیروز وٹواں کی تصانیف نے ہزاروں افراد کے عقیدے درست کر دیے۔ نواب صاحب رحمہ اللہ نے سیکڑوں کتابیں لکھیں۔ ان میں بعض کتابیں ضخامت کے لحاظ سے کئی کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ فتح البیان، ترجمان القرآن، دلیل الطالب الی ارجح المطالب، الحطہ، منہج الوصول وغیرہ بڑی قیمتی کتابیں ہیں، جن سے اسلام کو بے حد فائدہ پہنچا۔ آج ہم ان جواہر پاروں کی اشاعت سے معذور ہیں۔ بعض غیر مفید کتابیں ملک میں شائع ہو رہی ہیں مگر ان جواہر پاروں سے اغماض کیا جا رہا ہے۔

''مسلک کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے معیار الحق مؤلفہ حضرت شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب، الارشاد مؤلفہ مولانا ابو یحییٰ شاہجہانپوری اور حسن البیان مؤلفہ مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کی اشاعت وقت کا تقاضا ہے۔ عون المعبود عرصہ سے ناپید ہے۔ اس بے نظیر شرح کی اشاعت اس وقت جماعت پر قرض ہے۔ تحفۃ الاحوذی کی اشاعت مصر میں ہو رہی ہے مگر عون المعبود کی سعادت معلوم نہیں کس صاحبِ دل بزرگ کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت جماعت کی طرف سے کاروباری انداز سے ہونی چاہیے تاکہ محفوظ رہے۔ مفت کی چیزیں عموماً ضائع ہو جاتی ہیں۔

''نواب صدیق حسن خاں کے بعد جلالۃ الملک عبدالعزیز بن سعود رحمہ اللہ کا موقف دینی کتابوں کی اشاعت میں صد ہزار تحسین کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو رحمت سے بھرے، ان کی اولاد بھی مرحوم والد کی طرح دینی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں مبارکباد کی مستحق ہے مگر جماعتِ اہلِ حدیث کا اس معاملے میں عرصہ سے سکوت بلکہ بے توجہی قابلِ شکایت ہے۔

''چند مکاتب اپنی بساط کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ ان کا کام قابلِ تعریف ہے اور ذاتی ہونے کے ساتھ ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ضرورت ہے کہ اہلِ علم اور دانش مند حضرات مل کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔''

ان معروضات کو ذکر کرنے کا مقصود اپنے اکابر، خصوصاً جن احباب کے ہاتھ میں جماعت کی زمامِ کار ہے، کی خدمت میں یہ گوش گزار کرنا ہے کہ کیا انھوں نے بھی اس جانب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے؟

تحریکِ آزادیٔ فکر:

زیرِ نظر کتاب ''تحریکِ آزادیٔ فکر'' میں مولانا سلفی رحمہ اللہ کے تحریکِ اہلِ حدیث کے تجزیہ و تعارف اور مسلکِ اہلِ حدیث سے متعلقہ شکوک وشبہات کے ازالے کے تناظر میں لکھے گئے مضامین و مقالات شامل ہیں۔

ان مضامین میں جماعتِ اہلِ حدیث کی تاریخی خدمات کا بہ خوبی تجزیہ وتعارف کرایا گیا ہے اور مختلف حوادث و واقعات کے تناظر میں اس طائفہ منصورہ کی کثیر الجہت جهود و مساعی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

- بالخصوص برصغیر کے ظلمت کدہ میں اس جماعت کی مثالی اور روشن مساعی کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔
- ان مقالات میں سلفی فکر اور منہجِ اہلِ حدیث کو نہایت دلنشین اسلوب میں متعارف کرایا گیا ہے۔
- تاریخی واقعات کے حوالے سے ائمۂ حدیث پر ڈھائے جانے والے مظالم اور توحید و سنت کی اشاعت کی راہ میں پیش آمدہ مصائب و تکالیف کا بالتفصیل تذکرہ زیرِ نظر مجموعہ میں نظر آتا ہے، جس میں داعیانِ حق کے لیے گراں قدر نصائح کا سامان ہے۔
- مختلف فرق اور مذاہب کی جانب سے اس مقدس گروہ پر لگائے جانے والے اتہامات و الزامات

اور ان کی حقیقت کی خوب نقاب کشائی کی گئی ہے۔

❀ مسلکِ اہلِ حدیث کے روشن پہلو اور امتیازی اوصاف کی بخوبی تفصیل بیان کی گئی ہے اور دوسرے فرقوں بالخصوص اہل الرائے کے منہج میں موجود عیوب و نقائص کی خوب وضاحت کی گئی ہے۔

❀ برصغیر میں تحریک مجاہدین کی لازوال خدمات، آزادیِ وطن کے لیے علمائے اہلِ حدیث کی جہود و مساعی اور ملکی مسائل اور ملی معاملات میں حاملینِ مسلک اہلِ حدیث کی کوششوں کا تذکرہ اس کتاب کی زینت ہے۔

❀ مختلف تقلید پسند گروہوں کی جانب سے مسلکِ حق پر عائد اعتراضات و الزامات کی خوب خبر لی گئی ہے لیکن کہیں بھی احترام و وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔

❀ ان مقالات میں حاملینِ مسلک اہلِ حدیث کے لیے بے بہا نصائح و توجیہات شامل ہیں، جن میں انفرادی و جماعتی ذمہ داریاں، جماعتی ذمہ داران کے فرائض، موجودہ دور میں مسلک کی ترقی اور نشو ونما کے لیے مفید ہدایات جیسے مباحث پڑھنے کو ملتے ہیں۔

اس کتاب میں مولانا سلفی رحمہ اللہ کے مندرجہ ذیل تیئس (۲۳) مضامین شامل ہیں:

1- تحریکِ اہلِ حدیث کا مد و جزر:

اس مضمون میں مسلکِ اہلِ حدیث کی ابتداء، مختلف فرقوں کا رویہ، سلفی نقطۂ نظر کی نمایاں خوبیاں، اہل الرائے کی غلط تاویلات، قیاس و تفقہ کے نتیجے میں ان گروہوں کے عیوب و نقائص اور اہلِ حدیث کے مضبوط موقف و نقطۂ نگاہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس ضمن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی خدمات کا بالتفصیل تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ مضمون سب سے پہلی بار ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۴/ نومبر ۱۹۶۱ء تا ۹/ فروری ۱۹۶۲ء) میں بارہ اقساط میں شائع ہوا۔ نیز یہ مضمون ۱۹۹۱ء میں انڈیا سے کتابی شکل میں بھی طباعت پذیر ہوا اور اس مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر ہندوستان کے بعض مدارسِ اہلِ حدیث نے اسے اپنے نصاب میں بھی شامل کیا ہے۔

2- ایک مقدس تحریک جو مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی:

اس مضمون میں تقلید و جمود کے مختلف اثرات، مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف اہل الرائے کی

ریشہ دوانیاں، تاریخِ اہلِ حدیث کے بعض ادوار کا تذکرہ اور تقلید و ظاہریت کے درمیان اہلِ حدیث کے امتیازی مقام پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون پہلی بار ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (یکم جولائی ۱۹۶۶ء تا ۲/ستمبر ۱۹۶۶ء) میں نو اقساط میں شائع ہوا۔

3- تحریک اہلِ حدیث کا تاریخی موقف اور اس کی خدمات:

اس مضمون میں تحریک اہلِ حدیث کے مقاصد، دیگر فرقوں کے مناہج میں مخفی نقائص، ائمۂ حدیث کی خدماتِ جلیلہ اور برصغیر میں علمائے اہلِ حدیث کی مساعیِ جمیلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۹، اگست، ۱۹۴۹ء) کے پہلے شمارے میں شائع ہونے والا مولانا سلفی رحمہ اللہ کا اولین مضمون تھا۔ اس کے بعد بھی ہفت روزہ الاعتصام کے مختلف شماروں (۱۲/اکتوبر ۱۹۵۶ء، ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۱ء) میں یہ مضمون شائع ہوتا رہا۔

4- برصغیر پاک و ہند میں اہلِ توحید کی سرگرمیاں:

اس مضمون میں خطۂ برصغیر کے اندر شرک وبدعت کی مختصر روداد اور اس کے مقابلے میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کی جدوجہد کا تذکرہ ہے۔ یہ مضمون پہلی بار ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱۔ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۶۳ء) میں دوقسطوں میں شائع ہوا۔

5- تحریک اہلِ حدیث کے تین دَور:

اس مضمون میں ۱۸۵۷ء کے گرد و پیش تحریکِ اہلِ حدیث کی عملی مساعی کا تذکرہ ہے اور پھر مناظرات کے افادی و سلبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی مستقبل کے حوالے سے دعوتی اور جماعتی ترقی کے لیے مفید تجاویز کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (۱۵۔۲۲/ جنوری ۱۹۳۷ء) میں دوقسطوں میں شائع ہوا۔

6- جماعت کے ماضی اور حال پر ایک نظر اور مستقبل کے لیے ایک لمحہ فکریہ کی ضرورت:

اس میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے بعد جماعت اہلِ حدیث کی کارگزاری کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (یکم دسمبر ۱۹۳۲ء) میں شائع ہوا۔

7- آج کل کے مناظروں کی افادی اور شرعی حیثیت پر ایک نظر اور جماعت کا لائحہ عمل میں ایک اہم تبدیلی کی ضرورت:

جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس مضمون میں مناظرات کے مثبت اثرات اور شرعی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے برصغیر میں مناظرات کی تاریخ اور ان کے سلبی پہلو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (یکم فروری ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوا۔

8- اقامتِ دین اور آزادی کی پہلی انقلابی جدوجہد:

اس میں برصغیر کی جماعت مجاہدین کی خدمت و مساعی کا تذکرہ اور پھر بعض عصری تحریکوں کے طریقۂ کار کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ماہانہ ''المنبر'' فیصل آباد (۱۶/ اگست ۱۹۶۰ء) کے ''استقلال نمبر'' میں شائع ہوا۔

9- تحریک جہاد میں علمائے اہلِ حدیث کا حصہ:

اس مضمون میں ہندوستان کی تحریک آزادیِ وطن کے سلسلے میں اہلِ حدیث کی جہادی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۴/ مئی ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا۔

10- جماعت اہلِ حدیث اور نوائے پاکستان کا ایک خط:

نوائے پاکستان (مورخہ یکم ستمبر ۱۹۵۷ء) میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صاحب کا ایک خط شائع ہوا جس میں تحریکِ اہلِ حدیث کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا تذکرہ تھا۔ اس کے جواب میں مولانا سلفی رحمہ اللہ نے یہ مقالہ لکھا جو مجلّہ ''رحیق'' لاہور (اکتوبر ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا۔

11- تحریک مجاہدین اور مجلّہ رضوان:

مجلّہ ''رضوان'' لاہور (مارچ ۱۹۵۸ء) میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں تحریک مجاہدین کے متعلق یہ باور کرایا گیا کہ وہ انگریزوں کے نہیں بلکہ سکھوں کے خلاف تھی اور اس کے علاوہ بھی بعض حقائق کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے مولانا سلفی رحمہ اللہ نے یہ مضمون لکھا جو ماہانہ مجلّہ ''رحیق'' لاہور (مئی ۱۹۵۸) میں شائع ہوا۔

12- مدیرِ رضوان اور عدالتی چیلنج:

مجلّہ ''رضوان'' لاہور (جون ۵۸ء) میں مولانا سلفی ؒ کے سابق الذکر مقالے کے جواب الجواب میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں موضوع سے ہٹ کر کچھ نئے الزامات کا اعادہ تھا۔ اس کے جواب میں مولانا سلفی ؒ نے یہ مضمون لکھا جو مجلّہ ''رحیق'' لاہور (اگست و ستمبر ۱۹۵۸ء) میں شائع ہوا۔

13- فقہ اور تفقّہ:

اس میں فقہ اور تفقّہ کا لغوی اور شرعی معنی اور ایک فقیہ کی خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ فقہائے اہلِ حدیث کا ایک مستقل مکتبِ فکر ہے اور اس کے تاریخ شواہد پیش کیے ہیں۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۷/ جولائی ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔

14- اختلاف اور حدودِ ادب، امام ابو یوسف کا اندازِ بحث:

اس مضمون میں امام ابو یوسف کا بعض مسائل میں اپنے استاذِ گرامی امام ابو حنیفہ ؒ سے اختلاف بتاتے ہوئے یہ تنبیہ کی ہے کہ اگر اختلاف علمی ہو اور ادب کے دائرے میں کیا جائے تو یہ غلط نہیں اور نہ اسے توہین کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر امام ابو یوسف جیسا شاگرد اپنے استاذ سے اختلاف کر سکتا ہے تو دیگر علمائے امت بھی امام ابو حنیفہ ؒ سے اختلاف کریں تو یہ قابلِ طعن نہیں ہے اور اسے گوارا کرنا چاہیے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۶/ مئی ۱۹۵۰ء) میں شائع ہوا۔

15- اسلافِ کرام کا مطلوب احترام اور تقلیدِ جامد کے کرشمے:

اس میں اسلافِ امت کے احترام کا تذکرہ کرتے ہوئے مقلدین کی ائمۂ امت کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تقلیدِ جامد انسان سے ادب واحترام کا وصف چھین لیتی ہے اور مقلدین ہی اکابرِ امت کی توہین کے درپے رہتے ہیں۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۱۱/ اگست ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔

16- شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ اور مسئلہ فاتحہ خلف الامام:

اس مضمون میں فاتحہ خلف الامام کے متعلق شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ؒ کا فقہی موقف بتایا گیا ہے اور بعض علمائے احناف کی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ امام ابن تیمیہ ؒ کا موقف اس

مسئلے میں احناف سے ہم آہنگ ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ (۱۵/ ستمبر ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوا۔

17- ترکِ تقلید اور اہلِ حدیث:

اس مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ترکِ تقلید اور اہلِ حدیث نیز اہلِ حدیث اور غیر مقلد میں ترادف نہیں اور جو شخص ایسا سمجھتا ہے وہ فقہی مذاہب اور جمود و تقلید کے تاریخی پسِ منظر سے نابلد ہے۔ مضمون کے آخر میں بعض ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جنھیں غیر مقلد کہنا تو درست ہے لیکن وہ لوگ اہلِ حدیث کہلانے کے قطعاً حق دار نہیں۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۔۹۔۱۶/ جولائی ۱۹۶۵ء) میں تین اقساط میں شائع ہوا۔

18- اہلِ حدیث کی اقتداء:

آلِ بریلی کے آرگن ماہانہ ''رضوان'' لاہور (۲۸/ مارچ ۱۹۵۱ء) کے ''نماز نمبر'' میں بعض اختلافی مسائل کے تذکرے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اہلِ حدیث حضرات کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں، اور اس کے ساتھ ہی بعض مسائل کی غلط توجیہ اور چند قدیم اتہامات کا بھی اعادہ کیا گیا تو مولانا سلفی رحمہ اللہ نے ان الزامات کے جواب میں مذکورہ بالا عنوان سے یہ گراں قدر مقالہ لکھا جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷/ اپریل تا یکم جون ۱۹۵۱ء) میں چھے اقساط میں شائع ہوا۔

یہ مقالہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی فقہی مسائل میں ژرف نگاہی اور دقتِ نظر کی روشن دلیل ہے جس میں انھوں نے مخالفین کے شبہات و اتہامات کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے اور مسلکِ اہلِ حدیث کے موقف کی مضبوطی اور فریق مخالف کے منہج و استدلال کی کمزوریاں بھی خوب واشگاف کی ہیں۔

19- ہماری سرگذشت... آیندہ تبلیغی مساعی گذشتہ حوادث کی روشنی میں:

اس مضمون کے عنوان ہی سے اس کے مباحث کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں اور خصوصاً برصغیر میں اس جماعت کے خلاف مختلف حربے بروئے کار لائے گئے اور مسلک حق کے پیروکاروں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، حتی کہ انھیں مساجد سے نکال باہر کیا گیا لیکن دعوت کی ہمہ گیری اور عقیدے کی صفائی و پاکیزگی کی بدولت یہ تحریک پروان چڑھتی گئی اور کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہ ہوسکی۔

یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۴؍جون ۱۹۵۸ء تا ۱۴؍اگست ۱۹۵۹ء) میں چار اقساط میں شائع ہوا۔

20- ہمارے تعلقات... حضراتِ دیوبند سے:

اس میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر کے اکابر اہلِ علم مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف و تلامذہ فقہی جمود کے سخت مخالف تھے اور اسی فکر کی علمبردار جماعت اہلِ حدیث ہے۔ اب اس صورتِ حال میں علمائے دیوبند کو جماعت اہلِ حدیث سے نفرت و عداوت نہیں، بلکہ اکابر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس فقہی جمود سے اعراض کرنا چاہیے۔ بعد ازاں پاکستان میں اہلِ حدیث اور دیوبندی حضرات کے باہمی تعلقات کے نشیب و فراز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

21- قابلِ ضبط کتابیں... بریلوی حضرات سے مودبانہ گزارش:

اس مضمون میں بریلوی حضرات کی طرف سے ''تقویۃ الایمان'' اور بعض دیگر کتابوں کو قابلِ ضبط گردانے کی تجویز پر تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کتب میں وہی عقائد مذکور ہیں جو قرآن و سنت کی نصوص میں مرقوم ہیں اور اس کے ساتھ ہی بریلوی حضرات کے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے متعلق ناروا پروپیگنڈے اور الزامات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۲۷؍ستمبر، ۴، ۱۱، ۱۸؍اکتوبر ۱۹۵۷ء) کی چار قسطوں میں شائع ہوا۔

22- آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدائش اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ:

اس میں عید میلاد کی تاریخی اور شرعی حیثیت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس بدعت کے آغاز و ارتقاء کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے اور علمائے سنت کے ہاں اس کی شرعی حیثیت بھی واضح کی گئی ہے۔ یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۴؍ستمبر ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا۔

23- مسلکِ اہلِ حدیث کے بارے میں چند اہم سوالات اور ان کے جوابات:

۱۹۶۶ء میں جناب عبدالحق بی۔ اے، ایل۔ایل۔بی نے مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی خدمت میں مسلکِ اہلِ حدیث کے منہج اور طرزِ فکر و عمل کے بارے میں چودہ سوالات ارسال کیے جن کا مولانا سلفی رحمہ اللہ نے نہایت تسلی بخش جواب دیا۔ یہ سوالات و جوابات ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (۳؍جون ۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئے۔

اسلوبِ تحقیق:

۱۔ آیات کی نشاندہی۔

۲۔ احادیث و آثار کی تحقیق و تخریج۔

۳۔ عربی و فارسی عبارات کا اصل مصادر و مراجع سے تقابل و اصلاح۔

۴۔ عربی و فارسی اشعار کا ترجمہ، جو برادرِ مکرم پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ کا تحریر کردہ ہے۔

۵۔ حتی الوسع مقالات و مضامین کا اصلی مآخذ سے مقارنہ و موازنہ۔

۶۔ بعض مقامات پر مختصر حواشی و تعلیقات۔

۷۔ ہمیں مولانا سلفی رحمہ اللہ کی معروف کتاب ''تحریک آزادیِ فکر'' کا مولانا سلفی رحمہ اللہ کا تصحیح شدہ ذاتی نسخہ حاصل ہوا جس میں کئی مقامات پر مولانا سلفی رحمہ اللہ کے ہاتھ کی تصحیحات تھیں جو ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں، جن سے بعض مضامین کی اصلاح میں مکمل استفادہ کیا گیا۔ یہ نسخہ مؤلف رحمہ اللہ کے حفید محترم حافظ اسعد محمود سلفی رحمہ اللہ نے ہمیں مہیا کیا۔ جزاہ اللہ خیراً.

اظہارِ تشکر:

ہم سب سے پہلے اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں جس کی توفیق سے ہمیں ان نگارشات کو منظرِ عام پر لانے کی سعادت حاصل ہوئی، اور بعد ازاں ان تمام احباب و اخوان کے ممنون ہیں جنھوں نے ہمارے ساتھ ان مقالات کی تکمیل و طباعت کے لیے کسی طرح کا تعاون کیا، خصوصاً فضیلۃ الشیخ مولانا صلاح الدین مقبول حفظہ اللہ کے شکر گزار ہیں جنھوں نے کتاب پر مفصل علمی مقدمہ تحریر کیا۔ جَزَاہُ اللّٰہُ خَیراً وَبَارَکَ فِیهِ.

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیرِ خَلْقِهِ وَسَلَّمْ وَعَلٰی آلِهِ وَصَحْبِهِ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

والسلام

حافظ شاہد رفیق

یکم نومبر ۲۰۲۳ء

تحریک اہلِ حدیث

اور

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

(۱۳۱۴۔۱۳۸۷ھ = ۱۸۹۵۔۱۹۶۸ء)

(شیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ)

اہلِ حدیث کا اطلاق:

اہلِ حدیث کا اطلاق بیک وقت ان نفوس قدسیہ پر ہوتا ہے جنھوں نے ایک طرف ذخائرِ حدیث اور دواوینِ سنت کی جمع و تدوین کا کام سر انجام دیا اور دوسری طرف وہ کسی بھی دور میں تقلید شخصی، تعصب فقہی اور جغرافیائی تنگ نظری کے بندھنوں سے آزاد ہو کر تمام شعبہ ہائے زندگی میں صرف کتاب وسنت کی راہنمائی اور بالا دستی کے حامی و قائل رہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علمائے حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"وَبِكُلِّ حَالٍ، فَهُمْ أَعْلَمُ الْأُمَّةِ بِحَدِيْثِ الرَّسُوْلَ وَسِيْرَتِهِ وَمَقَاصِدِهِ وَأَحْوَالِهِ، وَنَحْنُ لَا نَعْنِي بِأَهْلِ الْحَدِيْثِ الْمُقْتَصِرِيْنَ عَلىٰ سِمَاعِهِ أَوْ كِتَابَتِهِ أَوْ رِوَايَتِهِ، بَلْ نَعْنِي بِهِمْ: كُلُّ مَنْ كَانَ أَحَقُّ بِحِفْظِهِ وَمَعْرِفَتِهِ وَفَهْمِهِ ظَاهِراً وَبَاطِناً، وَاتِّبَاعِهِ بَاطِناً وَظَاهِراً، وَكَذٰلِكَ أَهْلُ الْقُرْآنِ" (فتاوی شیخ الإسلام: ٤/ ٩٥)

"بہر حال وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث و سیرت اور آپ کے مقاصد و احوال کے بارے میں امت کے سب سے زیادہ صاحبانِ علم افراد ہیں۔ ہمارے نزدیک اہلِ حدیث سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کا کام حدیث سننے، لکھنے یا روایت کرنے تک محدود ہے بلکہ اہلِ حدیث سے مراد ہر وہ شخص ہے جو ظاہری و باطنی طور پر حفظِ حدیث، اس کی معرفت اور اُس

کے فہم اور باطنی و ظاہری طور پر اتباعِ حدیث کا حقدار و دل دادہ ہے، اور اسی طرح اہلِ قرآن بھی۔"

یہی وجہ ہے کہ مختلف فیہ فقہی مسائل میں اہلِ حدیث کا ذکر مستقل طور پر ائمۂ فقہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

امام ابوعبداللہ حاکم نیسابوری نے اپنی معروف کتاب "معرفة علوم الحديث" (ص: ۶۳) میں اس علم کی بیسویں قسم کو "معرفة فقه الحديث" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کا مقصد اس سے فقاہتِ اہلِ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہے کہ ماہرینِ اہلِ فن فقہ حدیث سے نابلد نہیں، کیوں کہ وہ اس علم معرفت حدیث کی ایک قسم ہے۔ پھر انھوں نے فقہائے اہلِ حدیث کا تذکرہ فرمایا۔

دوامِ تحریک کے اسباب:

دنیا کی جو تحریکیں کسی سیاسی مقصد، ذاتی مصلحت، جغرافیائی ضرورت یا جذبات کی بنا پر وجود میں آتی ہیں وہ اپنے اغراض و مقاصد اور مصالح کے حصول کے بعد یا تو سرد پڑ جاتی ہیں یا ہمیشہ کے لیے اپنی موت خود مر جاتی ہیں۔

قوتِ فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے پھر کسی قوم کی عظمت پر زوال آتا ہے

دوام و جاودانی صرف ان تحریکوں کو میسر آتی ہے جن کا قیام ایسے مستحکم اصولوں پر ہوتا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے پاک اور وقتی احوال و ظروف کی پیدا وار نہیں ہوتیں۔ مسلک اہلِ حدیث کے اغراض و مقاصد کتاب و سنت سے ماخوذ وہ اصول و ضوابط ہیں جو تا قیامت دنیائے انسانیت کی راہنمائی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ وہ زمان و مکان کے حدود سے آزاد ہیں۔ مصلحت پرستی اور جذباتیت سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس مسلک کے حاملین و عاملین کی بے نفسی، عدل و انصاف اور کتاب و سنت کی بالا دستی کے لیے ہر دور میں جہد مسلسل تاریخ کے طالب علموں پر مخفی نہیں۔

حبّ کتاب و سنت:

حبّ کتاب و سنت اہلِ حدیث کا وہ امتیازی وصف ہے جس کا کما حقہ وجود کسی دوسرے گروہ میں نہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"وَأَدْنىٰ خَصْلَةٍ فِيْ هٰؤُلَاءِ: مُحَبَّةُ الْقُرْآنِ وَالْحَدِيْثِ، وَالْبَحْثُ عَنْهُمَا وَعَنْ مَعَانِيْهِمَا، وَالْعَمَلُ بِمَا عَلِمُوْهُ مِنْ مَوْجِبِهِمَا..." (فتاویٰ شیخ الاسلام: ۴/ ۹۵)

''قرآن و سنت سے محبت، ان کی تحقیق و جستجو، ان کے معانی و مفاہیم کے بارے میں بحث و تحقیق، ان کے بموجب اس پر عمل ان (اہلِ حدیث) کی ادنیٰ خصلت ہے۔''

اس اصول کی پابندی کے سبب ان کے یہاں اختلاف دوسروں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"وَلِهٰذَا تَجِدُ أَقَلَّ النَّاسِ اخْتِلَافًا أَهْلَ السُّنَّةِ وَالْحَدِيْثِ، فَلَيْسَ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ طَائِفَةٌ أَكْثَرُ اتِّفَاقًا، وَأَقَلُّ اخْتِلَافًا مِنْهُمْ لَمَّا بَنَوْا عَلٰى هٰذَا الْأَصْلِ"

(إعلام الموقعين: ٢/ ٧٤٥)

''اس (پیروی کتاب وسنت) کی وجہ سے اہل الحدیث والسنۃ کے درمیان اختلاف دوسروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس اصول کی پابندی کے سبب مسائل میں ان سے زیادہ متفق اوران سے کم اختلاف کرنے والا پورے روئے زمین پر کوئی گروہ نہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کی پیروی میں اتحادِ امت کا راز پوشیدہ ہے اوران کی تعلیمات سے دوری فرقہ بندی کا پیش خیمہ ہے۔

علامہ اقبال نے بھی انہی امور کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا ہے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہے سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کون ہے تارکِ آئین رسولِ مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار
روح میں سوز نہیں قلب میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمھیں پاس نہیں

خلاصہ کلام یہ کہ اہلِ حدیث و سنت و اثر میں ان کمالات و محاسن اور امتیازات وخصوصیات کا منبع و سرچشمہ صرف قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی پابندی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ))

لہٰذا اس بہترین کتاب قرآن کریم اور بہترین سنت و سیرت کی بنیاد پر جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ یقیناً بہترین معاشرہ ہوگا۔

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

”تم سب سے بہتر امت چلے آتے ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس نبی ﷺ کی بہترین امت کا ہراول دستہ ہیں اور اہلِ حدیث ہر دور میں ان کی دعوت کے امین و نگہبان اور مخلص علم بردار رہے ہیں۔

اہلِ حدیث فرقہ یا تحریک؟

بعض اہلِ حدیث مورخین لکھتے اور خطبا و مقررین کہتے رہتے ہیں کہ اہلِ حدیث مکمل اسلام پر عمل کی ایک تحریک ہے، کوئی فرقہ نہیں۔ اس کے تحریک ہونے میں کوئی شک نہیں اور یہی حق ہے لیکن ”فرقہ“ کا لفظ اردو زبان میں شاید مذموم گروہ بندی ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے اسے مذموم سمجھا جاتا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں   کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

عربی زبان میں امت، ملت، فرقہ، طائفہ اور حزب وغیرہ لفظی طور پر نہیں بلکہ اپنے اقوال و افعال کی بنا پر ممدوح و مذموم قرار پاتے ہیں۔ ”حزب اللہ“ اور ”حزب الشیطان“ کی قرآنی تعبیر سے کون واقف نہیں۔

﴿ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المجادلة: ۱۹]

﴿ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [المجادلة: ۲۲]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ... ﴾ [التوبة: ١٢٢]

''سو ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے؟''

اس آیت میں فرقہ و طائفہ کا استعمال مادحانہ ہے۔

حدیث نبوی ہے:

« إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابَيْنِ افْتَرَقُوا فِيْ دِيْنِهِمْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً، وَإِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً -يَعْنِي الْأَهْوَاءَ- كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ »

(مسند أحمد: ٤/ ١٠٢، واللفظ له، وأبو داود، رقم الحديث: ٤٥٩٧، والسلسلة: ٢٠٤ عن معاوية رضي الله عنه)

بعض روایات میں ''فرقہ'' کا لفظ وارد ہے۔ اس روایت کی تفسیر میں اہل الحدیث والسنۃ والأثر ہی کو ''الفرقة الناجية'' کہا گیا ہے۔

حدیث میں ہے: « لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ قَائِمَةً بِأَمْرِ اللّٰهِ...»

(متفق عليه عن معاوية وغيره)

اس حدیث میں مذکور طائفہ کو ''طائفة منصورة'' کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اگر اہل الحدیث اور اہل السنۃ نہیں ہیں تو دوسرا کون ہوسکتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے مشہور زمانہ رسالہ ''العقيدة الواسطية'' کا افتتاح ہی حدیث میں مذکور ''فرقہ'' کے تذکرے سے کیا ہے۔ رقمطراز ہیں:

''فَهٰذَا اعْتِقَادُ الْفِرْقَةِ النَّاجِيَةِ الْمَنْصُوْرَةِ إِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ۔ أَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ...'' (دعوة شيخ الإسلام: ٢/ ٦٤٩)

خلاصۂ کلام یہ کہ فرقۂ حق ہونا کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ دلائل سے دور مسائل اور باطل افکار و نظریات کی تائید کے لیے فرقہ بننا بہر حال مذموم ہے۔ یا یہ کہہ لیں کہ اہلِ حدیث اردو زبان کی دلالت کے اعتبار سے ''فرقہ'' نہیں لیکن عربی میں ان کا ''فرقہ ناجیہ و منصورہ'' ہونا کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ حدیث فرقہ ناجیہ و منصورہ ہیں اور ان کا مسلک کتاب و سنت پر بے چوں و چرا عمل کی ایک تحریک ہے۔

مسلک اہلِ حدیث کے محاسن اور امتیازات وخصوصیات:

- مسلک اہلِ حدیث سلف صالحین (صحابہ کرام وغیرہم) کے فہم کے مطابق مکمل اسلام کی صحیح ترین تعبیر اور جملہ شعبہ ہائے حیات میں اس کے نفاذ وعمل کی ایک تحریک ہے۔
- یہ مسلک کتاب وسنت کی روشنی میں جہاں عقائد کی اصلاح، عبادات کی صحیح ادائیگی، احکام شریعت کے نفاذ، معاملات کی صفائی، سیاست وحکومت کی بہتری، اخلاق و آداب کی پاکیزگی، غرضیکہ جملہ دنیاوی و اخروی امور کی طرف ہدایت و راہنمائی کا ضامن ہے، وہیں گمراہ فرقوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی اور ان کے باطل افکار ونظریات سے نجات کا ایک محفوظ ترین قلعہ ہے۔
- مسلک اہلِ حدیث عقائد وفقہی موشگافیوں سے دور واضح وصریح مسلک ہے جو انسانی فطرت سے قریب تر اور عقیدے میں وحدت و یگانگت کا داعی ہے۔
- مسلکِ اہلِ حدیث افراط وتفریط سے پاک، تمام مذاہبِ فکر اور مسالکِ فقہ میں سب سے زیادہ معتبر اور معتدل مسلک ہے۔

﴿ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ٣٠]

''یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یہ شرف اس مسلک کو کتاب وسنت سے براہ راست استفادے کے سبب حاصل ہوا ہے جو دوسرے مسالک و مذاہب کو میسر نہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

- دوسرے قدیم و جدید مذاہب ومسالک اور جماعات وجمعیات کے دستور اور لائحۂ عمل کا مطالعہ فرمائیں تو اندازہ ہوگا کہ ان میں خلافِ فطرت اتنے قیود وشرائط اور دفعات ہوتے ہیں جنھیں عقل سلیم کسی بھی حال میں گوارا نہیں کرسکتی کیوں کہ وہ اسلامی تعلیمات کی وسعت اور اللہ کی عطا کردہ آزادیٔ فکر کے خلاف ہیں۔ وصف نبوی ہے:

﴿ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

''اور وہ ان سے ان کا بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو اُن پر پڑے ہوئے تھے۔''

یہ وہ محاسن وفضائل ہیں جن کے سبب مسلک اہلِ حدیث دوسرے مسالک ومناہج اور فرق و جماعات سے ممتاز ہوجاتا ہے۔

یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تاریخ ادیان و مذاہب کے مطالعہ کے بعد مسلک حدیث اور اس کے حاملین کے بارے میں نہایت عادلانہ و ذمہ دارانہ حکم صادر فرماتے ہوئے لکھا:

”أَهْلُ الْحَدِيْثِ فِيْ كُلِّ زَمَانٍ، كَأَهْلِ الْإِسْلَامِ فِيْ سَائِرِ الْأَدْيَانِ“ (نقض المنطق: ٧٧)

”اہلِ حدیث ہر زمانے میں دوسروں کے مقابلہ میں ویسے ہی ممتاز ہیں جیسے اہلِ اسلام دوسرے ادیان کے مقابلے میں ممتاز ہیں۔“

مسلک اہلِ حدیث کی جامعیت وشمولیت اور آفاقیت و ہمہ گیری:

تعصب اور تنگ نظری کی عینک اتار کر حقیقت پسندانہ طور پر مسلک اہلِ حدیث کی ہمہ جہتی و ہمہ گیری اور اس کی جامعیت وشمولیت اور آفاقیت کے اسباب پر ایک طائرانہ نظر ہی کسی منصف مزاج شخص کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

وجوہ و اسباب:

۱۔ اسلام سے منسوب قدیم گمراہ فرقے (قدریہ، جہمیہ، خوارج، روافض، معتزلہ اور مرجیہ وغیرہ) خلاف عقل وشرع ان کے بنیادی اغراض و مقاصد اور اسلامی زندگی پر مرتب ہونے والے ان کے مضر اثرات ونتائج کا مسلک اہلِ حدیث میں سد باب کیا گیا ہے۔

افراط وتفریط سے بچتے ہوئے ان فرقوں کے اس وقت کے سلگتے ہوئے مسائل (صفاتِ باری تعالیٰ، خلق افعال العباد، وعید، ایمان، دین اور اسلام کے مفہوم کی تعیین اور صحابہ کرام وغیرہ) کے بارے میں مسلک اہلِ حدیث میں عادلانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس باب میں مختلف علمائے حدیث کی گراں مایہ کوششوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جماعت محدثین کے قافلہ سالار، امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ ملاحظہ فرمائیں کہ انھوں نے اپنی بابرکت تصنیف ”صحیح البخاری“ کی کتاب الایمان میں مرجیہ، کتاب الفتن میں خوارج، کتاب الأحکام میں روافض، کتاب الاعتصام میں اہل القیاس والرأی، کتاب اخبار آحاد میں اہلِ اصول اور کتاب التوحید میں جہمیہ وقدریہ وغیرہ کی خبر کس قدر محدثانہ، عالمانہ ومحققانہ انداز میں لی ہے۔

ان گوشوں کی طرف راہنمائی دوسرے مسالک و مناہج میں یا تو مفقود ہے یا اس میں اس قدر

بے سمتی ہے کہ منہج حق کی تلاش بے حد مشکل ہوگی۔ یہ صرف مسلک اہلِ حدیث وسنت اور اس کے عاملین ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔

۲۔ مسلکِ اہل الحدیث والسنۃ والأثر مکمل اسلام کی صحیح ترین تعبیر اور اس کے اوامر ونواہی پر عمل اور نفاذ کی جامع تحریک ہے۔ جملہ شعبہ ہائے زندگی اور کتاب وسنت کی روشنی میں تمام دنیاوی و اخروی مسائل کا احاطہ اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس جامعیت وشمولیت کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں جو دوسرے مناہج ومسالک میں مفقود ہیں:

❀ ''کتاب وسنت'' ہی مسلک اہلِ حدیث کے اصلی مآخذ ومصادر ہیں۔ انھیں اس مسلک میں سلف صالحین (صحابہ کرام وتابعین عظام) کے طریقہ پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کیوں کہ وہی ان کے اولین مخاطب تھے۔ پس کتاب وسنت کی تشریح میں ان کا فہم وادراک دوسروں کے مقابلے میں معتبر اور معتمد علیہ ہے۔

❀ مسلک اہلِ حدیث میں صحیح سند سے ثابت بلا تفریق جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احادیث سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

روافض نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے معدودے چند حامیوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام مع خلفائے راشدین کی احادیث کو نہ صرف ترک کیا بلکہ ان نفوس قدسیہ کی تکفیر کے بھی قائل ہوئے۔ خوارج مسئلہ تحکیم کے بعد علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما اور دونوں کے حامیوں کی احادیث سے استفادہ تو درکنار، ان کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ جہمیہ، قدریہ، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ اپنے اغراض ومقاصد کے لیے معین و مددگار احادیث کو مانتے اور دوسری احادیث کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ ان کا کلی انکار کرتے ہیں۔

مزید برآں ان گمراہ فرقوں نے حدیث «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً» کی وعید سے بے پروا ہوکر اپنے مذہب کی تائید میں حدیثیں وضع کیں جس کا اعتراف بہتوں نے اپنی ہدایت یابی کے بعد کیا۔ (الطوام المرعشة للشيخ بديع الدين الراشدي، ص: ۳۰)

بعض فقہی مذاہب کے مقلدین کی حالت بھی عمل بالحدیث کے سلسلہ میں زیادہ بہتر نہیں بلکہ مذہب کی تائید میں وضع حدیث کے وہ بھی مرتکب ہوئے۔

علامہ ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی (۱۳۰۷ھ) نے فقہی تعصب اور تقلیدی جمود کو وضع حدیث کا

ایک سبب بتاتے ہوئے مامون ہروی کے بارے میں نقل کیا کہ اس نے نماز میں رفع الیدین اور فاتحہ خلف الامام کی قراءت کے پابند کی نماز نہ ہونے کی حدیث وضع کی۔ اسی طرح امام شافعی کی مذمت اور امام ابو حنیفہ کی منقبت میں بھی جھوٹی حدیث بنائی۔ (الطوام المرعشة، ص: ٦٧)

اسی طرح علامہ بکر بن عبداللہ ابو زید رحمہ اللہ نے فقہی تعصب کو تمام خرابیوں کی جڑ بتاتے ہوئے فرمایا کہ ایک عالم ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی طرف منسوب ہو کر دلیل یا اس کی دلالت کی تحریف میں اس لیے مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کے مسلک کی اس سے تائید ہو جائے۔ تعصب اور تنگ نظری کے شکار ہر مذہب میں اس طرح کے کتنے ہی افراد گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔

(تحريف النصوص، ص: ١٤٩، ضمن الردود، وزوابع في وجه السنة، ص: ٢٩٥ ـ ٣٨٧)

قدیم گمراہ قوموں کی طرح مختلف فقہی مذاہب کے مقلدین نے بھی اپنی تنگ نظری کے سبب بہت سی صحیح حدیثوں کو ترک کر دیا، صحابہ کرام کو فقیہ و غیر فقیہ کے خانوں میں بانٹنے کی کوشش کی اور خبر آحاد کو ظنی الثبوت کہہ کر نا قابلِ اعتبار قرار دیا۔ بعضوں نے تو یہ کہنے کی جرأت کر ڈالی کہ جو حدیث ہمارے مذہب کے مطابق نہ ہو وہ قابلِ عمل ہی نہیں۔ اس کے برخلاف مسلک اہلِ حدیث کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کے حاملین و عاملین نے تمام صحابہ کرام اور ہر طرح کی صحیح احادیث سے استفادہ فرمایا، جس کے نتیجے میں مکمل و مدلل اسلامی نظام حیات مرتب ہوا۔ اگر محدثین نے یہ عادلانہ رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو امتِ مسلمہ ذخیرۂ حدیث کے بہت سے گراں مایہ اجزاء سے محروم رہ جاتی۔

اس طرح محدثین ارشادِ ربانی: ﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨١] کے اولین مصداق قرار پائے۔

٣۔ اسلام ایک فطری مذہب اور مکمل نظام حیات ہے۔ اس کے احکام و فرامین پر عمل اور ان کا نفاذ "کل لا يتجزأ" کے طور پر مطلوب ہے تاکہ ﴿ أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ کی وعید سے بچا سکے۔ لہٰذا سیاسی اسلام، اقتصادی اسلام، اشتراکی اسلام، جمہوری اسلام، ترقی پسند اسلام، یہاں تک کہ تبلیغی اسلام، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اسلام وغیرہ کی تقسیم اسلام کے مزاج اور اس کی ہمہ گیری و جہاں داری اور جامعیت و شمولیت کے خلاف ہے۔

مسلک اہلِ حدیث کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں دین وسیاست اور مادیت وروحانیت میں کوئی تفریق نہیں بلکہ فطری تقاضوں کے مطابق ہر چیز کی ضرورت انسانی زندگی کا خاصہ ہے ﴿ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴾ [الملك: ١٤]

اسی طرح فقہی تعصب اور تنگ نظری سے دور رہ کر مسلک اہلِ حدیث جزوی اسلام کی نہیں بلکہ کلی اسلام کی نمائندہ تحریک ہے جس میں انسانی زندگی سے متعلق جملہ مادی و روحانی اور دنیوی و اخروی امور کا احاطہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٣٨]

''ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔''

فرمان نبوی ہے:

"إِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ إِلَّا مَا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ، وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى النَّارِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ" (الصحيحة، رقم الحديث: ٢٨٦٦، عن ابن مسعود)

مذکورہ بالا تمام گوشوں پر نگاہ ڈالنے سے آپ کو یہ یقین ہوجائے گا کہ جو جامعیت، آفاقیت اور ہمہ جہتی و ہمہ گیری مسلک اہلِ حدیث میں ہے وہ کسی اور مسلک میں نہیں۔

انسانی زندگی پر مسلکِ اہلِ حدیث کے اثرات:

مسلک اہلِ حدیث کی پابندی سے معتدل ومتوازن اور مستقل بالذات شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ مکمل اسلام پر عمل اور اس کی طرف دعوت اس کی زندگی کا لازمہ اور جزو لاینفک ہوجاتا ہے۔ اس کی شخصیت موقع پرستی اور تنگ نظری کا شکار نہیں ہوسکتی بلکہ وہ اللہ کے اوامر ونواہی کی پابندی کرتے ہوئے صراط مستقیم پر بہرحال گامزن رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ:

- اسلام کے سیاسی واقتصادی نظام کے نفاذ کو اپنی زندگی کا حاصل مانے اور دوسری طرف اس کی زندگی میں اسلام کے دوسرے شعائر کا کوئی قابلِ ذکر عمل دخل نہ ہو۔
- یا وہ بعض عبادات وارکان کی مبالغہ آمیز پابندی کا قائل ہو اور دوسری طرف بنیادی عقائد اور دیگر اساسیاتِ دین کے سلسلہ میں اس کی ایمانی برودت تحت الصفر ہوجائے۔
- یا وہ اپنی عورتوں کو تو عام حالات میں بغیر محرم کے بلا جھجک ملکی وغیر ملکی سفر کرائے اور حج وعمرہ

میں جانے کے لیے محرم کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یا عورتیں برسرِ عام بے پردہ بازاروں میں سیر وتفریح کریں تو کسی فتنہ وفساد کا کوئی شبہ نہیں لیکن صلاۃ العیدین کے لیے عید گاہ یا جمعہ و جماعت کے لیے مسجد میں باپردہ حاضر ہونا چاہیں تو سنت کے خلاف فتنہ وفساد میں مبتلا ہونے کے شبہہ کا فتویٰ جڑ دیا جائے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مسلک اہلِ حدیث میں اس افراط وتفریط کی کوئی گنجایش نہیں اور نہ اس مسلک کے زیر سایہ تربیت یافتہ شخص یہ مضحکہ خیز رویہ اختیار کرسکتا ہے۔ میں حقیقت سے دور برائے نام مسلکی انتساب کی بات نہیں کرتا کیونکہ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

اصل مرکزِ حق کتاب وسنت:

مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”اصل مرکزِ حق ویقین کتاب وسنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ سب کو اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ اس کی چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔“

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ»

”جب نص رسول کے مقابلے میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی تو اَحب رسول کب باقی رہا۔ ارباب افراط وغلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل بنا لیتے ہیں، جس کو کسی حال میں اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا اور پھر چاہتے ہیں کہ وحیِ الٰہی وصاحب وحی کی نص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر خود ساختہ مرکز تک لے جائیں اور نہ جا سکے تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں۔ اس پر ستم یہ کہ اس طریق کو توفیق و تطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ تطبیق ہے تو ”والذي نفسي بيده“ کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا اور نہ کبھی اہلِ کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی۔“

(تذکرة، ص: ٥٧، ٥٨ بحواله مولانا أبو الكلام آزاد، ص: ٣٣، مصنفه محمد أعظمى)

خلاصۂ کلام:

آج کی ماڈرن دنیا اسی مسلکِ حق و منہج سلف کی تلاش میں ہے جو مذاہبِ فقہ کے وجود سے قبل صحابہ کرام اوران کے تابعین کا مسلک تھا، تاکہ وہ اصل مرکزِ حق کتاب وسنت کی طرف فطری طور پر لوٹ سکے۔

آج بھی وہ مذہب ذخائرِ حدیث اور دواوینِ سنت میں ویسے ہی موجود ہے جیسے خیر القرون میں تھا۔ وہی مسلک مسلک اہلِ حدیث، مسلک اہل السنۃ والجماعہ، مسلک اہلِ اثر اور مسلک سلف کہلاتا ہے، اس مسلک کے حاملین وعاملین، کتاب وسنت کی روشنی میں ''فرقۂ ناجیہ'' و''طائفۂ منصورہ'' ہیں۔ ان کا راستہ وہ صراط مستقیم ہے جسے اختیار کرنے کے بعد کوئی انسان گم گشتۂ راہ نہیں ہوسکتا۔ لَا يَزِيغُ عَنْهَا إِلَّا هَالِكٌ!

ارشادِ نبوی ہے:

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُولِهِ»

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مسلک اہلِ حدیث کے حاملین وعاملین، دعاۃ ومبلغین اور علما وطلبہ کا اوّلین دعوتی فریضہ ہے کہ وہ خود اس کے محاسن اور امتیازات وخصوصیات سے اپنے آپ کو مزین کریں اور پھر دوسروں کو اس کی حقانیت سے روشناس کرائیں۔ آج کی ماڈرن دنیا کتاب وسنت سے ماخوذ اسلامی نظامِ حیات کے اخلاق وآداب اور اصول وضوابط سے واقفیت کے لیے بے قرار ہے۔ اس کی داد رسی کے لیے آپ کمر بستہ ہوں کیوں کہ کتاب وسنت کا گوہر نایاب بغیر کسی کم وکاست اور تحریف وتغیر کے اصل صورت میں صرف آپ کے پاس موجود ہے، لہٰذا دنیا کو آج آپ کی ضرورت ہے۔ آپ اس ذمے داری کو محسوس کریں۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

وعدۂ ربانی ہے:

﴿ إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ﴾ [محمد: ۷]

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جما دے گا۔''

اللہ آپ کا حامی و مددگار ہو۔

صاحبِ کتاب کی تحریروں کا مرکزی عنوان:

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی تمام تحریروں کا مرکزی عنوان تحریک اہلِ حدیث، محدثین کی قربانیاں، ان کی خصوصیات، امتیازات اور مسلکِ اہلِ حدیث کے فضائل و محاسن ہے۔ اسی مناسبت سے یہاں اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ہوئی۔ شاید اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما لے۔

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

درخورِ اعتنا یہ کوشش کو تاہ کرے حشر میرا میرے اسلاف کے ہمراہ کرے

صاحبِ کتاب اپنی تحریروں کے آئینے میں:

چودھویں صدی ہجری (بیسویں صدی عیسوی) میں مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ (۱۳۱۴۔ ۱۳۸۷ھ = ۱۸۹۵۔ ۱۹۶۸ء) کا شمار تحریک اہلِ حدیث (برصغیر پاک و ہند) کے ممتاز رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تعلیم و تربیت گھریلو دیندارانہ ماحول سے شروع ہوئی، پھر ''وزیر آباد''، ''دہلی''، ''امرتسر'' اور ''سیالکوٹ'' کے علمی مراکز کے مرکب سے جو خمیرہ تیار ہوا اس سے ان کی ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل ہوئی۔

یہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی سعادت مندی ہے کہ وہ ہر خاص مقام پر اپنے ان محسن اساتذہ کرام کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ ''حجیتِ حدیث'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''اگر یہ کوشش عند اللہ مقبول ہو تو میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں میرے اساتذۂ کرام کو بھی شریک فرمائے۔''

اپنی معروف کتاب ''تحریک آزادیِ فکر اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تجدیدی مساعی'' کے مقدمے میں اپنے استاذ گرامی محدث کبیر حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کے لیے خصوصی دعا کی درخواست کرتے ہوئے معترف ہیں کہ ان کی بامقصد تربیت نے انھیں توحید و سنت سے محبت اور مذہبِ سلف کے تمسک پر آمادہ کیا۔

علومِ کتاب و سنت میں اعلیٰ بصیرت، عقیدہ و شریعت میں درک، معاصر تحریکوں سے گہری واقفیت، اسلام اور مراجع اسلام کے خلاف رچی جانے والی سازشوں سے آگاہی میں وہ اپنے جماعتی و غیر جماعتی معاصرین سے کہیں آگے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد وحیِ معصوم پر

رکھی، جن سے ایک طرف معتبر امور عقائد و عبادات اور احکام و مسائل کی توضیح اور تحریک اہلِ حدیث کی تائید ہوئی تو دوسری طرف منکرینِ حدیث کی جانب سے سنت کے خلاف سازشوں کا پردہ فاش ہوا۔

کتاب و سنت کی بالا دستی، ثابت شدہ معتبر مسائل اور مستحکم اسلامی اصولوں کے خلاف کوئی بھی نامناسب آواز کہیں سے بھی اٹھی تو اس کی بازگشت کو مولانا نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے دبانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس سلسلے میں نہ کورٹ میں اعلیٰ منصب پر فائز کرسیٔ عدالت پر متمکن کسی جج کی پروا رہی، نہ کسی اسلامی جماعت کی اعلیٰ قیادت کا خیال رہا اور نہ جادۂ استقامت سے منحرف ادارے اور شخصیتیں ملحوظِ خاطر رہیں۔ اگر کسی چیز کا غم رہا تو وہ صرف اسلام، اصولِ اسلام اور مراجعِ اسلام کی حفاظت و صیانت کا غم تھا اور بس:

ایک مرکز پہ سمٹ آیا جہانِ آرزو کثرتِ موہوم سے جب دل پریشاں ہوگیا

گویا عربی شاعر نے آپ کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے:

إِذَا رَضِيَ الْحَبِيْبُ فَلَا أُبَالِي أَ قَامَ الْحَيُّ أَمْ جَدَّ الرَّحِيْلُ

مولانا سلفی کا اسلوب نگارش:

علومِ شریعت کے در و بست، پیچ وخم اور اَسرار و رموز سے اعلیٰ واقفیت کے ساتھ مولانا ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ بڑے سے بڑے مسئلے کو چند جملوں میں سمیٹ لینا، مشکل سے مشکل قضیے کو اشاروں میں حل کر دینا آپ کا خاصہ تھا۔ تحریر و تقریر میں نہ کوئی شرعی مخالفت اور نہ ادبیت کا فقدان۔ یہ وہ اوصاف جمیلہ ہیں جن کا معاصرین کی تحریروں میں فقدان نظر آتا ہے۔

میں علومِ کتاب و سنت کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ بیجا مدح و ذم اور جرح و تعدیل کا نہ قائل ہوں اور نہ میرا مسلک و منہج اس کی اجازت دیتا ہے۔ یہ بات میں مولانا سلفی رحمہ اللہ سے خوش اعتقادی کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی اور معاصرین کی تحریروں کے درمیان موازنے کے بعد علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کیوں کہ میں نے معاصرین کی تحریروں کے سیکڑوں صفحات کا مطالعہ کیا ہے اور ان پر میرے قلم سے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل نقد و تبصرہ شائع ہے۔

ان حضرات کے یہاں جب کسی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے تو اس کے لیے ایک پیرا گراف نہیں بلکہ صفحات کیا، ایک رسالے تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں بسا اوقات نہ کہیں قرآن سے استدلال، نہ

حدیث سے تائید بلکہ اس کے برعکس ایک جگہ نہیں، جگہ جگہ مصنف کا فکر کہیں کسی آیت کے صحیح مفہوم سے متصادم ہو جاتا ہے اور کہیں کسی صحیح حدیث سے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ حضراتِ مصنفین دانستہ طور پر ایسا کرتے ہوں گے لیکن علومِ شریعت میں درک نہ ہونے کی یہ واضح مثال ہے۔

الحمد للہ! ہمارے راہنما مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تحریریں ان نقائص سے خالی ہیں۔

❁ برصغیر (ہند و پاک) کے مشہور سوانح نگار اور معروف صحافی، ہمارے بزرگ مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کے مطابق مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تقریر بھی تحریر ہی کی طرح ہوا کرتی تھی۔ یہ وصف خال خال ہی علما میں پایا جاتا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

❁ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی کسی کتاب یا مضمون کا آپ مطالعہ فرمائیں، موضوع سے متعلق وافر معلومات کی فراہمی کے ساتھ، اس کی روانی میں نہ کوئی کمی محسوس ہوگی اور نہ بیان میں کوئی پیچیدگی۔ میں اس طرزِ نگارش کو ادب و انشا کا منتہائے کمال سمجھتا ہوں۔

موقع و محل کے اعتبار سے کتاب و سنت سے بھرپور استدلال کے ساتھ ساتھ تحریروں میں اردو، عربی اور فارسی کے ایسے اشعار اور محاورے رقم فرماتے ہیں جیسے ان کا سببِ ورود انھی مقامات کے لیے تھا۔ مثلاً کسی پر پیچ مسئلہ میں بغیر دلیل کے رائے زنی کرنے والے پر یہ عربی شعر برمحل نوٹ فرما دیا:

كَبَهِيمَةٍ عَمْيَاءَ قَادَ زِمَامَهَا أَعْمٰى عَلٰى عِوَجِ الطَّرِيقِ الْحَائِرُ

”اندھی سواری کی طرح، جس کا سوار بھی اندھا، اور راستہ بھی پر پیچ۔“

نقد و تبصرہ سے فارغ ہوئے تو نقل کر دیا:

شَكَوْتُ وَمَا الشَّكْوىٰ لِمِثْلِي عَادَةٌ وَلٰكِنْ تَفِيضُ الْكَأْسُ عِنْدَ امْتِلَائِهَا

خطرناک غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے:

فَاحْفَظْ وُقِيتَ، فَتَحْتَ قَدَمِكَ هُوَّةٌ كَمْ قَدْ هَوىٰ فِيهَا مِنَ الْإِنْسَانِ

شخصیات کے احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تنقید اور اپنے مسلک سے محبت و وابستگی ظاہر کرتے ہوئے: ”وَأَمَّا حُبُّ لَيْلٰى فَلَا أَتُوبُ!“

مسلّمات کی مخالفت کرنے پر:

جملہ عالم اک طرف، آں شوخ رعنا اِک طرف

دوراز کار تاویل نصوص پر، جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مراد سے کوئی تعلق نہ ہو:

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

مولانا سلفی رحمہ اللہ کے بے لاگ تبصروں کے چند نمونے:

مولانا سلفی رحمہ اللہ کو جب محسوس ہوجاتا ہے کہ اسلام کے مستحکم اصول و مراجع کی پامالی کی دانستہ کوشش ہورہی ہے، کتاب وسنت کی تفسیر وتوضیح میں دیدہ دلیری کی جا رہی ہے، صحیح احادیث کا برملا انکار کیا جا رہا ہے، یا انکار کے لیے چور دروازے کھولے جا رہے ہیں تو وہاں ان کی دینی غیرت و حمیت جوش میں آ جاتی ہے، تحریر کا تیور بدل جاتا ہے، پھر معذرت کرتے ہوئے صورتِ حال کی ایسی تصویر کشی کر دیتے ہیں جو مدتوں قاری کے ذہن میں مرتکز رہتی ہے۔

چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

- معتزلہ کی دوراز کار تاویل صفاتِ باری تعالیٰ اور ردِ احادیث صحیحہ پر تنقید فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"...اور حدیث کے متعلق اُن کے ذوق کی سلامتی کا یہ حال ہے کہ وہ متواتر احادیث کو بھی "آحاد" کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ نصوصِ قرآنیہ کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے سُن پائیں تو انھیں حیرت ہو:

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، حجیت حدیث، ص:۱۴۲)

- منکرینِ حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

"عقل اور احتمالات کے گھوڑے اگر اس طرح سرپٹ دوڑانا شروع کر دیں جس طرح سنت اور حدیث کے خلاف ان کی لگامیں ڈھیلی کر دی گئی ہیں تو ان کی یورش سے نہ خدا بچے گا، نہ رسول، نہ کوئی حقیقت محفوظ رہے گی، نہ کوئی اصول۔"

(حدیث کی تشریعی اہمیت، حجیت حدیث، ص:۵۳)

- انکارِ حدیث کا پسِ منظر بیان فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"انکارِ حدیث احساسِ کہتری کی پیداوار ہے، جس نے گریز پائی کی صورت اختیار کر لی ہے... احادیث کے متعلق تو وہ یہی ہتھیار استعمال کرتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو نہیں

مانتے۔ لیکن جب یہ مصیبت قرآنِ عزیز میں آجائے اور قرآنِ عزیز ان کے تبحر فی الجہل کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر ایسی تاویلات گھڑتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کے خیال میں رب العزت اتنی عربی نہیں جانتے جس قدر کہ یہ متبحر فی الجہل جانتے ہیں۔''

(سنت قرآن کے آئینہ میں، حجیت حدیث، ص: ۱۷۷)

- ''ادارۂ طلوع اسلام'' (کراچی) کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''رہا ''ادارۂ طلوعِ اسلام'' تو اس سے نہ علم وفہم کی امید ہے نہ تقویٰ ودیانت کی۔''

(حدیث کی تشریعی اہمیت، حجیت حدیث، ص: ۷۵)

- ضمناً ہائی کورٹ کے جج میاں محمد شفیع پر تنقید فرماتے ہوئے مذکورہ ادارے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''دراصل ہماری معذرت یا ترجمانی بھی آپ حضرات منکرینِ حدیث اور ادارۂ طلوعِ اسلام سے سنتے ہیں اور ان گونگے دانشوروں کا یہ حال ہے کہ وہ آج تک نہیں سمجھا سکے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔'' (حوالۂ بالا، ص: ٦٩)

- ''ادارۂ ثقافت اسلامیہ'' (لاہور) کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''...وہاں اسلام کے بنیادی حقائق کی تشریحات اس انداز سے کی گئی ہیں جس سے اسلام کے ارکان تک محفوظ نہیں رہ سکے... پورا اسلام قریباً دنیا پرستی کا دوسرا نام ہوگیا ہے۔''

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، حجیت حدیث، ص: ۹۹)

- ''مرکزِ ملت'' کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مرکزِ ملت کی تشکیل اگر عوام کے نمائندے کریں اور وہ نمائندے بھی قرآن فہمی میں عوام ہی کی طرح ہوں تو یہ مرکزِ ملت جہلاء کا مجموعہ ہوگا...''

(حدیث کی تشریعی اہمیت، حجیت حدیث، ص: ٦۴)

- ہائی کورٹ کے جج محمد شفیع صاحب سے یوں مخاطب ہیں:

''آپ حضرات نے یہ شیوہ بنا رکھا ہے کہ ساری عمر انگریزی قانون اور انگریزی زبان پڑھتے ہیں، پھر ملازمت کرتے ہیں، پھر ریٹائرڈ ہوتے ہیں اور یہ آخری فرصت کی گھڑیاں جو آپ کو عبادت کے لیے قدرت نے عطا کی ہیں ان کو سنت پر اعتراض اور بحث کرنے میں صرف کرتے ہیں اور اہلِ حق کی نظر میں مضحکہ بنتے ہیں۔ یا پھر اونچی کرسیوں سے اس شریف فن پر حملہ آور ہوتے ہیں حالانکہ آپ ایک خاص قانون کے ماہر

ہیں، علوم حدیث سے واقف نہیں۔ کرسی کی آڑ میں یہ شکار مناسب نہیں۔‘‘

(حوالۂ بالا، ص: ۸۵، ۸۶)

- نیز رقمطراز ہیں کہ جماعت اسلامی کے احباب مولانا مودودی کے ارشادات کو نصوص کی طرح پیش کرتے اور اسے ’’امرت دھارا‘‘ کی طرح تمام بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں۔

(مقدمہ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث)

- مولانا مودودی و مولانا امین احسن اصلاحی پر تنقید فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

’’مولانا کے ارشادات کے بعض حصص اور مودودی صاحب کا ’’مسلکِ اعتدال‘‘ قطعاً اس قابل نہیں کہ ان کی اشاعت کی جائے۔ ان میں جو کچھ صحیح ہے وہ بھی غلط انداز سے کہا گیا ہے۔اور ’’مسلک اعتدال‘‘ میں تو دماغ کے کباڑ خانہ نے خیالات اس بے اعتدالی سے اُگل دیے ہیں کہ اگر کوئی منکرِ حدیث بھی لکھتا تو یہی کچھ لکھتا۔‘‘

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، حجیت حدیث، ص: ۱۴۰)

- ایک دیوبندی مولوی صاحب کی اہلِ حدیثوں کے خلاف زہر افشانی پر رقمطراز ہیں:

’’مجھے مؤلف محترم کے اس سوئے ظن اور مطاعن سے غرض نہیں، وہ جو چاہیں فرمائیں۔ کتاب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالبًا خون کے دباؤ کے مریض ہیں، اسی لیے پوری کتاب بلا وجہ ناراضگی اور پراگندہ خیالی کا مجموعہ ہے۔‘‘

(مسئلہ درایت وفقہ راوی، حجیت حدیث، ص: ۳۶۰، جامعہ سلفیہ، بنارس)

- ’’فقہ راوی کی شرط اور اکابر حنفیہ‘‘ کے تحت رقمطراز ہیں:

’’ہمارے مدارس کا یہ حال ہے کہ وہ فقہ راوی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے کسی آیت کا مفہوم بیان فرما رہے ہیں، یا کوئی متواتر حدیث...‘‘ (حوالہ بالا، ص: ۳۸۸)

مولانا سلفی رحمہ اللہ کی کتابوں کے عربی ترجمے:

مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تحریروں کی جامعیت، موضوع سے متعلق معلومات کی فراہمی، ان کی اخلاص وللہیت کے ساتھ ان تحریروں کی سحر انگیزی کہیے کہ برّ صغیر میں (چند افراد کو چھوڑ کر) کسی عالم کی کتابوں کے ترجمے اتنے نہیں ہوئے جتنے مولانا کی کتابوں کے ہوئے ہیں۔

- یادش بخیر، استاذِ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ (سابق صدر جامعہ سلفیہ بنارس و ایڈیٹر مجلّہ

''صوت الأمۃ'') نے مولانا سلفی کی گراں قدر تالیف ''تحریک آزادیِ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی'' کو قسط وار اُس وقت کے مجلّہ میں بعنوان "حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله في التجديد" شائع فرمایا، پھر شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ کے مقدمہ کے ساتھ ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں اسے کتابی شکل دی گئی۔

یہ سال ''جامعہ سلفیہ'' (بنارس، ہند) سے خاکسار کی فراغت کا پہلا سال تھا اور وہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ یونیورسٹی) کی طرف رختِ سفر باندھنے سے قبل اس کی ''جنرل لائبریری'' کی خدمت پر مامور تھا۔ اس وقت مجھے اس کتاب کی فہرستِ مراجع کی ترتیب کا شرف حاصل ہوا تھا۔

۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں مولانا سلفی رحمہ اللہ کے رسائل ''مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ'' و ''زیارتِ قبور'' اور ان کے تحریکِ اہلِ حدیث سے متعلق کچھ سوالات کے جوابات بھی شامل کر دیے گئے، جس سے کتاب کی ضخامت کے ساتھ اس کی افادیت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

اس ایڈیشن پر شیخ الحدیث مبارک پوری رحمہ اللہ کے مقدمہ کے ساتھ استاذ علی شامی (سوریا) اور استاذ محمد نافع (سوریا) کے مقدمے بھی ہیں۔

استاذ علی نے آٹھ مقامات پر معترضانہ اور توضیحی نوٹ لگائے ہیں جنھیں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ان مقامات پر ان کے نام کے ساتھ باقی رکھا ہے۔ یہ بحث و تحقیق کی ایک بڑی قدر دانی ہے۔

❁ یاد رہے کہ مئی ۱۹۸۳ء میں کویت لوٹتے ہوئے فاضل گرامی مولانا عبدالحمید رحمانی حفظہ اللہ (بانی صدر ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر، نئی دہلی) نے مجھے مولانا سلفی کے رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عربی ترجمہ کی طرف توجہ دلائی۔ ''حجیت حدیث'' (۸۷۔۱۵۹) کے مجموعہ میں ۷۳ صفحات پر مشتمل شائع شدہ یہ رسالہ تعریب و تعلیق کے بعد ۱۶۵ صفحات پر محیط ہوا، اور اس وقت کے مشہور سلفی مکتبہ ''دار السّلفیہ'' سے پہلا ایڈیشن (۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء میں) بعنوان "موقف الجماعة الإسلامية من الحديث النبوي: دراسة نقدية" شائع ہوا۔

میرے علم کے مطابق عرب محققین کو ''جماعتِ اسلامی'' کے قائدین کے نظریۂ حدیث کے بارے میں تفصیلی معلومات پہلی بار اسی کتاب سے حاصل ہوئیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَات.

✿ پھر مجموعہ ''حجیتِ حدیث'' کے بقیہ رسائل کا ترجمہ استاذِ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ نے ہی فرمایا۔ اس مجموعے میں "حسن البيان فيما في سيرة النعمان" (مؤلفہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ) پر مولانا سلفی رحمہ اللہ کے مقدمہ بعنوان ''مسئلہ درایت وفقہ راوی کا تاریخی وتحقیقی جائزہ'' کو بھی شامل کر لیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی وفات سے قبل اس کتاب کی سی ڈی مجھے دے دی تھی۔ یہ میرے لیے شرف کی بات ہے کہ یہ میرے ہی زیرِ نگرانی مکتبہ ''دار غراس'' (کویت) سے ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔

اس ایڈیشن پر میں نے مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب (مترجم کتاب) اور مولانا سلفی رحمہ اللہ (مؤلفِ کتاب) دونوں کی سوانح حیات بھی لکھی۔ مولانا سلفی رحمہ اللہ کا سوانحی خاکہ تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ عربی میں مولانا کی سوانح پر اس سے قبل اس سے مفصل تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی، فالحمد لله.

✿ مولانا سلفی رحمہ اللہ کے کتب و رسائل میں ''مسلک امام بخاری'' کا نام نظر سے گزرا۔ میری طبیعت لگ گئی کہ مولانا نے بہت عمدہ لکھا ہوگا۔ اپنے برادر بزرگوار الشیخ عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کی کوشش سے وہ رسالہ دستیاب ہوا جو قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری کی نگرانی میں ''جمعیت طلبہ اہلِ حدیث'' کی جانب سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل مولانا کا یہ مقالہ مجلّہ ''الہدیٰ'' (دربھنگہ، بہار، مارچ ۱۹۵۶ء) میں بھی شائع ہو چکا تھا۔

۴۵ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ عربی ترجمہ اور تعلیقات وتحشیہ کے بعد ۲۱۸ صفحات میں مکتبہ ''دار غراس'' (کویت) سے ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

ابھی کتاب طباعت کے مرحلے میں تھی کہ یہ رسالہ ''مقالات حدیث'' میں بھی نظر آیا جو اس مجموعے کا پہلا مقالہ ہے۔ حافظ شاہد رفیق حفظہ اللہ کی بعض تعلیقات سے بھی استفادہ کیا، فجزاه الله خيرا.

✿ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی تحریروں کے یہ عربی ترجمے تقریباً ۱۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ''جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث'' اور ''مسلک امام بخاری'' کو چھوڑ کر (جن کے مجموعی صفحات کل ۳۸۳ ہیں) تمام کتب و رسائل کے ترجمے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن رحمہ اللہ کی کوششوں کے رہینِ منت ہیں۔

میرے لیے شرف کی بات یہ ہے کہ ان تمام عربی تحریروں سے کسی نہ کسی طرح ابتدا ہی سے میرا تعلق رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا سلفی رحمہ اللہ اور ان کی تحریروں کے مترجمین کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

بطورِ خاص استاذِ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کو جنت الفردوس سے نوازے، جنھوں نے اس کارِ خیر کی ابتدا فرمائی تھی۔ والفضل للمتقدم۔

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

میں ان بزرگوں کے درمیان صرف یہی کہنے کے لائق ہوں:

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

مجھ کو رب کوششِ کوتاہ پہ ماجور کرے
میرے ویرانۂ دل کو سدا معمور کرے

مجموعہ ''نگارشات'':

- مولانا سلفی رحمہ اللہ تدریس و خطابت، دعوت و افتا اور کچھ خصوصی دروس کا زندگی بھر اہتمام فرماتے رہے، جماعت کی نظامت و امارت، اس کے انتظام و انصرام اور تنظیم و ترتیب کی ذمے داری الگ سے تھی، پھر عام مسلکی مسائل میں جماعت کی نمائندگی کا فریضہ بھی ادا فرماتے تھے۔

ان گونا گوں مصروفیات کے باعث آپ کو دلجمعی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا موقع کم میسر آیا، لیکن جو تحریریں بھی موجود ہیں وہ بے حد وقیع اور نہایت ذمہ داری کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

- فاضل گرامی مولانا حافظ شاہد رفیق وفقہ اللہ کی سعادت مندی کہیے کہ انھوں نے مولانا سلفی رحمہ اللہ کے اہم رسائل اور معلومات افزا مقالات کا ایک ضخیم مجموعہ ''مقالاتِ حدیث'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع فرمایا۔ مزید برآں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابو القاسم سیف بنارسی، مولانا محمد بشیر سہسوانی اور مولانا حافظ محمد گوندلوی وغیرہم (رحمہم اللہ) کی کتب و رسائل اور مقالات کے مجموعوں کو شائع کر کے بہت سی تحریروں کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کر دیا جو دنیائے سلفیت پر احسان عظیم ہے۔

- مولانا سلفی رحمہ اللہ کے بہت سے مقالات، جلسوں کے تاثرات، کانفرنسوں کے خطباتِ استقبالیہ اور تحریک سے متعلق اہم سوالات و جوابات اپنے اپنے وقت میں بہت سے رسائل و جرائد کی زینت

بنتے رہے۔ اَب کے گرامی قدر حافظ شاہد رفیق، مولانا سلفی رحمہ اللہ کی ان تحریروں کو بعنوانِ ''نگارشات'' شائع فرما رہے ہیں جو بہر پہلو تحریک اہلِ حدیث سے متعلق گراں قدر معلومات پر مبنی ہیں۔

❁ اس مجموعہ میں جماعت کی دعوتی و جہادی تاریخ بھی ہے، جلسوں اور کانفرنسوں کے بارے میں تاثرات اور خطباتِ استقبالیہ بھی ہیں، جماعتی نظم و نسق کے متعلق ہدایات و ارشادات بھی ہیں، تحریک کے بارے میں سوالات کے جوابات بھی ہیں اور دینی جماعتوں سے اتحاد کے لیے طریقِ کار کی نشاندہی بھی ہے۔

یہ سب وہ امور ہیں جن کے مطالعہ سے تحریک اہلِ حدیث کی تاریخی و دعوتی اہمیت، کتاب و سنت کی بالا دستی اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لیے وابستگانِ مسلک کی مساعیِ جمیلہ کا پُر کیف منظر سامنے آجاتا ہے:

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین و ایماں کی
کہ اس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہوجائے

❁ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ ''نگارشات'' مولانا سلفی رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ کو درجۂ قبولیت سے نوازے اور انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ اور اس مجموعہ کے مرتب مولانا حافظ شاہد رفیق ۔وفقه الله۔ کو علمائے کرام کی منتشر تحریروں کی ترتیب و اشاعت کے لیے توفیق مزید عنایت فرمائے اور انھیں دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ.

صلاح الدین مقبول احمد

(غفر الله له ولوالديه ومشايخه وإخوانه وسائر المسلمين)

الجہراء۔کویت

۵۔۳۔۱۴۳۲ھ بمطابق ۸۔۲۔۲۰۱۱ء

تقدیم[1]

محدث العصر مولانا عبیداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ
سابق رئیس جامعہ سلفیہ، بنارس، انڈیا

قوموں اور ملکوں کی سیاسی تاریخ کی طرح تحریکوں اور جماعتوں کی دینی اور ثقافتی تاریخ بھی ہمیشہ بحث و تحقیق کی محتاج ہوتی ہے۔

محققین کو واقعات کی زبان کھلوا کر نتائج اخذ کرنے، غلطیوں کی اصلاح کرنے اور محض دعووں کی تکذیب و تردید کے لیے پیہم کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ پھر مورخین بھی دقتِ نظر، رسوخِ بصیرت، قوتِ استنتاج اور علمی دیانت کا لحاظ رکھنے میں ایک سے نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات کئی تاریخ دان غلط کو درست کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ وہ واقعات سے اس چیز کی دلیل لیتے ہیں جس پر وہ دلالت ہی نہیں کرتے۔ جو من کو نہ بھائے، خواہ وہ کتنا ہی اہم ہو، اس سے تغافل کرتے ہیں۔ اور جو دل کو لگے، خواہ وہ انتہائی بودا ہو، اس کی تعریف کے شادیانے بجاتے رہتے ہیں۔ اِس طرح تاریخ کے خد و خال بگڑ جاتے ہیں اور تحریف اس میں اپنی راہ نکال لیتی ہے۔

یہاں علمی اخلاص سے مالا مال اور حقائق کی تہ تک پہنچنے کے لیے شخصی رجحانات سے ماورا دیانتدار مورخین کا کردار شروع ہوتا ہے کہ وہ افراط و تفریط سے بچ کر درست بنیادوں پر تاریخ کی تدوین، غلطیوں کی اصلاح، حق کو کارگاہ شیشہ گری میں محفوظ رکھنے اور ہر اہم اور قابلِ ذکر چیز کو مرقوم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

حضرت علامہ اسماعیل بن ابراہیم سلفی رحمہ اللہ امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث، مغربی پاکستان کا شمار انہی منفرد محققین میں ہوتا ہے۔ آنجناب نے اپنی یہ کتاب تحریک اہلِ حدیث کے موضوع پر لکھی ہے،

[1] حضرت العلام مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی معروف کتاب ''تحریک آزادیٔ فکر'' کا عربی ترجمہ بنام ''حركة الانطلاق الفكري'' از جامعہ سلفیہ بنارس انڈیا شائع ہوا تو اس کے شروع میں مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ نے مقدمہ لکھا تھا جسے ہم ترجمہ کرنے کے بعد ان نگارشات کے شروع میں شاملِ اشاعت کر رہے ہیں۔

جس میں ان مختلف مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے یہ تحریک ہندوستان میں گزرتی رہی۔ انھوں نے وضاحت فرمائی ہے کہ دیگر مذاہب و مسالک کے پیروکاروں کا اس تحریک کے متعلق کیا موقف رہا، تقلید اور جمود کے خلاف شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کوششوں کے کیا آثار مرتب ہوئے اور انھوں نے کس طرح لوگوں کو تقلید و جمود کی بیڑیوں سے آزاد ہونے اور کتاب وسنت پر عمل کرنے کی دعوت دی، نیز وہ کون لوگ تھے جنھوں نے بحث و تحقیق کا پرچم اٹھایا اور اس کے بعد اعتقادی اور عملی بدعتوں کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔

یہ اور اس طرح کے اہم نکات ہیں جن کی تحقیق و تفصیل مولانا اسماعیل صاحب کی یہ کتاب پیش کرتی ہے۔

اس کتاب کی تالیف کا ایک خاص سبب تھا جس کی طرف مولف نے بھی اشارہ کیا ہے۔ پاکستان میں بعض مقلدین نے اہلِ حدیث اور مقلدین کے درمیان چند اختلافی مسائل کو ہوا دے رکھی ہے۔ چنانچہ مولف نے تعصب اور تقلید سے آزاد ہو کر صحیح احادیث پر عمل پیرا ہونے کے اہلِ حدیث کے موقف اور نقطۂ نظر کا دفاع کرنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے اپنی اس بیش قیمت تحقیق میں مدمقابل کا نہ صرف مناظرانہ اور متکلمانہ انداز میں رد کیا ہے بلکہ اختلافی مسائل، مسلمانوں کی دینی حالت، گروہ بندی، فرقہ واریت اور ان ارتقائی منازل پر علمی اسلوب میں بڑی دقیق بحث کی ہے جن سے کتاب و سنت کی تحریک کو رسول کریم ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک گزرنا پڑا۔ انھوں نے اس اختلاف کی بنیاد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اہلِ حدیث اور ائمۂ کرام میں سے کسی کی تقلید کے وجوب کے قائل فرقوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہ ساری تفصیل توضیحانہ اور تحقیقانہ انداز میں اور کسی بھی مذہب و مسلک پر ناانصافی کی بنا پر طعن و تشنیع سے ماورا ہو کر ایک مخلص محقق کی نظر سے پیش کی گئی ہے۔

جب ہم ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک کے ان علمائے کرام پر نظر ڈالتے ہیں جو حدیث اور علومِ حدیث کو مسلکی تعصب کے تناظر میں پڑھتے ہیں تو وہ ان علمائے حدیث پر کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں جنھوں نے جمعِ حدیث، شرحِ حدیث، دفاعِ حدیث، تمییزِ حدیث، استنباطِ حدیث اور علمِ رجال کے لیے اپنی زندگیاں صرف کر دی تھیں۔ ایسے میں اِس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ وہ اعاظم رجال تھے جن کا احادیث کی جمع و تدوین، شروحِ متون اور احادیث سے احکام مستنبط کرنے کے سلسلے میں امت پر عظیم احسان ہے لیکن یہ عظیم الشان خدمت ان مفاد پرست فرقہ

پردازوں کو ایک آنکھ نہیں بھائی، چنانچہ انھوں نے محدثین کی نیتوں پر شک کرتے ہوئے اپنے اختیار کردہ مذاہب و مسالک کے دفاع میں ان کے کلام کا رد کیا۔ یہی وہ موقف اور طرزِ فکر ہے جس نے برصغیر پاک و ہند میں انکارِ حدیث اور شریعت میں احادیث کی عدمِ حجیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

ایسی ہی نامسعود کوششوں کا رد کرنے اور سنت نبویہ اور برصغیر کے اہلِ حدیث کا دفاع کرنے کی خاطر ہمارے مخلص دوست نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ کتاب نے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل کی ہے اور ہر نیک ارادے اور اچھی نیت کے مالک فرد نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ کتاب اپنے پختہ علمی اسلوب اور سنجیدہ اور اچھوتے مباحث کے پیشِ نظر ہر اس شخص کے مطالعے کے لائق ہے جو خصوصاً عرب ممالک میں مذاہب کی تاریخ اور کتاب و سنت پر عمل کی تحریک کے ارتقا سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بنا بریں جامعہ سلفیہ بنارس میں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ نے ڈاکٹر مقتدی حسن، مدرس جامعہ، ایڈیٹر مجلۂ جامعہ، کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اس کتاب کو عربی میں منتقل کریں تاکہ عرب قارئین بھی اس کا مطالعہ کر سکیں۔

موصوف رحمہ اللہ نے بڑے اچھے انداز میں اپنی یہ ذمے داری نبھائی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ مؤلف اور مترجم کو ہماری طرف سے اور علم کی خدمت کرنے کی بنا پر بہترین جزا عنایت فرمائے۔ مترجم کے لیے علم اور بھلائی کی راہ آسان کرے اور ہر ایک کو اپنی مرضیات کی توفیق مرحمت فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ، مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ.

عبیداللہ مبارکپوری
لائل پور، مبارکپور، اعظم گڑھ
۱۹ شوال ۱۳۹۶ھ
۱۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ، وَعلٰى أَصْحَابِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ:

میں مسلسل لکھنے کا عادی نہیں۔ پیدایشی طور پر ذہنی میلان دین کی طرف ہے اور عقیدۂ سلف سے طبعی شغف۔ تعلیم و تربیت بھی اسی نہج پر رہی۔ انگریزی تعلیم اور عصری مدارس سے نہ تاثر ہے نہ انس۔ اگر کبھی ضرورت ہو تو مذہبی مسائل ہی پر لکھتا ہوں۔ جہاں تک اپنے متعلق خیال ہے، میں مناظر نہیں ہوں۔ نہ آج کے رسمی مناظرات سے طبیعت آشنا ہے، اس لیے حوالوں میں کاٹ چھانٹ، تراجم میں حسبِ مطلب قطع و برید کی قطعاً عادت نہیں۔ مسلک اہلِ حدیث سے محبت ہے اور فنِ حدیث سے بلحاظِ طالبِ علم کچھ تعلق۔ اور اسی ماحول میں کم و بیش کچھ لکھنے کا موقع ملا ہے۔

حدیث کی اساس چونکہ قرآن ہے، اس لیے قرآنِ عزیز کے ساتھ بھی اسی قسم کا تعلق ہے، بلکہ قرآن کو سنت سے قطع کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ کئی سال سے ہمارے ملک میں انکارِ حدیث کی تحریک چل رہی ہے اور کئی مراحل سے گزری ہے، اور اس کے محرکین نے وقت کے تقاضوں کے مطابق کئی لباس بدلے ہیں۔ میں نے ابتدا میں یہ لٹریچر بطور طالبِ علم تحقیق کی نظر سے پڑھا۔ اب مجھے اس تحریک اور اس لٹریچر سے نفرت ہے۔ اس شغل کو اضاعتِ وقت سمجھتا ہوں۔ صلاۃ القرآن، بیان القرآن، طلوعِ اسلام: یہ اس تحریک کی بے چارگی کے مختلف مراحل ہیں۔ اس تحریک کی قیادت کے عمل اور فکر کا ماحصل یہ ہے:

وہ قرآن کو مفصل کہنے کے باوجود مجمل اور قابلِ تشریح و تفسیر سمجھتے ہیں اور قرآن کی تفسیر اور تشریح کے لیے لٹریچر شائع کرتے ہیں، جس کا مطلب ظاہر ہے کہ قرآنِ عزیز کو ان حضرات کی تشریح کی ضرورت ہے۔ ان کے ہاں اس تشریح کو قبول کرنا گویا قرآن کو ماننا اور قبول کرنا ہے مگر آنحضرت ﷺ یا آپ کے رفقائے کرام قرآن کے مقاصد کو بیان کریں تو اسے یہ حضرات نہ قبول

کرتے ہیں نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں بلکہ قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔ کوئی حدیث سمجھ میں نہ آئے مگر اس کا انکار کر دینا سمجھ میں آتا ہے۔ ائمۂ حدیث رحمہم اللہ نے جن احادیث کو اپنے معیار پر نہیں پایا ان کا انکار کر دیا یا ان کو موضوع فرما دیا لیکن چند احادیث سمجھ میں نہ آئیں تو پورے ذخیرے اور فن کا انکار بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ عقل کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔

اسی طرح کچھ بزرگ چند رسمیں اور چند نعرے لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اسلام کی خدمت کا دعویٰ فرماتے ہیں۔ ان رسموں کو اسلام اور ایمان کی بنیاد سمجھنا اور ان سے انکار یا ان پر انکار کو اسلام کی مخالفت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے منافی سمجھنا عجیب بات ہے حالانکہ قرونِ خیر اور ائمۂ اسلام فقہاء و محدثین کے آثار میں ان رسوم کا ذکر تک نہیں۔ اگر کہیں تھوڑا بہت پتا چلتا ہے تو ان بزرگوں نے ان رسوم کو نفرت کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسلام ایسے فعّال مذہب کا انحصار چند رسموں اور نعروں پر ہو، ضمیر اس سے اِباء کرتا ہے۔

اسی طرح مروجہ تقلید اور جمود کا آغاز تو غالباً طبعی تاثر ہے جو ایک شاگرد استاد سے اور تلمیذ شیخ سے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ یہ طبعی اور قدرتی ہے۔ اس کے جواز یا عدمِ جواز کی بحث بے فائدہ ہے۔ یہ تاثر ناگزیر ہے اور یہ تاثر ہمیشہ باندازِ تحقیق اور بحث ونظر کی راہ سے ہوتا ہے۔ اس میں جمود نہیں ہوتا۔ دوسرے ائمۂ اجتہاد سے حق کی نفی یا نفرت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے بلکہ ایک تحقیقی تاثر اور فکر ونظر کی راہوں میں کسی قدر ہم آہنگی اور ہمواری ہوتی ہے۔ ان فقہی فروع میں نہ حق کسی ایک میں محصور ہوتا ہے نہ دوسرے اہلِ تحقیق سے نفرت اور بغض ہوتا ہے۔ اور خود ائمہ رحمہم اللہ نے اپنے متعلق کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ حق صرف ہمارے دامن سے وابستہ ہے۔ نہ یہ تاثر ہی دیا ہے کہ ہماری باتوں کو بلا دلیل محض خوش فہمی اور عقیدت کی بنا پر قبول کیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام فکر ونظر کی دعوت دیتے تھے۔ ان کے اَتباع تقلید اور جمود کی دعوت کیسے دے سکتے تھے!

میری رائے میں یہ تینوں مقام اس قدر ظاہر اور واضح ہیں کہ ان پر کسی طویل بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود دنیا میں ایسے حضرات موجود ہیں جو انکارِ حدیث کو بطور تحریک چلانا چاہتے ہیں۔ ان کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل، سکوت اور اجتہاد دین میں حجت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کی تفسیر فرمائیں، ہمیں حق ہے کہ ہم ان کے خلاف تفسیر کریں اور

صرف اپنی تفسیر کو صحیح سمجھیں۔ لیکن اس شناعت کے لیے عنوان یہ رکھا گیا ہے کہ قرآن مکمل ہے اور اسناد کی وجہ سے حدیث پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال قریباً بعض دوسرے بزرگوں کا ہے۔ وہ بدعی رسوم اور مشرکانہ عادات کو آنحضرت ﷺ کی محبت اور بزرگوں کے ساتھ ربط وعقیدت کے نام دیتے ہیں اور ائمہ سے علمی استفادے کا نام تقلید رکھ دیا گیا ہے۔ وَبَيْنَهُمَا مَفَاوِزُ تَنْقَطِعُ فِيهَا أَعْنَاقُ الْإِبِلِ.[1]

گذشتہ ایام کسی ضرورت یا کسی تاثر کے تحت میں نے چند مضامین ''الاعتصام'' میں لکھے جو بعض حلقوں میں بہت پسند کیے گئے۔ بعض حلقوں میں کافی ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا۔ کسی چیز کے موثر ہونے کی یہی دلیل ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے مختلف حلقے پیدا کر لے اور نقد ونظر کا تختۂ مشق بنے۔ مضمون جب چھپ رہا تھا، بعض محترم اور عزیز دوستوں نے اس کے بعض حصوں پر دوستانہ اور محققانہ تنقید فرمائی۔ جزاهم الله أحسن الجزاء.

بعض احباب کا خیال تھا کہ اہلِ حدیث حفاظِ حدیث کا دوسرا نام ہے، یہ مکتبِ فکر نہیں۔ اس کے متعلق کچھ مختصر اشارات زیرِ طبع مضامین میں آگئے ہیں۔ اس موضوع پر ایک مبسوط مضمون لکھنے کا خیال ہے۔ أَرْجُوْ مِنَ اللّٰهِ التَّوْفِيْقَ.

مولانا محمد حنیف یزدانی کی نظر سے غالباً یہ مضامین گزرے۔ انھوں نے ان کی طباعت کا ارادہ فرمایا ہے۔ میں نے انھیں اجازت دے دی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اعمالِ خیر کی توفیق مرحمت فرمائے۔

ناظرین سے گزارش ہے اگر وہ ان پریشان خیالات کو پسند فرمائیں تو حضرت استاذِ محترم محدث الکبیر حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی رحمہ اللہ کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ ان کی مبارک تربیت ہی دراصل توحید وسنت کے ساتھ محبت اور مسلکِ سلف کے ساتھ تعلق کی حقیقی محرک ہے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، وَاجْعَلْ جَنَّةَ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ، وَاجْعَلْهُ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ.

محمد اسماعیل

مدرس وخطیب

جامع اہلِ حدیث۔ چاہ شاہاں۔ گوجرانوالہ

۲۶ مارچ ۱۹۶۶ء، ۳ ذیقعد ۱۳۸۵ھ

---

[1] حالاں کہ ان دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جسے طے کرتے ہوئے اونٹ بھی ہلاک ہو جائیں۔

تحریک اہلِ حدیث کا مد و جزر

اور

حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی کے اثرات

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ پہلی امتوں میں بھی مختلف ذہن تھے۔ بعض الفاظ کے ظاہری مفہوم پر اعتماد کرتے تھے۔ بعض کی توجہ اسباب وعلل کی طرف ہوتی تھی۔ وہ الفاظ کو صرف ذریعہ سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ اس عالمِ کون وفساد میں دین اور دنیا دونوں کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ کچھ ترکِ دنیا اور زہد و ورع کو حاصلِ مقصد خیال کرتے تھے۔ معلوم ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ سب چیزیں درست ہیں۔ اس کارخانۂ حیات وموت میں نہ الفاظ سے گریز ممکن ہے نہ اسباب وعلل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر دنیا اور اس کی ضروریات سے بالکلیہ دامن کشی نہ شریعت کا مقصد ہے اور نہ دنیا پرستی اور اس کی طلب میں جنون کی حد تک بھاگ دوڑ صحیح راہِ عمل ہے۔ غلو کسی میں آئے اس میں خرابی پیدا ہوگی۔ اسلام اور آنحضرت ﷺ ۔فِدَاهُ رُوحِي۔ نے اس میں اعتدال کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔

”قَالَ ابْنُ كَرُيُوْنَ: وَكَانَ الْيَهُوْدُ فِيْ دِيْنِهِمْ يَوْمَئِذٍ ثَلَاثَ فِرَقٍ: فِرْقَةُ الْفُقَهَاءِ وَأَهْلِ الْقِيَاسِ، وَيُسَمُّوْنَهُمُ الْفَرُوْشِيْمَ، وَهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ، وَفِرْقَةُ الظَّاهِرِيَّةِ الْمُتَعَلِّقِيْنَ بِظَوَاهِرِ الْأَلْفَاظِ مِنْ كِتَابِهِمْ، وَيُسَمُّوْنَهُمُ الصَّدُوْقِيَّةَ، وَهُمُ الْقُرَّاؤُوْنَ، وَفِرْقَةُ الْعُبَّادِ الْمُنْقَطِعِيْنَ لِلْعِبَادَةِ وَالتَّسْبِيْحِ، وَالزُّهَّادُ فِيْمَا سِوٰى ذٰلِكَ، وَيُسَمُّوْنَهُمُ الْحُسَيْدِيْمَ“[1]

”یہود میں اس وقت تین گروہ تھے۔ فقہاء اور اہلِ قیاس تھے جن کو وہ فروشیم کہتے تھے۔

[1] تاریخ ابن خلدون (۲/ ۱۲۲)

ربانیین بھی انھی کا نام ہے۔ بعض ظاہری تھے جو کتاب کے الفاظ کو مانتے تھے۔ ان کا نام صدوقیہ تھا۔ انھیں قراء بھی کہا جاتا تھا۔ اور ایک گروہ فقراء اور زاہدوں کا تھا۔ انھیں تسبیح و تہلیل کے سوا کسی چیز سے رغبت نہ تھی، ان کو حسید یم کہا جاتا تھا۔"

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ»[1]

"تم پہلے لوگوں کے قدم بہ قدم چلو گے۔"

مختلف ذہن:

آج اسلام میں بھی تینوں قسم کے آدمی موجود ہیں۔ بعض شریعت پر غائر نظر رکھتے ہیں اور دین کے مصالح ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ کچھ ظاہر بین ہیں جن کی نظر بالکل سطحی ہے۔ اور زاہدوں کا گروہ تو پورے ملک کے ذہن پر چھا رہا ہے۔ خانقاہی نظام ابتدا میں کسی قدر اچھا تھا۔ اس کی تفصیلات معلوم ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اکثر بدعات انھی کے قدموں سے اٹھتی ہیں اور بدعی فتنوں کا مرکز یہی لوگ ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد صحابہ میں فقہا بھی موجود تھے، اہلِ ظاہر بھی، زاہد اور اتقیاء بھی پائے جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد امت میں مختلف طبقات رہے اور یہ قسمیں اہلِ فکر میں موجود رہیں لیکن اس میں کبھی بے اعتدالی ہوجاتی۔ جمود تو اسلام کی اُفتادِ فطرت کے خلاف تھا لیکن یہ جمود تینوں تحریکات میں آیا۔ کبھی ظاہر پرستی اس طرح اذہان پر چھا گئی کہ الفاظ کی پرستش شروع ہوگئی۔ لوگوں نے مقاصد اور مصالح کو نظر انداز کر کے محض الفاظ پر سارا زور صرف کر دیا۔ کبھی آرائے رجال اور قیاساتِ علماء نے ذہن کو اس قدر متاثر کیا کہ شخصی آراء و افکار نے تقلید اور جمود کی صورت اختیار کر لی۔ ائمہ اور علماء کی تقلید کو واجب اور فرض کیا جانے لگا۔[2] مقتدر علماء کی جزوی مخالفت اس قدر جرم سمجھی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٩) ولفظه: "لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع..." اور ایک روایت میں ہے: لتسلكن سنن من قبلكم حذو النعل بالنعل..." (المستدرك: ٢١٩/١)

[2] ائمہ اربعہ اور باقی ائمہ سنت اور ان کے علوم کے ساتھ تعلق کی جو آج جامد صورت پیدا ہو چکی ہے معلوم ہے ابتدا میں نہیں تھی، نہ ائمہ اسے پسند فرماتے اور نہ ان کے تلامذہ۔ ہارون نے امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے موطا کی آئینی ←

جانے لگی گویا وہ پیغمبر کی مخالفت ہے۔ یہ دونوں غلو کی راہیں تھیں۔

یہی مرض زہاد و اتقیاء میں نمودار ہوا۔ وہاں بھی پیر کو مظہر بنایا یا پیغمبر کا نعم البدل سمجھا جانے لگا۔ بزرگوں کے عادات و رسوم اور اوراد و وظائف کو وحی کا مقام دیا گیا۔ فقر و حال کو شریعت اور وحی کا رقیب ظاہر کیا گیا۔ شرعی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہنے میں ان حضرات کو کوئی تامل نہ تھا۔ یہ بھی ایک جمود ہے جو اسلام کے مزاج اور طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام ایک متحرک دین ہے۔ اس میں کتاب و سنت کو اساس قرار دے کر ہر دور میں فکری آزادی کی نہ صرف حمایت فرمائی گئی ہے بلکہ حریتِ فکر کے لیے ممکن طور پر راہیں ہموار کر دی گئی ہیں اور جمود اور تقلید کو روکنے کی ہر کوشش عمل میں لائی گئی۔

جمود شکن تحریکات:

اسلام کی اشاعت کے مختلف ادوار میں اس کے اثر و رسوخ اور مختلف اذہان کی عقیدت مندیوں اور مختلف قسم کے امیال و عواطف کی نیرنگیوں نے مد و جزر کی صورت اختیار کی۔ کبھی ظاہر پسندی اور الفاظ کے تقاضوں نے اتنا زور پکڑا کہ قیاسِ صحیح اور مصالح کو شکست دے دی گئی۔ کبھی آراء و مقائیس کی محبت نے ایسا جمود پیدا کیا کہ آرائے رجال کے سامنے نصوص مہجور اور متروک قرار پا گئے۔ فرضی مسائل کا نام شریعت رکھ دیا گیا۔

اس مد و جزر کا نتیجہ حافظ ابن حزم کی ظاہریت ہے اور اسی کا نتیجہ فقہاء کی کتاب الحیل ہے جس نے عبادات سے لے کر معاشیات تک دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ بڑے بڑے فواحش دین کے لبادے میں عبادت اور تفقہ تصور ہونے لگے۔ نماز، زکوۃ، حج؛ حیل کی وبا سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ظاہریت کا تعلق فنِ حدیث سے ہے۔ ابن حزم وغیرہ پر ظاہریت اسی لیے غالب رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہی حیل اور ظاہریت دونوں ایک ہی ذہن کی پیداوار ہیں۔ ابن حزم اور ان کے رفقاء نے حدیث کے الفاظ کے ظاہر سے ٹھوکر کھائی اور اربابِ حیل نے فقہی قواعد کے ظواہر

← حیثیت کا جب ذکر کیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے سختی سے اس کا انکار کیا۔ (الدیباج، ص: ۲۰۰)
ائمہ اربعہ نے اپنی تقلید سے روکا۔ حجۃ اللہ اور کتاب العلم لابن عبدالبر وغیرہ میں ان کے ارشادات بصراحت موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ اکابر دیوبند آج بڑی جرأت سے اسی جمود اور تقلید کی دعوت دیتے ہیں اور اسے واجب تک کہنے سے گریز نہیں فرماتے، حالانکہ یہ صاحبِ شریعت کا وظیفہ ہے۔ معلوم ہے کہ تقلید اور اس جمود کا دور چار سو سال بعد ہوا۔ (مؤلف)

سے دھوکا کھایا۔ شارع کے مقاصد اور مصالح دونوں جگہ نظر سے اوجھل ہوگئے۔ دونوں جگہ الفاظ کی ظاہریت نے معاملہ فہمی اور ذکا کی نگاہوں کو چکاچوند کر دیا۔

قیاس سے اگر نظائر کا صحیح جائزہ نہ لیا جا سکے اور شریعت کے مقاصد کا صحیح طور پر لحاظ نہ رکھا جا سکے تو صرف قیاس کے اعتراف یا اسے اصول و ادلہ مان لینے سے کچھ بھی حاصل نہیں۔ اکابر کے ارشادات اگر محض اکابر کی برتری کی وجہ سے قابلِ احترام ہوں تو یہ بھی ظاہر پرستی کی ایک قسم ہے اور جمود کا ایک نامناسب مظاہرہ!

تاریخِ مذاہب پر ایک نظر:

حجاز، بخارا، مصر اور مغرب میں حدیث کا دور دورہ تھا۔ لوگ حدیث پڑھتے پڑھاتے تھے۔ حفظ وضبط کی مجلسیں گرم تھیں۔ مدارس میں "حَدَّثَنَا" اور "أَخْبَرَنَا" کے غلغلے بلند تھے۔ یکا یک حجاز اور مصر میں امام شافعی رحمہ اللہ کے حفظ و ذکا کا اثر بڑھا۔ سوڈان سے اندلس تک امام مالک رحمہ اللہ کے مسلکِ فقہ کا اقتدار قائم ہوا۔ کوفہ سے ایران اور پھر اقصائے ہند میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی علمی ضیا باریوں نے اپنا اثر ظاہر کیا۔ نجد اور اس کے حوالی میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی قربانیاں اپنا رنگ لائیں۔ اس کے علاوہ بھی بعض ائمۂ اجتہاد نے بعض علاقوں پر اپنا اثر ڈالا۔ جیسے امام اوزاعی، ابن جریر طبری، حافظ ابن خزیمہ، داود ظاہری رحمہم اللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بزرگوں کے فہم اور طریقِ فکر کو بھی حدیث فہمی میں ضروری قرار دیا گیا۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ ان حضرات کے افکار کا تتبع ذہن کو لغزش سے بچا سکے گا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فکر مندی خود ایک لغزش بن گئی اور سنگِ میل سنگِ راہ ہوگیا۔

ائمۂ حدیث اور فقہاء کے مباحث، احناف اور شوافع کے مناقشات اسلام کی خدمت کے بجائے بعض مقامات پر اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ قرآن وسنت کے نصوص باہم تقسیم ہوگئے۔

اپنی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور کے اہلِ علم اس مرض کے علاج میں مصروف رہے۔ آوارگی سے بچتے تو جمود آ جاتا۔ جمود سے بچنے کی کوشش کرتے تو آوارگی کے خارستان میں دامن اُلجھ جاتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی مساعی:

پیشِ نظر گزارشات میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی مساعی اور اُن کے نتائجِ فکر کا تذکرہ اس

نگاہ سے ہے کہ مغل دور کے اواخر میں جب جمود کی گھٹائیں ہند کے افق پر چھائی ہوئی تھیں، اورنگ زیب عالمگیر جیسا نیک دل بادشاہ زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کر سکا کہ اس نے فتاویٰ ہندیہ کی صورت میں علماء کے ذریعے سے اسلام کی خدمت کی۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، ان کے رفقاء اور ان کے متوسلین نے اس اندھیرے میں ایک روشنی کے مینار کی طرف توجہ دلائی اور وہ فقہاء و محدثین کا طریق تھا۔ شاہ صاحب ہندوستان کی حنفیت اور ابن حزم کی ظاہریت کو فقہاء و محدثین کے دامن میں پناہ دینا چاہتے تھے۔

ہندوستان کے اہلِ توحید، حنفی یا اہلِ حدیث، کو شاہ ولی اللہ سے کوئی صحیح نسبت ہے تو حنفیتِ خالصہ اور ظاہریتِ محضہ سے بچ کر انھیں فقہاء و محدثین کا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ اس دور میں اسلام کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباعِ حق اور عمل اور اعتقاد میں اعتدال کی توفیق دے۔

آیندہ اوراق میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف اذہان کے غلو میں صالح تحریکات نے کیا کردار نمایاں ادا کیا۔ تحریکاتِ سلفیہ نے مختلف ادوار میں کیا اصلاحات فرمائیں، فقہائے اسلام نے کیا خدمات انجام دیں، صوفیہ نے کیا کیا اور ان تینوں اذہان پر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اصلاحی کوششوں نے کیا اثر ڈالا۔

اہلِ حدیث:

شروع شروع میں لفظ ''اہلِ حدیث'' کا مقصد یہ تھا کہ اجتہادی اُمور میں تقلید اور جمود کو دین میں پنپنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ صحابہ اور ائمۂ اسلام کے اجتہاد سے وقت کے مصالح کے مطابق فائدہ اٹھایا جائے اور فقہی فروع میں جمود اور فرقہ پروری کی حوصلہ افزائی نہ ہونے پائے۔ اصل نظر کتاب اللہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مرکوز رہے۔

کتاب و سنت میں اگر کسی مسئلے یا وقتی حادثے کے متعلق صراحت موجود نہ ہو تو اس کا فیصلہ محض کسی شخصی رائے کے مطابق نہ ہو، یا کسی علاقے کے علماء اپنے مخصوص افکار امت پر نہ ٹھونس دیں، بلکہ اصل مطمحِ نظر صحابہ اور اسلافِ کرام کی وسعتِ نظر ہو۔ جمود اور شخصیت پروری سے اُمت میں ضیق نہ پیدا کیا جائے۔

جب نصوص نہ ہوں، کتاب و سنت میں احکام صراحتاً نہ ملیں تو رائے یا اجتہاد کے سوا چارہ

نہیں۔صحابہ نے بھی اجتہاد فرمایا۔ ائمۂ اربعہ اور دوسرے ائمۂ مجتہدین نے بھی بوقتِ ضرورت اجتہاد فرمایا۔ وقت کے ضروری مسائل کو اجتہاد ہی سے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اہلِ حدیث اور فقہائے مذاہب سبھی نے اجتہاد کیا اور قیاسِ شرعی یا میزانی، وقت کے مسائل میں مخلصی کی راہ پیدا فرمائی۔

حافظ ابن حزم اور امام داود ظاہری کا قیاس سے بالکل صرفِ نظر کا نظریہ ائمۂ حدیث میں مقبول نہ ہوسکا۔ فقہائے عراق میں تو اس کی گنجایش ہی کہاں تھی۔ اس لیے ائمۂ حدیث اور فقہائے عراق میں قیاس سے استفادہ یا نظائر میں احکام کی وحدت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ بوقتِ ضرورت قیاس کو سب درست سمجھتے ہیں بلکہ ضروری!

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان دو مختلف اور غیر معتدل نظریات اور ان کے نتائج کے حسن و قبح سے متاثر ہو کر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو یہ وصیت فرمائی:

> ''وصیت اول ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن و اگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن و در عقاید مذہب قدمائے اہلِ سنت اختیار کردن و از تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن و بتشکیکات معقولیان خام التفات نکردن و در فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن و دائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیّز قبول آوردن والا کالائی بد بریش خاوند دادن امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنا حاصل نیست و سخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمی را دست آویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن و بدیشاں التفات نکردن و قربت خدا جستن بدوری اینان۔'' (تفہیمات: ۲/ ۲۴۰)

> ''فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمسک کرے اور ان دونوں کو اپنا مشغلہ قرار دے۔ اور ہر دو سے کچھ حصہ روزانہ پڑھے اور اگر پڑھ نہ سکے تو چند اوراق کا ترجمہ سنے۔ اور عقائد میں سلف اہلِ سنت کی روش اختیار کرے اور ائمۂ سلف کی طرح موشگافیوں سے بچے اور خام کار معقولیوں کی شک آفرینیوں سے بچے۔ اور فرعی مسائل میں ان محدثین کا اتباع کرے جو حدیث اور فقہ دونوں سے پوری طرح واقف ہوں، اور فقہی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت پر پیش کرے۔ جو موافق ہو اسے قبول کرے ورنہ

بالکلیہ نظر انداز کر دے۔ اُمت کو اپنے اجتہادات کو کتاب وسنت پر پیش کرنے سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہوا۔ اور ضدی قسم کے فقیہ حضرات جنھوں نے بعض اہلِ علم کی تقلید کو دین کا سہارا بنا رکھا ہے اور کتاب وسنت سے اعراض ان کا شیوہ ہے، اُن کی بات تک نہ سننا اور ان کی طرف نگاہ مت اٹھانا اور ان سے دور رہنے میں ہی خدا کا قرب تلاش کرنا۔''

شاہ صاحب کے دانشمندانہ اور جرأت آمیز اعلان سے تعجب ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی وہ فقہی جمود کا دور تھا۔ اس وقت کا بہت بڑا متدین اور روشن خیال بادشاہ اسلام کی جو سب سے بڑی خدمت کر سکا وہ فتاویٰ عالمگیری کی تالیف تھی جسے فتاویٰ ہندیہ کہا جاتا ہے۔ عالمگیر نے اسلامی قانون کی بہتر تعبیر کے لیے وقت کے بہترین علماء کو جمع کیا۔ ان مقدس بزرگوں نے اپنے وسیع علمی معلومات کی روشنی میں فقہ حنفی کی یہ بہترین خدمت انجام دی۔

اس کتاب کی خوبی صرف اسی قدر ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ کے اقوال سے اوفق بالمصالح اقوال کو لے لیا گیا اور مختلف فیہ کو اسی طرح درج کر دیا گیا تاکہ جس پر مناسب ہو عمل کر لیا جائے۔ گویا اس دیرینہ جمود میں ایک محدود مقام تک حرکت کی کوشش کی گئی۔ قرآن اور سنت یا دوسرے ائمہ کے مذاہب کے لحاظ سے شرعی مصالح کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی ماحول میں پڑھا اور غالباً والد صاحب کی زندگی میں مسندِ درس کی زینت بنے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے دروس اور طریقِ افتا سے طالب علم اور اس وقت کے عوام مطمئن تھے لیکن خود شاہ صاحب مطمئن نہ تھے۔ جس چشمے سے عام دنیا سیرابی حاصل کر رہی ہے وہ چشمہ خود اپنے سوتوں میں تشنگی اور خشک سالی محسوس کر رہا تھا۔ جامد اور تقلید مزاج طبائع اپنی رسائی اور فہم کے لحاظ سے سمجھ رہے تھے کہ فقہ حنفی اور اس کے مصالح کی ترجمانی کا حق صحیح طور پر ادا ہو رہا ہے، لیکن علم وتفقہ اور حکمت ومصالح کا یہ ترجمان دل ہی دل میں محسوس کر رہا تھا کہ جب مذاہبِ مجتہدین اسلام کی ترجمانی ہے اور ائمۂ فقہ کا ماخذ قرآن اور سنت ہے تو بعض تعبیرات کو کلیتاً کیوں ترک کیا جائے اور بعض پر قناعت کیوں کی جائے۔ اگر کسی موسم اور کسی ملک میں ایک تعبیر اسلامی مصالح اور دینی مقاصد کے چوکھٹے میں پوری سازگار آسکے تو بالکل ممکن ہے کہ دوسری تعبیر دوسرے ماحول میں اس سے بھی زیادہ سازگار آئے۔ نبوت جب ختم ہو چکی ہے تو صرف ترجمانی اور تعبیر کو کیوں نبوت کی

طرح واجبی اور دوامی حیثیت دی جائے؟ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ دین کے خادم ہیں اور اسلام کے ترجمان۔ دین ان کا دست نگر اور خادم نہیں کہ ان کے ارشادات اور احکام کے لیے ہر وقت چشم براہ رہے۔

فقہاء کی عرصے سے یہ حالت تھی کہ وہ اس اسمی اور فقہی تقلید کو واجب اور فرض سمجھتے تھے۔ اس کی مزعومہ حیثیت کی بنا پر اِکفار وتکفیر اور ایک دوسرے کی اقتدا سے حتمی طور پر روکا جاتا تھا۔ یہ سوتیلی ماں کا معاملہ ایک دانشمند کے لیے موجبِ حیرت تھا۔ شافعی حنفی ہو تو سزا پائے اور حنفی شافعی ہو تو خلعت ملے، یہ کیسی حق پروری ہے؟!

یہ عجیب وتیرہ تھا کہ علماء کے اقوال وارشادات اور نصوصِ کتاب وسنت میں جب اختلاف اور تعارض ہو تو تاویل اور توڑ پھوڑ نصوص کا حصہ تھا اور اپنی جگہ پر قائم رہنا ائمہ کی فقہیات کا حق تھا۔ اور پھر دعویٰ یہ تھا کہ اصل مطاع نبوت ہے، اجتہاد نہیں! یہ دو عملی اور تضاد حضرت شاہ صاحب جیسے دور اندیش، معاملہ فہم فقیہ کے لیے کیسے اطمینان کا موجب ہوسکتا تھا؟!

اس لیے ظاہر ہے کہ جمود پیشہ اور قاصر النظر دنیا کی سیرابی اور اطمینان کے اسباب و دواعی ایک بالغ النظر اور تجدیدی ذہن کے لیے کبھی اطمینان کا موجب نہیں ہوسکتے تھے، اس لیے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تشنگی فطری اور قدرتی تھی۔

پھر جمود اور استعدادِ اجتہاد کا فقدان فقہائے احناف سے مخصوص نہ تھا بلکہ تقلید کے مزاج کا تقاضا تھا کہ وسعتِ نظر اور دقت سے ممکن طور پر اجتناب کیا جائے۔ دلائل کی چھان پھٹک کے مشغلے سے بچ کر رجال اور ان کے اقوال کے سہارے پر زندہ رہنے کی کوشش کی جائے۔

جس طبیعت کا خمیر تجدید اور اجتہاد سے اٹھایا گیا ہو، جہاں حِکَم اور مصالح ذوق میں سمو دیے گئے ہوں، جس شخص نے اسرارِ شریعت اور دین کی حکمتوں میں رازی اور غزالی سے سبقت حاصل فرمائی ہو، ابن حزم اور عز بن عبدالسلام جیسے فحول ائمہ پر تنقیدی تبصرے کیے ہوں، وہ توضیح اور کشف الاسرار پر کیسے مطمئن ہوسکتا تھا؟ اصولِ فقہ اور فقہ کے متعارض اور متصادم اصول اور جزئیات اسے کیسے مطمئن کر سکتے تھے؟

ظاہر پرستی کا مرض:

حافظ ابن حزم اور امام داود ظاہری رحمہما اللہ نے قیاس کی ان بھول بھلیوں سے تنگ آ کر اس کی حجیت سے انکار کر دیا اور اس تلاش میں نکلے کہ صرف کتاب وسنت پر کفایت کریں۔

یہ راستہ اس لحاظ سے بے خطر تھا کہ اس میں اپنی ذمے داریاں کم ہوجاتی ہیں، تاویلات اور قیاسات کی دوڑ دھوپ سے تھکنے یا ہار جانے کی نوبت نہیں آتی۔ جب دین میں مدار نقل پر ہے تو نقل پر انسان کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگر عقل بالفرض قاصر ہے تو حرج نہیں۔ اصل تو نقل ہی ہے۔ جب قرآن اور سنت میں ایک حکم مل گیا تو اب عقل اور نظائر کی تلاش چنداں ضروری نہ تھی۔ نہ عقل کی موافقت کی شرط ہی۔ اس لیے اپنی طرف سے نہ کسی اضافے کی ضرورت ہے نہ اس خطرے کو خریدنے میں کوئی فائدہ۔

لیکن معلوم ہے کہ نصوص کا ذخیرہ محدود ہے۔ سننِ ثابتہ چند ہزار کے پس و پیش ہوں گی اور قرآنِ عزیز کی ایک سو چودہ سورتوں میں آیاتِ احکام کی تعداد معمولی ہے، لیکن حوادث کا سلسلہ غیر محدود ہے۔ جب تک دنیا فنا کی حدود تک نہ پہنچ جائے، واقعات اور حوادث ہوتے رہیں گے۔ ان غیر محدود واقعات کے متعلق ان محدود نصوص میں صریح احکام کیسے مل سکتے تھے؟ اس لیے ظاہریت کی راہ بالآخر تکلفات کی راہ بن گئی اور عملی زندگی میں زیادہ دور تک نہ جا سکی، اور ملتے جلتے نظائر سے حکم میں فرق اور تفاوت معقول اور پسندیدہ راہ نہ شمار کی جا سکی، اس لیے اگر ظاہری مکتبِ فکر ایک لحاظ سے بے خطر تھا تو دوسرے نقطۂ نظر سے بے کار بلکہ بسا اوقات مضحکہ خیز بھی ہوگیا۔

قیاس اور تفقّہ کی راہ:

عملی زندگی میں آگے بڑھنے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ نظائر اور ان کے احکام میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ شارع حکیم کے احکام کے وجوہ اور اسباب پر غور کیا جائے۔ ان مصالح کا بغور مطالعہ کیا جائے جن کی بنا پر شارع حکیم نے یہ احکام نافذ فرمائے۔ اور قرآنِ عزیز نے جب قدم قدم پر عقل و فہم کو مخاطب فرمایا ہے، توحید و نبوت اور معاد کے دلائل کے تذکرے میں عقل، لُب اور نُہیٰ کے استعمال کی تلقین کی گئی ہے تو اسے معطل کیوں چھوڑا جائے؟!

﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝١٧ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ [الزمر: ١٧۔ ١٨]

''وہ لوگ بشارت کے مستحق ہیں جو گفتگو سن کر اس کے حسن و قبح میں تمیز کرتے ہیں، اچھی باتوں کو قبول کرتے ہیں، یہی لوگ اللہ سے ہدایت کے مستحق ہیں اور یہی عقلمند کہلانے کے حق دار۔''

اس میں عقل مند اور معاملہ فہم لوگوں کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ ملتے جلتے مسائل میں توازن

قیاسِ صحیح کا نتیجہ اور عقل کا واجبی تقاضا ہے۔ فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ [الشوریٰ: ۱۷]

''اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور اس کے ساتھ میزان کو بھی اُتارا۔''

جس میزان کا تعلق کتاب کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اتری ہے یہ ترازو وہ نہیں جو مادی اور جسمانی چیزوں میں توازن کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس سے مراد وہی میزان ہے جو کتاب کے فہم اور ادلۂ شرعیہ میں جس سے بصیرت پیدا ہوتی ہے، جس سے مختلف نظائر کے حکم میں توازن ہوتا ہے۔ اس کا فقہی اور اصطلاحی نام قیاس سمجھ لینا چاہیے، لیکن حقیقت میں وہ میزان ہے۔

اس لیے نہ قیاس کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ اپنے مقام پر اس کی حجیت اور افادیت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ائمۂ حدیث ظواہرِ حدیث کے ساتھ پوری عقیدت، الفاظ اور ان کے لغوی معانی کے ساتھ پورے اعتنا کے باوجود قیاس کو شرعی حجت سمجھتے ہیں اور ان قیاسی ادلہ سے پوری طرح استفادے کے قائل ہیں۔ ان اصول کے احتوا اور ممکن عموم اور ہمہ گیری کے معترف ہیں، لیکن نصوصِ شرعیہ کو ان اصول پر قربان نہیں کرتے۔ جس کی بعض مثالیں ان گزارشات میں مذکور ہو رہی ہیں۔ عام فقہاء اور خصوصاً فقہائے حنفیہ سے اس معاملے میں کچھ مسامحات ہوئی ہیں، رَحِمَهُمُ اللّٰهُ۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اصل بے چینی یہی ہے۔ بعض جگہ اصول نصوص سے ٹکرا گئے ہیں اور بعض جگہ اصول کی جامعیت اور اس کے طرد و عکس میں خلل واقع ہوا ہے۔ جہاں اصول کی جامعیت نے دل کی گہرائیوں میں جگہ لی اور نظائر کو اس پیمانے سے ناپنا شروع کیا، دیکھتے ہی دیکھتے پیمانہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ نظائر کا حکم باہم ٹکرا گیا اور اصول پاش پاش ہوگیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرما لیجیے۔

پہلی مثال:

1 صحیح بخاری میں ہے: ''كَانَتْ عَائِشَةُ يَؤُمُّهَا ذَكْوَانُ مِنَ الْمُصْحَفِ'' [1]

(عمدة القاري: ۲/ ۷۵٦، فتح الباري: ۱/ ۳۸٦ طبع هند)

[1] صحيح البخاري، كتاب الجماعة والإمامة، باب إمامة العبد والمولىٰ (۱/ ۲٤٥) امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مذکورہ بالا اثر معلق ذکر کیا ہے، لیکن اسے امام عبدالرزاق (المصنف: ۲/ ۳۹٤) ابن ابی شیبہ (۲/ ۱۲۳) بیہقی (۲/ ۲۵۳) امام ابن ابی داود (المصاحف، ص: ۷٦٦) اور حافظ ابن حجر (التغليق: ۲/ ۲۹۱) نے متصل بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''وهو أثر صحيح'' (تغليق التعليق: ۲/ ۲۹۱)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا غلام ذکوان قرآن سے دیکھ کر نماز پڑھاتا تھا۔''

ابن سیرین، حسن بصری، حکم، عطاء قرآن سے نماز میں قراءت جائز سمجھتے تھے۔[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پیچھے سامع کے ہاتھ میں قرآن ہوتا، وہ انھیں لقمہ دیتے۔[2] امام مالک تراویح میں اسے جائز سمجھتے ہیں۔[3] حافظ عینی فرماتے ہیں:

"قُلْتُ: اَلْقِرَاءَ ةُ مِنْ مُصْحَفٍ فِيْ الصَّلَاةِ مُفْسِدَةٌ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ لِأَنَّهُ عَمَلٌ كَثِيْرٌ، وَعِنْدَ أَبِي يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٍ يَجُوْزُ لِأَنَّ النَّظَرَ فِيْ الْمُصْحَفِ عِبَادَةٌ لَكِنَّهُ يُكْرَهُ لِمَا فِيْهِ مِنَ التَّشَبُّهِ بِأَهْلِ الْكِتَابِ" (عمدة القاري: ٢/ ٧٥٧)

''نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنے سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز فاسد ہوگی، کیوں کہ یہ عملِ کثیر ہے جس سے خشوع اور نماز کی ہیئت بگڑ جاتی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ قرآن میں دیکھنا عبادت ہے اس لیے نماز درست ہے، لیکن مکروہ ہوگی کیوں کہ اس میں اہلِ کتاب سے مشابہت ہے۔ وہ کتاب سے دیکھ کر ہی نماز پڑھتے ہیں۔''

"إِمَامٌ قَرَأَ فِيْ الْمُصْحَفِ فَصَلَاتُهُ فَاسِدَةٌ، قَالَ أَبُوْ يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ: تَامَّةٌ، وَيُكْرَهُ" (الجامع الصغير للإمام محمد، ص: ١٥ طبع مصر)

''حضرت امام صاحب کے نزدیک قرآن دیکھ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی۔ امام محمد اور ابو یوسف کے نزدیک مکمل ہوگی لیکن مکروہ۔''

حضرت عائشہ اور اکابر ائمہ، تابعین کے عمل کے باوجود دل مانتا ہے کہ مصحف میں پڑھنا ٹھیک نہیں۔ یہ واقعی عملِ کثیر ہے (عملِ کثیر کی کچھ حد ہو!) اوراق کی الٹ پلٹ اور صفحات کی طرف توجہ اور حفاظت سے واقعی نماز کی طرف صحیح اور مناسب توجہ نہیں رہے گی، اس لیے مناسب یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے یہ تکلف نہ کیا جائے اور حفظ سے پڑھا جائے۔

---

[1] امام ابن سیرین، حسن بصری، حکم اور عطاء رحمہم اللہ سے یہ آثار صحیح وحسن اسانید کے ساتھ ثابت ہیں۔ دیکھیں: كتاب المصاحف لابن أبي شيبة (٢/ ١٢٣)

[2] **صحيح**. مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ١٢٣)

[3] **صحيح**. كتاب المصاحف لابن أبي داود (ص: ٧٢١) امام مالک رحمہ اللہ تراویح میں بوقتِ ضرورت اسے جائز سمجھتے ہیں۔

اہلِ کتاب سے تشابہ کی وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر یہ شرعاً درست ہے تو تشابہ کیا ہوا؟ اور جب آپ پڑھنا شروع کر دیں گے تو پھر اہلِ کتاب کا آپ سے تشابہ ہو جائے گا۔ تاہم دوسرے نمبر پر یہ وجہ بھی مان لی جائے تو اس سے دو اصل سمجھ میں آتے ہیں:

1. نماز میں عملِ کثیر نہیں ہونا چاہیے، نماز سے توجہ ہٹ جائے گی۔
2. غیر مسلم قوموں کے ساتھ تشبیہ سے بچنا چاہیے۔

اب دوسرا نکتہ سنیے...!

"لَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّيْ إِلَى الْمُصْحَفِ، وَقَرَأَ مِنْهُ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ، لَا إِلٰى فَرْجِ امْرَأَةٍ بِشَهْوَةٍ، كَأَنَّ الْأَوَّلَ تَعْلِيْمٌ وَتَعَلُّمٌ فِيْهَا، لَا الثَّانِيْ"

(الأشباه والنظائر، ص: ٤٣٤، مطبوعه هند)

''اگر نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھے تو نماز فاسد ہو گی، لیکن اگر عورت کی شرم گاہ جنسی جذبے کے ساتھ دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہو گی، کیوں کہ پہلی صورت درس و تدریس کی ہے، شرمگاہ دیکھنے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا۔''

اب اس عقل پروری اور تفقہ نوازی کو کون سمجھے؟ جہاں قرآن دیکھنے سے خشوع ٹوٹے اور عملِ کثیر ہو اور شرم گاہ کی طرف جنسی جذبات کے ساتھ توجہ نماز پر کوئی اثر ہی نہ ڈالے!!

کچھ شک نہیں جب علماء بحث و مناظرہ کے موڈ میں آ جائیں تو بھیڑیا حلال کر سکتے ہیں، مرغی حرام فرما سکتے ہیں مگر عقلِ سلیم اور میزانِ اعتدال تو موشگافیوں اور نکتہ نوازیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس لیے محدثین نے قیاس کی حجیت کے باوجود اس دو عملی سے بچنے کے لیے پوری احتیاط سے کام لیا ہے۔

ہمارے حضراتِ احناف کی ایک قسم بریلی سے نمودار ہوئی ہے۔ ان کی عمر قریباً ساٹھ ستر سال کے پس و پیش ہو گی۔ یہ حضرات اسلام کے مدنی ڈھانچے کے حصۂ عقائد میں بڑی اہم اور دور رس ترمیمات چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے مدنی عقائد بریلی، لاہور، لائل پور کے تابع بنوا لیے جائیں۔

ان حضرات کی نظر سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ملفوظات حصہ دوم (جو صراطِ مستقیم کے نام سے مشہور ہے) کی اس بات پر پڑی کہ گاؤ خر کے تصور سے نماز میں خشوع پر اتنا اثر نہیں پڑتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور سے خشوع زیادہ مجروح ہوتا ہے۔[1]

[1] صراطِ مستقیم (ص: ۱۱۸) ادارہ نشریاتِ اسلام۔ لاہور

عنوان یا تعبیر کچھ ہو، بات صحیح اور درست تھی کہ محبوب اور پسندیدہ چیز کے تصور سے طبیعت کے رجحان اور خشوع پر زیادہ اثر پڑے گا۔ گاؤخر جیسی معمولی اور حقیر چیز کے تصور سے نماز اور خشوع پر وہ اثر نہیں پڑے گا۔ بات پتے کی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت اور والہانہ تعلق جب توحید کی سرمستیوں سے ٹکرائے تو اس سے بچنا بڑی دانشمندی ہے۔ نہ تو نبوت کی بلندیوں کو گاؤخر کی حقارتوں سے ہم آہنگ ہونے دیا جائے، نہ نماز کی معراج اور اس مکالمۂ الٰہیہ کے ذوق میں کسی دوسرے محبوب کو اشتراک کا موقع ہی دیا جائے۔

مسئلہ درست تھا۔ اگر تعبیر ناپسند تھی تو اسے بدل دیا جاتا۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی کا ترجمہ وحی نہیں تھا لیکن یہاں کوئی پرانا بغض تھا جسے نکالنا ضروری سمجھا گیا۔ سید احمد کا ارشاد اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کا ترجمہ دونوں حضرت شاہ اسماعیل شہید کے نام لگا دیے گئے اور فتووں کی مشین تان دی گئی۔ کفر کے انبار بالاکوٹ کے میدان میں دریائے منہار کے کناروں پر انڈیل دیے گئے جنھیں خونِ شہادت کے چند قطروں نے دریائے منہار کے سپرد کر دیا اور شہداء کی طہارت ان نجس اور غلیظ فتووں سے متاثر نہ ہو سکی۔

سراسیمگی اور شوریدہ سری کی کوئی حد ہے کہ سید شہید کے ملفوظات اور مولانا عبدالحی کا ترجمہ دونوں بے چارے شاہ اسماعیل کے نام پر الاٹ کر دیے گئے اور درس و افتاء کی مسندیں شہیدِ حق کے کیڑے نکالنے میں مشغول ہوگئیں جو ان کے درجات کی رفعت کا موجب ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

سید شہید رحمہ اللہ نے نماز کی سرگوشیوں میں آنحضرت ﷺ کے مقام کی رفعت اور گاؤخر کی حقارت انگیزیوں میں اگر امتیاز فرما کر نماز کی روحانی کیفیتوں کو شرک کی غلاظتوں سے پاک و صاف رکھنے کی تلقین فرمائی تو وہ کافر ہوئے، اس لیے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے محبت فرماتے ہیں۔ آپ کی فقہی موشگافیوں نے تحریمِ نماز میں مصحف کے تقدس کو شرمگاہ کی عریانی اور انسانی کمزوریوں کے جنسی شہوت سے قرآن عزیز کو شکست دے دی۔ یعنی قرآن سے پڑھنا نماز کے لیے ناقص ٹھہرا اور شرمگاہ کی زیارت آپ کے خشوع میں کوئی خلل نہ پیدا کر سکی۔ إنا للہ .... آپ کا ایمان سلامت رہا اور آپ بالکل تازہ اہلِ سنت و جماعت ہو گئے، اور شہدائے بالاکوٹ شہادت اور قربانی کے باوجود کافر ہی رہے:

مَنْ كَانَ هٰذَا الْقَدَرُ مَبْلَغَ عِلْمِهِ فَلْيَسْتَتِرْ بِالصَّمْتِ وَالْكِتْمَانِ[1]

اگر فقہائے بریلی کا اندازِ فکر یہی رہا تو یہ قافلہ چند دن کا مہمان سمجھنا چاہیے۔ بریلی، بدایوں، مارہرہ، لاہور، لائل پور؛ کوئی مقام اور کوئی نسبت ایسے لوگوں کے لیے زندگی کی کفیل نہیں ہوسکتی۔ پاکستان میں جہالت کا یہ دور اور علم فروشی کا یہ بازار ان شاء اللہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔ آپ ہی سوچیں اس پون صدی کی کفر نوازی سے آخر اسلام کو کیا فائدہ پہنچا۔ ملک کہاں تک سر بلند ہوا۔ دین اور سیاست میں آپ کو کونسا مقام ملا؟ آپ نے اہلِ توحید کو مشقِ ستم کے لیے انتخاب فرمایا اور وہ شرافت سے سر جھکا کر کھڑے ہوگئے اور آپ نے مظالم کی مشق ان مساکین پر فرمالی۔ ہوا کیا؟

ہمہ آہوانِ دشتی سر خود نہادہ بر کف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد[2]

دوسری مثال:

② ظن کو فیصلوں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ شریعت نے بیسیوں مقامات میں قرائن سے فیصلہ کیا کہ بچے کے اِلحاق میں اور لقیط کو ورثاء کے ساتھ ملانے میں قیافہ کو بہت بڑا دخل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے متعلق قیافہ اور اس کے ماہرین کی رائے پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔[3] بعض فقہاء نے اس قرینے کا اس لیے انکار فرمایا کہ اس میں ظن اور تخمین پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ اپنی جگہ یقین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یقین کے بالمقابل ظن کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ ﴿ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ [يونس: ٣٦]

لیکن بعض فقہاء نے ان قرائن کو نظر انداز کر دیا کیوں کہ یہ ظنی ہیں لیکن جب ظن کے قبول کا رجحان ذہن میں آیا تو کمال کر دیا۔ شکوک و اوہام کو یقین کا مقام دے دیا۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قَالَ بَعْضُ الْفُقَهَاءِ: وَمِنَ الْعَجَبِ إِنْكَارُ لُحُوْقِ النَّسَبِ بِالْقِيَافَةِ الَّتِي اعْتَبَرَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَعَمِلَ بِهَا الصَّحَابَةُ مِنْ بَعْدِهِ، وَحَكَمَ بِهَا عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ رضي الله عنه، وَإِلْحَاقُ النَّسَبِ فِي مَسْأَلَةِ مَنْ تَزَوَّجَ بِأَقْصَى الْمَغْرِبِ

---

[1] جس کا مبلغِ علم اسی قدر ہو، اسے خاموشی ہی زیبا ہے۔

[2] جنگل کے تمام ہرن اس امید پر کہ تم کسی دن شکار کو آؤ گے، اپنا سر ہتھیلی پر رکھے پھرتے ہیں۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٩)

امْرَأَةً بِأَقْصَى الْمَشْرِقِ، وَبَيْنَهُمَا مَسَافَةُ سِنِيْن، ثُمَّ جَاءَتْ بَعْدَ الْعَقْدِ بِأَكْثَرَ مِنْ سِتَّةِ أَشْهُرٍ بِوَلَدٍ"[1]

''آنحضرت ﷺ صحابہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیافہ کو اثباتِ نسب میں معتبر سمجھا لیکن بعض فقہاء نے اس کا انکار کر دیا اور اقصیٰ مغرب میں ایک آدمی اس عورت سے نکاح کرے جو اقصیٰ مشرق میں ہے، چھے ماہ کے بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو یہ حضرات اس کے نسب کو صحیح سمجھتے ہیں!''

یہ قیاس کا عجیب کرشمہ ہے۔ مستند قرائن کا انکار کر دیا گیا اور اوہام وظنون کی بنا پر نسبت ثابت کر دی اور بچہ ثابت النسب قرار پا گیا۔ یہ اوہام تو قابلِ اعتماد قرار پائے اور قیافہ کی وجہ سے خبرِ واحد کے پورے ذخیرے پر عتاب فرمایا گیا کہ وہ ظنی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس غیر معتدل طریقِ فکر پر کیسے مطمئن ہوتے؟!

تیسری مثال:

③ علمائے اصول نے ایک قاعدہ بیان فرمایا: "اَلْخَاصُّ لَا يَحْتَمِلُ الْبَيَانَ"[2]

اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ خاص کا مفہوم چونکہ واضح اور بین ہوتا ہے اس لیے اسے بیرونی تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی قانون کی روشنی میں کئی مواقع میں شوافع پر حجت قائم کی اور یہ ظاہر فرمایا کہ ہمارا موقف صحیح ہے اور شافعی غلطی پر ہیں، بلکہ اگر کہیں صحیح حدیث بھی اس قانون سے ٹکرا گئی تو حدیث کو نظر انداز کر دیا گیا اور اس قانون کی آبرو رکھ لی گئی۔

قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ ﴾ [الحج: ۷۷]

''اے ایمان والو! رکوع اور سجود کرو اور اللہ کی عبادت کرو۔''

فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں کہ رکوع کے معنی جھکنا ہیں، سجود کے معنی زمین پر سر رکھنا۔ اگر کوئی شخص ذرا جھک جائے یا زمین پر سر رکھ لے تو نماز ہو جائے گی، گو رکوع اور سجود میں اطمینان اور اعتدال حاصل نہ ہو۔ شوافع اطمینان اور اعتدال کو فرض سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح نماز میں رکوع

[1] الطرق الحكمية في السياسة الشرعية لابن القيم (ص: ١٤)

[2] حسامی (ص: ١٠) نور الأنوار (ص: ١٥) كشف الأسرار، التلويح على التوضيح (ص: ٣٤) [مؤلف]

اور سجود ضروری ہے ٹھیک اسی طرح شرعاً نماز میں طمانیت اور سکون بھی ضروری ہے۔ اگر ان ارکان میں اعتدال نہ ہو تو شوافع اور ائمۂ حدیث کے نزدیک نماز نہیں ہو گی۔ احناف فرماتے ہیں کہ نماز ہو جائے گی، کیوں کہ رکوع اور سجود کا لغوی معنی ثابت ہو گیا، اس لیے شوافع کا خیال غلط ہے۔ خاص کو کسی بیان اور خارجی تشریح کی ضرورت نہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ کے سامنے نماز پڑھی، اس نے رکوع و سجود اطمینان سے نہیں کیا، آنحضرت ﷺ نے اسے تین دفعہ فرمایا:

«فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ»[1] (تم نماز پڑھو، کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی)

یعنی شرعاً تمھاری نماز کا کوئی وجود نہیں۔ اسی حدیث کی بنا پر اہلِ حدیث اور شوافع وغیرہم کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر رکوع اور سجود میں اطمینان نہ ہو تو نماز نہیں ہو گی۔ احناف فرماتے ہیں رکوع اور سجود کے معنی معلوم ہو جانے کے بعد ہم حدیث کی تشریح اور نماز کی نفی قبول نہیں کرتے۔

قرآن کی عظمت:

اسی اصل کی حمایت میں یہ عذر فرمایا گیا کہ اگر شوافع کے مسلک یا حدیث پر یقین کرتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ نماز میں اطمینان فرض ہے تو یہ قرآن پر زیادتی ہو گی جو نسخ کے مترادف ہے۔ جب قرآنِ عزیز نے خاص الفاظ سے ایک حقیقت کا اظہار فرما دیا، اس پر زیادتی کسی طرح درست نہیں۔ ایسا کرنا یا سمجھنا قرآنِ عزیز کی عظمت اور اس کی رفعتِ شان کے منافی ہے۔

قرآن کی عظمت واقعی ضروری ہے لیکن اس آڑ میں مقامِ نبوت کا تعطل ہو جائے، پیغمبر کو یہ بھی حق نہ رہے کہ وہ قرآنِ عزیز کے مفہوم کی تعیین فرمائیں، کسی عمل کی شرعی ہیئت کا اظہار یا کوئی ایسا حکم جس سے قرآنِ عزیز نے سکوت فرمایا ہو، آنحضرت ﷺ بھی اسے بیان نہ فرما سکیں، خود صاحبِ وحی بھی اپنی وحی کا مطلب بیان نہ فرما سکیں، مجتہد اور فقیہ، عالم اور صوفی تو اپنے خیال سے اپنی استعداد کے مطابق قرآن کا مطلب بیان فرما لیں مگر آنحضرت ﷺ کو روک دیا جائے کہ آپ قرآن کے متعلق کچھ نہیں فرما سکتے، یہ عجیب ہے۔

آخر یہ اصول بھی تو قرآن فہمی ہی کے لیے بنائے گئے اور ان کے بنانے میں بقول

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

صاحبِ کشف الظنون (ص: ۸۹) زیادہ کوشش معتزلہ اور اہلِ حدیث نے کی۔ ان کا احترام تو اس قدر رکھا کہ حدیث بھی ان کے ہوتے ہوئے نظر انداز فرما دی گئی اور نصوصِ نبویہ کے لیے یہ گنجایش بھی نہ رکھی گئی کہ وہ قرآنِ عزیز کی وضاحت فرما سکیں، حالانکہ قرآنِ عزیز یہ مقام آنحضرت ﷺ کے لیے ذمے داری کے طور پر متعین فرماتا ہے:

① ﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٤]

''ہم نے ذکر تم پر اس لیے اتارا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے واضح فرمائیں اور یہ لوگ اسی پر سوچیں۔''

② ﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [النحل: ٦٤]

''اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لیے اتاری کہ آپ ان کے باہم اختلافات کو واضح فرمائیں اور یہ کتاب اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

ان دونوں آیات میں تبیین اور اظہار آنحضرت ﷺ کی ذمے داری قرار پایا ہے جس سے آنحضرت ﷺ کسی طرح بھی صرفِ نظر نہیں فرما سکتے۔

③ سورۂ مائدہ میں اہلِ کتاب کو بھی آنحضرت ﷺ کے بیان کی طرف دعوت دی:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [المائدة: ١٥]

''اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارے رسول اس لیے تشریف لائے کہ وہ تمھاری چھپائی ہوئی چیزوں کی وضاحت فرمائیں۔''

تعجب ہے کہ جس بیان کے سامنے اہلِ کتاب کو بھی انقیاد کی دعوت دی جا رہی ہے، مسلمان اس سے محروم ہونے کی اس لیے کوشش فرماتے ہیں کہ اربابِ اعتزال کے طے فرمودہ قوانین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ حدیث رہے یا نہ رہے، اصول اور ان کی پختگی میں کمی نہ آنے پائے!!

④ پھر یہ ذمے داری تمام انبیاء علیہم السلام پر ڈالی گئی:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ

﴿وَيَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ﴾ [إبراهيم: ٤]

''ہم نے ہر نبی کو اس کی مادری زبان میں اس لیے مخاطب فرمایا کہ وہ پوری وضاحت کر سکے، پھر ہدایت اور گمراہی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ عزیز اور حکیم ہے۔''

⑤ پھر پیغمبر کے اس بیان کو اپنا بیان قرار دیا تاکہ خالق اور مخلوق کی مغایرت کا اثر بیان پر مرتب نہ ہو۔ فرمایا: ﴿فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ‌ۚ‏ ۝١٨ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ﴾ [القيامة: ١٨۔ ١٩]

''تم ہمارے ارشاد کے مطابق قرآن کو پڑھو، پھر اس کا بیان ہمارے ذمے ہے۔''

پیغمبر ﷺ خدا کے حکم کے مطابق احکام کی وضاحت فرمائیں لیکن وہ بیان ہمارے خود ساختہ اصول کے ہم پلہ نہ ہو سکے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ عجیب تھا۔ اس لیے ''حجة الله''، ''الخير الكثير''، ''تفهيمات''، ''مصفى''، ''مسوىٰ''، ''عقد الجيد''، ''الإنصاف'' وغیرہ میں اسے بار بار دہرایا اور مختلف طرق سے اس فقہی جمود کو توڑنے کی کوشش فرمائی اور احتجاج فرمایا کہ سنت کے ساتھ یہ بے انصافی اور ترجیحی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ بڑا ہی نا مناسب ہے کہ غیر معصوم انسانوں کے بنائے ہوئے اصول تو دین کی اساس قرار پائیں اور سنت جو فی الحقیقت وحی اور دین کی بنیاد ہے، وہ ان مصنوعی اصول کے سامنے یتیم اور لاوارث قرار پائے۔ اور سنت سے ایسا سلوک وہ لوگ کریں جو آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہیں!

حدیث کی صحت:

حدیث کی صحت یا ضعف کا مسئلہ اس وقت خارج از بحث ہے، اس لیے کہ ان اصول کی حکومت کے سامنے حدیث، صحیح ہو یا ضعیف، بے بس ہے۔ ویسے تو ہمیں بتایا گیا ہے کہ حدیث ضعیف بھی ہو تو وہ قیاس سے مقدم ہے اور اس کے لیے اصولِ فقہ کے دفاتر میں حدیثِ قہقہہ[1] کے انداز کی شاید ایک دو مثالیں بھی مل جائیں۔ دراصل حضرات فقہائے عراق خصوصاً اَتباعِ قاضی عیسیٰ بن ابان سنت سے ویسے ہی کچھ ناراض ہیں۔ وہ رائے کے دروازوں کو کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ سنت کے ابواب

---

[1] اس سے مراد وہ حدیث ہے کہ جس شخص نے نماز میں قہقہہ لگایا وہ وضو اور نماز دہرائے۔ اس معنی کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن الدارقطني (٥٩۔٦٤) نصب الراية (١/ ٤٧) إرواء الغليل (٢/ ١١٧)

بند ہوتے ہیں تو ہولیں۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ جیسا بیدار مغز، معاملہ فہم، دور اندیش، تجدیدی ذہن رکھنے والا آدمی پورے ماحول کی اس نامناسب کیفیت پر کیسے مطمئن ہوسکتا تھا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اصولِ فقہ کے ان نظریات پر اپنی تصانیف میں جا بجا تنقید فرمائی، اور یہی تنقید اس وقت ان ذہین لوگوں کے سامنے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جو اہلِ حدیث یا سلفی کہلاتے ہیں۔

اس تحریک کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ ائمہ کی مساعی بے کار ہیں یا ان کے علوم سے استفادہ ناجائز ہے یا ان کے علوم اور اجتہادات پر تنقید زندگی کا کوئی اہم اور ضروری مشغلہ ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے اجتہادات اور جملہ مسائل کی حیثیت ایک علمی تحقیق یا مقدس محنت کی ہے۔ ان کا مقام علومِ نبوت کا مقام نہیں۔ جس طرح ان سے استفادہ اور ان کے سامنے انقیاد بشرطِ صحت درست ہے اسی طرح کتاب وسنت کی روشنی میں ان پر تنقید بھی درست ہے اور ان سے صرفِ نظر بھی کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق کی راہیں جس طرح ان کے لیے کھلی ہیں ان کے اَتباع اور تلامذہ کو بھی اجازت ہے کہ علم ونظر کی راہنمائی میں کتاب وسنت کی نصوص پر غور کریں اور مصالحِ وقت کے لحاظ سے ان پر عمل کریں، گو یہ تحقیق ان کی تحقیق سے مختلف بھی ہو جائے۔ تحقیق ونظر کے لیے علوم اور خلوصِ نیت کے بعد ضروری نہیں کہ مصطلح اجتہاد اور اس کے مفروضہ علوم بھی زیرِ نظر ہوں۔ یہ اصطلاح زمانۂ نبوت میں اس مفہوم سے موجود نہ تھی۔ یہ علومِ اجتہاد بھی زمانۂ نبوت سے صدیوں بعد موجود ہوئے۔ ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ نے بھی یہ تمام علوم نہ پڑھے بلکہ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اس مصنوعی جال سے ہر ایک کو شکار کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ علم کو علم ہی کی راہ سے منوایا جائے، اسے فتویٰ یا حکومت یا اکثریت کے دباؤ سے نہ منوایا جائے۔

چوتھی مثال:

۴ قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ [المزمل: ۲۰]

سورۂ مزمل میں رات کی نماز کا ذکر فرماتے ہوئے حکم فرمایا کہ تہجد میں قرآن کا جس قدر حصہ آسانی سے پڑھا جا سکے اسے ضرور پڑھو۔ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ﴿ مَا تَيَسَّرَ ﴾ سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ جس طرح حدیث میں « مَا تَيَسَّرَ » کا لفظ وارد ہوا ہے اسی طرح اس حدیث کے دوسرے طرق

میں ﴿مَا تَيَسَّرَ﴾ کی وضاحت "أم القرآن" سے کی گئی ہے۔[1] گویا جو تذکرہ قرآنِ عزیز میں ﴿مَا تَيَسَّرَ﴾ کے لفظ سے ہوا تھا اسی کا دوسرا نام یا اس کی وضاحت "أم القرآن" سے فرمائی گئی ہے۔ اس لیے آپ امام ہوں یا مقتدی یا منفرد، آپ کو سورۃ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے۔ (جزء القراءة للبيهقي، ص: ٣، ٤)

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ فاتحہ کا تعین درست نہیں۔ چونکہ "القرآن" کا لفظ خاص ہے، اسے مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں، اس لیے فرض صرف قرآن ہوگا اور احادیث کی وضاحت قابلِ قبول نہ ہوگی۔

لیکن یہ پابندی قائم نہ رہ سکی۔ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ میں قراءت کی مقدار کا تعین بقدر ایک آیت یا تین آیت قیاس سے کیا گیا۔ پھر ﴿فَاقْرَءُوْا﴾ میں امام، مقتدی، منفرد سب شامل تھے۔ اسی سے مقتدی کو حدیث «مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ»[2] (دارقطنی) سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، حالانکہ یہ حدیث بھی باتفاقِ ائمہ ضعیف ہے۔ اس کا کوئی طریق صحیح ثابت نہیں ہوسکا۔ اگر قراءت کے حکم سے مقتدی مستثنیٰ ہوسکتا ہے تو فاتحہ کا تعین بھی ہوسکتا تھا۔ اگر حدیث اپنے مسلک کی مؤید ہو تو اس سے قرآن کے مفہوم کی تعیین ہوسکتی ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے مسلک کے لیے مفید ہو تو اس سے قرآنِ عزیز کے احترام کو نقصان پہنچتا ہے! یہ طریقِ بحث ونظر درست نہیں۔

پانچویں مثال:

5 ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

یعنی تیسری طلاق کے بعد عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوسکتی جب تک کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرلے۔

---

[1] **صحيح**. سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٥٩) مسند أحمد (٤/ ٣٤٠) اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔

[2] **ضعيف**. سنن ابن ماجه (٨٥٠) مسند أحمد (٣/ ٣٣٩) سنن الدارقطني (١/ ٣٢٣) امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: "هذا خبر لم يثبت عند أهل العلم من أهل الحجاز وأهل العراق وغيرهم لإرساله وانقطاعه" (تحفة الأنام في تخريج جزء القراءة خلف الإمام للبخاري، ص: ٩٠) اسی طرح دیگر ائمۂ حدیث اور حفاظِ کرام نے اس حدیث کو ضعیف ومعلول قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٢/ ٢٦٧) تحفة الأنام (ص: ٨٩)

آیت میں ﴿ تَنْكِحَ ﴾ کا فاعل ضمیر مؤنث ہے جو عورت سے تعبیر ہے۔ گویا نکاحِ ثانی کی ذمے داری بلحاظِ فاعل عورت پر رکھی گئی ہے۔ جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کرے، تین طلقات کے بعد وہ پہلے خاوند کی طرف رجوع نہیں کر سکتی۔

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ نے اسے خاص سمجھ کر اس سے حصر کا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بالغہ عورت نکاح کے معاملے میں مختار ہے۔ اسے ولی کی ضرورت نہیں۔ بالغہ ہونے کی صورت میں وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ ولی اسے پابند نہیں کر سکتا۔ اور حدیث:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ بَاطِلٌ بَاطِلٌ»[1] (ترمذي: ٢/ ١٧٥)

''جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل (تین بار) ہے۔''

اس حدیث سے ولی کی ضرورت ظاہر ہوتی ہے مگر آیت کے مقابل یہ حدیث قابلِ قبول نہیں۔ آیت اس تشریح کی محتاج نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نکاح کے انعقاد میں چار شخصیتوں کو دخل ہے: ناکح، منکوحہ، ولی، گواہ، لیکن حصر کی کوئی دلیل نہیں۔ ان چاروں میں سے کوئی بھی دوسرے سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ اپنے اپنے فرائض کے لحاظ سے سب پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اگر ﴿ تَنْكِحَ ﴾ کی نسبتِ فاعلی کا اثر ولی پر پڑ سکتا ہے تو ناکح اور شاہدین پر بھی پڑنا چاہیے۔ عورت کو اس استدلال کے مطابق نکاح میں مختارِ مطلق ہونا چاہیے۔ نہ خاوند کی رضا کی ضرورت ہوگی نہ گواہ کی۔ حالانکہ قرآنِ عزیز میں نکاح کا فاعل کئی جگہ مردوں کو قرار دیا گیا:

① ﴿ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ [النساء: ٣]

''(اور) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو، دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے۔''

② ﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ﴾ [الأحزاب: ٤٩]

''جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو۔''

③ ﴿ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ﴾ [البقرة: ٢٢١]

[1] صحیح. سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩) اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن اور امام حاکم، ابن حبان اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: التلخيص الحبير (٣/ ١٥٦) إرواء الغليل (٦/ ٢٤٣)

''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

④ ﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ [الممتحنة: ١٠]

''اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان سے نکاح کرلو، جب انھیں ان کے مہر دے دو۔''

⑤ ﴿ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ [النساء: ٢٥]

''تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو اور انھیں ان کے مہر اچھے طریقے سے دو۔''

ان تمام آیات میں نکاح کا فاعل مردوں کو قرار دیا گیا ہے۔ فاعلیت سے حصر پر استدلال کیا جائے تو قرآن میں تعارض ہوگا۔ کہیں عورت کو مختارِ مطلق بنایا گیا ہے کہیں مرد کو۔ نکاح میں دو گواہ معاملے کے لحاظ سے بھی ضروری ہیں اور حدیث میں اس کی صراحت بھی موجود ہے۔[1] ﴿ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ کی تخصیص حدیثِ شہادت پر بھی اثر انداز ہونی چاہیے، یا پھر ولی پر بھی اثر انداز نہیں ہونی چاہیے۔

پھر بالغہ کو تو اس آیت کی بنا پر مختار سمجھا گیا، لیکن نابالغہ کو اس قدر بے بس کر دیا گیا کہ اس میں باپ اور دادا کی ولایت کو جبری قرار دیا اور اس بے چاری مسکینہ سے خیارِ بلوغ کا حق بھی چھین لیا گیا، حالانکہ آیت میں بالغہ اور نابالغہ کی نہ تخصیص ہے نہ شرط۔ ایک اصل کی حمایت نے قرآن وسنت دونوں سے تعلق ڈھیلا کر دیا۔ اگر آیت میں عورت کو خصوصیت سے نکاح کا اختیار دیا گیا ہے تو نابالغہ کے استثناء کے لیے کونسی آیت آئی ہے؟ بلا وجہ ترجیح کے لیے کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

صاحب فصول الحواشی بڑی متانت سے فرماتے ہیں:

''وَنَحْنُ تَرَكْنَا الْخَبَرَ الْوَاحِدِ بِمُقَابَلَةِ الْخَاصِّ مِنَ الْكِتَابِ'' (ص: ٢٦)

''ہم نے قرآنِ حکیم کے خاص حکم کے بالمقابل خبرِ واحد (حدیثِ اشتراطِ ولی) کو چھوڑ دیا۔''

مگر نابالغہ کے متعلق پھر اسی خبرِ واحد سے استفادہ فرما لیا گیا اور مرد کے قبول کو بھی مان لیا گیا، حالانکہ آیت ﴿ تَنْكِحَ ﴾ میں مرد کی قبولیت کا بھی ذکر نہیں۔ اسی طرح گواہوں کی ضرورت بھی مان لی گئی حالانکہ آیت میں شہود کا بھی کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس آیت کا مقصد گویا فقط ولی کی ضرورت کو توڑنا تھا اور بس!

[1] صحيح. سنن الدارقطني (٣/ ٢٢٤) صحيح ابن حبان (٤٠٧٥)

شاہ صاحب اس صورت حال پر کیسے مطمئن ہو سکتے تھے؟ جہاں اصول کا یہ حال ہو وہاں فروع تو بہر حال اسی پر متفرع ہوں گی۔

چھٹی مثال:

٦ حرمتِ رضاع کے متعلق قرآنِ عزیز نے مطلقاً فرمایا:

﴿ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] ''تمھاری رضاعی مائیں بھی تم پر حرام ہیں۔''

احناف اور موالک فرماتے ہیں کہ ایک قطرہ بھی اگر کسی کا دودھ پی لیا گیا ہو تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ قرآنِ عزیز نے رضاع میں کوئی مقدار معین نہیں فرمائی، اس لیے حرمت کے لیے ایک گھونٹ پینا اور دو سال پینا برابر ہے۔ ائمۂ حدیث اور شوافع کا خیال ہے کہ حدیث میں خمس رضعات [پانچ بار دودھ پینا] موجود ہے۔[1] اگر اس سے کم دودھ پیا جائے تو حرمت ثابت نہیں ہو گی۔ امام احمد کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ احناف فرماتے ہیں کہ یہ حدیث خبرِ واحد ہے۔ اس سے قرآن کی تخصیص نہیں ہوسکتی، اس لیے حدیث سے صرفِ نظر کیا جائے گا اور قلیل و کثیر رضاع سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔ حالانکہ صورت اس طرح نہیں۔ اولاً یہاں تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قرآنِ عزیز کے اِطلاق کے ساتھ قید لگائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جو چیز مطلقاً مذکور ہے، حدیث نے خمس رضعات سے اسے مقید فرما دیا۔

رہا خبرِ واحد کا مظنون ہونا تو یہ بھی کامیاب عذر نہیں۔ خود فقہائے حنفیہ نے قرآنِ عزیز کی تخصیص کئی مقام پر فرمائی ہے۔ فرضیتِ جمعہ کے لیے علی العموم سورۂ جمعہ کی آیت سے استدلال فرمایا گیا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ﴾[2] [الجمعة: ٩]

غلام، مسافر، عورت وغیرہ کا استثنا خبرِ واحد ہی سے عمل میں آیا ہے۔ مگر دیہات کو جمعہ سے مستثنیٰ کرنے کے لیے مرفوع روایت بھی میسر نہیں آسکی۔ وہاں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر ہی سے قرآنِ عزیز کی تخصیص کا کام لے لیا گیا۔[3] ع

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٥٢)

[2] ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''

[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ قول مروی ہے کہ جمعہ صرف بڑے شہر ہی میں ہوسکتا ہے۔ دیکھیں: سنن البيهقي (٥٦١٥)

دراز دستی ایں کوتاہ آستیناں ببیں [1]

شاہ صاحب سمجھتے تھے کہ ایسے ہی اصول جن کی ساخت کے ساتھ ان کی شکست کی بنیاد بھی رکھ دی گئی ہو، دین کی بنیاد اور اجتہاد اور تفقہ کی اساس نہیں قرار پا سکتے۔ حضرات ائمۂ اصول اور فقہائے حنفیہ آیت کے اس احترام کو بھی قائم نہ رکھ سکے۔ معلوم ہے کہ آیت میں رضاع کی وجہ سے صرف ماں کی حرمت کا ذکر ہے۔ نصِ قرآن میں کسی دوسرے رشتے کا ذکر نہیں لیکن حدیث شریف میں حضرت علی سے مروی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ» [2] (ترمذي: ٢/ ١٩٧)

یعنی جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں رضاع کی وجہ سے بھی حرام ہوں گے۔

اس مقام پر آیت کی وضاحت میں مزید وسعت حدیث سے ہوئی۔ یہ زیادت خبرِ واحد ہی کی بنا پر کی گئی ہے۔ اسی طرح آیت میں مدتِ رضاع کا کوئی ذکر نہیں۔ کس عمر میں دودھ پیا جائے تو وہ حرمت میں مؤثر ہوگا؟ آیت اس میں خاموش ہے لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک وہی رضاعت مؤثر ہوگی جو بچے کی غذا بنے۔ حدیث شریف میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«لَا يُحَرِّمُ مِنَ الرَّضَاعِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأَمْعَاءَ، وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ» هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. [3] (ترمذي مع التحفة: ٢/ ٢٠١)

دو سال کے بعد رضاعت کا کوئی اثر نہیں۔ مدتِ رضاع کا تذکرہ قرآن میں نہیں۔ یہ صراحت سنت میں ہے۔ جو قاعدہ تعیینِ رضعات کے متعلق بنایا گیا تھا مدتِ رضاع اور باقی رضاعی رشتوں کی حرمت کے سلسلے میں اسے توڑ دیا گیا۔ ماحول کتنا ہی مخدوش کیوں نہ ہو شاہ صاحب ایسے اصول پر کیسے مطمئن ہو سکتے تھے؟

اہلِ حدیث بھی ان علوم کو پڑھتے ہیں لیکن وہ سنت کے بالمقابل کسی اصل کو قابلِ قبول نہیں

---

[1] ان کوتاہ آستینوں کی دراز دستی دیکھ!

[2] **صحيح.** سنن الترمذي (١١٤٦) وقال الترمذي: "حديث علي رضي الله عنه حسن صحيح" نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٣) صحيح مسلم (١٤٤٤)

[3] ترجمہ: "اسی رضاعت سے حرمت ثابت ہے جو رگوں میں جائے اور دودھ چھڑانے سے پہلے پہلے ہو۔"
صحيح. سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٢) صحيح ابن حبان (٤٢٢٤)

سمجھتے۔ جہاں قرآن اور سنت کسی امر کی صراحت کر دے وہاں کوئی اصل قبول نہیں کیا جا سکتا۔

اگر اصولِ فقہ کو طالب علمی کی صلاحیت سے پڑھا جائے تو واقعی اس کی گرفت سخت ہوتی ہے۔ اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ اصول اس قدر وزنی نہیں رہتے۔ شاہ صاحب ایسے اصول کیسے قبول فرما سکتے ہیں، اسی لیے اُنھوں نے بڑی جرأت سے فرمایا کہ مجھے فقہائے محدثین کی راہ پسند ہے اور یہی نصیحت انھوں نے اپنے تلامذہ اور اپنے متعلقین کو تلقین فرمائی۔[1]

محدثین کی روش:

البتہ محدثین اور فقہائے عراق میں اتنا فرق تھا کہ وہ نصوص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے، گو استنباط اور اجتہاد کے اصول اس کے ظاہر الفاظ کے خلاف فیصلے کا تقاضا کریں۔ فقہائے عراق رحمہم اللہ کا خیال ہے اصول نظر انداز نہیں ہوں گے، چنانچہ اگر شراب کا سرکہ بنا لیا جائے تو یہ حلال ہی ہو گا اور ایسا کرنا درست بھی ہے، کیوں کہ جب کسی چیز کی صورت ہی بدل جائے تو اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے، لیکن محدثین کا خیال ہے کہ سرکہ بنانا درست نہیں۔ اور اگر کوئی سرکہ بنا بھی لے تو حرمت بدستور قائم رہے گی، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ حدیث میں شراب سے سرکہ بنانے کی صراحتاً ممانعت آئی ہے۔[2]

مالِ مسروق کی صورت اگر بدل جائے، مثلاً غلّہ اگر پیس دیا جائے یا جانور ذبح کر کے اس کا گوشت بنا دیا جائے تو فقہائے کرام کے نزدیک چور کے تمام تصرفات مالکانہ ہوں گے۔ فقہائے حدیث ان ظاہری تبدیلیوں کے باوجود سارق کے مالکانہ حقوق کو تسلیم فرماتے ہیں نہ اسے مزید تصرفات کی اجازت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس مال میں گو بظاہر تبدیلی آ گئی ہے لیکن چور بدستور چور ہے۔ جب تک وصف موضوع معلوم اور ثابت ہے، تصرفات کی بنا پر چور کو مالک نہیں کہہ سکتے۔

نص ﴿ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ﴾[3] [المائدة: ٣٨] کا مقصد یہ ہے کہ جب تک سارق سارق ہے، مال مسروق ہے۔ اس کی خرید و فروخت جس طرح اس کی اصل صورت میں ممنوع ہے اسی طرح تبدیل شدہ صورت میں بھی اس میں تصرف شرعاً درست نہیں، بشرطیکہ سرقہ کا علم ہو۔

---

[1] دیکھیں: تفہیمات إلٰهية (٢/ ٢٤٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٣)

[3] ترجمہ: ''اور جو چوری کرنے والا اور جو چوری کرنے والی ہے سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔''

میرا یہ مطلب نہیں کہ فقہائے عراق کے پاس اپنے مسلک کی حمایت کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ انھوں نے ان مسائل کو درست ثابت کرنے کے لیے بڑے دلائل اور نظر وفکر کی گہرائیوں سے کام لیا ہے، لیکن محدثین کا اندزِ فکر چونکہ بالکل مختلف ہے، اس لیے وہ ان نکتہ نوازیوں پر مطمئن نہیں ہو سکے۔ وہ بدستور ان مسائل کو ظاہر سنت کے خلاف سمجھتے رہے۔ ان نکتہ آفرینیوں کو رائے سے تعبیر کرتے رہے اور اہل الرائے کے دلائل حدیث وسنت کے مقابلے میں ان کی تسلی نہ کر سکے۔ فقہاء نے اپنے اصول کی حمایت کے لیے احادیث کو نظر انداز کر دیا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ضعاف اور موقوفات کو قبول کر لیا۔

فقہ الحدیث کے اصول:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ائمۂ حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ذکر فرمائے ہیں:

١. جب قرآن میں کوئی حکم صراحتاً موجود ہو تو اہلِ حدیث کے نزدیک کسی دوسری چیز کی طرف توجہ کی ضرورت نہیں۔
٢. اگر قرآن میں تاویل کی گنجایش ہو، مختلف مطالب کا احتمال ہو تو سنت کا فیصلہ ناطق ہو گا۔ قرآن کا وہی مفہوم درست ہو گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔
٣. اگر قرآن کسی حکم کے متعلق بالکل ہی خاموش ہو تو عمل سنت پر ہو گا۔ وہ سنت فقہاء میں متعارف اور معلوم ہو یا کسی شہر کے ساتھ مخصوص یا کوئی خاص خاندان اسے روایت کرے، کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو، ائمۂ حدیث اسے قابلِ استناد سمجھیں گے۔
٤. جب کسی مسئلے میں حدیث مل جائے تو کسی مجتہد اور امام کی پروا نہ کی جائے گی اور نہ کوئی اثر قابلِ قبول ہو گا۔
٥. جب پوری کوشش کے باوجود حدیث نہ ملے تو صحابہ اور تابعین کے ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور اس میں کسی قوم اور شہر کی قید یا تخصیص نہیں ہو گی۔
٦. اگر جمہور فقہاء اور خلفاء متفق ہو جائیں تو اسے کافی سمجھا جائے گا۔
٧. اگر فقہاء میں اختلاف ہو تو زیادہ متقی اور ضابط کی حدیث قبول کی جائے گی یا پھر جو روایت زیادہ مشہور ہو اسے لیا جائے گا۔

⑧ اگر علم و فضل، ورع و تقویٰ اور حفظ و ضبط میں سب برابر ہیں تو اس مسئلے میں متعدد اقوال تصور ہوں گے۔ جس پر جی چاہے عمل کرے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ نہ اس میں کوئی ضیق پیدا کیا جائے۔

⑨ اگر اس میں بھی تسکین بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن وسنت کے عموماتِ اقتضا اور ارشادات پر غور کیا جائے گا اور مسئلہ زیرِ بحث کے نظائر کے حکم کو دیکھا جائے گا اور حکم استخراج کیا جائے گا۔ اصولِ فقہ کے مروجہ قواعد پر اعتماد نہ کیا جائے گا بلکہ طمانیتِ قلب اور ضمیر کے سکون پر اعتماد کیا جائے گا۔ جس طرح متواتر روایات میں اصل چیز راویوں کی کثرت نہیں بلکہ اصل شے دل کا اطمینان اور سکون ہے۔

یہ نو اصول پہلے بزرگوں (صحابہ و تابعین) کے طریق کار سے ماخوذ ہیں۔

(حجة الله البالغة: ٢/ ١١٩)

اس وقت تحریک اہلِ حدیث:

ابتدائی چار سو سال تک تقلیدِ شخصی اور جمود کم تھا بلکہ پہلی صدی میں آج کی مروجہ تقلید کا رواج ہی نہیں تھا۔ اواخر صدی میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ پیدا ہوئے تھے، پھر بتدریج ائمہ کے مسالک کا رواج ہوتا گیا۔ اس وقت کے اہلِ حدیث علماء کے سامنے اہم مسئلہ یہ تھا:

① لوگ قرآنِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کی پابندی کریں۔

② ان کے سمجھنے میں اگر مشکل پیش آئے تو صحابہ اور تابعین کی روش پر اسے سمجھا جائے۔

③ فہم میں جمود اور تقلید پیدا ہو نہ آزادی اور آوارگی راہ پائے، بلکہ صحابہ کرام کے زمانے اور ان کے فتووں میں وقت کے مصالح کی بنا پر وسعت قائم رہے۔ علماء کے فتووں کو قرآن اور سنت کا قائم مقام نہ سمجھا جائے۔

حسن بن بشر رحمہ اللہ معافیٰ سے نقل فرماتے ہیں اور معافیٰ امام اوزاعی سے:

"قَالَ: كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ: أَنَّهُ لَا رَأْيَ لِأَحَدٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ، وَإِنَّمَا رَأْيُ الْأَئِمَّةِ فِيمَا لَمْ يَنْزِلْ فِيهِ كِتَابٌ، وَلَمْ تَمْضِ بِهِ سُنَّةٌ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَلَا رَأْيَ لِأَحَدٍ فِي سُنَّةٍ سَنَّهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ"[1] (سنن دارمي، ص: ٦)

"کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے ہوتے ہوئے کسی شخص کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل

[1] **صحيح**. سنن الدارمي، رقم الحديث (٤٣٢) الإبانة لابن بطة (١٠٠) الشريعة للآجري (٥٩) جامع بيان العلم (١٣٠٧)

نہیں۔ ائمہ کی آراء اسی وقت قابلِ توجہ ہیں جب کتاب اللہ ہو نہ سنتِ رسول اللہ ﷺ۔‘‘

ایک دوسرا اثر ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خطبہ دیا:

’’اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجا اور قرآن کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ آنحضرت ﷺ کی زبان سے جو حلال ہے وہی حلال ہے اور جو آپ ﷺ نے حرام ٹھہرا دیا وہی حرام ہے۔ یہ حکم تا قیامت ہے۔ میں خود قاضی نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کے فیصلوں کو نافذ اور جاری کرتا ہوں۔ میں پہلوں کا متبع ہوں۔ میں خود کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن مجھ پر تم سے ذمے داری اور بوجھ زیادہ ہے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت ضروری نہیں۔ کیا میں نے سنا دیا؟‘‘[1]

ان آثار سے اس وقت کی ذہنی حالت کا پتا چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت علماء کے ذہن پر کیا خطرات محیط ہیں۔ اتباعِ سلف پر اعتماد کے ساتھ جامد پابندی اور آوارگی دونوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ بدعت سے بھی پرہیز پیشِ نظر ہے اور اپنی حاکمانہ حیثیت سے بھی کوئی حکم منوانا پسند نہیں فرماتے۔ پوری توجہ اس طرف ہے کہ بدعت اور آوارگی نہ آنے پائے اور صداقت کی اشاعت جبر سے نہ ہو بلکہ ضمیر کی آواز اور محض اللہ کے لیے ہو۔ سنن دارمی کے ابتدائی ابواب پر غور فرمائیے:

۱۔ بَابُ اجْتِنَابِ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ وَالْبِدَعِ وَالْخُصُومَةِ.

۲۔ بَابُ اجْتِنَابِ الْأَهْوَاءِ.

۳۔ بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ وَالْعُلَمَاءِ.

٤۔ بَابُ التَّوْبِيخِ لِمَنْ يَّطْلُبُ الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ.

ان تمام ابواب اور سلف اہلِ علم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کے بعد ائمۂ سلف کے طریق کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں۔ شخصی آراء و افکار اور تقلیدِ جامد سے اذہان کو ہر قیمت پر آزاد رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اہلِ بدعت کی سی ذہن میں آوارگی کسی قیمت پر بھی پسند نہیں کرتے۔

اس وقت کے علمائے اہلِ حدیث کے سامنے چند کام تھے: احادیثِ نبویہ کا حفظ اور ضبط، احادیث میں تفقہ اور استنباط، بدعاتِ اعتقادیہ اور عملیہ سے کلیتاً پرہیز۔

[1] **صحيح**. سنن الدارمي (١/ ١٢٦) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٥/ ٢٥٠) المعرفة والتاريخ للفسوي (١/ ٥٧٤) المدخل إلى السنن الكبرىٰ للبيهقي (١٩) تاريخ واسط (ص: ١٨٨)

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ سے ائمہ حدیث کے مذہب کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

”علمائے محدثین بیک مذہب از مذاہبِ مجتہدین پابندمی باشند، بس بعضے اعمال ایشاں مطابق کتب فقہ می باشند و بعضے دیگر مطابق کتب فقہ می باشند و بعضے دیگر مطابق کتب دیگر۔“
(فتاویٰ عزیزی: ۲/ ۱۱۷)

”ائمہ حدیث مروجہ مذاہب کے پابند نہیں ہوتے۔ فقہائے عراق و باقی علمی مآخذ سے برابر استفادہ فرماتے ہیں۔“

شاہ صاحب کے ارشاد سے واضح ہے کہ یہ ایک مستقل مکتبِ فکر ہے جس میں پابندی اور جمود نہیں۔

فتنہ اعتزال:

جب عجمی اسلام سے متاثر ہوئے تو اسلام کی سادگی نے جہاں انھیں کافی حدتک اپنی تربیت میں لے لیا وہاں ان لوگوں نے بھی اسلام کو متاثر کیا۔ یونانی علوم اور فلسفی نظریات اسلام کے بعض بنیادی عقائد سے ٹکرائے۔ صفاتِ باری کی حقیقت کیا ہے؟ باری تعالیٰ کے انصاف کی نوعیت کیا ہے؟ صفات عینِ ذات ہیں یا غیرِ ذات؟ حادث اور قدیم کے درمیان ربط کی کیا صورت ہے؟ بیسیوں مسائل و مباحث سطحِ ذہن پر اُبھر آئے۔

یہیں سے اعتقادی بدعات کا آغاز ہوا۔ علمائے سنت کو یونانی اسلحہ سے مسلح ہو کر ان مباحث کو حل کرنا پڑا۔ بدعات کے شیوع نے ایک دفعہ اہلِ علم کو حیرت میں ڈال دیا۔ امام احمد، علامہ عبدالعزیز کنانی وغیرہ نے اس وقت بڑی جرأت اور ثابت قدمی سے کام کیا۔ مامون رشید، واثق باللہ، معتصم باللہ اور عمائدِ حکومت ان خیالات سے متاثر تھے۔ اس وقت ائمہ حدیث بے انتہا مشکلات میں مبتلا ہوئے۔

یہ اندازِ فکر تقریباً آٹھویں صدی تک چلتا رہا۔ یونانی فلسفے کا ائمہ حدیث نے خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔ اس دور کی فرقہ پرستی جاننے کے لیے ابن حزم (م ۴۵۶ھ) کی ”الفصل“، شہرستانی (م ۵۴۸ھ) کی ”الملل والنحل“، علامہ ابو طاہر عبدالقادر بغدادی (م ۴۲۹ھ) کی ”الفرق بين الفرق“ اور ”المواعظ والاعتبار للمقريزي“ (صفحہ ۱۴۱ تا ۱۸۶) ملاحظہ فرمایئے۔

اسلام میں بدعی فرقوں کی کس قدر گرم بازاری رہی۔ آٹھویں صدی میں معلوم ہوتا ہے علمائے سنت نے یونانی فلسفے کو فاش شکست دی۔ یونانی نظریات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ علمائے حدیث نے انہی کی

زبان میں ان سے گفتگو کر کے انھیں یقین دلایا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق ان کی معلومات سطحی ہیں اور اسلامی عقائد پر ان کے اعتراضات کی حیثیت تلبیسِ نفس سے زیادہ نہیں۔

حضرات متکلمین:

عقائد کی اس دیرپا اور صبر آزما جنگ میں کچھ لوگ مخالفت کے باوجود فلاسفہ سے متاثر ہوئے۔ بعض نصوص میں انھوں نے تاویل کی۔ اسلامی نصوص کے لیے ایسے محامل تلاش کیے جو مسلکِ تفویض سے مختلف اور جدا تھے لیکن ائمہ سلف اور ائمہ اربعہ کا تقریباً اجتماعی عقیدہ تفویض تھا۔ احناف نے عموماً عقائد میں ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی کی راہ اختیار کی۔ شوافع کا زیادہ رجحان اشعریت کی طرف ہوگیا۔ ائمہ حدیث اور حنابلہ اپنی پرانی راہ پر قائم رہے۔ تاویل سے بچ کر انھوں نے امام احمد اور باقی ائمہ حدیث کی روش کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا بلکہ اس سادگی کو قائم رکھا جس کا دوسرا نام تفویض تھا۔[1] ان عقائد میں ائمہ اربعہ متفق ہیں۔ فروع کی طرح عقائد میں یہ حضرات چنداں مختلف نہیں ہیں۔

---

[1] صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں تفویض کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے:

1- تفويض المعنى والكيفية: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے اِثبات میں قرآن و حدیث میں جو الفاظ مذکور ہیں (جیسے استواء، وجہ، ید، سمع، بصر وغیرہ) ہم نہ ان کے معنی جانتے ہیں نہ اِن کی کیفیت کا علم رکھتے ہیں۔

2- تفويض الكيفية دون المعنى: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال کیے گئے الفاظ کے معنی و مفہوم تو واضح اور معلوم ہیں، لیکن ہم ان کی کیفیت سے ناواقف ہیں۔ جیسے امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ "اَلِاسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ، وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ" یعنی استواء کے معنی تو معلوم ہیں، لیکن اس کی کیفیت و ماہیت مجہول ہے۔

اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کا عقیدہ ائمہ سلف اور اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں، بلکہ یہ بعض اشاعرہ اور اہلِ بدعت کا عقیدہ ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صفات کے ضمن میں جو الفاظ ذکر کیے ہیں کوئی بھی ان کے معنی سے آگاہ نہیں، نہ رسول اللہ ﷺ، نہ صحابہ کرام اور نہ سلفِ امت۔ گویا یہ الفاظ عبث اور بے فائدہ ہی ذکر کیے گئے ہیں جن کا کوئی معنی و مطلب مقصود نہ تھا۔ اس بیان و توضیح ہی سے اس نظریے کا بدیہی البطلان ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔

مزید برآں ائمہ سلف سے صفاتِ باری تعالیٰ کے معانی کے متعلق صریح نصوص وارد ہوئی ہیں جیسے استواء کے معنی ارتفاع اور علو ثابت ہیں، لیکن ان کی کیفیت کا علم نہیں۔ اہلِ سنت اگرچہ صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں، لیکن وہ تشبیہ کا کلیتاً انکار کرتے ہیں، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الشورىٰ: ۱۱] اس آیتِ کریمہ میں جہاں تشبیہ و تمثیل کی نفی کی گئی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ سمع و بصر کا اثبات کیا گیا ہے جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ صفات کے اثبات سے تشبیہ اور تمثیل لازم نہیں آتے۔

الغرض اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کو ائمہ سلف کا عقیدہ قرار دینا درست نہیں، البتہ ثانی الذکر معنی کے اعتبار سے عقیدۂ سلف پر تفویض کا اطلاق درست ہے۔

تقلید کی تین راہیں:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ چوتھی صدی کے قریب فقہی فروع میں تلفیق اور اتباعِ ہویٰ سے بچنے کے لیے اس دور کے عقلاء نے ائمۂ اربعہ کی تقلید اختیار کر لی۔ اجتہاد کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ صحابہ و تابعین کے زمانے میں جس قدر وسعت تھی، تقلیدِ شخصی اور ذہنی جمود سے اسے روک دیا گیا۔ لوگوں کو خواہ مخواہ مجبور کیا گیا کہ وہ چار ائمہ میں سے کسی نہ کسی کی تقلید ضرور کریں، گو یہ شرعاً واجب نہیں مگر ضرورتاً اسے کالواجب سمجھنا چاہیے۔

تھوڑی دور آگے بڑھ کر عقائد کے اختلاف میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی جگہ اشعری اور ماتریدی کو دے دی گئی۔ یہ حضرات عقائد میں الگ ائمہ قرار پائے۔ گویا فقہی فروع میں الگ امام، عقائد میں اور امام۔ پھر ذرا اس سے آگے بڑھ کر جب تصوف میں طبقاتی دور آیا، اسلامی زہد و ورع یا احسان میں جب بدعات شامل ہونے لگیں اور خانقاہی نظام نے پیشہ اور دکانداری کی صورت اختیار کر لی تو اس وقت کے دانشوروں نے چند امام یا فرقے انتخاب کر لیے، یعنی حنفی اور شافعی، مالکی اور حنبلی تصوف میں نقشبندی، قادری، سہروردی اور چشتی وغیرہ ہو گئے۔ گویا تین مختلف محاذوں پر ائمہ کے متبعین نے اپنے امام بدل لیے۔

یوں سمجھیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے باقی رفقاء کی امامت فروع تک محدود ہو گئی۔ وہ تصوف اور عقائد میں امام و مقتدیٰ نہیں بن سکتے۔ ہمارے ملک میں احناف کی بریلوی قسم عموماً قادری ہیں حالانکہ شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ فروع میں حنبلی تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تصوف میں دس فرقوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اہلِ حدیث کی روش:

ان تمام مقامات میں بحمداللہ اہلِ حدیث کی روش ایک جیسی رہی۔ وہ فروع، عقائد اور تصوف میں صحابہ کی اتباع کرتے رہے اور خانقاہی نظام کی بدعات سے اسی طرح نفرت کی جس طرح فروع میں جامد تقلید اور عقائد میں بے دینی کی بدعات سے انھیں نفرت تھی۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

ان تمام مراحل میں وہ ائمۂ سلف کی اتباع کرتے اور وقت کی ہر ہر بدعت سے برسرِ پیکار رہے۔ ؎

أَهْلُ الْحَدِيْثِ هُمْ أَهْلُ النَّبِيِّ   وَإِنْ لَّمْ يَصْحَبُوْا نَفْسَهُ أَنْفَاسَهُ صَحِبُوْا [1]

[1] اہلِ حدیث ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق دار ہیں، اگرچہ انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کی صحبت حاصل نہیں ہوئی، لیکن آپ کی سانسوں (فرامین) کی صحبت تو انہی کو حاصل ہوئی ہے!

یہی حال تقریباً حنابلہ کا رہا۔ وہ اشعریت اور ماتریدیت سے بہت کم متاثر ہوئے۔ اہلِ حدیث نے کتاب وسنت کے فہم میں کسی فرد کی امامت کے بجائے ائمہ سلف اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنا امام تصور کیا اور فروع وعقائد اور احسان وتصوف میں ان بزرگوں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور نہ شخصی آراء وافکار کو ائمہ سلف اور صحابہ کا بدل سمجھا۔ دراصل فتنوں کے دورِ عروج میں آزادی اور پابندی، جمود اور آوارگی کے بین بین یہی صحیح حل تھا جسے ائمہ حدیث نے تلاش فرمایا اور عملاً صدیوں اس پر کاربند رہ کر آوارگیِ ذہن اور جمود کا مقابلہ کیا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) کی مجاہدانہ کوششیں صفحاتِ تاریخ کی رونق ہیں۔ انھوں نے جہاں اعتزال اور تجہم کو دفن کیا اور ان کے تابوت میں آخری میخ ٹھونکی وہاں رفاعی فرقہ کے فقیروں کے آگ میں کودنے کا چیلنج قبول فرما کر بدعی تصوف کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

یہ جرأت مندانہ جہاد اس وقت عمل میں آیا جبکہ اربابِ تقلید وجمود کی اکثریت بدعات میں مبتلا ہو چکی تھی، بلکہ ان حضرات نے اصلاح کے پروگرام کی قدم قدم پر مخالفت کی۔ شیخ الاسلام کا یہ ارشاد کس قدر جاندار ہے: ”أَهْلُ الْحَدِيْثِ فِيْ الْفِرَقِ كَالْإِسْلَامِ فِيْ الْمِلَلِ“[1] (رد المنطق)

منہاج السنہ، کتاب العقل والنقل اور رسالہ رد المنطق اس موضوع پر انتہائی مفید معلومات سے بھرپور ہیں۔ شیخ الاسلام کی کتاب ”اَلرَّدُّ عَلَى الْمَنْطِقِيِّيْنَ“ میں اس قدر شگفتگی نہیں جس قدر ”رد المنطق“ میں ہے۔ اس مختصر رسالے میں شیخ الاسلام نے مسلک اہلِ حدیث کی حمایت اور ترجیح میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے۔ شاید یہ بسط شیخ کی کسی دوسری کتاب میں نہ ملے۔ اس کتاب سے شیخ الاسلام کی روشن خیالی اور وسعتِ ظرف کا اندازہ ہوتا ہے۔

یونانی فلسفے کی پسپائی:

شیخ الاسلام اور ان کے رفقائے عالی مقام نے یونانی فلسفے کی صرف مخالفت ہی نہیں فرمائی بلکہ اس پر اس قدر بھرپور وار کیے کہ علماء کے علاوہ عوام میں بھی یونانی علوم اور یونانی نظریات کی کوئی علمی

[1] ترجمہ: ”دیگر فرقوں کے مقابلے میں اہلِ حدیث کی وہی اہمیت ہے جو دیگر ادیان کے مقابلے میں اسلام کو حاصل ہے۔“ نقض المنطق لابن تيمية (ص: ٢٨) نیز دیکھیں: مجموع الفتاویٰ (٤/٢٤)

آبرو نہ رہی، بلکہ ان کی ﴿ جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ﴾ [ص: ١١] کی سی کیفیت ہوگئی اور صدیوں کی اعتقادی پابندیاں اور اس دور کی تقلید پرور نزاعیں تقریباً ختم ہوگئیں۔ اعتزال اور تجہم کے پیدا کیے ہوئے فرقے ایک ایک کر کے تاریخ کے اوراق میں دفن ہوگئے۔ مذاہب وملل اور رد و مناظرات کی کتابوں کے سوا یہ فرقے عملاً ختم ہوگئے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تجدیدی کارناموں میں یہ اہم کارنامہ اور ائمۂ حدیث کی مصالحانہ خدمات میں یہ سب سے عظیم الشان خدمت ہے۔ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْهُمْ كَمَا تَتَقَبَّلُ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ.

شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء یونانی جارحیت کے خلاف تو کامیاب ہوگئے لیکن تقلیدی جمود کے خلاف اس قدر کامیاب نہ ہوسکے جس قدر ظروف اور حالات کا تقاضا تھا، بلکہ فقہی جمود تیز تر ہوگیا۔ ائمۂ اربعہ کی حقانیت مسلّمہ ہو جانے کے باوجود یہ چاروں حق پرور گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئے۔ ہر ایک نے یہی سمجھا کہ حق حقیقتاً ہمارے ہاں فروکش اور تشریف فرما ہے۔ باقی ائمہ کی صداقت صرف ایک ظن ہے۔

حضرت علامہ علاء الدین حصکفی رد المحتار میں الاشباہ و النظائر کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"وَفِيهَا إِذَا سُئِلْنَا عَنْ مَذْهَبِنَا وَمَذْهَبِ مُخَالِفِنَا، قُلْنَا وُجُوبًا: مَذْهَبُنَا صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ، وَمَذْهَبُ مُخَالِفِنَا خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ، وَإِذَا سُئِلْنَا عَنْ مُعْتَقَدِنَا، وَمُعْتَقَدِ خُصُومِنَا قُلْنَا وُجُوبًا: اَلْحَقُّ مَا نَحْنُ عَلَيْهِ، وَالْبَاطِلُ مَا عَلَيْهِ خُصُومُنَا"[1]

''جب ہمیں اپنے اور اپنے مخالف کی بابت پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ ہم یقیناً حق پر ہیں، البتہ احتمال ہے کہ ہمارا خیال غلط ہو جائے۔ ہمارا مخالف یقیناً خطا پر ہے، ممکن ہے اس کا خیال درست ہو، لیکن عقائد کے معاملے میں ہم یقیناً حق پر ہیں اور ہمارے مخالف غلطی اور باطل پر ہیں۔''

حالانکہ عقائد میں پورا استدلال تاویل کا ایک نظر فریب جال ہے۔ ائمۂ اربعہ کو حق پر ماننے کے بعد فکر کا یہ انداز یقیناً مستحسن نہیں ہے۔ جب ائمۂ اجتہاد کے متعلق معلوم ہے کہ وہ پیغمبر نہیں، بلکہ ان

[1] الأشباه والنظائر لابن نجيم الحنفي (ص: ٣٨١) رد المحتار (١/ ١١٥)

کی کوششیں مخلصانہ ہیں تو اس تنگ نظری سے کیا حاصل! لیکن تقلید و جمود کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ شخصی محبت میں افراط کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخالف کے متعلق تفریط کرے اور اس کے محاسن کو بھی عیب کی نظر سے دیکھے۔ تقلید و جمود میں یہ بڑی ہی عیب ناک چیز ہے۔ اس میں عصبیت اور سوئے ادب سے بچنا سخت مشکل ہے۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات خود از بس بے ادب ہیں لیکن الزام دوسروں کو دیتے ہیں!!

امام شافعی رحمہ اللہ کے متعلق عجیب روش:

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی ذہانت اور علمی رفعت کی بنا پر کوشش فرمائی گئی کہ انھیں اپنا شاگرد ظاہر کیا جائے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ علم امانت ہے۔ جہاں سے ملے لے لینا چاہیے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے یقیناً اپنے وقت کے اکابر سے علم حاصل کیا۔ فقہ اور حدیث دونوں اپنے وقت کے کامل اساتذہ سے سیکھے۔ چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفی ذکر فرماتے ہیں کہ امام شافعی امام محمد کے تلامذہ سے تھے:

"وَمِنْ تَلَامِذَتِهِ الشَّافِعِيُّ -رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ- وَتَزَوَّجَ بِأُمِّ الشَّافِعِيِّ وَفَوَّضَ إِلَيْهِ كُتُبَه وَمَالَه فَبِسَبَبِه صَارَ الشَّافِعِيُّ فَقِيهًا"[1]

''امام شافعی امام محمد کے شاگرد تھے۔ امام محمد نے امام شافعی کی والدہ سے نکاح کیا اور اپنی کتابیں اور اپنا مال امام شافعی کو دے دیا، اسی لیے امام شافعی فقیہ بن گئے۔''

لیکن امام محمد کی فقہ سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہے!

پھر امام شافعی رحمہ اللہ کا اقرار ذکر فرماتے ہیں:

"وَاللّٰهِ مَا صِرْتُ فَقِيهًا إِلَّا بِكُتُبِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ" (کتاب مذکور: ۱/ ۵۳)

''میں صرف امام محمد کی کتابوں سے فقیہ بنا۔''

ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے:

"وَكَتَبَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ الْفَقِيْهِ وَقْرَ بُخْتِيٍّ" (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۳۲۹)

''امام محمد فقیہ سے امام شافعی نے اونٹ کا بوجھ نقل فرمایا۔''

امام شافعی رحمہ اللہ کا امام محمد سے استفادہ فرمانا کوئی عیب کی بات نہیں۔ امام محمد تو اکابر ائمۂ سنت سے ہیں۔ ائمۂ حدیث علم کے معاملے میں اس قدر وسیع الظرف تھے کہ تنقید اور تنقیح کے بعد وہ اہلِ بدعت

[1] الدر المختار (۱/ ۵۳)

سے بھی تحصیلِ علم میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مستند کتبِ حدیث میں ان لوگوں سے احادیث مروی ہیں جن کو ائمہ حدیث دین کے لحاظ سے پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے امام محمد سے تلمذ ائمہ سنت کی خوبی ہے۔

امام شافعی ایسے شاگرد تھے جن کی مناظرانہ استعداد سے امام محمد کئی دفعہ خاموش ہوجاتے، چنانچہ اخبارِ آحاد کی حجیت، شاہد اور یمین (قسم) کے ساتھ فیصلہ، «لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ» وغیرہ مسائل پر امام شافعی نے مسکت گفتگو فرمائی۔[1] (حجة الله)

اہلِ علم میں تعلیم وتعلم اور بحث ونظر میں کوئی حرج نہیں۔ یہ امام شافعی اور امام محمد دونوں کے لیے باعثِ فضیلت ہے۔ ایسے شاگرد پر جس قدر فخر کیا جائے بجا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی تنقیص:

ایک طرف تو امام شافعی رحمہ اللہ کی شاگردی پر فخر ہے۔ دوسری طرف جب امام شافعی رحمہ اللہ نے بعض فقہائے عراق کے بعض مسائل پر تنقید فرمائی تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ پر اعتراضات شروع ہوگئے اور جاہل تک کہہ دیا گیا۔ اصول بزدوی اور اس کی شرح کشف الاسرار سے لیکر اصول شاشی تک ہر بزرگ کو دیکھیے، امام شافعی کی اجتہادی مساعی کو جہالت سے تعبیر کیا ہے۔ بعض نے امام شافعی رحمہ اللہ کا صراحت سے نام لیا ہے۔ بعض نے مسائل کا ذکر کر کے انھیں جہالت سے یاد فرمایا ہے:

”وَكَذٰلِكَ جَهْلُ مَنْ خَالَفَ فِيْ اجْتِهَادِهِ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ مِنْ عُلَمَاءِ الشَّرِيْعَةِ، وَأَئِمَّةِ الْفِقْهِ، أَوْ عَمِلَ بِالْغَرِيْبِ مِنَ السُّنَّةِ عَلٰى خِلَافِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ فَمَرْدُوْدٌ بَاطِلٌ، لَيْسَ يُعْذَرُ أَصْلًا، مِثْلَ الْفَتْوٰى بِبَيْعِ أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ، وَمِثْلَ الْقَوْلِ فِيْ الْقِصَاصِ فِيْ الْقَسَامَةِ، وَمِثْلَ اسْتِبَاحَةِ مَتْرُوْكِ التَّسْمِيَةِ عَمَداً، وَالْقَضَاءِ بِالشَّاهِدِ الْوَاحِدِ وَيَمِيْنِ الْمُدَّعِيْ“[2]

”اسی طرح ائمہ فقہ اور مجتہدین کی جہالت بھی عنداللہ عذر نہیں ہوسکتی جس میں کتاب اللہ اور سنتِ مشہورہ کی مخالفت کی ہے یا کسی غریب حدیث پر عمل کیا ہے۔ یہ جہالت مردود اور باطل ہوگی۔ جیسے ام ولد کی بیع کا فتویٰ یا قسامہ میں قصاص کا فتویٰ یا جس جانور پر

[1] حجة الله البالغة (ص: ٣٠٩) نیز دیکھیں: آداب الشافعي ومناقبه لابن أبي حاتم (ص: ١١١، ١٥٩)

[2] أصول البزدوي (ص: ٣٤٢)

بوقتِ ذبح عمداً اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کی حلت کا فتویٰ اور مدعی کی قسم اور ایک گواہ کی بنا پر مدعیٰ علیہ کے خلاف ڈگری کی اجازت۔''

① اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ امام داود ظاہری کا خیال ہے کہ امِ ولد کی بیع درست ہے، یعنی اس لونڈی کی جس کے بطن اور اس کے مالک کی پشت سے اولاد ہو۔ جمہور ائمہ سید کی موت کے بعد اس کی بیع کو درست نہیں سمجھتے، لیکن داود ظاہری بعض احادیث کی بنا پر اسے درست سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی ''جہالت'' ہے!

② کسی محلے میں میت پائی جائے لیکن قاتل معلوم نہ ہو۔ امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں اگر اہلِ محلّہ اور مقتول میں سابقہ دشمنی اور باہم خلش کا علم ہو تو قاضی مقتول کے ولی سے پچاس قسمیں لے کر قاتل کی تعیین کے بعد قصاص کی اجازت دے گا۔ احناف کرام اور حضرات ائمۂ اصول کے نزدیک یہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی ''جہالت'' ہے۔(إنا لله وإنا إليه راجعون)

③ امام شافعی کا خیال ہے کہ اگر ذبیحہ پر بوقتِ ذبح جان بوجھ کر بھی خدا کا نام نہ لیا جائے، لیکن ذبح کرنے والا مسلمان ہو تو یہ فعل درست نہیں، لیکن ذبیحہ حلال ہے۔ احناف اسے امام شافعی رحمہ اللہ کی ''جہالت'' تعبیر فرماتے ہیں۔

④ اسی طرح اگر مدعی کے پاس دو گواہ نہ ہو تو مدعی خود قسم کھائے اور ایک گواہ دے دے تو امام شافعی اجازت دیتے ہیں کہ قاضی اس صورت میں مدعی کو ڈگری دے دے۔ ائمۂ حنفیہ کا خیال ہے کہ یہ امام شافعی کی ''جہالت'' ہے۔

مسائل میں اختلاف ہوسکتا ہے اور مجتہدین کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی تحقیق کے مطابق فتویٰ دیں۔ اَتباع کو حق ہے کہ اپنے امام کی رائے کے مطابق عمل کریں مگر تلخ اور ترش زبان تو بے حد نامناسب ہے۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے متعلق بھی ایسی زبان اختیار نہیں کرنی چاہیے چہ جائیکہ ائمۂ اجتہاد کے متعلق یہ لب و لہجہ اختیار کیا جائے! پھر بھی بے ادب غیر مقلد ٹھہریں! کیا یہ تقلیدی جمود اور اس میں غلو کا نتیجہ نہیں؟!

کشف الاسرار میں علامہ شیخ عبدالعزیز (م ۷۳۰ھ) نے متن کی شرح فرماتے ہوئے ائمہ کے

اسماء کا تذکرہ فرمایا ہے جن کے اجتہادات کو علامہ بزدوی نے جہالت سے تعبیر فرمایا ہے، لیکن اس تیز لب و لہجے کے متعلق ایک حرف بھی نہیں فرمایا۔[1]

حسامی نے تھوڑے سے اختصار کے ساتھ اصولِ بزدوی کے الفاظ نقل فرما دیے ہیں اور وہی امثلہ جو بزدوی نے بیان فرمائی ہیں بطور توارث نقل کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں پر رحم فرمائے۔ یہ دورِ جمود کی بڑی تلخ اور ناپسندیدہ یادگار ہے اور بعض بزرگوں کے ساتھ محبت میں غلو کا نتیجہ!

حسامی کے شارح عبدالحق حقانی رحمہ اللہ نے نامی میں دو لفظ فرمائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ زبان اور انداز پسند نہیں۔ فرماتے ہیں:

"وَكُلُّ وَاحِدٍ يُجَهِّلُ الْآخَرَ فِيمَا خَالَفَهُ، وَيَقُولُ: إِنَّهُ مُخَالِفٌ لِلسُّنَّةِ"

''ہر ایک اپنے مخالف کو جاہل اور سنت کے مخالف کہتا ہے۔'' (نامی مجتبائی، ص: ۱۲۰)

''المنار'' میں ماتن نے صرف امہاتِ اولاد کا ذکر کیا ہے لیکن شارح ملا جیون نے امثلہ میں پوری تفصیل ذکر کی ہے۔ امام شافعی اور امام داود ظاہری کا نام صراحتاً لیا ہے اور آخر میں فرماتے ہیں:

"وَقَدْ نَقَلْنَا كُلَّ هٰذَا عَلٰى نَحْوِ مَا قَالَ أَسْلَافُنَا، وَإِنْ كُنَّا لَمْ نَجْتَرِئْ عَلَيْهِ"
(نور الأنوار، ص: ۲۹۸)

''ہم نے یہ سب کچھ اس لیے نقل کیا ہے کہ ہمارے پہلے بزرگوں نے ایسا ہی فرمایا ہے، ورنہ ہم یہ جرأت نہ کرتے۔''

گویا یہ تلخ بیانی یا غلط نوازی حضراتِ سلف کی اتباع میں ہوگی، ورنہ ملّا جیون خود اس کے لیے آمادہ نہ تھے۔ عذرِ گناہ، گناہ سے بھی عجیب رہا۔ یہ سب دورِ جمود و عصبیت کی نوازشیں ہیں، ورنہ نہ شافعی ایسے کمزور ہیں نہ ان کے اَتباع اتنے کم سواد کہ صریح کتاب و سنت کے خلاف فتویٰ دیں۔ یہ معلوم ہے کہ متاخرینِ فقہائے حنفیہ اور ائمۂ اصول سے ائمۂ شوافع کی کتاب و سنت پر نظر زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ علمائے حدیث کی تعداد شوافع میں کافی زیادہ ہے۔

یہ جمود و تقلید کے لوازم سے ہے۔ فرطِ محبت میں اپنے مخالف کے ساتھ تلخی اور بے ادبی قرینِ قیاس ہے۔ اس دور کے علمائے اہلِ حدیث نے اس جمود کے خلاف اپنا پورا زور لگایا۔ اس جمود اور اس کے

[1] كشف الأسرار (٤/ ٤٧٣)

مضرت رساں اثرات اور طوفان خیز نتائج کا اندازہ حافظ ابن قیم کی کتاب "أعلام الموقعين"، "زاد المعاد" اور "الطرق الحكمية" وغیرہ سے ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے تلمیذ اور قریب ترین اہلِ علم میں حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) سابقہ بدعات کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہوئے عباسی دور کی اعتقادی اور ملحدانہ یورش کا تذکرہ فرماتے ہیں:

"وَفِيْ هٰذَا الزَّمَانِ ظَهَرَ بِالْبَصرَةِ عَمْرُو بْنُ عُبَيْدٍ الْعَابِدُ، وَوَاصِلُ بْنُ عَطَاءٍ الْغَزَّالُ، وَدَعَوَا النَّاسَ إِلَى الْإِعْتِزَالِ، وَالْقَوْلِ بِالْقَدْرِ، وَظَهَرَ بِخُرَاسَانَ الْجَهْمُ بْنُ صَفْوَانَ، وَدَعَا إِلىٰ تَعْطِيْلِ الرَّبِّ عَزَّ وَجَلَّ وَخَلْقِ الْقُرْآن، وَظَهَرَ بِخُرَاسَانَ فِيْ قَبَالَتِهِ مُقَاتِلُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْمُفَسِّرُ، وَبَالَغَ فِيْ إِثْبَاتِ الصِّفَاتِ حَتّٰى جَسَّمَ، وَقَامَ عَلىٰ هٰؤُلَاءِ عُلَمَاءُ التَّابِعِيْنَ وَأَئِمَّةُ السَّلَفِ، وَحَذَّرُوْا مِنْ بِدَعِهِمْ، وَشَرَعَ الْكِبَارُ فِيْ تَدْوِيْنِ السُّنَنِ وَتَأْلِيْفِ الْفُرُوْعِ وَتَصْنِيْفِ الْعَرَبِيَّةِ، ثُمَّ كَثُرَ ذٰلِكَ فِيْ أَيَّامِ الرَّشِيْدِ، وَكَثُرَتِ التَّصَانِيْفُ، وَأَلَّفُوْا فِيْ اللُّغَاتِ، وَأَخَذَ حِفْظُ الْعُلَمَاءِ يَنْقُصُ، وَدُوِّنَتِ الْكُتُبُ، وَاتَّكَلُوْا عَلَيْهَا، وَإِنَّمَا كَانَ قَبْلَ ذٰلِكَ عِلْمُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ فِيْ الصُّدُوْرِ فَهِيَ كَانَتْ خَزَائِنَ الْعِلْمِ لَهُمْ- رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ"(تذكرة الحفاظ: ١/ ١٥٠)

"اس وقت بصرہ میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا کا ظہور ہوا۔ وہ لوگوں کو اعتزال اور انکارِ تقدیر کی دعوت دینے لگے۔ خراسان میں جہم بن صفوان نے تعطیلِ صفات اور خلقِ قرآن کی دعوت دی۔ خراسان ہی میں مقاتل بن سلیمان مفسر نے صفات کی دعوت اس طرح دی جس سے تجسیم کا شبہ ہونے لگا۔ علمائے سلف اور ائمہ تابعین نے ان سب کے خلاف دعوت دی اور ان کی بدعتوں سے لوگوں کو ڈرایا۔ اکابر ائمۂ حدیث، سنت کی تدوین اور فروع کی تصنیف میں مشغول ہوگئے۔ عربی زبان کے علوم کی تدوین کثرت سے ہوئی۔ یہ ہارون رشید کے دورِ حکومت کی حالت ہے۔ اسی زمانے میں کتبِ لغت کی تالیف ہوئی اور علماء کا حفظ کم ہونے لگا اور کتابوں پر زیادہ اعتماد ہونے لگا۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کا علم سینوں میں تھا اور ان کے سینے علم کے خزانے تھے۔"

یہ اعتقادی بدعات کا دور تھا۔ ائمۂ حدیث کی اس باب میں جو مساعی تھیں ان کا مختصر تذکرہ

حافظ ذہبی نے فرمایا ہے۔ وہ اپنے وقت کے فقہاء اور ائمۂ حدیث کا سلف کے اہلِ علم سے موازنہ فرماتے ہوئے تقلید و جمود کے اثرات کا تذکرہ دل گداز انداز سے فرماتے ہیں۔ ابو محمد فضل بن محمد (م ۲۰۲ھ) کے تذکرے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس وقت کے قریب قریب ائمۂ حدیث کی بڑی تعداد موجود تھی جن کا تذکرہ میں نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ یہاں میں نے اس کا عُشرِ عشیر بھی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح اس وقت ائمۂ اہل الرائے اور فروع سے بھی کثیر جماعت تھی۔ شیعہ متکلمین اور معتزلہ سے بھی بڑے بڑے اساطین موجود تھے جو معقول کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور اتباعِ سلف اور آثارِ نبویہ سے بے پروا تھے۔ فقہاء میں تقلید نمایاں ہو چکی تھی۔ اجتہادات میں تناقض ظاہر ہو چکا تھا۔ اللہ پاک ہے جس کے قبضے میں خلق اور امر ہے۔

''اے شیخ! خدا کی قسم اپنے آپ پر رحم کرو اور انصاف کی نگاہ سے دیکھو۔ ان کی طرف غلط نگاہ مت ڈالو۔ ان کے نقائص کی تلاش مت کرو۔ یہ مت خیال کرو کہ وہ آج کل کے محدثین کی طرح ہیں، حاشا وکلا۔ میں نے جن ائمۂ حدیث کا ذکر کیا ہے وہ دین میں پوری بصیرت رکھتے تھے اور نجات کی راہ کو خوب سمجھتے تھے۔ ہمارے زمانے کے بڑے بڑے محدث بھی علم و بصیرت میں ان کا لگا نہیں کھا سکتے تھے۔

''میں یقین رکھتا ہوں کہ تم اپنی ہوئی پرستی کی وجہ سے اگر کھلے طور پر نہ کہہ سکے تو بزبانِ حال کہو گے کہ احمد بن حنبل کیا چیز ہے، ابن مدینی کون ہے، ابو داود اور ابو زرعہ کی کیا حقیقت ہے، یہ صرف محدث ہیں۔ انھیں فقہ کا پتا ہی نہیں! نہ وہ اصول سے واقف ہیں نہ انھیں معلوم ہے کہ رائے کیا چیز ہے۔ نہ وہ معانی اور بیان کے وقائع کو سمجھتے تھے، نہ وہ منطق کی باریکیوں کو جانتے تھے، نہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل دے سکتے تھے، نہ فقہائے ملت میں ان کا کہیں تذکرہ پایا جاتا ہے۔ یا تو حلم سے چپ رہو یا علم سے بات کرو۔ مفید علم وہی ہے جو ان حضرات سے منقول ہے۔ تمھارے فقیہ تو ہمارے آج کل کے محدثین کی طرح ہیں۔ نہ ہم کچھ چیز ہیں، نہ آپ ہی کچھ جانتے ہیں۔ اربابِ فضیلت کی قدر اہلِ فضل ہی جانتے ہیں۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا

ہے۔ جو کبر و غرور اور شر پسندی سے گفتگو کرتا ہے اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس کا انجام وبال ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے معافی وسلامتی چاہتے ہیں۔'' (تذكرة الحفاظ: ٦٢٧/٢)

حافظ ذہبی نے اپنے وقت کے اس مرض کو جس درد انگیز طریقے سے بیان فرمایا اور جس ہمدردی سے ذکر کیا، اس سے ظاہر ہے کہ آٹھویں صدی میں جمود اور شخصیت پرستی کس قدر بڑھ چکی تھی۔ حافظ ذہبی اس سے کس قدر خائف اور متاثر تھے، اور اس کے عواقب اور نتائج سے ائمۂ حدیث کی دُور اندیش نظریں کس قدر آ گاہ تھیں؟

اور عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ حدیث کے خلاف آٹھویں صدی ہجری میں بھی وہی اسلحہ جات استعمال ہوتے تھے جو اپنی زنگ آلود شکل میں آج استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ فقیہ نہیں، یہ عطّار ہیں۔ اصول سے نا آشنا ہیں۔ منطق نہیں جانتے۔ عقلی دلائل سے بے خبر ہیں۔ علم کلام ان کے اذہان سے بالا ہے!!

یہ وہی زنگ آلود اور بوسیدہ اوزار ہیں جو فلاسفۂ یونان نے متکلمین کے خلاف استعمال کیے اور فقہائے کرام نے ائمۂ حدیث کو ان معائب سے مطعون کیا۔ اور اب حضرات اربابِ تقلید ان لوگوں کے خلاف استعمال فرماتے ہیں جو اس وقت آزادیِ فکر کے حامی ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جب ائمۂ مجتہدین حق پر ہیں تو ان سب کے اجتہادات کیوں قابلِ عمل نہ سمجھے جائیں۔ چار کی تحدید اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے نہیں فرمائی۔ بعض اوقات حکومتوں نے اپنے مقاصد یا امنِ عامہ کی حفاظت کے لیے کی۔ اس کے لیے شرعاً اس کی کوئی سند نہیں پائی گئی۔ اگر کسی شخص کو قرآن وسنت میں مناسب بصیرت نہ ہو تو وہ ائمۂ اجتہاد کے علوم سے بلا تعیین استفادہ کرے۔ جب سب مجتہدین حق پر ہیں تو حق کو تقسیم کیوں کیا جائے؟ تعیینِ شخص کا تقسیم کے سوا کوئی مطلب نہیں۔

بے شک تلفیق سے روکا جائے، اتباعِ ہوا سے منع کیا جائے، لیکن ہر شخص کی نیت پر مسلط ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ مخفیات اور سرائر کو اللہ تعالیٰ عالم الغیب کے سپرد کیا جائے، یا پھر اس قوت کی تحویل پر اعتماد کیا جائے جو ملک کے نظم ونسق اور قیامِ امن کی ذمے دار ہے، لیکن انسانی اذہان و افکار، عقل و بصیرت اور نظر و اجتہاد پر تالے ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ انسانیت پر ظلم بھی ہے اور اس کی توہین بھی، اور علم و بصیرت کے ساتھ دشمنی کے مترادف بھی!

حافظ ذہبی رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مناقب، وسعتِ علم اور ان کے تفردات و اختیارات

کا ذکر فرماتے ہوئے اپنے دور کے شخصی جمود کا تذکرہ عجیب انداز سے فرماتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن مسعود کی سیرت اگر لکھی جائے تو تقریباً نصف جلد اسی میں سما جائے۔ وہ کبار صحابہ سے تھے۔ وہ نہایت وسیع العلم اور ہدایت کے امام تھے۔ اس کے باوجود فروعی مسائل اور قراءت میں ان کے کچھ تفردات تھے جو کتابوں میں موجود ہیں۔ ہر امام کی بعض باتیں لے لی جاتی ہیں اور بعض نظر انداز کر دی جاتی ہیں، سوائے امام الاتقیاء صادق مصدوق نبی الرحمہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے جو معصوم اور امین ہیں۔ اس عالم پر تعجب ہے جو کسی خاص امام کی تقلید کرے، باوجودیکہ اسے ان نصوص کا علم ہے جو اس کے امام کے خلاف پائی جاتی ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔'' (تذكرة الحفاظ: ١/ ١٥)

جمود کے خلاف ہر دور کے علماء نے بہت کچھ کیا ہے۔ ابو شامہ، شاطبی، ابن قدامہ جیسے مشاہیر نے اس مرض کے خطرات سے آگاہ فرمایا۔ ابن قیم فرماتے ہیں:

اَلْعِلْمُ مَعْرِفَةُ الْهُدٰى بِدَلِيْلِهِ مَا ذَاكَ وَالتَّقْلِيْدُ يَسْتَوِيَانِ
إِذْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ مُقَلِّدًا لِلنَّاسِ وَالْأَعْمٰى هُمَا أَخَوَانِ [1]

''علم معرفت بالدلیل کا نام ہے۔ تقلید اس کے مساوی اور مرادف نہیں ہوسکتی۔ علماء کا اجماع ہے کہ تقلید نابینگی کے مرادف ہے۔''

میں نے اس مقام پر ذہبی کے تاثرات کو اس لیے ذرا تفصیل سے لکھا ہے کہ ذہبی مختلف مکاتبِ فکر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی نظر تاریخی لحاظ سے اور رجال میں بہت وسیع ہے۔ بحر العلوم مسلّم الثبوت کی شرح میں ذہبی کے متعلق فرماتے ہیں:

''قَالَ الذَّهَبِيُّ، وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْاِسْتِقْرَاءِ التَّامِّ فِيْ نَقْلِ حَالِ الرِّجَالِ''

(بحر العلوم، ص: ٤٤١ نولكشور)

''ذہبی کا استقراء اسماء الرجال میں بہت کامل ہے۔''

ذہبی نے فکر کے جمود اور تقلید کے متعلق ان ممالک کا حال لکھا ہے جو ارضِ حرم کے قریب اور دینی علوم کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان جیسا ملک جو علومِ نبوت سے پہلے ہی کافی دور ہے، جہاں محققین کی پہلے ہی کمی ہے، یہاں کے حالات تو اور بھی خراب ہوں گے۔

[1] القصيدة النونية (ص: ٩٩)

غزالی فرماتے ہیں:

”فَإِنْ خَاضَ الْمُقَلِّدُ فِي الْمُحَاجَّةِ فَذٰلِكَ مِنْهُ فُضُولٌ، وَالْمُشْتَغِلُ بِهِ صَارَ كَضَارِبٍ فِي حَدِيْدٍ بَارِدٍ، وَطَالِبٍ لِصَلَاحِ الْفَاسِدِ، وَهَلْ يُصْلِحُ الْعَطَّارُ مَا أَفْسَدَهُ الدَّهْرُ؟“[1]

”مقلد کے ساتھ بحث ٹھنڈا لوہا کوٹنے کے مترادف ہے۔ عطار وقت کی بگڑی کو نہیں بنا سکتا۔“

ہندوستان میں اِسلام:

معلوم ہے کہ ہندوستان میں فاتحینِ اسلام دو راستوں سے آئے، سندھ کی راہ سے اور ایران کی راہ سے۔ پہلا لشکر محمد بن قاسم کی قیادت میں پہلی صدی کے اواخر میں پہنچا۔[2] اس وقت ائمۂ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہ کے سوا باقی ائمہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کے لیے یہ دور طالب علمی کا تھا اور امامت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لشکر اہلِ حدیث تھا اور موجودہ تفریق سے بے خبر۔ ان کا مسلک تقریباً وہی تھا جو آج کل اہلِ حدیث کا ہے، یعنی بلا تخصیصِ شخص مسائل اہلِ علم سے پوچھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ اسی لیے عامۃ المسلمین میں اس وقت تعصب ناپید تھا۔ دوسرا حملہ ایران کی راہ سے ہوا۔ یہ فاتح عموماً حنفی تھے۔ انھی کی وجہ سے ہندوستان میں حنفیت پورے زور سے پہنچی۔ اور اس وقت تک احناف کی ملک میں کثرت ہے اور عوام وخواص میں عصبیت بھی ہے۔ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ!

یہ علاقے مرکز سے کافی دور اور علوم کی برکات سے بے حد تشنہ رہے۔ یہاں کے علماء عموماً حجاز میں اقامت اور ہجرت کو ترجیح دیتے رہے۔ ان حالات میں اگر یہاں جمود ہو، تحقیق اور اجتہاد سے عوام نفرت کریں تو اس میں تعجب نہیں۔ جمود ایسے علاقوں میں مستبعد نہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر برصغیر ہندوستان و پاکستان کے حالات عرب سے کہیں ابتر ہونے چاہییں۔ اس کا تذکرہ حافظ ذہبی نے فرمایا ہے۔ یہاں کی حکومت اکثر جاہل، اس کے ساتھ حکّام میں بے عملی اور بدعملی دونوں کارفرما

[1] فيصل التفرقة بين الإسلام والزندقة للغزالي (ص: ٧٨)

[2] ہندوستان پر پہلا حملہ ۹۲ھ میں ہوا۔ اس وقت ولید بن عبدالملک خلیفہ تھے۔ حجاج بن یوسف گورنر اور محمد بن قاسم قائدِ جیوش۔ محمد بن قاسم کے یہ حملے ۹۵ھ تک جاری رہے۔ ملتان سے قنوج تک ان کی فوجیں پہنچیں۔ دوسرا حملہ چوتھی صدی ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے کیا۔ اس وقت مذاہبِ اربعہ کا رواج کسی قدر ہو چکا تھا۔ غزنویوں کے بعد حکومت غوریوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ [مولف]

تھیں۔ علماء اور فقراء بھی اپنے مقام سے ہٹ چکے تھے۔

علامہ صغانی (م ۶۵۰ھ) کے بعد یہاں چند گنے چنے بزرگ نظر آتے ہیں۔ شیخ علی متقی (۹۷۵ھ)، شیخ محمد طاہر پٹنوی شہید (۹۸۶ھ) اور سب سے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)۔ جہاں اکبر جیسے فاسق بادشاہ اور ملّا مبارک کا خاندان ملک کے دروبست پر محیط ہوں، فواحش اور فسق و فجور کی حکومت کی طرف سے حوصلہ افزائی ہو، وہاں تقلید و جمود سے آگے ذہن کہاں تک پرواز کر سکتے ہیں۔ اور یہ چند مخلص بزرگ بدعت اور شرک کے ان جھکڑوں اور آندھیوں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اس آخری دور میں شیخ عبدالحق (۱۰۵۲ھ) کا وجود غنیمت ہے۔ وہ اپنے وقت کے محدث ہیں۔ ان کے وجود سے دہلی اور دہلی کے اطراف میں حدیث کا چرچا ہوا۔ ان کی رجال پر نظر ہے، لیکن نقلِ روایت میں حافظ سیوطی کے بعد شاید ہی کوئی اس قدر غیر محتاط ہو۔ ان کی مدارج النبوۃ میں سیرت کے متعلق بڑی جامعیت ہے، لیکن ضعاف اور موضوعات کا ذخیرہ بھی حضرت شیخ نے جمع فرما دیا ہے۔ پھر وہ تصوف کی مخترعات اور وقت کی دوسری بدعات کے خلاف کھل کر کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ ان کا رجحان حمایت کی طرف ہوتا ہے۔ وہ شطحیات کے دلدادہ ہیں۔

ان کے رجحانات کا یہ حال ہے کہ "سفر السعادۃ" ایسی محققانہ اور محدثانہ کتاب کی شرح لکھی اور اسے جمود سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ جہاں اتنے بڑے اکابر محدثین کا یہ حال ہو وہاں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تجدیدی مساعی اور ابن القیم کے تنقیدی کارناموں کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ بحوالہ حافظ سخاوی لفظ شیخ الاسلام کے غلط استعمال کا شکوہ فرماتے ہیں اور اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثُمَّ اشْتَهَرَ بِهَا جَمَاعَةٌ مِنْ عُلَمَاءِ السَّلَفِ حَتّٰى ابْتُذِلَتْ عَلٰى رَأْسِ الْمِئَةِ الثَّامِنَةِ فَوُصِفَ بِهَا مَنْ لَّا يُحْصٰى، وَصَارَتْ لَقَبًا لِمَنْ وَلِيَ الْقَضَاءَ الْأَكْبَرَ، وَلَوْ عَرِيَ عَنِ الْعِلْمِ وَالسِّنِّ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. اِنْتَهٰى كَلَامُ السَّخَاوِيِّ، قُلْتُ: ثُمَّ صَارَتِ الْآنَ لَقَبًا لِمَنْ تَوَلّٰى مَنْصَبَ الْفَتْوٰى وَإِنْ عُرِيَ عَنْ لِبَاسِ الْعِلْمِ وَالتَّقْوٰى" (الفوائد البهية، ص: ۱۰۱)

"شیخین (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے بعد سلف سے ایک جماعت کے لیے یہ لقب مشہور ہوا۔ پھر آٹھویں صدی میں یہ لقب ایسا عام ہوا کہ جسے قضائے اکبر کا

عہدہ ملا وہی شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور ہوگیا اور بے شمار شیخ الاسلام ہو گئے، اگرچہ علم اور عمر کے لحاظ سے وہ کچھ بھی اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ پھر یہ لقب ان لوگوں کے لیے مخصوص ہوگیا جو منصبِ افتا پر کسی طرح قابض ہوگئے، گو وہ علم اور تقویٰ سے قطعاً تہی دست ہوں۔''

اواخر تیرھویں صدی تک علم کے دروس و انحطاط کا حال ظاہر ہے۔ علم و تقویٰ کے بجائے القاب پر زور ہے۔ جس قدر علم کم ہو گا اسی قدر جمود بڑھے گا۔ لوگ دوسروں کا سہارا لینے کی کوشش کریں گے۔ ضرورت کے لحاظ سے اسے کوئی واجب کہے یا مباح لیکن ہے تو ایک لاعلمی کا کرشمہ! اسی لیے اس دور میں سارا زور القاب پر آ گیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اصلاحی کوششوں کے بعد اعتقادی بدعات کی جگہ عملی بدعات نے لے لی۔ موت اور شادی کے مواقع پر ہنود سے یہ رسوم اور بدعات مستعار لے لی گئیں۔ حکومتوں کے ایوانوں سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک یہ اندھیرا چھا گیا۔ علماء کا کام بھی محض حیل کی تلاش رہ گیا اور شرعی احکام کو ٹالنا فقہ کی انتہا قرار پا گئی۔

آخری دینی کوشش فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہے۔ وہ بھی آخر یہی کہ مخصوص آراء کو جمع کر دیا گیا اور حکومت کی سرپرستی سے اسے اعتماد کی صورت حاصل ہوگئی۔

حافظ ذہبی کی زبان سے اپنے وقت اور اپنے ماحول کے جمود اور تقلیدِ معین کا شکوہ آپ سن چکے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا انتقال ۷۴۸ھ میں ہوا۔ اسی دور کے متعلق حافظ ذہبی نے شکایت فرمائی ہے کہ لوگ تحقیق کے بجائے تقلید کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اپنی تحقیق اور اپنے علم پر اعتماد کے بجائے دوسروں کے فہم پر اعتماد اور دوسرے کے سہارے پر زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے اگر دماغی قویٰ اور قوتِ فکر اور شعور کو استعمال نہ کیا جائے تو وہ اپنا عمل چھوڑ دے گی اور معطل ہو کر رہ جائے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ائمۂ سلف کے بعد علم اور تفقہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ کتابت اور تذکروں نے حافظوں کو کافی حد تک کمزور کر دیا ہے۔ محدثین کے حافظوں کا ذکر کیا جائے تو لوگ اسے افسانہ سمجھتے ہیں۔ فقہاء کی دور اندیشیوں اور نکتہ دانی کا تذکرہ آجائے تو خواصِ امت تک حیرت میں کھو جاتے ہیں۔ یہ ساری مصیبت جمود نے پیدا کی۔ بڑے بڑے ہوشمند اہلِ علم احساسِ کمتری میں مبتلا نظر آئیں گے۔ اس عمومی ابتلا کے باوجود جمود بتدریج اذہان پر چھا گیا ہے۔

اس زمانے میں ایسے بزرگ بھی ملیں گے جو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں، اپنی سمجھ سے سوچتے ہیں۔ منقولات کے فہم میں انھیں اپنے علم اور اپنی فراست پر بجا طور پر اعتماد ہے اور کسی کی تقلید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

تذکرۃ الحفاظ:

حافظ ذہبی نے فنِ رجال میں دو کتابیں لکھی ہیں: میزان الاعتدال اور تذکرۃ الحفاظ۔ میزان میں تو عموماً ضعیف اور مجروح رواۃ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ تذکرۃ الحفاظ کی چار جلدیں ہیں جن میں حفاظ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ ان کے اکیس طبقات ہیں۔ پہلی اور دوسری جلد میں دس طبقات کا ذکر ہے۔ تیسری اور چوتھی میں گیارہ طبقات مرقوم ہیں۔ کل اکیس طبقات ہوئے۔ ان میں تقریباً گیارہ سو انیس ائمہ کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض ائمہ کا ذکر ضمناً آیا ہے اور بعض کا تذکرتاً ذکر فرمایا ہے۔ اس تعداد کے علاوہ حافظ ذہبی نے التزام سے تو نہیں فرمایا کہ ہر آدمی کے ساتھ اس کے مسلک کا ذکر کریں گے لیکن چونکہ ائمہ حدیث کے تذکرے میں یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے اس لیے وہ تذکرتاً کہیں ذکر فرما جاتے ہیں کہ فلاں بزرگ تقلید نہیں کرتے تھے، فلاں بزرگ اہل الرائے کو پسند نہیں کرتے تھے، فلاں بزرگ نے اپنے علاقے میں اہلِ اثر کے مذہب کو رواج دیا۔

تذکرۃ الحفاظ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ذہبی کے زمانے (۷۴۸ھ) تک ایسے لوگ موجود تھے جو شخصی تقلید اور جمود سے پرہیز کرتے تھے۔ کتاب و سنت کو براہِ راست سلفِ امت صحابہ اور تابعین کی طرح سمجھنے اور سوچنے کی کوشش فرماتے تھے۔ تقلید اور جمود کی تنگ دامانیوں سے وہ اپنا دامن بچائے رکھتے تھے۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں کافی تھے، اور پھر یہ لوگ بہت ہی اچھی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ لوگ اساتذہ تھے۔ لوگ ان سے علمِ سنت پڑھتے اور سیکھتے تھے۔

ایک مختصر سی فہرست بقیدِ سنین ذکر کی جاتی ہے۔ یہ فہرست "تذكرة الحفاظ"، "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع للشوكاني" اور "التاج المكلل للنواب صديق حسن خاں" سے منقول ہے۔ اس سے دو چیزوں کی وضاحت مقصود ہے:

① اول یہ کہ یہ نظریہ نیا نہیں۔ بڑے فحول اور اکابر اہلِ علم نے تقلید سے پرہیز اور ائمہ سلف کی راہ کو پسند فرمایا ہے۔

② دوسرے یہ کہ تقلید شخصی پر کبھی اجماع نہیں ہوا، بلکہ ہر دور میں اہلِ علم تحقیق و تفحص کے طلبگار

رہے۔ اس مسلک کے لیے ''وہابیت'' کا عنوان بڑا جھوٹ ہے۔

وہابیوں کا مرکزی مقام نجد اور حجاز ہے لیکن وہ لوگ اکثر حنبلی ہیں۔ خال خال ان میں سلفی بھی ہیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن حضرات نے فنِ حدیث کی تحصیل ہندوستان سے کی یا پھر حافظ شوکانی اور علامہ حیات سندھی سے علمِ حدیث کا استفادہ فرمایا۔ گویا وہابیوں کو بھی سلفیت یا ہندوستان سے ملی یا یمن اور حجاز سے۔ تعجب ہے آج کل کے بعض اکابر علمائے دیوبند بھی اس لقب کے استعمال میں غلط بیانی سے نہیں ڈرتے۔ بریلوی انھیں وہابی کہتے ہیں۔ وہ اس کا انتقام اہلِ حدیث سے لیتے ہیں۔

تیسری صدی تک تو اتفاق ہے کہ تقلیدِ ائمہ کی پابندی کا رواج نہ تھا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق اس کا عام رواج چوتھی صدی کے بعد ہوا لیکن محققینِ ائمہ کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ اس وقت بھی بند نہیں ہوا، اس لیے امام ذہبی کئی ائمہ کے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ وہ مجتہد تھے۔ کہیں فرماتے ہیں: ''كَانَ لَا يُقَلِّدُ أَحَداً''[1] کہیں فرماتے ہیں: ''لَمْ يَكُنْ يُعَلِّمُ أَهْلَ الرَّأْيِ''[2] وغير ذلك.

ائمۂ محققین کی فہرست مع قید سنین:

① بقی بن مخلد (۲۰۶ھ)
② احمد بن عاصم (۲۸۷ھ)
③ قاسم بن محمد اندلسی (۲۷۶ھ)
④ حافظ ابن خزیمہ (۳۱۰ھ)
⑤ علامہ ابن منذر (۳۱۸ھ)
⑥ حسین بن محمد سنجی (۳۱۵ھ)
⑦ حافظ ابو یعلی (۳۴۶ھ)
⑧ حسن بن سعد قرطبی (۳۳۱ھ)
⑨ ابن شاہین (۳۸۵ھ)
⑩ حافظ محمد بن علی ساحلی (۴۴۱ھ)
⑪ امام حمیدی (۴۸۸ھ)
⑫ محمد بن طاہر مقدسی (۵۰۷ھ)
⑬ امام عبدری (۵۴۴ھ)
⑭ ابو زرعہ بن محمد (۵۶۶ھ)
⑮ حافظ ابن رومیہ (۶۳۷ھ)
⑯ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ)
⑰ الحافظ مجد الدین فیروز آبادی (۸۱۷ھ)
⑱ محمد بن یوسف ابو حیان اندلسی (۷۴۵ھ)

---

[1] تذكرة الحفاظ (١/ ٣٠٥، ٢/ ٦٣٠، ٣/ ٧٨٢)

[2] تذكرة الحفاظ (٣/ ٨٠١) ولفظه: ''وكان لا يحدث أهل الرأي إلا بعد الجهد''

(۱۹) شیخ شہاب الدین (۹۵۱ھ)　(۲۰) سید یحیٰ بن حسین (۱۰۸۰ھ)

(۲۱) صالح بن محمد حمیدی مقبلی (۱۱۰۸ھ)　(۲۲) عبدالقادر بن علی البدری (۱۱۶۰ھ)

(۲۳) سید محمد بن اسماعیل امیر یمانی (۱۱۸۲ھ)

ان ائمہ کے اسمائے گرامی اور سنینِ وفیات پر توجہ فرمایئے اور غور کیجیے کہ یہ حضرات ترکِ تقلید کے باوجود امام ہیں۔ ہم اور آپ نقلِ احادیث میں ان کے علوم سے استفادہ کرتے ہیں۔ حدیث کے دفاتر میں ان کی نقل پر اعتماد کرتے ہیں۔ استدلال اور فقہی فروع کے ماخذ میں انہی کے علم پر یقین کرتے ہیں۔ پھر آج اگر کوئی شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی کلی طور پر تقلید نہ کرے تو اکابر اہلِ علم کی نظر میں وہ مجرم قرار پاتا ہے۔ بریلی اور دیوبند والے اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے القاب سے ان لوگوں کو یاد فرمایا جاتا ہے۔ یہ مسلک بھی اپنی قدامت کے لحاظ سے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے مسالک سے کسی طرح کم نہیں بلکہ ان حضرات نے اپنے مسالک میں ائمہ حدیث ہی سے استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک تاریخی شہادت کا تعلق ہے، خراسان، ایران، یمن، الجزائر، بربر اور اقصائے مغرب میں ابتداءً ائمہ حدیث ہی کا مسلک رائج تھا۔ موجودہ فقہی مسالک کو بذریعہ حکومت یا دوسری وجوہ سے غلبہ حاصل ہوا۔ یہ ایک مستقل بحث ہے کہ مختلف ممالک میں کیسے اور کن وجوہ سے مختلف مسالک رائج ہوئے۔ مقدمہ ابن خلدون اور المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار مقریزی میں صفحہ ۱۴۱ سے صفحہ ۱۶۳ تک شیعہ سنی مذاہب کی اشاعت اور ان کے مناقشات کا مبسوط تذکرہ ملتا ہے، اور ان وجوہ پر روشنی پڑتی ہے جن سے مروجہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ مقریزی نے ان ائمہ اور بادشاہوں کا نام بنام اور سنین کے حساب سے تذکرہ کیا ہے جن کی معرفت مروجہ مذاہب کا رواج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی شیعہ حضرات اور ان کے تشدد کا بھی ذکر کیا ہے جو اپنے مسلک کی اشاعت میں مصر اور اس کے اطراف میں ان سے ظاہر ہوا۔ اس سے سلف کے مسلک کی قدامت اور غربت کے وجوہ بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

اندھیرے میں روشنی کی کرن:

بارھویں صدی ہجری اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خاص وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس ماحول میں دنیائے اسلام میں ایک بیداری محسوس ہو رہی ہے۔ ان محیط اندھیروں میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی روشنی سی نمودار ہوتی ہے۔

عرب میں نجدی تحریک پیدا ہوئی جس کی قیادت شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ نے فرمائی۔

ایران میں سید جمال الدین افغانی نے صور پھونکا جس کی آواز مصر، اسکندریہ اور قسطنطنیہ تک پہنچی۔

تقریباً تھوڑی دیر پہلے ہندوستان کی قسمت جاگی اور رشد و ہدایت کی سوئی ہوئی طاقتوں نے انگڑائی لی۔ اس کی بیداری کا آغاز سید احمد سرہندی رحمہ اللہ نے گیارھویں صدی ہجری میں فرمایا۔ بدعات کے خلاف کھلی جنگ لڑی۔ بدعت کی تقسیم کا حیلہ عز بن عبدالسلام کے وقت سے آ رہا تھا۔ لوگ بدعت کو حسنہ کہہ کر جواز کی راہ پیدا کر لیتے تھے۔ حضرت مجدد نے اسے تار تار کر دیا اور فرمایا کہ جب آنحضرت ﷺ ہر بدعت کو ناپسند فرماتے ہیں تو اسے حسنہ کہنے کا حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ شرعاً کوئی بدعت حسنہ نہیں کہلا سکتی۔ سنت سے محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت کی سچی دلیل ہے۔ بدعتی کتنا ہی عابد و زاہد ہو، بارگاہِ نبوت میں وہ کسی احترام کا مستحق نہیں![1]

مجدد صاحب رحمہ اللہ کی مساعی نتائج و عواقب کے لحاظ سے آج کی مصطلح تحریکات سے کہیں زیادہ ہمہ گیر اور موثر تھیں۔

حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ نے کوئی اصطلاحی تحریک نہیں چلائی جس کے بزرگ صدر یا سربراہ ہوں،[2] اس کی مجالس کا جال ملک میں پھیلا ہو، جس کے ممبر اور اعوان و انصار کسی عرفی تنظیم کے ماتحت کام کر رہے ہوں۔ بلکہ ان میں ہر ایک اپنے وقت میں ایک مینار ہے جس سے خود بخود روشنی پھیلتی ہے۔ لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ کسی عہدے اور عرفی نظم کے بغیر ان تاثرات کو پھیلایا جاتا ہے اور وہ اس سرعت سے پھیلتے ہیں کہ کوئی عرفی تحریک اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے ان گزارشات میں اگر کہیں تحریک کا لفظ آ جائے تو اس سے مراد آج کی انجمن سازی اور اسی قسم کی اصطلاحی تحریک نہیں ہوگا بلکہ پرانا مفہوم ہوگا جس میں ایک شخص ایک سچائی کو لے کر اٹھتا ہے، پروانے خود بخود شمع کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور روشنی اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ وقت کے اسباب و وسائل اپنی بساط کے مطابق استعمال ہونے لگتے ہیں۔ میری دانست میں مجدد صاحب رحمہ اللہ سے شروع ہو کر سید احمد شہید رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تک کام کی نوعیت یہی رہی۔ ایک سپاہی کے دل میں ذمے داری کا احساس اور مقاصد کی تحصیل کے لیے اتنا ہی درد تھا جس قدر کسی بڑے سے بڑے عہدہ دار کو ہونا چاہیے، اور یہ احساس ہی کامیابی کا راز ہے۔

---

[1] دیکھیں: مکتوبات مجددیہ (۱/ ٤١١)

[2] مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمہ اللہ نے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو مصطلح تحریک کا بانی قرار دیا ہے۔ یہ ان کا محض حضری تخیل ہے اور بالکل بے دلیل وہم۔ [مؤلف]

ولی اللّٰہی تحریک کا مزاج:

اس تحریک کے اہم عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الفِ ثانی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، حضرت مولانا فاخر الہ آبادی، آزاد بلگرامی، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا شاہ عبدالغنی، حضرت سید احمد شہید، مولانا شاہ اسماعیل، مولانا عنایت علی، مولانا ولایت علی، مولانا عبدالحی بڈھانوی۔ ان میں بعض علماء حنفی ہیں لیکن عقیدتاً اہلِ حدیث۔ بعض عمل و عقیدہ دونوں میں حنفی، بعض دونوں میں اہلِ حدیث لیکن اس اختلاف کی نمایش ان حضرات نے کبھی نہیں فرمائی۔

قاضی ثناء اللہ صاحب کا تفسیر مظہری میں رجحان فقہ حنفی کی طرف ہے لیکن بدعت کی مخالفت میں کوئی لچک نہیں۔ ارشاد الطالبین میں قبر پرستی اور قبور پر چراغاں اور انھیں چونا گچ کرنے کے متعلق ان کی رائے بہت واضح ہے۔ آج کے اربابِ دیو بند کی طرح ان میں لچک اور مداہنت نہیں۔ آج بعض اکابر دیو بند کے افکار کا رجحان زیادہ تر بریلویت کی طرف ہے۔ وہ اہلِ توحید اور اصحابِ سنت سے زیادہ اہلِ بدعت کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ.

ان حضرات کے مقاصد کا تجزیہ:

① حنفیت کے باوجود یہ حضرات فقہی جمود اور عصبیت کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔

② ائمہ کے اختلافی مسائل میں یہ حضرات وسیع القلب ہیں۔ کسی طرح بھی عمل کیا جائے، انھیں ناگوار نہیں ہوتا۔

③ بدعات کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کے خلاف سخت انکار فرماتے ہیں۔

④ شیعہ حضرات سے سمجھوتے کے قائل نہیں تاوقتیکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق وہ اپنی رائے بالکلیہ نہ بدل لیں۔ مجدد صاحب کے رسائل اور "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" (از شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ) اور تحفہ اثنا عشریہ (شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ) اس کے شاہد ہیں۔ ان کتابوں میں شیعہ حضرات پر انتہائی معقول تنقید فرمائی ہے، مداہنت نہیں کی۔

⑤ تصوف سے بہت متاثر ہیں لیکن اس راہ کی بدعی رسوم سے انتہائی متنفر۔

⑥ وہ اہلِ سنت کے دو فریق سمجھتے ہیں: اہلِ حدیث اور اہل الرائے۔ دونوں اہلِ سنت ہیں لیکن شاہ صاحب فقہائے اہلِ حدیث کی راہ کو زیادہ پسند فرماتے ہیں، جیسا کہ آیندہ ان شاء اللہ آئے گا۔

شیخ ابو منصور عبدالقاہر دمشقی نے بھی ''اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْفِرَق'' میں متعدد مقامات پر اہلِ حدیث اور اہل الرائے دونوں کو اہلِ سنت قرار دیا ہے۔[1] علامہ عبدالکریم شہرستانی کا بھی یہی حال ہے۔

⑦ یہ جماعت سیاسی سربراہی کی خواہش مند نہیں لیکن اگر لادینیت برسرِ اقتدار آنا چاہے یا آجائے تو وہ ایسے سیاسیین سے جہاد کرنا پسند کرتے ہیں، جھکنا گوارا نہیں کرتے۔

حضراتِ دہلی کے نظریات:

شاہ صاحب امت میں دو جماعتوں کی روش کو فی الجملہ صحیح سمجھتے ہیں۔ غلو کو ناپسند کرتے ہیں اور کسی کے لیے شخصی طور پر تعصب پسند نہیں فرماتے۔

''باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل وفتوی بر دو وجہ بودند، یکے آنکہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع می کردند واز آنجا استنباط می نمودند، واین طریقہ اصل راہ محدثین است، و دیگر آنکہ قواعد کلیہ کہ جمعی از ائمہ تنقیح وتہذیب آں کردہ اند یاد گیرند بی ملاحظہ مآخذ آنہا، پس ہر مسئلہ کہ وارد می شد جواب آں از ہماں قواعد طلب می کردند و ایں طریقہ اصل راہِ فقہاء است، و غالب بر بعض سلف طریقہ اولیٰ بود و بر بعض آخر طریقہ ثانیہ۔'' (مصفی: ۱/۴)

''سلف میں استنباطِ مسائل کے متعلق دو طریق تھے۔ پہلا یہ تھا کہ قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ جمع کیے جائیں اور انھیں اصل قرار دے کر پیش آمدہ مسائل پر ان کی روشنی میں غور کیا جائے۔ یہ محدثین کا طریق ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقّح اور مہذّب کیے ہوئے قواعدِ کلیہ کو اصل قرار دیا جائے اور پیش آمدہ مسائل کا حل انھی سے تلاش کیا جائے اور اصل مآخذ کی طرف توجہ کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ یہ فقہاء کا طریقہ ہے۔ سلف سے ایک کثیر گروہ پہلے طریق کا پابند ہے اور ایک گروہ دوسرے طریق کا۔''

پھر ان دونوں طریقوں کی تفصیل اور ان کے طریقِ عمل کی پوری وضاحت حجۃ اللہ البالغہ میں فرمائی ہے۔ حدیث کی جمع و کتابت، پھر تدوین و تالیف کا تذکرہ فرمایا ہے۔ پھر فقہائے محدثین کا تذکرہ فرمایا ہے:

[1] دیکھیں: الفرق بین الفرق (ص: ۲۹۹)

"فَرَجَعَ الْمُحَقِّقُوْنَ مِنْهُمْ، بَعْدَ إِحْكَامِ فَنِّ الرِّوَايَةِ وَمَعْرِفَةِ مَرَاتِبِ الْحَدِيْثِ، إِلَى الْفِقْهِ، فَلَمْ يَكُنْ عِنْدَهُمْ مِنَ الرَّأْيِ أَنْ يُجْمَعَ عَلٰى تَقْلِيْدِ رَجُلٍ مِمَّنْ مَضٰى مَعَ مَا يَرَوْنَ مِنَ الْأَحَادِيْثِ وَالْآثَارِ الْمُتَنَاقِضَةِ فِيْ كُلِّ مَذْهَبٍ مِنْ تِلْكَ الْمَذَاهِبِ، فَأَخَذُوا يَتَتَبَّعُوْنَ أَحَادِيْثَ النَّبِيِّ ﷺ وَآثَارَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَالْمُجْتَهِدِيْنَ عَلٰى قَوَاعِدَ أَحْكَمُوْهَا فِيْ نُفُوْسِهِمْ"

(حجة الله البالغة: ١/ ١١٩)

"محققین اہلِ حدیث نے فنِ روایت میں پختگی اور مراتبِ حدیث سے پوری معرفت پیدا کی اور فقہ کی طرف توجہ کی، لیکن ان کا یہ طریق نہ تھا کہ اس معاملے میں گذشتہ بزرگوں میں سے کسی خاص شخص کی تقلید پر اتفاق کر لیں کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ ان مروجہ مذاہب میں احادیث اور آثارِ متناقضہ موجود ہیں، اس لیے انھوں نے احادیث اور ائمہ مجتہدین کے علوم پر اپنے قواعد کی روشنی میں غور کیا۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے مختصر طور پر محدثین کے ان قواعد کا بھی تذکرہ فرمایا ہے جو ان کے نزدیک تطبیق بین النصوص یا استنباطِ مسائل کے لیے معیار ہیں۔ یہ قواعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر کی تعمیل میں مرتب کیے گئے ہیں۔

قاضی شریح فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا:

"اگر کوئی مسئلہ اللہ کی کتاب میں مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور کسی کے کہنے پر اس سے صرفِ نظر مت کرو۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو آنحضرت ﷺ کی سنت پر غور کرو اور اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر مسئلہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ دونوں میں نہ ہو تو لوگوں کے عمومی عمل کو دیکھو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اگر کوئی معاملہ ان تینوں طریقوں سے طے نہ ہو سکے تو اس کا فیصلہ یا تو اجتہاد سے کرو یا پیچھے ہٹ جاؤ۔ اور میری دانست میں تاخیر زیادہ مناسب ہے۔" [1] (دارمی)

دوسرے گروہ (اہل الرائے) کے ذکر میں فرماتے ہیں:

[1] صحيح. سنن الدارمي (١/ ٦٩)

''یہ لوگ سوالات کی کثرت اور فتووں سے نہیں گھبراتے لیکن حدیث کی روایت سے گھبراتے ہیں، کہیں الفاظ میں کمی بیشی نہ ہوجائے۔ ان کا خیال ہے کہ دین کی بنیاد فقہ پر ہے، اس کی اشاعت ضروری ہے۔''[1]

آخر میں فرماتے ہیں:

''ان حضرات کی نظر میں فقہ، حدیث اور مسائل کی تدوین دوسرے طریق سے ہوئی، کیوں کہ ان کے پاس حدیث اور آثار کا سرمایہ اس قدر نہیں تھا جس کی بنا پر وہ ان اصولوں پر اعتماد کر سکتے جن پر علمائے اہلِ حدیث نے اعتماد کیا ہے۔ نہ مختلف ممالک کے سابقہ علماء کے اقوال ان کی نگاہ میں تھے جس سے شرح صدر کے ساتھ استنباط کرتے۔ اپنے اکابر پر انھیں بے حد اعتماد تھا، اس لیے وہ ان کے طے کردہ اُصولوں پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ غرض یہ حضرات استنباط میں کتاب و سنت کی جگہ اپنے گذشتہ بزرگوں کے ارشادات پر اعتماد کرتے اور انہی کی روشنی میں مسائل کو حل فرماتے۔''[2]

اس دور کے بعد معاملہ اور بھی بگڑ گیا اور ایک ایسا گروہ سامنے آ گیا جس کا تذکرہ شاہ صاحب ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

''وَمِنهَا أَنَّهُم اطمَأَنُّوا بِالتَّقلِيدِ، وَدَبَّ التَّقلِيدُ فِي صُدُورِهِم دَبِيبَ النَّملِ، وَهُم لَا يَشعُرُونَ'' (حجة الله البالغة: ١/ ١٢٣)

''وہ لوگ تقلید پر مطمئن ہوگئے اور تقلید ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی۔''

شاہ صاحب نے اس انحطاط کی متعدد وجوہ لکھی ہیں:

١. فقہاء کا باہم اختلاف اور مزاحمت جس کا انقطاع کسی پہلے بزرگ کے حوالے کے بغیر نہ ہوسکا۔
٢. رؤساء کی جہالت اور علماء کا حدیث اور تخریج سے ناآشنا ہونا۔
٣. دوراز کار فرضی مسائل میں تعمق، وغیر ذلک۔

اس کے نتائج کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اس کے نتیجے میں جہالت، اختلاط، شکوک اور اوہام پیدا ہوگئے جن کی اصلاح کی کوئی امید

[1] حجة الله البالغة (١/ ٣١٤) [2] مصدر سابق

نہیں رہی، پھر مدتوں خالص تقلید ہی ان کا شیوہ رہا اور حق و باطل کا امتیاز جاتا رہا۔ فقہ محض جھگڑے اور باتیں بنانے کا نام رہ گیا اور محدث چند غلط سلط احادیث نقل کر دینے کا نام رہ گیا۔"

آخری الفاظ سنیے:

"وَلَمْ يَأْتِ قَرْنٌ بَعْدَ ذٰلِكَ إِلَّا هُوَ أَكْثَرُ فِتْنَةً، وَأَوْفَرُ تَقْلِيدًا، وَأَشَدُّ انْتِزَاعًا لِلْأَمَانَةِ مِنْ صُدُورِ الرِّجَالِ، حَتّٰى اطْمَأَنُّوا بِتَرْكِ الْخَوْضِ فِي أَمْرِ الدِّيْنِ، وَبِأَنْ يَّقُولُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ، وَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى" [1] (حجة الله البالغة: ١/ ١٢٣)

ان تصریحات کا نتیجہ:

١ اہلِ حدیث اور اہل الرائے دونوں مکتبِ فکر ہیں اور دونوں اہلِ علم میں رائج ہیں۔

٢ شاہ صاحب کے خیال میں اہلِ حدیث اور اہل الرائے اس آخری دور میں اپنی جگہ سے ہٹ چکے ہیں۔

٣ متاخرینِ اہل الرائے میں استدلال اور استنباط کے بجائے تقلید اور جمود آ گیا ہے۔ یہ شاہ صاحب کی نظر میں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

٤ اہلِ حدیث نے بھی حدیث کی طرف بے توجہی کی ہے۔ وہ تقریباً اسے ایک رسم کے طور پر کر رہے ہیں۔ استنباط اور اجتہاد کے نقطۂ نظر سے نہیں کرتے اور نہ تفقہ کی کوشش کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کا مقصد:

شاہ صاحب چاہتے ہیں کہ دونوں گروہ حقیقت پسندی سے کام لیں۔ اہل الرائے اکابر کے بجائے کتاب و سنت کو اساس قرار دیں اور اہلِ حدیث ظاہریت سے بچ کر تفقہ سے کام لیں۔ ملاحظہ ہو: تفہیمات (١/ ٢٠٩):

"وَمِنْهَا: إِنِّي أَقُوْلُ لِهٰؤُلَاءِ الْمُسَمِّيْنَ أَنْفُسَهُمْ بِالْفُقَهَاءِ الْجَامِدِيْنَ عَلَى التَّقْلِيْدِ يَبْلُغُهُمُ الْحَدِيْثُ مِنْ أَحَادِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ، وَقَدْ ذَهَبَ إِلَيْهِ جَمْعٌ عَظِيْمٌ مِنَ الْفُقَهَاءِ الْمُتَقَدِّمِيْنَ، وَلَا يَمْنَعُهُمْ إِلَّا التَّقْلِيْدُ

---

[1] ترجمہ: "اس کے بعد ہر زمانے میں فتنہ زیادہ ہوا، تقلید بڑھتی رہی اور امانت کم ہوتی گئی، حتی کہ وہ دینی امور میں بات چیت بالکل ہی ترک کر گئے اور اپنے پہلوں کے طریق پر مطمئن ہو بیٹھے۔"

لِمَنْ يَّذْهَبُ إِلَيْهِ، وَهٰؤُلَاءِ الظَّاهِرِيَّةُ الْمُنْكِرِيْنَ لِلْفُقَهَاءِ الَّذِيْنَ هُمْ طَرَازُ حَمَلَةِ الْعِلْمِ وَأَئِمَّةِ أَهْلِ الدِّيْنِ إِنَّهُمْ جَمِيْعًا عَلٰى سَفَاهَةٍ وَسَخَافَةِ رَأْيٍ وَضَلَالَةٍ، وَإِنَّ الْحَقَّ بَيْنَ بَيْنَ"

''میں ان نام کے فقہاء سے کہتا ہوں جن میں تقلید کی وجہ سے انتہائی جمود آ چکا ہے کہ جب ان کو صحیح حدیث پہنچتی ہیں جو اُمت میں معمول بہا ہے، لیکن وہ صرف ان لوگوں کی تقلید کی وجہ سے یہ حدیث جن کے مسلک کے خلاف ہے، اس حدیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور ان ظاہری حضرات سے بھی کہتا ہوں جو ائمہ دین اور چوٹی کے فقہاء کا انکار کرتے ہیں، تم دونوں فریق غلط راہ پر جا رہے ہو۔ یہ کم فہمی کی راہ ہے۔ حق ان دونوں کے بین بین ہے۔''

دونوں فریق پر کس صاف گوئی سے تنقید فرمائی اور جمود توڑنے کے لیے کس قدر واضح راہ بتلائی ہے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

"وَأَشْهَدُ لِلّٰهِ بِاللّٰهِ أَنَّهُ كُفْرٌ بِاللّٰهِ أَنْ يُّعْتَقَدَ فِيْ رَجُلٍ مِنَ الْأُمَّةِ مِمَّنْ يُّخْطِئُ وَيُصِيْبُ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيَّ اتِّبَاعَهُ حَتْمًا، وَأَنَّ الْوَاجِبَ عَلَيَّ هُوَ الَّذِيْ يُوْجِبُهُ هٰذَا الرَّجُلُ، وَإِنَّ الشَّرِيْعَةَ الْحَقَّةَ قَدْ ثَبَتَ قَبْلَ هٰذَا الرَّجُلِ بِزَمَانٍ... الخ" (تفہیمات: ۱/ ۲۱۱)

''میں اللہ کے نام سے اس کی قسم کھاتا ہوں کہ امت کے کسی آدمی کے بارے میں جو خطا اور ثواب دونوں کا مرتکب ہو سکتا ہے، یہ خیال کرنا کہ اسی کا اتباع واجب ہے اور جسے یہ واجب کہے وہی امر واجب ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کے برابر ہے، کیوں کہ شریعت اس شخص سے کہیں پہلے موجود ہے۔''

شاہ صاحب نے یہاں تقلیدِ شخصی اور جمود کو کفر باللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ وہ کسی شخص کے حق کو اس مسئلے میں تسلیم نہیں فرماتے۔ تقلید سے جو ذہنی انقباض ہوتا ہے اور قوتِ فکر کی راہ میں جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس کے متعلق اور کھل کر فرماتے ہیں:

"وَتَرَى الْعَامَّةَ سِيَّمَا الْيَوْمَ فِيْ كُلِّ قُطْرٍ يَتَقَيَّدُوْنَ بِمَذْهَبٍ مِنْ مَذَاهِبِ الْمُتَقَدِّمِيْنَ، يَرَوْنَ خُرُوْجَ الْإِنْسَانِ مِنْ مَذْهَبِ مَنْ قَلَّدَهُ، وَلَوْ فِيْ مَسْأَلَةٍ،

كَالْخُرُوْجِ مِنَ الْمِلَّةِ كَأَنَّهُ نَبِيٌّ بُعِثَ إِلَيْهِ، وَافْتُرِضَتْ طَاعَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ أَوَائِلُ الْأُمَّةِ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَيْرَ مُتَقَيِّدِيْنَ بِمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ" (تفہیمات:۱/ ۱۵۱)

"ہر علاقے میں عوام ائمۂ متقدمین سے کسی نہ کسی مذہب کے مقلد اور پابند ہیں۔ کسی ایک مسئلے میں وہ اختلاف کرنا نہیں چاہتے۔ گویا وہ امام نبی ہے اور ان پر اس کی اطاعت واجب ہے حالانکہ چوتھی صدی سے پہلے یہ حالت نہ تھی۔"

"تفہیمات" (١/ ٢١٤) میں لہجہ ذرا اور سخت ہوگیا۔ اس میں صوفیوں اور علماء کا تذکرہ اس جلال سے فرماتے ہیں:

"نَحْنُ لَا نَرْضىٰ بِهٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَ النَّاسَ لِيَشْتَرُوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا أَوْ يَشُوْبُوْا أَغْرَاضَ الدُّنْيَا إِذْ لَا تَحْصُلُ الدُّنْيَا إِلَّا بِالتَّشْبِيْهِ بِأَهْلِ الْهِدَايَةِ، وَلَا بِالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ إِلىٰ أَنْفُسِهِمْ وَيَأْمُرُوْنَ بِحَسَبِ أَنْفُسِهِمْ، هٰؤُلَاءِ قُطَّاعُ الطَّرِيْقِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ مَفْتُوْنُوْنَ فَتَّانُوْنَ، إِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ، وَلَا تَتَّبِعُوْا إِلَّا مَنْ دَعَا إِلىٰ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهِ وَلَمْ يَدْعُ إِلىٰ نَفْسِهٖ"

"ہم نہ تو ان صوفیوں کو پسند کرتے ہیں جو دنیا کے لیے لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، کیوں کہ دنیا کمانے کے لیے بھی اصحابِ ہدایت سے مشابہت ضروری ہے، اور نہ ان علماء کو پسند کرتے ہیں جو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ ڈاکو ہیں، جھوٹے ہیں، خود فتنے میں مبتلا ہیں، لوگوں کو فتنے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں سے بچو اور صرف ان لوگوں کی بات قبول کرو جو کتاب وسنت کی طرف دعوت دیں اور اپنی ذات کی طرف دعوت نہ دیں۔"

پھر طالب علموں کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا ہے:

"وَرُبَّ إِنْسَانٍ مِنْكُمْ يَبْلُغُهُ حَدِيْثٌ مِنْ أَحَادِيْثِ نَبِيِّكُمْ فَلَا يَعْمَلُ بِهٖ، وَيَقُوْلُ: إِنَّمَا عَمَلِيْ عَلىٰ مَذْهَبِ فُلَانٍ لَا عَلَى الْحَدِيْثِ، ثُمَّ احْتَالَ بِأَنَّ فَهْمَ الْحَدِيْثِ وَالْقَضَاءَ بِهٖ مِنْ شَأْنِ الْكُمَّلِ الْمَهَرَةِ، وَإِنَّ الْأَئِمَّةَ لَمْ يَكُوْنُوْا مِمَّنْ يَّخْفىٰ عَلَيْهِمْ هٰذَا الْحَدِيْثُ فَمَا تَرَكُوْهُ إِلَّا لِوَجْهٍ ظَهَرَ لَهُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ نَسْخٍ وَمَرْجُوْحِيَّةٍ" (تفہیمات:۱/ ۲۱۵)

''بہت سے لوگوں کو تم سے حدیثِ نبوی مل جاتی ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: میرا عمل فلاں مذہب پر ہے۔ پھر بہانہ بناتے ہیں کہ حدیث سمجھنا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا کامل اور ماہر لوگوں کا کام ہے۔ اور ائمہ سے یہ حدیث پوشیدہ نہ تھی۔ کوئی وجہ ضرور ہوگی جس کی بنا پر ائمہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔''

اس کے نتیجے میں فرماتے ہیں:

''یہ قطعاً دین کی بات نہیں۔ تم صرف آنحضرت ﷺ کی اطاعت کرو، مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ تم کتاب وسنت کی اطاعت کرو۔'' الخ

بظاہر شاہ صاحب فقہ حنفی سے مانوس ہیں۔ ان کا خاندانی مسلک عام طور پر فقہ عراقی ہے، لیکن شاہ صاحب چونکہ جمود اور اس توقیفی فقہ سے بیزار ہیں، اس لیے اس فقہی نظام پر بھرپور وار کرتے ہیں۔ ''قُرَّةُ الْعَيْنَيْن'' میں شیخین (حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما) کے محاسن میں فرماتے ہیں کہ دراصل اختلاف شیخین کے بعد شروع ہوا:

''گویا اصل مذاہب اربعہ اجماعیات شیخین افتادہ، اما ایں سخن بکسے کہ سرمایہ علم او بجز قدوری ووقایہ باشد نتواں گفت'' (قرۃ العینین، ص: ۱۲۴)

''مذاہبِ اربعہ میں اجماعی مسائل شیخین ہی کے مرہونِ منت ہیں، لیکن یہ بات ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آ سکتی جن کے علم کا کل سرمایہ قدوری اور وقایہ ہے۔''

دوسرے مقام پر اسی انداز سے فرماتے ہیں:

''ایں نکتہ کسے کہ سرمایہ فقہ او شرح وقایہ ومنہاج باشد نمے تواند دانست آں را عالمے متبحر باید'' (ص: ۱۳۵)

''یہ نکتہ شرح وقایہ اور منہاج وغیرہ پڑھنے والے فقہاء کی سمجھ میں نہیں آ سکتا، اس کے لیے متبحر عالم کی ضرورت ہے۔''

شاہ صاحب کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ متون وشروحِ فقہ کو جو اعتماد وتفوق حاصل ہوا ہے وہ ائمہ اور ان کتب کے مصنفین کے ساتھ محبت اور ان کے علوم پر یقین سے حاصل ہوا ہے۔ دراصل یہ اعتماد صحابہ اور خصوصاً شیخین پر ہونا چاہیے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ.

بالکل اسی انداز سے یہ تذکرہ "إزالة الخفاء" میں آیا ہے۔ شاہ صاحب کی نظر میں یہ فقہی نظام اور یہ تقلید محض شخصی کوششیں ہیں۔ انھیں اساسی طور پر کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے وجوب اور فرضیت کی بحث بے معنی اور لا حاصل ہے۔ یہ بزرگ عالم تھے۔ ان کے علوم سے ممکن طور پر استفادہ کرنا چاہیے۔

اس قسم کی تصریحات حجۃ اللہ البالغہ کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حجۃ اللہ میں تفہیمات کے بعض مجمل مضامین کی تفصیل اور شرح ہے۔

اُصولِ فقہ:

اس میں شک نہیں کہ اصولِ فقہ کی تاسیس اور تدوین علمائے اہلِ حدیث خصوصاً امام شافعی نے فرمائی ہے، اور عموماً اصول قرآن و حدیث اور لُغتِ عرب اور عقلِ سلیم سے اخذ کیے گئے ہیں۔ امام شافعی کے اس شاہکار کا تذکرہ ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں مرحوم، کشف الظنون للکاتب چلپی، فہرست ابن ندیم وغیرہ میں ملتا ہے۔[1] شاہ ولی اللہ نے بھی یہ تذکرہ حجۃ اللہ (۱/ ۱۱۷) وغیرہ تصانیف میں فرمایا ہے۔

ویسے اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی حیثیت منطق کی ہے۔ حدیث کی تصحیح اور تضعیف میں اصولِ حدیث اور فقہی جزئیات کی تخریج میں اصولِ فقہ کو وہی مقام حاصل ہے جو معقولات میں منطق کو۔ اس فن کی تاسیس گو امام شافعی ہی نے فرمائی ہے لیکن فقہائے حنفیہ کی خدمات اس فن میں قابلِ تعریف ہیں، بلکہ اس فن کی بدولت اُنھوں نے بانیِ فن امام شافعی پر بھی بعض مقامات پر کڑی تنقید کی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ فقہ کا کام اور خوبی اصولِ فقہ ہی سے ہے۔ شاہ صاحب نے فقہ کے ساتھ اصولِ فقہ پر بھی تنقید فرمائی ہے اور اس بھرم کی حقیقت کھول دی ہے۔

قرۃ العینین (ص: ۱۸۶) میں فرماتے ہیں:

"حنفیان برائے احکام مذہب خود اصلے چند تراشیدہ اند (۱) اَلْخَاصُ بَيِّنٌ فَلَا يَلْحَقُهُ الْبَيَانُ (۲) اَلْعَامُّ قَطْعِيٌّ كَالْخَاصِّ (۳) اَلْمَفْهُومُ الْمُخَالِفُ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ (٤) اَلتَّرْجِيحُ بِكَثْرَةِ الرُّوَاةِ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ (٥) الزِّيَادَةُ عَلَى الْكِتَابِ نَسْخٌ"

"احناف نے مذہب کی پختگی کے لیے کچھ اصول تراشے ہیں، مثلاً خاص بین ہے، اسے بیان کی ضرورت نہیں۔ عام بھی خاص کی طرح قطعی الدلالت ہے۔ مفہومِ مخالف معتبر نہیں

[1] أبجد العلوم (۲/ ۷۲) کشف الظنون (ص: ۸٤۰)

ہے۔ کتاب اللہ پر زیادت کتاب کا نسخ ہے۔"

بعینہٖ اسی انداز سے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فتاویٰ عزیزی (ص: ۶۲) میں کسی قدر تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا لہجہ شاہ ولی اللہ صاحب سے زیادہ سخت ہے:

"وَمِنَ اللَّطَائِفِ الَّتِي قَلَّمَا ظَفِرَ بِهَا جَدَلِيٌّ كَحِفْظِ مَذْهَبِهِ مَا اخْتَرَهُ الْمُتَأَخِّرُوْنَ لِحِفْظِ مَذْهَبِ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَهِيَ عِدَّةٌ قَوَاعِدَ يَرُدُّوْنَ بِهَا جَمِيْعَ مَا يَحْتَجُّ بِهَا عَلَيْهِمْ مِنَ الْأَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ"

"متاخرین کے چند گھڑے ہوئے قواعد حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب کی حفاظت کے لیے جو دنیا کے عجائبات سے ہیں، ان قواعد کی بدولت وہ تمام صحیح احادیث کو رد کر دیتے ہیں جو ان کے مذہب کے خلاف ہوں۔"

اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب نے تقریباً نو قواعد کا ذکر فرمایا ہے جن میں بعض تو وہی ہیں جن کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا ہے۔ میں نے بسط اور اِطناب سے ڈرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے۔ طالبِ حق کو فتاویٰ عزیزی (۱/۶۲) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں کئی جگہ اصولِ فقہ پر شاہ صاحب نے کڑی تنقید فرمائی ہے لیکن "بَابُ حِكَايَةِ حَالِ النَّاسِ بَعْدَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ" میں تقلید اور اس کے شیوع کی بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَبَعْضُهُمْ يَزْعُمُ أَنَّ بِنَاءَ الْمَذَاهِبِ عَلٰى هٰذِهِ الْجَدَلِيَّةِ الْمَذْكُوْرَةِ فِي مَبْسُوْطِ السَّرَخْسِيِّ وَالْهِدَايَةِ وَالتَّبْيِيْنِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ، وَلَا يَعْلَمُ أَنَّ أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ ذٰلِكَ فِيْهِمُ الْمُعْتَزِلَةُ" (حجة الله: ۱/ ۱۲۸)

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذاہب کی بنیاد ان مناظرانہ محاورات پر ہے جن کا ذکر مبسوط سرخسی، ہدایہ اور تبیین میں ہے، حالاں کہ یہ بے چارے نہیں جانتے کہ دراصل ان جدلیات کے بانی معتزلہ ہیں۔"

اس کے بعد اصولِ فقہ کے متعدد قواعد اور ان کا حدیث کے انکار میں جو اثر پڑتا ہے ذکر فرمایا ہے، پھر پورے جلال کے ساتھ ان قواعد پر معارضات عائد فرمائے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ احناف خود بھی ان قواعد کے پابند نہیں۔ یہ بحث کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ حق پسند طالب علم کو ان مقامات کا مطالعہ پورے غور سے کرنا چاہیے۔

اس وقت گزارش کا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب جس طرح فقہی جزئیات کو دین اور شریعت نہیں سمجھتے اسی طرح وہ اصولِ فقہ کو بھی لازوال اور دائمی نہیں سمجھتے۔ یہ محض علمی کوششیں ہیں جو علماء نے اپنے مسالک کو بچانے کے لیے کی ہیں۔ نہ فروع کے انکار سے کفر لازم آتا ہے نہ اصولِ فقہ کے انکار سے دیانت میں خلل لازم آتا ہے۔

فروع کے متعلق شاہ صاحب کی روش:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے رفقاء عقائد، اصول اور فروعی مکاتبِ فکر کے التزام میں کسی طرح جمود کو پسند نہیں فرماتے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی پابندی کے بغیر مذاہبِ اربعہ اور ائمۂ حدیث کے مسائل پر عمل کیا جائے۔ بظاہر حنفی ہونے کے باوجود وہ محدثین اور شوافع کے معمولات کو ترجیح دیتے اور پسند فرماتے ہیں۔

اس وقت ابنائے دیوبند سے بڑی کثرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کرتی ہے مگر ان کی روش اور ان کا عمل شاہ صاحب، ان کے رفقاء اور خاندان کے نظریات کے بالکل خلاف ہے۔ آج کا دیوبند، بریلویت سے چنداں مختلف نہیں۔ اختلافات لفظی قسم کے رہ گئے ہیں۔

آگے آنے والی گزارشات سے معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب فروع میں کس قدر وسیع الظرف تھے اور دیوبند کی موجودہ پود میں کس قدر تنگ ظرفی اور انقباض ہے۔ وہ اپنے خلاف کوئی چیز سننا پسند نہیں کرتے اور شاہ صاحب شافعی مکتبِ فکر پر عمل سے پرہیز نہیں فرماتے۔

حدیثِ قُلّتین:

پانی کی طہارت کے متعلق شوافع اور احناف میں بے حد اختلافات ہیں۔ قلتین کی حدیث کو ان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ احناف اسے مضطرب فرماتے ہیں۔ شوافع اسے صحیح سمجھتے ہیں اور معذرت فرماتے ہیں کہ قدمائے احناف اور موالک پر ایسی احادیث مخفی رہیں یا فہمِ مراد میں ان حضرات سے تسامح ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

”وَمِثَالُهُ حَدِيثُ الْقُلَّتَيْنِ فَإِنَّهُ حَدِيثٌ صَحِيحٌ رُوِيَ بِطُرُقٍ كَثِيرَةٍ. الخ“

(حجة الله: ١/ ١١٧)

''قلتین کی حدیث صحیح اور متعدد طرق سے مروی ہے۔''

گویا طہارت کے مسائل پر اس حدیث کی وجہ سے جو شبہات واقع ہوتے تھے، شاہ صاحب ان کا فیصلہ شوافع کے حق میں دیتے ہیں اور احناف و موالک کی طرف سے معذرت فرماتے ہیں کہ ابتدائی دور میں یہ حدیث عام نہیں ہوئی۔

امام کے پیچھے فاتحہ:

ائمۂ احناف اور شوافع کے نزدیک امام کی اقتدا میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے متعلق نزاع مشہور ہے۔ بیسیوں رسائل اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"وَإِنْ كَانَ مَأْمُومًا وَجَبَ عَلَيْهِ الْإِنْصَاتُ وَالْإِسْتِمَاعُ، فَإِنْ جَهَرَ الْإِمَامُ لَمْ يَقْرَأْ إِلَّا عِنْدَ الْإِسْكَاتَةِ، وَإِنْ خَافَتَ فَلَهُ الْخِيَرَةُ، فَإِنْ قَرَأَ فَلْيَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ قِرَاءَةً لَا يُشَوِّشُ عَلَى الْإِمَامِ، وَهٰذَا أَوْلَىٰ الْأَقْوَالِ عِنْدِيْ، وَبِهٖ يُجْمَعُ بَيْنَ أَحَادِيْثِ الْبَابِ" (حجة الله: ۲/ ۷)

''مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے۔ اگر امام آواز سے پڑھے تو سکتات کے درمیان قراءت کرے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی جس طرح چاہے پڑھے لیکن اس طرح پڑھے کہ امام کی قراءت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔''

شاہ صاحب کے ارشادات میں اعتدال ہے۔ دونوں فریق کے تشدد کو شاہ صاحب پسند نہیں فرماتے۔

رفع الیدین اور وتر:

رکوع وغیرہ میں رفع الیدین اور وتروں کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

"وَالْحَقُّ عِنْدِيْ فِيْ مِثْلِ ذٰلِكَ أَنَّ الْكُلَّ سُنَّةٌ، وَنَظِيْرُهُ الْوِتْرُ بِرَكْعَةٍ وَّاحِدَةٍ وَثَلَاثٍ، وَالَّذِيْ يَرْفَعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّنْ لَّا يَرْفَعُ، فَإِنَّ أَحَادِيْثَ الرَّفْعِ أَكْثَرُ وَأَثْبَتُ غَيْرَ أَنَّهُ لَا يَنْبَغِيْ لِإِنْسَانٍ فِيْ مِثْلِ هٰذِهِ الصُّوَرِ أَنْ يُّثِيْرَ عَلٰى نَفْسِهٖ فِتْنَةَ عَوَامِّ بَلَدِهٖ" (حجة الله: ۲/ ۸)

''میرے نزدیک حق یہ ہے کہ رفع یدین کرنا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔ اسی طرح ایک

رکعت اور تین رکعت وتر پڑھنا ہے۔ اور رفع یدین کرنے والا مجھے نہ کرنے والے سے زیادہ پسند ہے، کیوں کہ رفع یدین کی احادیث زیادہ ہیں اور صحیح ہیں، لیکن انسان کو ایسے اعمال کی وجہ سے اپنے خلاف ہنگامہ بپا نہیں کرانا چاہیے۔'' (خدا کا شکر ہے کہ ہنگاموں کا موسم گزر گیا۔)

ظاہر ہے عوام میں ان اعمال کی وجہ سے نفرت پیدا ہوتی تھی اور خواص اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اب وہ سلسلہ بحمداللہ ختم ہوگیا۔

زیارتِ قبور کے لیے شدِّ رحال:

عوام میں مروج ہے کہ بزرگوں اور استھانوں کی زیارتوں کے لیے دور دراز کے سفر کرتے ہیں اور حج کے شعائر کی طرح ان زیارتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''وَالْحَقُّ عِنْدِيْ أَنَّ الْقَبْرَ، وَمَحَلَّ عِبَادَةِ وَلِيٍّ مِنَ الْأَوْلِيَاءِ، وَالطُّوْرَ كُلُّ ذٰلِكَ سَوَاءٌ فِيْ النَّهْيِ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ'' (حجة الله: ١/ ١٥٣)

''حق یہ ہے کہ قبرِ ولی، عبادت گاہ اور طور پہاڑ وغیرہ نہی میں برابر ہیں۔ کسی کے لیے بالاستقلال سفر درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے شدِ رحال سے منع فرمایا ہے۔''

زیارت پسند دیوبندی اور بریلوی حضرات اس مسئلے میں بڑی طعن آمیز گفتگو کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب وہی فرماتے ہیں جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دوسرے ائمۂ توحید نے فرمایا ہے۔

وضو کے نواقض:

وضو کے نواقض میں فقہاء مختلف ہیں۔ شاہ صاحب کی رائے یہ ہے:

''وَأَصْلُ مُوْجِبِ الْوُضُوْءِ الْخَارِجُ مِنَ السَّبِيْلَيْنِ، وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ مَحْمُوْلٌ عَلَيْهِ'' (حجة الله: ١/ ١٣٩)

''وضو ٹوٹنے کا اصل سبب وہی ہے جو سبیلین سے نکلے، باقی اسی پر محمول ہیں۔''

وتر:

وتروں کے متعلق اختلاف ہے۔ فقہائے حنفیہ واجب کہتے ہیں اور ائمۂ حدیث سنت۔ شاہ صاحب کی رائے یہ ہے:

"وَالْحَقُّ أَنَّ الْوِتْرَ سُنَّةٌ، هُوَ أَوْكَدُ السُّنَنِ، بَيَّنَهُ عَلِيٌّ، وَابْنُ عُمَرَ، وَعُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ" (حجة الله: ٢/ ١٣)

"وتر سنتِ مؤکدہ ہے۔ حضرت علی، ابن عمر اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔"

قنوت:

فقہائے احناف قنوت کو وتروں میں واجب سمجھتے ہیں اور شوافع صبح کی نماز میں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"وَاخْتَلَفَتِ الْأَحَادِيثُ وَمَذَاهِبُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ فِي قُنُوتِ الصُّبْحِ، وَعِنْدِي أَنَّ الْقُنُوتَ وَتَرْكَهُ سِيَّانِ، وَمَنْ لَّمْ يَقْنُتْ إِلَّا عِنْدَ حَادِثَةٍ عَظِيمَةٍ أَوْ كَلِمَاتٍ يَسِيرَةٍ إِخْفَاءً قَبْلَ الرُّكُوعِ أَحَبُّ إِلَيَّ، لِأَنَّ الْأَحَادِيثَ شَاهِدَةٌ عَلٰى أَنَّ الدُّعَاءَ عَلٰى رِعْلٍ وَّذَكْوَانَ كَانَ أَوَّلًا ثُمَّ تَرَكَ، وَهٰذَا وَإِنْ لَّمْ يَدُلَّ عَلٰى نَسْخِ مُطْلَقِ الْقُنُوتِ لٰكِنَّهَا تُؤْمِي إِلٰى أَنَّ الْقُنُوتَ لَيْسَ سُنَّةً مُسْتَقِرَّةً"[1]

"صبح کی قنوت کے متعلق احادیث اور صحابہ اور تابعین کے مذاہب مختلف ہیں (شاہ صاحب فرماتے ہیں) قنوت پڑھنا نہ پڑھنا دونوں برابر ہیں۔ اور اہم حوادث پر چند کلمات پڑھنا مجھے زیادہ پسند ہے، کیوں کہ احادیث سے ثابت ہے کہ قبیلہ رعل و ذکوان پر بددعا ترک کر دی گئی۔ اس سے گو علی الاطلاق قنوت کا ترک ثابت نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ واضح ہے کہ یہ مستقل اور دائمی سنت نہیں۔"

جمع بین الصلاتین:

عذر کی وجہ سے نماز جمع کرنے کے متعلق ائمہ میں اختلاف ہے۔ فقہائے احناف نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں نہ جمع تاخیر کے۔ اور جمع صوری دراصل جمع ہی نہیں بلکہ جمع کی صورت ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نماز کے دراصل تین وقت ہیں۔ عصر ظہر سے نکال لی گئی اور عشاء مغرب سے اخذ کر لی گئی تاکہ دو نمازوں میں فاصلہ کم ہو اور نیند سے پہلے ہی ذکر سے غفلت نہ ہو۔

[1] حجة الله البالغة (ص: ٤٣٦)

”فَشَرَعَ لَهُمْ جَمْعَ التَّقْدِيمِ وَالتَّأْخِيرِ لٰكِنَّهُ لَمْ يُوَاظِبْ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَعْزِمْ عَلَيْهِ مِثْلَ مَا فَعَلَ فِي الْقَصْرِ“ (حجة الله: ٢/ ١٨)

”شارع حکیم علیہ السلام نے جمع تقدیم اور تاخیر دونوں کی اجازت دے دی، لیکن نہ اس پر ہمیشگی کا حکم دیا نہ اس پر تاکید فرمائی جیسے نمازِ قصر کے لیے تاکید فرمائی۔“

تکبیراتِ عیدین:

عید کی تکبیرات اور نمازِ عید کی ترتیب میں فقہائے اہلِ حدیث میں اختلاف ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

”يُكَبِّرُ فِي الْأُولٰى سَبْعًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ، وَالثَّانِيَةِ خَمْسًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ، وَعَمَلُ الْكُوفِيِّينَ أَنْ يُكَبِّرَ أَرْبَعًا كَتَكْبِيرِ الْجَنَائِزِ فِي الْأُولٰى قَبْلَ الْقِرَاءَةِ، وَفِي الثَّانِيَةِ ثَلَاثًا بَعْدَهَا، وَهُمَا سُنَّتَانِ، وَعَمَلُ الْحَرَمَيْنِ أَرْجَحُ“ (حجة الله: ٢/ ٢٣)

”پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں قراءت سے پہلے (طریقہ اہل الحرمین)۔ علمائے کوفہ کا خیال ہے کہ جنازہ کی طرح پہلی میں چار تکبیرات قراءت سے پہلے اور دوسری میں پانچ قراءت کے بعد، اور اہلِ حرمین کا عمل راجح اور بہتر ہے۔“

”دہ در دہ“ پانی:

فقہائے حنفیہ اور شوافع میں مائے کثیر کے متعلق اختلاف ہے۔ متاخرین فقہائے احناف اس کی مقدار ”دہ در دہ“ فرماتے ہیں اور شوافع قلتین بتاتے ہیں۔ پھر اگر کنواں پلید ہوجائے تو اسے پاک کرنے کے لیے ڈولوں کی مقدار کے متعلق عجیب قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

”وَبِالْجُمْلَةِ لَيْسَ فِي هٰذَا الْبَابِ شَيْءٌ يُعْتَدُّ بِهِ، وَيَجِبُ الْعَمَلُ بِهِ“ (حجة الله البالغة: ١/ ١٤٧)

”ان مسائل میں کوئی واجب العمل اور قابلِ اعتماد چیز نہیں ہے۔“

پھر فرماتے ہیں:

”وَقَدْ أَطَالَ الْقَوْمُ فِي فُرُوعِ مَوْتِ الْحَيَوَانِ فِي الْبِئْرِ، وَالْعَشْرِ فِي الْعَشْرِ، وَالْمَاءِ الْجَارِي، وَلَيْسَ فِي كُلِّ ذٰلِكَ حَدِيثٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ“ (حجة الله البالغة: ١/ ١٤٧)

''کنویں میں جانور مرنے اور دہ در دہ اور مائے جاری کے مسائل میں علماء نے طویل گفتگو کی ہے، لیکن ان میں کسی کے متعلق بھی قطعاً کوئی حدیث نہیں ہے۔''

حجۃ اللہ، مصفٰے اور مسوّیٰ میں اور بھی کئی فروعی مسائل ہیں جن میں شاہ صاحب نے نہایت ہی وسعتِ ظرف سے اپنا رجحان فقہائے حدیث اور شوافع کی طرف فرمایا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ خشک حنفیت اور جامد عصبیت کو شاہ صاحب قطعاً پسند نہیں فرماتے، اور نہ قدمائے احناف میں اس قسم کا جمود پایا جاتا تھا۔ یہ جمود چوتھی صدی سے شروع ہو کر آٹھویں نویں صدی تک عروج پر پہنچا۔ بدعت سے روکنے کی اصل راہ اتباعِ سلف ہے۔ ائمہ کی تقلید نے بھی بدعت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عقیدت مندی کا جمود آ گیا۔ اتباعِ سلف اور صحابہ کی مختلف رائیں اور ان کے فتووں میں مصالح کی بنا پر تنوع ہے، اس لیے وہاں جمود نہیں آ سکتا۔

چار مصلّے:

برقوق چرکسی نے حرمِ بیت اللہ میں ائمۂ اربعہ کے نام سے چار مصلّے قائم کیے تھے۔ غالباً یہ عمل ۸۰۷ھ کے پس و پیش ہوا۔ اس وقت بھی علمائے حق نے اس تفریق کی مخالفت کی لیکن حکومت اس تفریق کے احترام پر مصر رہی۔ یہ تفریق یہاں تک بڑھی کہ علی العموم ایک دوسرے کی اقتدا متروک ہوگئی۔ حنفی جماعت ہو رہی ہو تو شوافع اور حنابلہ بے پروا ہو کر بیٹھے رہتے۔ گویا یہ اذان اور نماز ان کے لیے قائم ہی نہیں ہوئی۔[1] یہی حال ان کے ساتھ احناف کرتے۔ حرمِ کعبہ میں اس بدعت کے اِحداث سے ساری دنیائے اسلام میں اس کا اثر ہوا۔ ائمہ کے اَتباع ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''وخدائے تعالیٰ بے خبر نیست از آنچہ در زمان آیندہ عمل خواہید کرد و از راہِ بدعت یک یک جہت از جہات کعبہ تقسیم خواہید و در ترجیح و تفصیل جہتِ مختار خود ہر کس خواہد آورد، مثلاً حنفیہ جہتِ جنوب را اختیار خواہند کرد و امام ایشاں جانب شمال کعبہ خواہند استاد و در مقام

[1] شکر ہے کہ بیت اللہ کی جدید تعمیر میں سلطان سعود بن عبدالعزیز نے یہ مصلّے بالکل ختم کر دیے ہیں۔ اب لوگ ایک ہی امام کی اقتدا کرتے ہیں۔ مختلف جماعتیں نہیں ہوتیں۔ اب یہ بدعت ختم ہوگئی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. [مؤلف]

خواہند گفت کہ قبلہ ما قبلہ ابراہیمی است زیرآنکہ آنجناب جانب میزاب متوجہ می شدند، و شافعیہ غرب را اختیار خواہند کرد و امام ایشاں درشرق کعبہ خواہد استاد و در مقام فخر خواہند گفت با استقبال باب مے نمائیم وقبلہ ما قبلہ منصوص'' (تفسیر فتح العزیز: ۱/ ۵۴۱)

''اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم آیندہ ایک بدعت کرو گے اور اطرافِ کعبہ کو تقسیم کر کے اس پر فخر کرو گے۔ احناف جنوب کی طرف کھڑے ہوں گے۔ ان کا رخ شمال کی طرف ہوگا۔ وہ فخر کریں گے کہ ہمارا قبلہ ابراہیمی ہے۔ شوافع مغرب کی طرف کھڑے ہو کر مشرق کی طرف رُخ کریں گے اور فخر سے کہیں گے کہ ہمارا قبلہ میزاب کے سامنے ہے۔ یہی سمت مخصوص ہے۔''

شاہ صاحب ان مصلّوں کی تقسیم کو بدعت سمجھتے ہیں اور اسلام میں اس تقسیم کو ناپسند فرماتے ہیں۔

ائمہ کی تقلید اور ان کی اطاعت کا مسئلہ اپنی جگہ پر قابلِ بحث ہے۔ اگر مروجہ تقلید کے جواز میں کوئی سہارا مل بھی جائے تو ائمہ رحمہم اللہ کے نام پر یہ تفریق کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ برقوق جیسے مسرف بادشاہ سے یہی اُمید ہوسکتی تھی۔ تفریق بین المومنین کا مزید بوجھ اس کی گردن پر ہوگا اور اسی طرح ان علماء پر جنھوں نے اسے سندِ جواز عطا کی۔ ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٢٧]

شاہ صاحب کا مقصد:

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جمود غلط ہے تو پھر صحیح کیا ہے۔ شاہ صاحب موجودہ حالات میں کیا تبدیلی چاہتے ہیں؟ قیاس اور رائے پرستی بھی انھیں پسند نہیں، اور ظواہر پرستی بھی ان کی نگاہ میں معیوب ہے تو پھر وہ کیا ہے جسے پسند کیا جائے؟

اس معاملے میں شاہ صاحب اپنا عندیہ حلفِ مؤکد کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

''وَأَشْهَدُ لِلّٰهِ بِاللّٰهِ أَنَّهُ كُفْرٌ بِاللّٰهِ أَنْ يُّعْتَقَدَ فِيْ رَجُلٍ مِنَ الْأُمَّةِ مِمَّنْ يُّخْطِئُ وَيُصِيْبُ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيَّ اتِّبَاعَهُ حَتْمًا، وَأَنَّ الْوَاجِبَ عَلَيَّ هُوَ الَّذِيْ يُوْجِبُهُ هٰذَا الرَّجُلُ عَلَيَّ، وَلٰكِنَّ الشَّرِيْعَةَ الْحَقَّةَ قَدْ ثَبَتَ قَبْلَ هٰذَا الرَّجُلِ بِزَمَانٍ، قَدْ وَعَاهَا الْعُلَمَاءُ، وَأَدَّاهَا الرُّوَاةُ، وَحَكَمَ بِهَا الْفُقَهَاءُ، وَإِنَّمَا اتَّفَقَ النَّاسُ عَلٰى تَقْلِيْدِ الْعُلَمَاءِ عَلٰى مَعْنًى أَنَّهُمْ رُوَاةُ الشَّرِيْعَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ،

وَأَنَّهُمُ اشْتَغَلُوْا بِالْعِلْمِ مَا لَمْ نَشْتَغِلْ، فَلِذٰلِكَ قَلَّدُوا الْعُلَمَاءَ، فَلَوْ أَنَّ حَدِيثًا صَحَّ، وَشَهِدَ لِصِحَّتِهَا الْمُحَدِّثُوْنَ، وَعَمِلَ بِهِ طَوَائِفُ فَظَهَرَ فِيْهِ الْأَمْرُ، ثُمَّ لَمْ يَعْمَلْ بِهِ هُوَ؛ لِأَنَّ مَتْبُوْعَهُ لَمْ يَقُلْ بِهِ فَهٰذَا هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيْدُ"[1]

''میں اللہ کے لیے اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اُمت میں کسی ایسے آدمی کے متعلق جو غلطی بھی کرتا ہو اور صحیح بھی کہتا ہو، یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کی اطاعت ضروری ہے اور جسے وہ واجب کہے اسے واجب سمجھنا ضروری ہے، یہ قطعاً کفر ہے، کیوں کہ شریعت اس شخص سے مدتوں پہلے سے موجود ہے۔ علماء نے اسے حفظ اور ضبط کیا اور رواۃ نے اسے بیان کیا۔ فقہاء نے اس کے مطابق فیصلے فرمائے۔ لوگوں نے علماء کی تقلید کو صرف اس لیے متفقہ طور پر قبول کیا کہ وہ درحقیقت شریعت کے آنحضرت ﷺ سے راوی ہیں، علم ان کا مشغلہ ہے اور وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اگر حدیث صحیح ہو، محدثین اس کی صحت کے شاہد ہوں، عامۃ المسلمین نے اس پر عمل کیا ہو، معاملہ واضح ہو چکا ہو، پھر اس پر صرف اس لیے عمل نہ کیا جائے کہ امام یا متبوع نے اس کے مطابق فتویٰ نہیں دیا تو یہ بہت بڑی گمراہی ہے۔''

شاہ صاحب کا ارشاد کسی حاشیہ آرائی کا محتاج نہیں۔ وہ تقلید کے صرف اس حد تک قائل ہیں کہ اہلِ علم کتاب وسنت سے روایت کرتے ہیں۔ علمی مشاغل کی وجہ سے ان کی معلومات زیادہ ہیں۔ عوام ان کی معلومات سے استفادہ کر سکیں۔ صحیح حدیث کا علم جب صحیح ذرائع سے پہنچ جائے تو علماء کے ساتھ تقلیدی وابستگی کا تعلق یکسر ختم ہو جائے گا۔ حدیثِ صحیح کے ہوتے ہوئے کسی عالم کے لیے تعصب یا اس کی حمایت کے لیے تاویل کے دروازوں کا کھول دینا شاہ صاحب کی نگاہ میں بہت بڑی گمراہی ہے۔ اس انداز کو وہ کسی طرح بھی پسند نہیں فرماتے۔

اس مقصد کے لیے دوسری راہ:

شاہ صاحب کی تجویز یہ ہے کہ اس فقہی جمود کو توڑنے کے لیے مختلف مسالک کو باہم آمیز کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ مصالح اور ان کے تقاضوں کی روشنی میں بعض مسائل میں حنفی مسلکِ فکر

[1] تفہیمات (۱/ ۲۱۱)

اختیار کیا جائے اور بعض میں شافعی مسلک کو قبول کر لیا جائے۔ فرماتے ہیں:

”وَنَشَأَ فِيْ قَلْبِيْ دَاعِيَةٌ مِنْ جِهَةِ الْمَلَأِ الْأَعْلٰى تَفْصِيْلُهَا: أَنَّ مَذْهَبَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ، وَالشَّافِعِيِّ هُمَا مَشْهُوْرَانِ فِي الْأُمَّةِ الْمَرْحُوْمَةِ، وَهُمَا أَكْثَرُ الْمَذَاهِبِ تَبَعًا وَّتَصْنِيْفًا، وَكَانَ جُمْهُوْرُ الْفُقَهَاءِ، وَالْمُحَدِّثِيْنَ، وَالْمُفَسِّرِيْنَ، وَالْمُتَكَلِّمِيْنَ، وَالصُّوْفِيَّةِ مُتَمَذْهِبِيْنَ بِمَذْهَبِ الشَّافِعِيِّ، وَجُمْهُوْرُ الْمُلُوْكِ وَعَامَّةُ الْيُوْنَانِ مُتَمَذْهِبِيْنَ بِمَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ، وَأَنَّ الْحَقَّ الْمُوَافِقَ لِعُلُوْمِ الْمَلَأِ الْأَعْلٰى الْيَوْمَ أَنْ يُّجْعَلَا كَمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ يُعْرَضَانِ عَلَى الْكُتُبِ الْمُدَوَّنَةِ فِيْ حَدِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْفَرِيْقَيْنِ فَمَا كَانَ مُوَافِقًا بِهَا يَبْقٰى، وَمَا لَمْ يُوْجَدْ أَصْلُهُ يَسْقُطُ، وَالثَّابِتُ مِنْهَا بَعْدَ النَّقْدِ إِنَّ تَوَافَقَ بَعْضُهُ بَعْضًا فَذٰلِكَ الَّذِيْ يُعَضُّ عَلَيْهِ بِالنَّوَاجِذِ وَإِنْ تَخَالَفَ تُجْعَلُ الْمَسْأَلَةُ عَلٰى قَوْلَيْنِ وَيُصَحَّحُ الْعَمَلُ عَلَيْهِمَا أَوْ يَكُوْنُ مِنْ قَبِيْلِ اخْتِلَافِ أَحْرُفِ الْقُرْآنِ أَوْ عَلَى الرُّخْصَةِ وَالْعَزِيْمَةِ أَوْ يَكُوْنَانِ طَرِيْقَيْنِ لِلْخُرُوْجِ مِنَ الْمَضِيْقِ كَتَعَدُّدِ الْكَفَّارَاتِ أَوْ يَكُوْنُ أَخْذًا بِالْمُبَاحَيْنِ الْمُسْتَوِيَيْنِ لا يَعْدُو الْأَمْرُ هٰذِهِ الْوُجُوْهَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى... إلخ“ (تفہیمات: ۱/ ۲۱۲)

”ملائے اعلیٰ کی طرف سے میرے دل میں ڈالا گیا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ دونوں ائمہ کے مذاہب امت میں مشہور ہیں۔ یہی دونوں کثرتِ اتباع اور کثرتِ تصنیف کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ جمہور فقہاء اور محدث، مفسر اور متکلم اور صوفی شافعی مذہب کے پابند تھے۔ اکثر بادشاہ اور یونان کے رہنے والے حنفی مسلک کے پابند تھے۔ اور ملائے اعلیٰ کی نظر میں حق اور صحیح یہ ہے کہ ان دونوں مذاہب کی جزئیات کو کتبِ حدیث پر پیش کیا جائے۔ اور معلوم ہے کہ دونوں مذاہب کے اہلِ علم نے فنِ حدیث میں تصنیفات کی ہیں۔ جو مسائل حدیث کے موافق ہوں قبول کر لیے جائیں اور جن کا اصل حدیث سے نہیں ہے انھیں کلیتاً ساقط کر دیا جائے۔ نقد و نظر کے بعد جن مسائل میں اتفاق پیدا ہو جائے انھیں دانتوں میں تھام لیا جائے۔ اگر اختلاف ہو تو انھیں دو قول تصور کر لیا جائے

اور دونوں پر عمل صحیح سمجھا جائے۔ یہ اختلاف قراءتِ قرآن کی طرح سمجھا جائے، یا رخصت اور عزیمت پر محمول کیا جائے، یا تنگی سے نکلنے کے لیے دو راہیں اختیار کر لی جائیں، یا دونوں کو مباح سمجھا جائے۔ معاملہ اس سے آگے نہیں جائے گا ان شاء اللہ۔''

شاہ صاحب نے حنفیت کی کثرت ہندوستان میں دیکھی اور شوافع کی اکثریت انھیں حجاز میں نظر آئی، اس لیے انھوں نے ان دونوں میں اتحاد کی ضرورت کو محسوس فرمایا۔ اگر شاہ صاحب نجد اور سوڈان میں حنبلیہ اور مالکیہ کو ملاحظہ فرما لیتے تو انہی وجوہ کی بنا پر ان کو بھی ان کے ساتھ ملا دیتے اور ان کے ساتھ اتحاد کو ضروری سمجھتے۔ اگر ان مسالک میں اتحاد دین کے کسی تقاضے کو پورا کر سکتا ہے تو مذاہبِ اربعہ میں اتحاد کی کوشش اور آرزو یقیناً اس تقاضے کو پورا کرے گی۔ شاہ صاحب ان مصالح کو اسلام کی روح تصور فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقہی افکار کا جمود شاہ صاحب کے ذہن پر ایک بوجھ ہے جس کے لیے وہ بے حد متفکر ہیں۔

طلبہ کو نصیحت اور علومِ دین اور علومِ دنیا میں تمیز فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''خُضْتُمْ كَالْخَوْضِ فِي اسْتِحْسَانَاتِ الْفُقَهَاءِ مِنْ قَبْلِكُمْ وَتَفْرِيْعَاتِهِمْ، أَمَا تَعْرِفُوْنَ أَنَّ الْحُكْمَ مَا حَكَمَهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ، وَرُبَّ إِنْسَانٍ مِنْكُمْ يَبْلُغُهُ حَدِيْثٌ مِنْ أَحَادِيْثِ نَبِيِّكُمْ فَلَا يَعْمَلُ بِهِ، وَيَقُوْلُ: إِنَّمَا عَمَلِيْ عَلٰى مَذْهَبِ فُلَانٍ، لَا عَلَى الْحَدِيْثِ، ثُمَّ احْتَالَ بِأَنَّ فَهْمَ الْحَدِيْثِ مِنْ شَأْنِ الْكُمَّلِ الْمَهَرَةِ، وَإِنَّ الْأَئِمَّةَ لَمْ يَكُوْنُوْا مِمَّنْ يَّخْفٰى عَلَيْهِمْ هٰذَا الْحَدِيْثُ فَمَا تَرَكُوْهُ إِلَّا لِوَجْهٍ ظَهَرَ لَهُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ نَسْخٍ أَوْ مَرْجُوْحِيَّةٍ'' (تفہیمات: ۱/ ۲۱۴)

''تمھاری توجہ پوری طرح فقہاء کے استحسانات اور تفریعات کی طرف ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ درحقیقت حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے رسول کا۔ تم میں سے بہت سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث پہنچ جاتی ہے لیکن وہ اسے اس لیے قابلِ عمل نہیں سمجھتا کہ اس کا عمل فلاں مذہب پر ہے۔ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ حدیث کو سمجھنا تو ماہرین اور اصحابِ کمال کا کام ہے اور ائمہ پر کوئی چیز مخفی نہ تھی۔ ان کو اس حدیث کا علم ضرور ہوا ہوگا۔ کوئی وجہ از قسمِ نسخ اور مرجوحیت ضرور ہوگی ورنہ وہ ضرور اس پر عمل کرتے۔''

شاہ صاحب ائمہ کا احترام فرماتے ہیں لیکن ان کی علمی وسعت کے باوجود ان پر اس طرح اعتماد اور حسنِ ظن کو پسند نہیں فرماتے جس سے صحیح حدیث کو نظر انداز کرنے کی نوبت آجائے۔ مروجہ تقلید میں یہی عیب ہے جو شاہ صاحب کے ذہن میں کھٹک رہا ہے۔ وہ طلبہ کو نصیحت فرماتے ہیں کہ حدیث کے متعلق انھیں اس سطح سے اونچے ہو کر غور کرنا چاہیے۔

شاہ صاحب کا اپنا مسلک:

سابقہ نظریے سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ضروری سمجھتے ہیں کہ عوام علماء کی اطاعت و اتباع کریں لیکن نہ اس میں پیغمبر کی طرح کسی شخص کا تعین ہو اور نہ جمود کی روح سرایت کرنے پائے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور مصفیٰ میں اہلِ حدیث اور اہل الرائے کا ذکر فرمایا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی نظر میں ائمہ کوفہ کے سوا باقی ائمہ اہلِ حدیث ہیں۔ وہ اپنے اساطین اور اساتذہ کے قواعد کے بجائے استدلال اور اجتہاد کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھتے ہیں، لیکن جہاں تک عوام شوافع، موالک اور حنابلہ کا تعلق ہے وہ بہر حال وہ کچھ ہیں جو شاہ صاحب کو کسی طرح بھی پسند نہیں۔ وہاں جمود بھی ہے اور عصبیت بھی۔ ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد (ابن العربی) کے مقام کی رفعت دیکھیے اور امام شافعی کے متعلق ان کے لب و لہجے کی تلخی دیکھیے (ملاحظہ ہو ان کی احکام القرآن)[1] تعصب کے سوا اس کی اور کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟ اور تمام مذاہب میں یہ عصبیت اور تلخی تقریباً ملتی ہے۔

اس لیے شاہ صاحب نے سابقہ نظریے پر عمل کے لیے ایک اور راہ اختیار فرمائی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس کے سوا کوئی دوسری راہ ہے بھی نہیں۔

شاہ صاحب "المقالة الوضية في النصيحة والوصية" میں فرماتے ہیں:

"وصیت اول ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب وسنت در اعتقاد وعمل و پیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن و اگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن و در عقائد مذہب قدمائے اہلِ سنت اختیار کردن و از تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن و بہ تشکیکات معقولیان خام التفات نکردن و در فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن و دائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب و

[1] أحكام القرآن لابن العربي (١/ ٢٧٤، ٤١٠)

سنت عرض نمودن و آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والاّ کالائے بد بریش خاوند دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنا حاصل نیست وسخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمے را دست آویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن و بدیشاں التفات نہ کردن وقربتِ خدا جستن بدوری اینان۔'' (تفہیمات: ۲/ ۲۴۰)

''فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمسک کرے اور ان دونوں کو اپنا مشغلہ قرار دے۔ اور ہر دو سے کچھ حصہ روزانہ پڑھے اور اگر پڑھ نہ سکے تو چند اوراق کا ترجمہ سنے۔ اور عقائد میں سلف اہلِ سنت کی روش اختیار کرے اور ائمہ سلف کی طرح موشگافیوں سے بچے اور خام کار معقولیوں کی شک آفرینیوں سے بچے۔ اور فرعی مسائل میں ان محدثین کا اتباع کرے جو حدیث اور فقہ دونوں سے پوری طرح واقف ہوں، اور فقہی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت پر پیش کرے۔ جو موافق ہو اسے قبول کرے ورنہ بالکلیہ نظر انداز کر دے۔ اُمت کو اپنے اجتہادات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہوا۔ اور ضدی قسم کے فقیہ حضرات جنھوں نے بعض اہلِ علم کی تقلید کو دین کا سہارا بنا رکھا ہے اور کتاب و سنت سے اعراض ان کا شیوہ ہے، اُن کی بات تک نہ سننا اور ان کی طرف نگاہ مت اٹھانا اور ان سے دور رہنے میں ہی خدا کا قرب تلاش کرنا۔''

تھوڑا بہت جاننے والوں کے لیے تو فقہائے محدثین ہی کی راہ صحیح ہوسکتی ہے، البتہ عوام کو ضرورت کے وقت حنفی اور شافعی فقہ کو کم از کم ملا لینا چاہیے۔ اور کم از کم ان دونوں فقہوں سے جو بھی "أوفق بالكتاب والسنة" (کتاب وسنت کے زیادہ قریب) ہو، اختیار کر لینا چاہیے۔

"وَنَحْنُ نَأْخُذُ مِنَ الْفُرُوْعِ مَا اتَّفَقَ عَلَيْهِ الْعُلَمَاءُ؛ لَا سِيَّمَا هَاتَانِ الْفِرْقَتَانِ الْعَظِيْمَتَانِ الْحَنَفِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ، وَخُصُوْصًا فِيْ الطَّهَارَةِ وَالصَّلَاةِ فَإِنْ لَّمْ يَتَيَسَّرِ الْإِتِّفَاقُ، وَاخْتَلَفُوْا فَنَأْخُذُ بِمَا يَشْهَدُ لَهُ ظَاهِرُ الْحَدِيْثِ وَمَعْرُوْفُهُ"

(تفہیمات: ۲/ ۲۰۲)

''ہم فروعی مسائل میں ان مسائل پر عمل کی کوشش کرتے ہیں جن پر علماء متفق ہوں، خصوصاً دو بڑے گروہ حنفی اور شافعی۔ طہارت اور نماز کے مسائل میں یہ طریقہ اور بھی پسندیدہ ہے۔ اگر اس میں اتفاق نہ ہوسکے تو جو ظواہرِ حدیث کے موافق ہو، ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔''

آج کل کی تلخیوں اور ان کے پس منظر کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہندوستان میں مسلک اہلِ حدیث کا مقصد اسی نوعیت کا اتفاق تھا جسے فرقہ وارانہ عصبیت نے ہیبت ناک صورت دے دی۔ آج ایک آزاد ملک میں تقلیدِ شخصی اور فقہی جزئیات پر زور دیا گیا یا حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ صرف حنفیت کو اسلام کا مرادف سمجھے تو اس کے نتائج اسلام کے لیے اور مسلمانوں کے لیے اچھے نہیں ہوں گے۔ فتاویٰ عالمگیری اپنے وقت کا بہت بڑا دینی اور علمی کارنامہ ہے جس کی تشکیل اور تاسیس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ صاحب کے والد حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ صاحب بھی شامل تھے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی دور اندیش نگاہ آنے والے فتنوں کے لیے اسے کافی نہیں سمجھتی۔ وہ ان فقہی استحسانات کو دین اور شریعت کا نام دینا اور اصولِ فقہ کو شرعی دستاویز قرار دینا پسند نہیں کرتے۔

ان کا منشا یہ ہے کہ مذاہبِ اربعہ کے علاوہ فقہائے محدثین کی راہ کو بھی ان کے ساتھ ملا کر ملک میں ایک ایسے فقہی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی جائے جس میں نہ حافظ ابن حزم کی ظاہریت ہو جس سے نصوص میں بھدا پن پیدا ہو اور آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی فصاحت و بلاغت اور حسنِ ادا نظر انداز ہو جائے، اور نہ قیاس اور رائے کو اس قدر اہمیت حاصل ہو کہ قوتِ فیصلہ علماء کی موشگافیوں اور حیل آفرینیوں کے ہاتھ میں چلی جائے، اور نصوصِ شرعیہ اس حیران کن منظر میں صرف تماشائی ہو کر رہ جائیں، جیسے متاخرینِ فقہاء نے فرضی صورتوں سے دین کا نیا محل تعمیر فرما دیا، قاضی خان، شامی، الاشباہ والنظائر، ان کے سامنے ان علوم اور ان کی ہمہ گیر تعلیمات انگشت بدنداں ہو کر رہ گئیں۔

ایک بہت بڑا مغالطہ اور اہلِ حدیث:

کچھ مدت سے عوام میں ایک مغالطے کی اشاعت ہو رہی ہے اور اچھے سنجیدہ اور پڑھے لکھے حضرات کو اس میں مبتلا پایا گیا ہے۔ وہ مغالطہ یہ ہے:

"اہلِ حدیث کوئی مکتبِ فکر نہیں بلکہ حفاظِ حدیث اور اس فن کے ماہرین کو اہلِ حدیث کا نام دیا گیا ہے۔"

اس مغالطے کی حمایت ہمارے ملک کی بعض تحریکات نے بھی کی ہے اور بعض کم سواد حضرات نے بھی اپنی تحریروں میں اس خیال کا اظہار فرمایا۔ اس کے دو ہی سبب ہیں: قلتِ مطالعہ یا پھر تعصب کے ساتھ سیاہ دلی!!

اس میں کچھ شک نہیں کہ فنِ حدیث اور اس کے حفظ و ضبط کا دل پسند مشغلہ مذاہبِ اربعہ میں رہا ہے، اور ان مکاتبِ فکر کے علماء نے فنِ حدیث اور اس کے خوادم فنِ رجال، اصولِ حدیث وغیرہ کی خدمت کی لیکن یہ حضرات اس خدمت کے باوجود فہمِ حدیث کے معاملے میں اپنے پیش رو امام ہی کے انداز سے سوچتے ہیں، جیسے حافظ طحاوی، علامہ ترکمانی، حافظ بیہقی، حافظ بدر الدین عینی، حافظ ابن حجر عسقلانی۔ یہ حضرات حدیث کی بہترین خدمت کے باوجود طریقِ فکر کے لحاظ سے یا حنفی ہیں یا شافعی۔ اسی طرح موالک اور حنابلہ میں بھی ایسے خدامِ حدیث موجود ہیں جو فکر کے لحاظ سے مالکیت یا حنبلیت کے پابند ہیں۔ وہ احادیث کے مفہوم کو سوچتے وقت اپنے ائمہ کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بلکہ ان کے تحقیقی ارشادات پر غور فرمایئے تو اپنے مخالفین کے خلاف بعض اوقات خاصا تشدد نظر آئے گا۔ اس کے باوجود وہ حدیث کے خادم ہیں۔

اہلِ حدیث مکتبِ فکر:

لیکن اہلِ حدیث مکتبِ فکر اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو اپنے افکار میں ان شخصی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ مجتہد ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ شخصی اجتہادات کے پابند نہیں بلکہ ان بزرگوں کے لیے مواد اور دلائل فراہم فرماتے ہیں۔ خود بھی پیش آمدہ مسائل پر کتاب اللہ اور سنت اور ائمۂ سلف کے ارشادات کی روشنی میں غور فرماتے ہیں۔ ائمۂ اربعہ کے اجتہادات سے موافقت ہو یا مخالفت، اس کے لیے وہ چنداں فکر مند نہیں ہوتے بلکہ ان کی نظر مصالح پر ہوتی ہے۔

1- شاہ صاحب نے حجۃ اللہ میں ایک باب کا عنوان ہی یہ رکھا ہے:

"بَابُ الْفَرْقِ بَيْنَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَأَهْلِ الرَّأْيِ"

عنوان سے ظاہر ہے کہ دو مکتبِ فکر کا تذکرہ ہوگا۔ پھر اہلِ حدیث کے چند اصول[1] ذکر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

"فَإِنْ عَجَزُوْا عَنْ ذٰلِكَ أَيْضًا تَأَمَّلُوْا فِيْ عُمُوْمَاتِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، وَإِيْمَا

[1] ان اصول کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ جماعتِ اسلامی اور اس کے ہمدرد حضرات نے گزشتہ ایام میں اس مغالطے کی کافی اشاعت فرمائی تھی۔ ممکن ہے جماعت کے لیے یہ مغالطہ مفید ہو۔ علمی اور تحقیقی طور پر یہ قطعاً غلط ہے۔ تاریخی شواہد اس کے خلاف ہیں۔ [مؤلف]

آتِيهِمَا وَاقْتِضَا آتِيهِمَا، وَحَمَلُوا نَظِيرَ الْمَسْأَلَةِ عَلَيْهَا فِي الْجَوَابِ إِذَا كَانَتَا مُتَقَارِبَتَيْنِ بَادِيَ الرَّأْيِ، لَا يَعْتَمِدُونَ فِي ذٰلِكَ عَلىٰ قَوَاعِدَ مِنَ الْأُصُولِ، وَلٰكِنْ عَلىٰ مَا يَخْلُصُ إِلَى الْفَهْمِ، وَيَثْلُجُ بِهِ الصَّدْرُ كَمَا أَنَّهُ لَيْسَ مِيزَانُ التَّوَاتُرِ عَدَدُ الرُّوَاةِ، وَلَا حَالُهُمْ وَلٰكِنَّ الْيَقِينَ الَّذِي يَعْقِبُهُ فِي قُلُوبِ النَّاسِ، كَمَا نَبَّهْنَا عَلىٰ ذٰلِكَ فِي بَيَانِ حَالِ الصَّحَابَةِ" (حجة الله: ١/ ١١٩)

"اگر سابقہ اصولوں کے مطابق مسئلہ طے نہ ہوسکے تو کتاب و سنت کے ارشادات و اقتضاءات کو دیکھتے اور پیش آمدہ مسئلے کے نظائر اور ان کے حکم پر غور کرتے اور جواب تلاش کرتے ہیں۔ جب وہ نظائر صراحتاً متقارب ہوں تو اصولِ فقہ کے قواعد کو چنداں ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ قلبی سکون اور طمانیت کو ملحوظ رکھتے ہیں، جیسے تواتر میں اصل چیز عددِ روات نہیں بلکہ اصل چیز یقین اور اطمینان ہے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اہلِ حدیث محض فن کے حفاظ کا نام نہیں بلکہ ان کے نزدیک فہم و استدلال کے لیے کچھ اصول ہیں جو کتاب و سنت ہی سے ماخوذ ہیں۔ وہ تقلیدی نہیں بلکہ ان سے یقین اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

"میں نے سنا ہے کہ گروہ صرف دو ہیں: اہلِ ظاہر اور اہل الرائے۔ تیسرا کوئی گروہ نہیں۔ جو بھی قیاس کرے اور استنباط کرے وہ اہل الرائے ہے، یہ قطعاً غلط ہے۔ اور رائے سے مراد عقل اور فہم نہیں کیوں کہ اس کے سوا تو اہلِ علم کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں، اور نہ اس سے وہ رائے مراد ہے جس کا کتاب و سنت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ یہ تو کوئی مسلمان پسند ہی نہیں کرسکتا۔ اور نہ رائے استنباط اور قیاس پر قدرت ہی کا نام ہے، کیوں کہ امام احمد، اسحاق بلکہ امام شافعی قیاس اور استنباط فرماتے ہیں لیکن وہ بالاتفاق اہل الرائے نہیں ہیں۔ بلکہ اہل الرائے سے مراد وہ حضرات ہیں جو اجماعی اور جمہور ائمہ میں متفقہ مسائل کے علاوہ متقدمین سے کسی متعین بزرگ کے اصولوں پر استنباط اور تخریج فرماتے ہیں۔ اور نظائر کو نظائر پر محمول فرماتے ہیں۔ اور معینہ اصولوں کی طرف رجوع فرماتے ہیں۔ اور اس کے لیے احادیث و آثار کے تتبع کا تکلف نہیں فرماتے۔ اور ظاہری علماء حافظ ابن حزم اور

داود ظاہری حضرات قیاس اور آثار دونوں کو حجت نہیں سمجھتے، اور محققین اہلِ سنت، اہل الرائے اور اہلِ ظاہر کے بین بین ہیں۔“[1]

شاہ صاحب کے اس ارشاد سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

① اہلِ حدیث صرف اہلِ فن نہیں بلکہ یہ ایک مکتبِ فکر ہے۔

② فقہائے کوفہ کے علاوہ باقی ائمۂ اجتہاد اہلِ حدیث ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اَتباع اور مقلدین گو اہلِ حدیث نہ کہلاسکیں۔

③ اہلِ حدیث قیاسِ جلی اور نظائر کے حکم کو مانتے ہیں اور اجتہاد و استنباط کے قائل ہیں۔

④ اہلِ حدیث اور اہلِ ظاہر دو مختلف مکتبِ فکر ہیں اور اہل الرائے ان دونوں سے الگ ہیں۔

⑤ اہلِ حدیث کتاب و سنت کے علاوہ صحابہ اور سلف کے ارشادات کو اصل سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے فہم اور استنباط کی بنیاد رکھتے ہیں۔

⑥ اہل الرائے مسائل کے استنباط میں مخصوص اہلِ علم کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ کتاب و سنت ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتے۔

⑦ اہلِ حدیث مکتبِ فکر اہل الرائے اور اہلِ ظاہر کے علاوہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس قسم کی تصریحات حجۃ اللہ کے علاوہ تفہیمات، الانصاف اور عقد الجید وغیرہ میں بھی فرمائی ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتاویٰ عزیزیہ اور تفسیر فتح العزیز میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ صراطِ مستقیم میں حضرت سید احمد شہید نے بھی جمود اور مروجہ تقلید کے متعلق کافی وضاحت فرمائی ہے۔ ان تصریحات کی تائید شاہ اسماعیل شہید نے بھی فرمائی ہے۔ علامہ شوکانی نے ”القول المفید“ میں بقدرِ ضرورت تفصیل کے ساتھ ائمۂ حدیث کے مسلک کی وضاحت فرمائی ہے۔

2- ”إیقاظ همم أولي الأبصار“ میں امام یحییٰ فلانی نے بھی محدثین کے مسلک کی تائید فرمائی ہے۔ اسی طرح حافظ ابن قتیبہ نے ”تأویل مختلف الحدیث في الرد علی أعداء أهل الحدیث“ میں فرمایا۔ ابن عبدالبر نے ”جامع بیان العلم وفضله“ میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث کا تذکرہ فرمایا اور مسلک اہلِ حدیث کو راجح اور صحیح تصور کیا ہے۔ ان تصریحات

① حجة الله البالغة (١/ ١٢٩)

کے لیے وقت اور کسی دوسری صحبت کی ضرورت ہے۔ حقیقت پسند آدمی ان تصریحات کا مطالعہ کرے تو اسے یقین ہو گا کہ اہلِ حدیث محض حفاظِ حدیث کا نام نہیں بلکہ ان حضرات کا طریقِ فکر ہے جس میں تفقہ اور اجتہاد کی بنیاد کتاب وسنت اور سلفِ امت کے ارشادات پر رکھی گئی ہے۔ تقلیدِ شخصی اور جمود کے لیے اس مسلک میں کوئی کام نہیں۔

3- شہرستانی (۵۴۸ھ) دورِ جمود کے آغاز سے بہت قریب ہیں۔ فرق اور مذاہب کے اجتماع اور افتراق پر ان کی نظر غائر اور وسیع ہے۔ ان کی کتاب "الملل والنحل" اس موضوع کی مستند دستاویز میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کی تصریحات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث ایک مکتبِ فکر ہے جسے فقہی مکاتب میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ محض حدیث کی خدمت کا نام نہیں۔

"ثُمَّ الْمُجْتَهِدُوْنَ مِنْ أَئِمَّةِ الْأُمَّةِ مَحْصُوْرُوْنَ فِيْ صِنْفَيْنِ، لَا يَعْدُوَانِ إِلٰى ثَالِثٍ: أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ وَأَصْحَابُ الرَّأْيِ. أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ هُمْ أَهْلُ الْحِجَازِ، وَأَصْحَابُ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ، وَأَصْحَابُ مُحَمَّدِ بْنِ إِدْرِيْسَ الشَّافِعِيِّ، وَأَصْحَابُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، وَأَصْحَابُ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ، وَأَصْحَابُ دَاوٗدَ بْنِ عَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ الْأَصْفَهَانِيِّ، وَإِنَّمَا سُمُّوْا أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ؛ لِأَنَّ عِنَايَتَهُمْ بِتَحْصِيْلِ الْأَحَادِيْثِ، وَنَقْلِ الْأَخْبَارِ، وَبِنَاءِ الْأَحْكَامِ عَلَى الْمَنْصُوْصِ، وَلَا يَرْجِعُوْنَ إِلَى الْقِيَاسِ الْجَلِيِّ وَالْخَفِيِّ مَا وَجَدُوْا خَبَرًا أَوْ أَثَرًا" (الملل والنحل: ۲/ ۲۵ بر حاشیہ کتاب الفصل لابن حزم)

"ائمہ مجتہدین کی دو ہی قسمیں ہیں: اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے۔ اصحاب الحدیث کا مسکن حجاز ہے۔ امام مالک اور ان کے تلامذہ، امام شافعی اور ان کے شاگرد، سفیان ثوری اور ان کے رفقاء، امام احمد کے ساتھی اور امام داود ظاہری کے خدام، انھیں اہلِ حدیث اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی توجہ حدیث اور اخبار کی طرف ہے اور وہ احکام کی بنیاد نصوص پر رکھتے ہیں۔ جب تک حدیث موجود ہو وہ قیاسِ جلی اور خفی کی پروا نہیں کرتے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"أَصْحَابُ الرَّأْيِ وَهُمْ أَهْلُ الْعِرَاقِ، هُمْ أَصْحَابُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ بْنِ

ثَابِتٍ، وَمِنْ أَصْحَابِهِ: مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ، وَأَبُوْ يُوْسُفَ يَعْقُوْبُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْقَاضِيُ، وَزُفَرُ بْنُ هُذَيْلٍ، وَالْحَسَنُ بْنُ زِيَادِ اللُّؤْلُؤِيُّ، وَابْنُ سَمَاعَةَ، وَعَافِيَةُ الْقَاضِيُ، وَأَبُوْ مُطِيْعِ الْبَلَخِيُّ، وَبِشْرٌ الْمِرِّيْسِيُّ، وَإِنَّمَا سُمُّوْا أَصْحَابَ الرَّأْيِ؛ لِأَنَّ أَكْثَرَ عِنَايَتِهِمْ بِتَحْصِيْلِ وَجْهٍ مِنَ الْقِيَاسِ وَالْمَعْنَى الْمُسْتَنْبَطِ مِنَ الْأَحْكَامِ، وَبِنَاءِ الْحَوَادِثِ عَلَيْهَا، وَرُبَّمَا يُقَدِّمُوْنَ الْقِيَاسَ الْجَلِيَّ عَلٰى أَخْبَارِ الْآحَادِ" (الملل والنحل للشهرستاني: ٢/ ٤٢)

''اہلِ عراق کو اصحاب الرائے کہا جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ ہیں۔ انھی میں امام محمد، امام ابو یوسف قاضی، زفر، حسن بن زیاد، ابن سماعہ، قاضی عافیہ، ابومطیع بلخی اور بشر مریسی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ انھیں اصحاب الرائے اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ قیاس اور معانی کے استنباط کی طرف ہے اور احکام کی بنا قیاس پر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات قیاسِ جلی کے سامنے خبرِ واحد کی بھی پروا نہیں کرتے۔''

حجۃ اللہ کا مقام "باب الفرق بين أهل الحديث وأهل الرأي" شہرستانی کے اسی مقام کی شرح معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا مقصد اس وقت اس جہالت آمیز غلط فہمی کی اصلاح ہے جو بعض علمی حلقوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہے کہ ''اہلِ حدیث محض فنی خدمت کا نام ہے۔''

شہرستانی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں قدیم مکتبِ فکر ہیں جو اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا باہم ردوتردید کا مشغلہ تو رہا ہے مگر کسی نے ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی۔

شہرستانی کے دونوں اقتباسات سے ظاہر ہے کہ اصحاب الحدیث ایک مکتبِ فکر ہے جس نے احادیث کے متون اور اسانید کی حفاظت فرمائی، پھر اس پر فقہی تبویب فرمائی، فروع اور عقائد کی صحت پر استدلال فرمایا۔ شخصی آراء تو ان کے ہاں کوئی قیمتی چیز نہیں، اس لیے فقہائے عراق یا دوسرے فقہاء کی طرح ان لوگوں نے اپنی فقہ ایجاد نہیں فرمائی تاکہ لوگ اس پر تقلیدی انداز میں اعتماد نہ کرنے لگیں۔ لیکن کتاب و سنت سے استنباط کی راہیں اور قیاسِ صحیح کے استعمال کی راہ کھولی۔ شخصی آراء پر نصوصِ شرعیہ کی برتری کو واضح کیا اور فقہ الحدیث کا بہت بڑا ذخیرہ اہلِ علم کے سامنے رکھ دیا۔

4- تاریخ کے امام اور تنقید کے مؤسس علامہ عبدالرحمان ابن خلدون (۸۰۸ھ) کا ایک اقتباس قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں:

”وَانْقَسَمَ الْفِقْهُ فِيهِمْ إِلىٰ طَرِيقَيْنِ: طَرِيقِ أَهْلِ الرَّأْيِ وَالْقِيَاسِ، وَهُمْ أَهْلُ الْعِرَاقِ، وَطَرِيقُ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَهُمْ أَهْلُ الْحِجَازِ، وَكَانَ الْحَدِيثُ قَلِيلًا فِي أَهْلِ الْعِرَاقِ لِمَا قَدَّمْنَاهُ، فَاسْتَكْثَرُوا مِنَ الْقِيَاسِ، وَمَهَرُوا فِيهِ، فَلِذٰلِكَ قِيلَ: أَهْلُ الرَّأْيِ، وَمُقَدَّمُ جَمَاعَتِهِمُ الَّذِي اسْتَقَرَّ الْمَذْهَبُ فِيهِ وَفِي أَصْحَابِهِ أَبُو حَنِيفَةَ“ (مقدمة ابن خلدون، ص: ۳۸۹)

”فقہ کی دو قسمیں ہوگئیں: فقہ اہل الرائے جن کا مرکز عراق ہے اور فقہ اہلِ حدیث جن کا مرکز حجاز ہے۔ اہلِ عراق میں حدیث کا چرچا کم تھا اور وہ قیاس میں ماہر تھے۔ ان کے امام حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔“

ابن خلدون کا تاریخی مقام پڑھے لکھے لوگوں سے مخفی نہیں۔ ان کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ اہلِ حدیث کو محض حفظِ حدیث تک محدود رکھنا تاریخ سے بہت بڑی بے خبری ہے یا عصبیت کی وجہ سے دیانت میں نقص!

5- اسی طرح ایک اقتباس علامہ ابو منصور عبدالقاہر بغدادی (۴۲۹ھ) کا گزر چکا ہے۔

6- علامہ کاتب چلپی کی نظر اصحابِ مذاہب اور ان کی تصنیف پر جس قدر ہے وہ ان کی کتاب ”کشف الظنون“ سے ظاہر ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”وَأَكْثَرُ التَّصَانِيفِ فِي أُصُولِ الْفِقْهِ لِأَهْلِ الْاِعْتِزَالِ الْمُخَالِفِينَ لَنَا فِي الْأُصُولِ، وَلِأَهْلِ الْحَدِيثِ الْمُخَالِفِينَ لَنَا فِي الْفُرُوعِ“ [1]

(كشف الظنون، ص: ۸۹، أبجد العلوم: ۱/۳۲۵)

معلوم ہے جو لوگ اصولِ فقہ میں اصحاب التصانیف ہیں وہ محض الفاظ کے حافظ نہیں، وہ فہم الفاظ میں بھی تحقیقی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اصولِ فقہ پر دقیق نظر ہے، اس لیے انھیں فنکار کہنا کسی فنکار ہی کا کام ہے، کوئی عالم یہ جرأت نہیں کر سکتا۔

[1] ترجمہ: ”اصولِ فقہ میں اکثر کتابیں معتزلہ کی تحریر کردہ ہیں جو اصول میں ہمارے مخالف ہیں، یا پھر اہلِ حدیث کی ہیں جو فروع میں ہمارے مخالف ہیں۔“

اہلِ حدیث اور متکلمین:

دوسری صدی میں صفاتِ باری کے متعلق فلاسفہ اور متکلمین نے جو دھاندلی مچائی، تاریخِ مذاہب کے غواص اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ اس دور میں اہلِ حدیث نے جس پامردی سے ان فتنوں کا مقابلہ کیا وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے۔ قید و بند کے مصائب اہلِ حدیث نے جس طرح برداشت کیے وہ ایسی داستان نہیں جسے بھلایا جا سکے۔ یہ ہنگامہ دوسری صدی سے شروع ہو کر تقریباً آٹھویں صدی تک رہا۔ اس دور کے متکلمین اور فقہائے محدثین کی تصانیف میں اہلِ حدیث کا تذکرہ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اربابِ تاویل کے سامنے ظواہر نصوص پر اڑنا اور مخالفین سے نمٹنا آسان نہ تھا لیکن اس وقت اہلِ حدیث نے یہ جنگ بڑی جواں مردی سے لڑی۔ مامون الرشید سے شروع ہو کر متوکل علی اللہ کی حکومت تک ان پر کیا گزری، اسے تاریخ کے طالبِ علم خوب جانتے ہیں۔ اس دور کی ان کتابوں میں یہ مباحث موجود ہیں۔ اہلِ حدیث کا تذکرہ جس انداز سے آیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ محض الفاظ کے حافظ اور فنکار نہیں بلکہ ان کی نظر معانی کی روح اور ان کے دُور رس عواقب پر رہی۔

حافظ ابن القیم اور ان کے استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس معرکۂ رستخیز اور اس میدانِ کارزار کے بہادر سپاہی ہیں۔ اپنی تصانیف میں ان مباحث کا ذکر فرماتے ہوئے اہلِ حدیث کا ذکر جس عقیدت سے کرتے ہیں وہ صرف حفظِ الفاظ کی وجہ سے نہیں۔ اعتزال و تجہم اور تشبیہ و تعطیل کے خارزار میں ظواہر نصوص کا ساتھ دینا معمولی بات نہیں۔

7- حافظ ابن قیم کی کتاب "الكافية الشافية في الانتصار للفرقة الناجية" اس معرکۂ کارزار کا رجز ہے جس میں وہ بار بار اہلِ حدیث کا تذکرہ ان لوگوں میں کرتے ہیں جنھوں نے فلاسفہ اور متکلمین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنت کی حمایت فرمائی اور تاویل کی دھاندلیوں سے عامۃ المسلمین کو بچایا۔ چند حوالے ملاحظہ فرمایئے۔

لَا تَبۡهَتُوا أَهۡلَ الۡحَدِيۡثِ بِهِ فَمَا ذَا قَوۡلُهُمۡ تَبًّا لِذِيۡ الۡبُهۡتَانِ[1]

"اہلِ حدیث پر بہتان مت لگاؤ، بہتان لگانے والوں کی حالت قابلِ افسوس ہے۔"

[1] القصيدة النونية (ص: ١٤٥)

هٰذَا هُوَ الْحَشَوِيُّ لَا أَهْلُ الْحَدِيْثِ أَئِمَّةُ الْإِسْلَامِ وَالْإِيْمَانِ

''حشوی دراصل یہ لوگ ہیں، اہلِ حدیث تو اسلام اور ایمان کے امام ہیں۔''

أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمْ بِهَا أَهْلَ الْحَدِيْثِ وَنَاصِرِيْ الْقُرْآنِ وَالْإِيْمَانِ [1]

''تم نے اہلِ حدیث کے کئی نام رکھے ہیں اور وہ صرف قرآن اور ایمان کے معاون ہیں۔''

مِنْ سَبِّهِمْ أَهْلَ الْحَدِيْثِ وَذَنْبُهُمْ أَخْذُ الْحَدِيْثِ وَتَرْكُ قَوْلِ فُلَانٍ

''یہ اہلِ حدیث کو گالیاں دیتے ہیں حالانکہ ان کا جرم صرف حدیث پر عمل ہے اور اقوالِ رجال کو ترک کرنا ہے۔''

وَكَذَاكَ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ فَإِنَّهُمْ ضُرِبَتْ لَهُمْ وَلَكُمْ بِذَا مَثَلَانِ [2]

''اسی طرح اہلِ حدیث کی اور تمھاری دو الگ الگ مثالیں ہیں۔''

وَإِلَىٰ أُوْلِي الْعِرْفَانِ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ خُلَاصَةُ الْإِنْسَانِ وَالْأَكْوَانِ

''اہلِ حدیث ہی اصحابِ معرفت ہیں اور انسانیت کا خلاصہ۔''

قصیدہ نونیہ کا شاید ہی کوئی ورق ہو جس میں کسی نہ کسی طریق سے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کا تذکرہ نہ آیا ہو۔

8- علامہ بزدوی خبر واحد کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

''قَالَ بَعْضُ أَهْلِ الْحَدِيْثِ: يُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ'' [3]

''بعض اہلِ حدیث کا کہنا ہے کہ خبرِ واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔''

9- اُصول بزدوی کے شارح علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں:

''ذَهَبَ أَكْثَرُ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ إِلىٰ أَنَّ الْأَخْبَارَ الَّتِيْ حَكَمَ أَهْلُ الصَّنْعَةِ بِصِحَّتِهَا تُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ'' [4]

''اکثر اصحاب الحدیث کا خیال ہے کہ جن خبروں کو اصحابِ فن نے صحیح فرمایا ہے، ان سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔''

---

[1] القصيدة النونية (ص: ١٤٦)

[2] القصيدة النونية (ص: ١٥٢)

[3] أصول البزدوي (ص: ١٥٤)

[4] كشف الأسرار (٢/ ١٩١)

علامہ عبدالعزیز بخاری مرسل کی حجیت کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ حدیث پر طعن فرماتے ہیں:

”إِنَّهُمْ سَمَّوا أَنْفُسَهُمْ أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ، وَانْتَصَبُوْا أَنْفُسَهُمْ لِحِيَازَةِ الْأَحَادِيْثِ وَالْعَمَلَ بِهَا، ثُمَّ رَدُّوْا مِنْهَا مَا هُوَ أَقْوىٰ أَقْسَامِهَا“[1]

”یہ لوگ اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں اور حدیث پر عمل اور اس کی حفاظت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کی قوی ترین اقسام کا انکار کرتے ہیں۔“

یہ تلخ نوائی محض حفظِ الفاظ پر نہیں۔ یہ تحقیقی مسئلہ ہے جس میں اہلِ حدیث کی رائے قدمائے احناف کے خلاف ہے۔

دوسرے مقام پر اسی کشف الاسرار میں انبیاء کے لیے رائے اور اجتہاد کے جواز کا تذکرہ فرماتے ہیں:

”هُوَ مَنْقُوْلٌ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ مِنْ أَصْحَابِنَا، وَهُوَ مَذْهَبُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَعَامَّةِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ“[2]

”انبیاء کے لیے اجتہاد کی اجازت ہے۔ امام ابو یوسف، مالک، شافعی اور اکثر اہلِ حدیث کا یہی مذہب ہے۔“

اس میں مذہب اہلِ حدیث کا تذکرہ بیسیوں مقامات پر آیا ہے۔ حسامی کی شرح غایۃ التحقیق میں اکثر مقامات پر اہلِ حدیث کا ذکر موجود ہے۔[3]

اس لیے اہلِ حدیث سے صرف حفاظِ الفاظِ حدیث مراد لینا انتہائی لاعلمی اور بے خبری ہے۔ قدماء کی کتابوں میں دوسرے مکاتبِ فکر کی طرح اہلِ حدیث کا بھی ذکر آتا ہے۔ اصولِ فقہ میں یہ تذکرہ خاص طور پر ملتا ہے کیوں کہ حسبِ ارشاد علامہ کاتب چلپی اس فن کے تو بانی ہی معتزلہ ہیں اور اصحاب الحدیث۔ البتہ متاخرین میں عصبیت بڑھتی گئی اور اقتدار بھی اہلِ تعصب کے ہاتھوں میں آ گیا تو حکومت اور اقتدار کے نشے میں اہلِ حدیث کا ذکر کم ہوتا گیا اور نفرت بڑھتی گئی۔

تیسری صدی تک تو پورے فارس پر مسلک اہلِ حدیث کا اقتدار تھا۔ مصنفینِ صحاح اور دوسرے علمِ حدیث کے مدوّن زیادہ تر اسی علاقے کے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی حضرات کو توفیق بخشی

[1] كشف الأسرار (٣/ ٢٢٥) [2] كشف الأسرار (٣/ ٩٢٥)

[3] مثلاً دیکھیں: غاية التحقيق (ص: ١٨) طبع نول کشور، لکھنؤ

کہ علوم کو آیندہ آنے والے لوگوں تک پہنچائیں اور انھوں نے یہ فرض ادا فرمایا۔ فَجَزَاهُمُ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

ان حضرات کی علوم پر نظر کا یہ حال تھا کہ تجوید میں بھی ان کی رائے کا تذکرہ ایک مکتبِ فکر کے لحاظ سے ہوا ہے۔ ائمۂ قراءت میں اختلاف ہے کہ آیت ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ہے یا نہیں۔ تجوید اور قراءت کے متعلق مستند کتاب "النشر في القراءات العشر" للعلامة محمد بن محمد الدمشقي (۸۳۳ھ) میں فرماتے ہیں کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف تام ہے۔ "وَهُوَ مَذْهَبُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَأَكْثَرِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ" (۱/ ۲۲۷)

قدمائے اہلِ حدیث ان تمام راہوں سے آگاہ تھے جن پر فقہائے متاخرین کو ناز ہے۔

فقہ اور اہلِ حدیث:

بچپن میں سنتے تھے: ''اہلِ حدیث کی مثال عطار کی ہے اور فقہاء کی مثال طبیب کی۔''

اس کا اثر ذہن پر یہ ہوتا تھا کہ شاید یہ دو گروہ ہیں۔ فقہاء عطاری نہیں کرتے اور اہلِ حدیث حدیث کے طبیب نہیں ہوتے، لیکن جب علومِ حدیث اور دفاترِ سنت دیکھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ یہ دو فرقے نہیں بلکہ عملی زندگی میں طبعی رجحانات کے مطابق ایک خاص طریق ہے جسے پسند کر لیا گیا۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ محدثین فقہ نہیں جانتے، نہ یہ درست ہے کہ فقہاء حدیث نہیں جانتے۔ قدرت نے سب کو استعداد عطا فرمائی ہے۔ جس کام کے لیے کسی نے اس استعداد کو استعمال کیا وہ چیز اسے عطا کر دی گئی۔

ائمۂ حدیث کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کے حلقۂ درس میں موجود تھے۔ حدیث کی کتابت اور حفظ و ضبط اور اس میں تفقہ کا مشغلہ اس وقت موجود تھا۔ صحابہ حدیث کا دور اور حفظ اسی طرح فرماتے تھے جس طرح حفاظِ قرآن کرتے ہیں۔ فہم کے لیے بھی اسی طرح محنت کرتے تھے لیکن اس وقت اس کی شکل تذکرے اور نوٹ کی تھی۔ کتاب کی طرح مدون نہ تھی۔ صحابہ اس کے غوامض کو سمجھتے تھے لیکن مروجہ کتبِ فقہ یا شروحِ حدیث کی طرح لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ فقیہ بھی تھے اور محدث بھی۔ اہلِ حدیث بھی تھے اور اصحابِ فقہ بھی۔ کسی چیز کی فنی تدوین دوسری چیز ہے اور اس کا صحیح فہم دوسری چیز۔

صحابہ کے ان تذکروں میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا پورا تذکرہ امام احمد بن حنبل نے مسند میں نقل فرمایا ہے۔[1] حضرت ابوہریرہ کی مسند بواسطہ ہمام بن منبہ مطبوعہ موجود ہے۔ تابعین کا یہ سلسلہ اور بڑھ گیا اور یہ نوٹ اور ضخیم ہوگئے۔ زہری، ابن عیینہ، عمر بن عبدالعزیز کے تذکرے اب بھی دستیاب ہوسکتے ہیں۔ مسند احمد میں یہی نوٹ بصورتِ مسانید موجود ہیں اور یہ ضخیم چھے جلدوں میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ صدیوں سے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ یہ دور فقہاء اور محدثین کا ہے۔ وہ احادیث کو حفظ بھی کرتے ہیں۔ اس کے مضمون کو سمجھ کر اس کی روشنی میں فتویٰ بھی دیتے ہیں۔ اس کے مواد کے لیے محلّٰی ابن حزم، مغنی ابن قدامہ، مصنف ابن ابی شیبہ ہمارے ہاتھوں میں ہے جس میں آثار کی بڑی مقدار موجود ہے۔ اسے فقہ کہیے یا آثار، ان لوگوں نے قرآن اور سنت سے سمجھ کر یہ فتوے دیے بلکہ محدثین کی فقہ کے لیے تو قرآن وسنت کے بعد یہی آثار اجتہاد اور استنباط کی اساس اور بنیاد ہیں۔ (حجة الله: ١/ ١١٩)

تدوینِ حدیث کا دور:

اس کے بعد تدوینِ حدیث کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس وقت کی مصنفات میں احادیث پر تبویب کی گئی ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، موطا، ابن ماجہ وغیرہ کے مصنفین نے تبویب کی ہے۔ احادیث سے مسائل استنباط فرمائے ہیں جس سے انسان میں قوتِ استنباط پیدا ہوتی ہے۔ مذاہبِ اربعہ کی کتبِ فقہ تو مسائل کی نقل ہے۔ ان کتابوں سے استنباط کا ملکہ مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ضخیم کتابوں کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ فقیہ نہیں۔ ان کا کام الفاظِ حدیث کا حفظ تھا۔ یہ صرف فنکار تھے۔ ایک پڑھا لکھا شخص جسے حدیث کی کتابوں پر سرسری عبور بھی ہو اسے یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ ائمۂ حدیث کو غیر فقیہ کہے۔

امام بخاری کی تبویب نے بڑے بڑے اربابِ فقہ و بصیرت کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ باقی محدثین ابوداود، نسائی، ترمذی، موطا، ابن ماجہ کی تبویب نے ان کے تفقہ اور فقہی بصیرت کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں تک احادیث سے مسائل کے استخراج اور فہم کا تعلق ہے، ائمۂ حدیث کی تبویب میں صحیح اور معیاری فقہ پائی جاتی ہے۔

[1] مسند أحمد (٢/ ٣١٢۔ ٢/ ٣١٩)

اگر فقہ فرضی صورتوں کا نام ہے اور اس سے غیر موجود بلکہ ناممکن الوقوع معاملات اور احکام کا تعلق ہے تو واقعی اہلِ حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث میں اس کا ثبوت نہیں ملے گا۔ یہ خوبی فقہ العراق میں ہوگی لیکن یہ دراصل فقہ نہیں۔ ائمۂ حدیث کا مقام تو مصطلح فقہاء سے کہیں زیادہ ہے۔

فرضی صورتوں پر احکام مرتب کرنا بھی کوئی مشکل چیز نہیں لیکن "عِلْمُ مَا لَمْ يَقَعْ وَالْجَهْلُ عَمَّا وَقَعَ"[1] اہلِ حدیث کے نزدیک اسے فقہ کہنا ہی درست نہیں۔

شاہ ولی اللہ چاہتے ہیں کہ مروجہ فقہ کو حدیث اور آثارِ سلف کی تائید حاصل ہو اور ظاہریتِ خالصہ کو تفقہ اور قیاسِ جلی سے ہم آہنگ کیا جائے۔ ہندوستان میں تحریک اہلِ حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے جسے مستقل طور پر گھبراہٹ کا پیغام سمجھ لیا گیا ہے اور حضراتِ دیو بند اور اربابِ بریلی دونوں اس مکتبِ فکر سے گھبرانے لگے۔ حضراتِ بریلی سے تو کوئی شکوہ نہیں، کیوں کہ وہاں پورا انحصار ہی جذبات اور چند نعروں پر ہے۔ عوام کی پیدا کی ہوئی رسوم اور چند بدعات کا نام شریعت رکھ لیا گیا اور غلط قسم کے رکھ رکھاؤ کو ادب سے تعبیر کر لیا گیا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک یہی چیزیں کتاب و سنت کا نعم البدل ہیں۔ یہ حضرات توحید و سنت کی ٹھوس آواز سے ڈریں تو بجا ہے لیکن تعجب حضراتِ دیو بند سے ہے، وہ بھی وہابی کے لفظ سے اس قدر گھبرائے کہ میدان چھوڑ گئے!!

سانحہ بالاکوٹ کے بعد ان حضرات کی رسمی تصوف کے ساتھ کچھ ایسی وابستگی ہوئی اور بیعت و ارادت ان میں کچھ اس انداز سے در آئی کہ یہ حضرات بریلی سے بہت قریب پہنچ گئے۔ اذکار و اوراد میں بھی سنت کا معیاری مقام قائم نہ رہ سکا۔ نماز کے وقت اور ہیئت میں بھی تسکین اور اطمینان قریباً ختم ہوگیا۔ خشوع، إنابت، ذوق اور اطمینان برائے نام رہ گیا۔ یہ گراوٹ شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی لیکن بتدریج بڑھتی گئی۔ توحید کا صحیح موقف بعض حضرات میں تو بے شک نمایاں رہا لیکن اکثر ابنائے دیو بند نے قریباً بریلویت کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیک دیے۔ اور جو قافلہ اقامتِ دین اور توحید و سنت کی سرپرستی کے لیے بالاکوٹ کے میدان میں فروکش ہوا تھا، جس نے عہد کیا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے تجدیدی عوامل اور مقاصد کی روشنی میں دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچائیں گے وہ بریلویت سے ڈر کر اور وہابیت کی تہمت سے گھبرا کر دم توڑ گیا اور اپنے موحد ساتھیوں کو چھوڑ کر بریلوی حضرات سے صلح کی راہیں تلاش کرنے لگا۔

[1] فرضی صورتوں کا علم اور پیش آمدہ مسائل سے لاعلمی۔

۶ مئی ۱۸۳۱ء (معرکہ بالاکوٹ) کے بعد یہ گروہ بدستور پسپا ہوتا گیا اور نہ صرف یہ کہ میدانِ وفا سے پیچھے ہٹ گیا بلکہ تحریک کی روح ترکِ جمود اور آزادیِ فکر سے بھی دست کش ہوگیا۔ میں نے سابقہ گزارشات میں شاہ صاحب کی تحریک کے مقاصد کا تذکرہ حضرت شاہ صاحب کی زبان اور حضرت ہی کے ملفوظات سے عرض کیا ہے۔ آپ خود فیصلہ فرمائیں گے کہ شاہ صاحب کے ساتھ انتہائی عقیدت کے باوجود یہ امانت محفوظ نہیں رکھی جاسکی بلکہ شاہ اسحاق کے تلامذہ سے اس کی سرپرستی صرف شیخ الکل حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب اور ان کے تلامذہ نے فرمائی۔

جب تحریک کے سیاسی مقاصد کی تکمیل بظاہر مشکل ہوگئی تو اسے زیرِ زمین لے جا کر اپنی بساط کے مطابق زندہ رکھا گیا۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی صاحب سے شروع ہو کر مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی اور اس کے بعد مولوی ولی محمد اور مولوی فضل الٰہی مرحوم اور محمد حسین مجاہد کوٹ بھوانیداس وغیرہم نے اس کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی۔ رہے حضرات دیوبند سو وہ ملک کی ملی جلی تحریکات میں کام کرتے رہے لیکن یہ خالص دینی تحریک ان کے فیوض سے محروم رہی، تا آنکہ ملک کی تقسیم نے صورت حال کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔

یہ تو سیاسی صورت حال تھی لیکن دینی پہلو سے یہ حضرات شاہ صاحب کے پروگرام سے کافی الگ ہوگئے۔ جس جمود کو شاہ صاحب ختم کرنا چاہتے تھے، دیوبند نے پورے زور سے اس کے اِحیا کی دعوت دی۔ پوری قوت سے اس کی سرپرستی کی۔ اس لیے میری ناقص رائے یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تحریک کے مقاصد کو سیاسی، علمی، معاشی اور فقہی طور پر اپنی بساط کے مطابق جماعت اہلِ حدیث نے پورا کیا، اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے

مرا در عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا در آں کویش را چو جان خویشتن دارم [1]

اربابِ دیوبند کی اس مصلحت اندیشی کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ ان میں توحید کے داعی حضرات کو خارجی کا خطاب دیا جا رہا ہے اور عوام کو مطمئن کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ دیوبندی نہیں ہیں۔

[1] میرا محبوب کے ساتھ وعدہ ہے کہ جب تک بدن میں جان ہے، اس کا عشق دل میں رہے گا۔

اس انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے نئے نئے مسائل پیدا کیے جا رہے ہیں جو اس اہمیت کے ساتھ پہلے کبھی سامنے نہیں آئے۔

شاہ صاحب سے علاحدگی:

اب ایک اور نوجوان گروہ پیدا ہو رہا ہے جسے شاہ صاحب کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ وہ شاہ صاحب کے متعلق عجیب انداز سے بدگمانیاں پیدا کر رہا ہے۔ یہ حضرات علامہ سید محمد زاہد کوثری مصری سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ائمۂ حدیث کے خلاف بدگمانی پیدا کرتے ہیں۔ رجال کے تذکروں میں قطع و برید کر کے ائمۂ حدیث کو بدنام کرتے ہیں۔ ان کے موجودہ گروہ سے ایک قابلِ احترام بزرگ ابن ماجہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کے متعلق فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا مَا قَالَ رحمه الله: وَإِنْ شِئْتَ حَقِيقَةَ مَا قُلْنَاهُ فَلَخِّصْ أَقْوَالَ إِبْرَاهِيمَ مِنْ كِتَابِ الْآثَارِ لِمُحَمَّدٍ وَجَامِعِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ الخ. فَهٰذَا دَأْبُهُ فِي تَصَانِيفِهِ إِذَا أَتىٰ بِدَعْوىٰ يَأْتِي بِكَلَامٍ يُدْهِشُ النَّاظِرَ. الخ“ (ما تمس إليه الحاجة، ص: ١٤)

یعنی شاہ ولی اللہ صاحب کا خیال ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ عموماً حضرت ابراہیم نخعی کے خیالات کا تتبع فرماتے ہیں۔ ان کے اجتہاد اور فقہ پر حضرت امام نخعی کا بہت زیادہ اثر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی معاملے کے متعلق لکھتے ہیں تو دہشت پھیلا دیتے ہیں (حالانکہ بات فی الحقیقت اس طرح نہیں ہوتی۔)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

”فَنَحْنُ بِحَمْدِ اللّٰهِ قَدْ طَالَعْنَا كِتَابَ الْآثَارِ، وَلَخَّصْنَا أَقْوَالَ إِبْرَاهِيمَ النَّخْعِيِّ رضي الله عنه، ثُمَّ قَايَسْنَاهُ بِمَذْهَبِ الْإِمَامِ فَوَجَدْنَا الْإِمَامَ يَجْتَهِدُ كَمَا اجْتَهَدَ النَّخَعِيُّ وَأَقْرَانُهُ، وَنَرَاهُ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْمَوَاضِعِ يَتْرُكُ رَأْيَ إِبْرَاهِيمَ وَرَاءَهُ ظِهْرِيًّا“ (ص: ١٤)

”ہم نے کتاب الآثار امام محمد کا مطالعہ کر کے امام نخعی اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمه الله کے

اقوال کی تلخیص کی ہے۔ امام کئی مقام پر حضرت ابراہیم کی رائے کو ترک فرما دیتے ہیں۔"

یہ محض حبِ علی (رضی اللہ عنہ) کے انداز سے فرمایا گیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمائی۔ چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف خود بخود زبانِ قلم پر آ گیا اور فرمایا:

"وَإِنْ كَانَ لَا يُنْكَرُ أَنَّ لِآرَاءِ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ أَثَرًا خَاصًّا فِي تَفْقِيهِ الْإِمَامِ أَبِي حَنِيفَةَ وَاجْتِهَادِهِ" (حوالہ مذکورہ)

"لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اجتہاد اور تفقہ پر خاصا اثر ہے۔"

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ میں جہاں یہ تقابل فرمایا ہے ان کا مقصد قلت و کثرتِ عددی اور حساب کے قواعد کے لحاظ سے نہیں۔ ان کا مقصد یہی تاثر ہے۔ آخر آپ حضرات صاحبین کو دو تہائی مذہب میں اختلاف کے باوجود حضرت امام والا مقام کے مقلد مانتے ہیں، حضرت امام بھی امام نخعی سے متاثر ہوں تو اس میں جرم کیا ہے؟ اگر تقلید کا مطلب یہی تاثر ہے تو یہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دیوبندی ذہن یا حضراتِ احناف سے توحید پسند گروہ پر یہ تیسرا انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء سے پہلے یہ حضرات اہلِ حدیث سے قریب تھے اور حنفیت کے باوجود فقہی جمود کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ اسے کلی طور پر ختم کرنا چاہتے تھے۔ یہی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا اصلی تجدیدی کارنامہ تھا۔

۱۸۳۱ء کے بعد ان میں اکثر حضرات تحریکِ توحید اور اقامتِ دین سے بالکل الگ ہو گئے اور اسلام کی خدمت کے لیے صرف اسی حد تک مطمئن ہو گئے جو اشاعتِ حنفیت اور فقہی جمود کے مرادف ہو۔ یہ لوگ شاہ صاحب کے خلفاء کے ساتھ نہ چل سکے، اس لیے کہ وہ جامد تقلید کے حامی نہ تھے۔ دیوبند کی تاسیس حنفیتِ خالصہ کی اشاعت کے لیے عمل میں آئی لیکن محدثین کا احترام شاہ صاحب کی تحریک سے ان کو وراثت میں ملا تھا۔

اور جو حضرات علامہ کوثری سے متاثر ہیں وہ جمود کے داعی ہیں اور ائمۂ حدیث سے بغض ان حضرات کو علامہ کوثری سے وراثت میں ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حدیث کو حجتِ شرعی سمجھتے ہیں۔

یہ ہلکا سا تضاد ہے جسے علم اور مطالعے کے زور سے اطمینانِ قلب کی حد تک یہ حضرات حل فرما لیتے ہیں، لیکن ان حضرات کے اذہان میں شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں کا وہ احترام نہیں جو قدمائے دیوبند میں تھا۔

خدا کرے کہ یہ حضرات وسعتِ مطالعہ سے فکری جمود کو توڑیں اور اپنے نظریات کی بنیاد تقلید کے بجائے علم اور تحقیق پر رکھیں۔ ظاہری تنقیص کے باوجود اس میں محدثین کے مسلک کی تائید اور توثیق ہوگی۔ ہماری دلی دلچسپیاں اس نئی تحریک کے ساتھ ہیں۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۲۴ نومبر ۱۹۶۱ء تا ۹ فروری ۱۹۶۲ء)

ایک مقدّس تحریک
جو مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی

مادی حکومتوں میں جس طرح توڑ پھوڑ ہوتا رہتا ہے اسی طرح دینی تحریکات اور فروعی اور اصولی نظریات میں بھی کسر اور انکسار کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون اور مقریزی کی المواعظ میں ان حوادث کا تسلسل نظر آتا ہے۔ مسائل میں اختلاف، اہلِ علم کی باہمی رقابتیں اور شکر رنجیاں تاریخِ مذاہب میں مدو جزر کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں۔ اس کے مادی ذرائع پر بحث تاریخ کا ایک خاص موضوع ہے۔ تاریخ، طبقات اور ملل و نحل کی کتابوں میں اس کی خاصی تفصیل ملتی ہے۔

فارس کے علاقوں میں ایران اور ماوراء النہر میں جس طرح مذہبی انقلابات آئے، ایک گروہ نے دوسرے پر یورش کی اور اسے ختم کیا؛ اس قسم کا مواد تاریخِ عالم میں کافی ملتا ہے۔ ائمۂ حدیث اور علمائے سنت کی کثرت، پھر ائمۂ شوافع کا زور، اس کے بعد علمائے احناف کی یورش، پھر تشیع کا غلبہ؛ یہ سب حوادث تھوڑی سی مدت میں رونما ہوگئے۔

آج بھی ایران اور عراق میں سنی بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن شیعی حکومت کے استبداد نے سب کی زبانیں بند کر رکھی ہیں۔ روسی ترکستان، ازبکستان، تاشقند میں فرقہ پرستی کی تنگ نظری اور فقہی استبداد نے لا دینی اور کمیونزم کے لیے راہ ہموار کر دی۔ یہاں عملاً اسلام ہی کو خارج البلد کر دیا گیا ہے۔ نکتہ ور، دور اندیش طبائع کے لیے اسی میں درسِ عبرت ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴾[1] [قٓ: ٣٧]

مصر اور سوڈان کے علاقوں میں اہلِ علم اور ائمۂ سنت کا طوطی بولتا تھا۔ قرآن و سنت اور سلف کا طریق عام تھا۔ حضرت امام شافعی ۱۹۸ھ میں تشریف لائے اور اپنے علمی فیوض سے سر زمینِ مصر کو

[1] بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو۔

سیراب فرمایا۔ ربیع بن سلیمان، امام اسماعیل بن یحییٰ مزنی، حافظ یوسف بن یحییٰ بویطی وغیرہم کی وجہ سے شافعیت مصر میں عام ہوگئی۔ (الخطط: ٤/ ١٤٥)

اس کے بعد فاطمیوں کے عروج نے ساری صورت حال بدل کر رکھ دی۔ ۳۵۸ھ میں مصر پر تشیع اور رفض چھا گیا۔ فاطمی اور دوسرے روافض جو دھاندلیاں کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ مصر کے در و دیوار پر صحابہ اور ائمۂ سلف پر تبرّا کے بورڈ آویزاں تھے۔ ۵۶۴ھ کے پس و پیش سلطان نور الدین محمود زنگی کی فوجوں نے اس دور کا خاتمہ کیا۔ فقہائے موالک اور شوافع کے دور کا پھر آغاز ہوا اور رفض و تشیع کا اس سرزمین سے خاتمہ ہوگیا۔

مقریزی نے خطط جلد چہارم میں اس مدو جزر اور عروج و زوال کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے۔ مقریزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے مذاہبِ اربعہ میں مناقشات جاری رہے۔ عہدۂ قضا کی وجہ سے اکھاڑ پچھاڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ اہلِ علم کی کمزوری تھی کہ مسلمان اور سنّی سمجھنے کے باوجود مدارات اور باہم خوشدلی سے گزر نہ کر سکے۔ اِفتا اور قضا نے کاروباری انداز اختیار کر لیا۔ وقت کی حکومت بھی ان حضرات کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی اور اپنے سیاسی مفاد حاصل کرتی رہی۔

ابتداءً ائمۂ اسلام ان درباروں کی حاضری سے پرہیز کرتے رہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو عباسی اور اموی دونوں درباروں نے عہدۂ قضا کی پیش کش کی۔ امام موصوف مدت العمر اس سے انکار فرماتے رہے اور قریباً دونوں درباروں کے معتوب رہے لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے یہ عہدے قبول کر لیے۔[1] مصالح بدلتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے کوئی نقصان بھی ہوا ہو مگر بظاہر تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو دینی اور دنیوی دونوں قسم کے فوائد حاصل ہوئے۔[2] فقہ حنفی کی اشاعت میں ان کے اس تعلق سے بہت مدد ملی۔ مذاہبِ اربعہ کا جہاں بھی زور ہے وہاں دلائل سے زیادہ اسی قسم کے مؤثرات کا نتیجہ ہے۔ الخطط للمقریزی، مقدمہ ابن خلدون، البدایہ والنہایہ وغیرہ کتبِ تاریخ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ اگر حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روش کی پابندی فرماتے

[1] علاوہ ازیں ان کے شاگردوں میں سے پندرہ کے قریب افراد نے عہدۂ قضا قبول کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: اللمحات (٤/ ٢٥٣)

[2] بلکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے: "مَنْ نَظَرَ فِيْ الرَّأْيِ وَلَمْ يَلِ الْقَضَاءَ فَقَدْ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ" (تاریخ بغداد: ١٤/ ٢٤٩)

تو قرینِ قیاس ہے کہ حنفی مسلک کی اس قدر کثرت نہ ہوتی۔ لوگوں نے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی اس روش پر تنقید کی ہے۔ کچھ جھوٹی سچی کہانیاں بھی تاریخ الخلفاء للسیوطی اور بعض دوسری کتب میں مرقوم ہیں۔[1] صورت حال کوئی بھی ہو مگر مسلک کی اشاعت میں یقیناً اس سے بڑی مدد ملی۔ اسی طرح افریقہ، حجاز، مصر اور نجد میں حکومتوں نے جن مسالک کی اعانت حکومت کی سطح پر کی ان علاقوں میں ان مسالک کو بڑی ترقی ہوئی اور خوب پھیلے۔

مسلک اہلِ حدیث کو یہ مواقع کم ملے۔ یہ بے چارے یوں ہی درباروں کی زندگی سے بھاگتے رہے۔ اس لیے تاریخ نے انھیں نسیان وخمول کی دبیز تہوں میں دبا دیا۔ اچھے پڑھے لکھے حلقوں میں اب بھی علی الاعلان کہا جا رہا ہے یہ کوئی مکتبِ فکر ہی نہ تھا۔ یہ محض حفاظِ حدیث کی جماعت تھی جس میں تفقہ اور درایت ناپید تھی۔ وہ اجتہاد اور استنباط کی راہوں سے ناآشنا تھے، حالانکہ تمام مسالک جن کا تعلق سنت سے ہے یا بدعت سے، وہ اپنی اور اپنے مسلک کی صحت اور درستی کے لیے اسی مسلک کو معیار اور کسوٹی سمجھتے تھے۔ اور یہ حضرات بھی علمِ کلام اور فلسفہ سے لے کر فقہ، اصولِ فقہ، تجوید، نحو، معانی، بیان، ادب وتاریخ میں مجتہدانہ افکار رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حدیث اور سنت کی عظمت پر تمام فرقوں کا اجماع ہے، اور ان کی متفقہ شہادت ہے کہ حق ائمۂ سنت میں ہے۔ اسی لیے جو لوگ ائمۂ حدیث کے زیادہ موافق ہوں وہ ان فرقوں میں دوسرے کی نسبت زیادہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ خود امام ابو الحسن علی بن اسماعیل اشعری چونکہ امام احمد اور دوسرے ائمۂ سنت سے زیادہ قریب تھے اس لیے وہ اپنے اَتباع میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ قاضی ابوبکر باقلانی کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی عزت ائمۂ حدیث کی موافقت کی وجہ سے ہے۔ امام الحرمین ابوالمعالی جوینی (۴۷۸ھ) اور امام غزالی (۵۰۵ھ) اشعری کے بعض اصولوں کی مخالفت کے باوجود ان کی عزت حدیث اور سنت کی موافقت ہی کی وجہ سے ہے۔ فقہی فروع میں امام شافعی کے اتباع کی وجہ سے ان کو حدیث سے تعلق ہوا اور علمِ کلام میں بھی سنت کی موافقت یا مخالفت کے تناسب ہی سے ان کا احترام کیا گیا ہے۔ معیارِ حق حدیث اور ائمۂ حدیث ہی

[1] دیکھیں: تاریخ الخلفاء (ص: ۲۱۵) أخبار أبي حنيفة للصيمري (ص: ۹۲)

قرار پائے ہیں۔ یہ عجیب ہے کہ وہ فقہ و درایت سے خالی لیکن حق و باطل کا معیار بھی ٹھہریں!'' (نقض المنطق، ص:١٦)

تقلید اور جمود کے اثرات:

مروجہ تقلید اور جمود نے صرف ائمۂ حدیث ہی کو ایذا نہیں دی بلکہ اپنے مسلک پر جمود کی وجہ سے دوسرے ائمہ کو حق پر سمجھنے کے باوجود وہ ان کے اَتباع سے انصاف نہیں فرما سکے۔ آپ اس سلسلے میں اقتدا بالمخالف ہی کو لے لیجیے۔ یہ مسلّمہ ہے کہ ائمۂ اربعہ حق پر ہیں۔[1] یہ چاروں نہریں ایک ہی دریا سے نکلی ہیں۔ یہ پانی ایک ہی منبع سے تقسیم ہوا ہے اور منبع کی طہارت پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ میزان شعرانی ملاحظہ فرمایئے۔[2] وہاں حوضِ کوثر کی تقسیم اور میزانِ اعمال کے وقت حضرات ائمۂ کرام بڑی توجہ سے میزان کے کام کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ پلِ صراط کے پاس بھی اپنے اَتباع کی رفتار کا بڑا غائر مطالعہ فرما رہے ہیں۔ قیامت کے محاسبے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعرانی رحمہ اللہ کی نگاہ میں ان حضرات کا موقف بھی انبیاء علیہم السلام کے قریب قریب ہے۔ اس احترام اور حق کے ساتھ اس وابستگی کے باوجود جب اقتدا بالمخالف کا سوال سامنے آیا تو متاخرین فقہاء بڑی احتیاط سے ایک دوسرے کا عمیق محاسبہ فرمانے لگے اور ایک دوسرے کا اس طرح محاسبہ شروع فرمایا جیسے ایک مسلم، غیر مسلم کا محاسبہ کرتا ہے، حالانکہ ان فروعی اختلافات کے باوجود معاملے میں کوئی دِقت نہیں تھی۔ شرح صدر سے کہا جاتا کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی بلا تامل ایک دوسرے کی اقتدا کر سکتے ہیں۔ چاروں کو حق پر کہنے کے بعد نہ مقتدی کے خیالات پیشِ نظر ہونے چاہییں نہ امام کے۔ ان اختلافات کی موجودگی میں ہم نے ان سب کو حق پر تسلیم کیا ہے لیکن اس میں احتیاط کا پہلو ملاحظہ فرمایئے۔

قاضی خاں علامہ حسن بن منصور اوزجندی (۵۹۲ھ) جو اصحابِ ترجیح تسلیم کیے گئے ہیں، فرماتے ہیں:

---

[1] یعنی حضرات مقلدین کے ہاں یہ ایک مسلمہ امر ہے، وگرنہ امرِ واقع اس کی تردید و تکذیب ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اصول و فروع میں ان کا بہت اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مَا الْحَقُّ إِلَّا وَاحِدٌ، قَوْلَانِ مُخْتَلِفَانِ يَكُوْنَانِ صَوابًا جَمِيْعًا؟! مَا الْحَقُّ وَالصَّوَابُ إِلَّا وَاحِدٌ'' (جامع بيان العلم: ٢/ ٨١)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: الميزان الكبرىٰ للشعراني (١/ ١٥٢)

"أَمَّا الْاِقْتِدَاءُ بِشَافِعِيِّ الْمَذْهَبِ، قَالُوا: لَا بَأْسَ بِهِ إِذَا لَمْ يَكُنْ مُتَعَصِّبًا، وَلَا شَاكًّا فِيْ إِيْمَانِهِ، وَلَا مُنْحَرِفًا تَحْرِيْفًا فَاحِشًا عَنِ الْقِبْلَةِ، وَلَا شَكَّ أَنَّهُ إِذَا جَاوَزَ الْمَغَارِبَ كَانَ فَاحِشًا، وَأَنْ يَكُوْنَ مُتَوَضِّئًا مِنَ الْخَارِجِ النَّجِسِ مِنْ غَيْرِ السَّبِيْلَيْنِ، وَلَا يَتَوَضَّأَ بِالْمَاءِ الْقَلِيْلِ الَّذِيْ وَقَعَتْ فِيْهِ النَّجَاسَةُ"[1] اھ

یعنی شافعی امام کی اقتدا ان شروط کے ساتھ درست ہے:

① متعصب نہ ہو۔
② اپنے ایمان کے متعلق ان شاء اللہ نہ کہتا ہو۔
③ قبلہ سے انحراف نہ کرے۔
④ اگر سبیلین کے سوا اس کے بدن پر نجاست کا اثر ہو تو اس سے وضو کرے۔
⑤ تھوڑے پانی میں اگر نجاست گری ہو تو اس سے وضو نہ کرے۔

ان شرائط کی عدمِ پابندی کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شافعی رہ کر احناف کا امام نہیں بن سکتا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ ردالمحتار (ا/ ۵۸۸) میں شرح منیہ سے نقل فرماتے ہیں:

"أَمَّا الْاِقْتِدَاءُ بِالْمُخَالِفِ فِيْ الْفُرُوْعِ كَالشَّافِعِيِّ فَيَجُوْزُ مَا لَمْ يُعْلَمْ مِنْهُ مَا يُفْسِدُ الصَّلَاةَ عَلٰى اعْتِقَادِ الْمُقْتَدِيْ"

"شافعی وغیرہ مخالفین کی اقتدا اس وقت درست سمجھتے ہیں جب امام، مقتدی کے خیال اور مذہب کے مطابق کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اس کی نماز فاسد ہو جائے۔"

پھر اسی صفحہ پر ملا علی قاری رحمہ اللہ کے رسالہ "الاهتداء في الاقتداء" سے نقل فرماتے ہیں:

"ذَهَبَ عَامَّةُ مَشَايِخِنَا إِلَى الْجَوَازِ إِذَا كَانَ يَحْتَاطُ فِيْ مَوَاضِعِ الْخِلَافِ وَإِلَّا فَلَا، وَالْمَعْنٰى أَنَّهُ يَجُوْزُ فِيْ الْمُرَاعِيْ بِلَا كَرَاهَةٍ وَفِيْ غَيْرِه مَعَهَا، ثُمَّ الْمَوَاضِعُ الْمُهِمَّةُ لِلْمُرَاعَاةِ أَنْ يَّتَوَضَّأَ مِنَ الْفَصْدِ، وَالْحِجَامَةِ، وَالْقَيْءِ، وَالرُّعَافِ، وَنَحْوِ ذٰلِكَ" (ا/ ۵۸۸)

"عام مشائخِ حنفیہ شافعی امام کی اقتدا جائز سمجھتے ہیں جب وہ اختلافات کے مقامات میں احتیاط کرے (ورنہ نہیں)۔ احتیاط سے مراد یہ ہے کہ فصد، سنگی، قے اور نکسیر وغیرہ کے بعد وضو کرے۔"

[1] فتاویٰ قاضی خاں (ا/۴۳)

علامہ خیر الدین آملی فرماتے ہیں:

"اَلَّذِيْ يَمِيْلُ إِلَيْهِ خَاطِرِيْ الْقَوْلُ بِعَدَمِ الْكَرَاهَةِ إِذَا لَمْ يَتَحَقَّقْ مِنْهُ مَفْسَدَةٌ"[1]

"میرا دلی رجحان یہ ہے کہ اگر شافعی امام سے کوئی مفسدہ ظاہر نہ ہو تو اس کی اقتدا درست ہے۔"

علامہ بیری اپنے رسالے میں فرماتے ہیں کہ شافعی امام کی اقتدا سے اکیلے پڑھنا افضل ہے، کیوں کہ وہ نماز میں ایسے کام کرے گا جن سے نماز لوٹانا ضروری ہوگا یا مستحب ہوگا۔ خیر الدین آملی شافعی سے منقول ہے کہ اگر اپنا ہم مذہب مل جائے تو پھر دوسرے کی اقتدا مکروہ ہے، البتہ اکیلے پڑھنے سے اقتدا کرنا افضل ہے۔ یہی فتویٰ رملی کبیر، اسنوی اور سبکی سے بھی منقول ہے۔ شیخ خیر الدین فرماتے ہیں:

"وَالْحَاصِلُ أَنَّ عِنْدَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ اخْتِلَافًا، وَكُلُّ مَا كَانَ لَهُمْ عِلَّةٌ فِيْ الِاقْتِدَاءِ بِنَا صِحَّةً وَّفَسَادًا وَّأَفْضَلِيَّةً كَانَ لَنَا مِثْلُهُ عَلَيْهِمْ" اھ (شامی: ۱/ ۵۸۸)

"حاصل یہ ہے کہ شافعی ہماری اقتدا کے متعلق صحت، فساد، یا افضلیت کے متعلق جو راہ اختیار کریں ہم بھی وہی کہیں گے۔"

مندرجہ بالا ارشادات سے ظاہر ہے کہ دین کے بجائے حضرات فقہائے کرام کی باہمی رقابت کارفرما ہے۔

اس کے بعد علامہ شامی نے ایسے مقامات کا ذکر فرمایا ہے جہاں مخالف اور موافق حضرات کی متعدد جماعتیں ہوتی ہوں۔ بعض نے فرمایا اگر پہلی نماز شوافع کی ہو تو اس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یہی افضل ہے۔ لیکن علامہ ابراہیم بیری فرماتے ہیں اگر اپنے مذہب کی جماعت نہ ملے تو اکیلے پڑھنا افضل ہے۔ شافعی کی اقتدا نہ کرے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ، امام ابن الہمام کے شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شافعی اگر رعایت بھی کرے تو بھی بہتر ہے کہ اکیلا پڑھے اور اقتدا نہ کرے۔

اس کے بعد علامہ علی قاری کی رائے کا ذکر فرمایا ہے کہ اگر اپنی جماعت مل سکے، پہلے ہو یا پیچھے، پھر مخالف کی اقتدا نہیں کرنی چاہیے۔ غرض علامہ شامی نے اقتدا کے متعلق فقہائے مذاہب کی آراء کا تذکرہ بڑی تفصیل سے فرمایا ہے اور حرمین کے تعامل کے پیشِ نظر اجازت دی ہے کہ اگر اپنے مذہب کا امام مل سکے تو شوافع کی نماز میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔

---

[1] مصدر سابق

اس کے بالمقابل بدعتی اور فاسق کی امامت کو مکروہ تنزیہی فرمایا ہے۔

درالمختار (۱/۵۸۴) میں ہے: "وَيُكْرَهُ تَنْزِيهاً الخ"۔ اور قاضی خاں میں فرماتے ہیں:

"وَيَصِحُّ الْاِقْتِدَاءُ بِأَهْلِ الْأَهْوَاءِ إِلَّا الْجَهْمِيَّةَ وَالْقَدَرِيَّةَ وَالرَّافِضِيَّ الْغَالِيْ، وَمَنْ يَّقُوْلُ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ" (شامی: ۱/ ۷۶، مطبوعہ مصر)

"جہمیہ، قدریہ، غالی روافض اور قائلین خلقِ قرآن کے علاوہ باقی اہلِ ہوا فرقوں کی اقتدا صحیح ہے۔"

نیز فرماتے ہیں:

"إِذَا صَلَّى الرَّجُلُ خَلْفَ فَاسِقٍ أَوْ مُبْتَدَعٍ، يَكُوْنُ مُحْرِزًا ثَوَابَ الْجَمَاعَةِ" اھ (۱/ ۷۷)

"اگر فاسق اور بدعتی کی اقتدا کرے تو اسے جماعت کا ثواب مل جائے گا۔"

شامی (۱/ ۵۸۸) اور طحطاوی (۱/۲۲۴) میں ہے کہ بدعتِ مکفر ہ نہ ہو تو اقتدا درست ہو گی، ورنہ نہیں۔ علامہ کاسانی نے "البدائع والصنائع" میں بدعت کے متعلق زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف بدعتی کے پیچھے علی الاطلاق نماز ناپسند فرماتے ہیں لیکن کاسانی اس کی بھی یہی توجیہ فرماتے ہیں:

"وَالصَّحِيْحُ أَنَّهَا إِنْ كَانَ هَوًى يُكَفِّرُهُ لَا تَجُوْزُ، وَإِنْ كَانَ لَا يُكَفِّرُهُ تَجُوْزُ"

"صحیح یہی ہے کہ اگر بدعتِ مکفر ہ نہ ہو تو اقتدا درست ہے۔" (۱/ ۱۵۷)

فقہائے کرام کے ان گرامی قدر ارشادات سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اہلِ بدعت و ہوا کے متعلق وہ پیش بندی اور احتیاط نہیں برتی گئی جو سنی مخالفین خصوصاً "وَلَا شَاكًّا فِيْ إِيْمَانِهِ"[1] کہہ کر ائمہ شوافع پر اور اہلِ حدیث پر جو تعریض کی گئی ہے بڑی نامناسب اور بے انصافی پر مبنی ہے۔ اگر واقعی امام شافعی اور ان کے اَتباع کا ایمان مشکوک ہے، ان کو اپنے ایمان میں شبہہ ہے تو کسی طرح بھی ان کی اقتدا درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام ائمہ حدیث اور ائمہ سنت ایمان میں استثنا کے قائل ہیں جسے "شَاكًّا فِيْ إِيْمَانِهِ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] "اپنے ایمان میں ان شاء اللہ کہنے والا نہ ہو۔"

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: كتاب الاعتقاد للبيهقي (ص: ۱۸۲) السنة للخلال (۳/ ۵۷۲) السنة لعبد الله بن أحمد (۱/ ۳۴۷)

شوافع کا قیام:

حالانکہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اَتباع سچے سنی ہیں اور ان کے مسلک کی حقانیت کا اعتراف علمائے احناف نے بھی فرمایا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فَهٰذِهِ الْمَذَاهِبُ الْمُخْتَلِفَةُ لِلْأَئِمَّةِ وَمُجْتَهِدِي الْأُمَّةِ كُلُّهَا تَتَّصِلُ بِأَنْهَارِ الصَّحَابَةِ، وَهِيَ مُتَّصِلَةٌ بِمَنْبَعِهَا، وَهُوَ حَضْرَةُ الرِّسَالَةِ، فَكُلُّهُمْ عَلٰى هُدًى، مَنِ اقْتَدٰى بِأَيِّهَا اهْتَدٰى، وَمَنْ تَوَهَّمَ أَنَّ وَاحِدًا مِنْهَا عَلٰى هُدًى، وَسَائِرُهَا فِي ضَلَالَةٍ فَقَدْ وَقَعَ فِي حُفْرَةِ الضَّلَالَةِ" (الفوائد البهية، ص: ۹)

"ائمہ مجتہدین کے مذاہب کا تعلق صحابہ سے ہے اور وہ نبوت کے منبع سے بہہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کو حق پر کہنا اور باقی کو گمراہ سمجھنا خود گمراہی ہے۔"

اس توثیق کے بعد شوافع کے متعلق احتیاط اور اقتدا کی یہ شرائط بالکل بے محل ہیں اور انصاف سے بمراحل دور، حالانکہ معلوم ہے کہ اعتزال و تجہم سے نہ احناف بچ سکے نہ موالک اور شوافع، بلکہ ان حضرات نے عقائد میں ان ائمہ اجتہاد کی راہ ہی ترک فرما دی، وہاں کے امام اور مجتہد اشعری ماتریدی قرار پائے۔ طحطاوی فرماتے ہیں:

"وَلَا خُصُوصِيَّةَ لِمَذْهَبِ الشَّافِعِيِّ بَلْ إِذَا صَلّٰى حَنَفِيٌّ خَلْفَ أَيِّ مُخَالِفٍ لِمَذْهَبِهِ كَذٰلِكَ" (۱/ ۲۸۱)

"اس تفصیل میں شافعی کی کوئی تخصیص نہیں۔ کسی بھی مخالف کے پیچھے کوئی حنفی نماز ادا کرنا چاہے، اس کی تفصیل اسی طرح ہے۔"

ہدایہ اور اس کی شرح کفایہ مطبوعہ بمبئی میں سابقہ تفصیل کسی قدر اختصار سے مرقوم ہے مگر مقصد میں کوئی فرق نہیں۔[1]

گفتگو کے لیے دوسرا محاذ:

شوافع اور دوسرے ائمہ سنت کے ساتھ اقتدا میں یہ احتیاط اور تنگ نظری طبعاً اچھی معلوم نہیں

[1] دیکھیں: الهداية مع شرح الكفاية (۱/ ۳۱۱)

ہوتی تھی اس لیے گفتگو کے لیے ایک اور محاذ بنا لیا گیا کہ اس صورت میں جب امام اور مقتدی میں فرعی اختلاف ہو تو اقتدا میں ایثار امام کو کرنا چاہیے یا مقتدی کو؟ اور رعایت کی ذمے داری امام پر ہے یا مقتدی پر کہ از راہ شفقت درگزر کرے؟

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

"هٰذَا بِنَاءً عَلٰى أَنَّ الْعِبْرَةَ لِرَأْيِ الْمُقْتَدِيْ وَهُوَ الْأَصَحُّ، وَقِيْلَ: لِرَأْيِ الْإِمَامِ، وَعَلَيْهِ جَمَاعَةٌ" (رد المحتار: ١/ ٥٨٨)

"یہ احتیاط کا حکم اس بنیاد پر ہے کہ اقتدا میں مقتدی کی رائے کا اعتبار ہے یا امام کی رائے کا؟ صحیح یہ ہے کہ مقتدی کی رائے ہی معتبر ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ امام کی رائے پر اعتماد ہوگا۔"

علامہ بدر الدین عینی اور صاحبِ ہدایہ کی بھی یہی رائے ہے لیکن ابن عابدین فرماتے ہیں کہ صحیح بات پہلی ہے، یعنی امام کو مقتدی کی رعایت کرنی چاہیے۔ گفتگو کا محاذ ضرور بدل گیا۔ ائمہ کے بجائے موضوعِ بحث امام اور مقتدی ہو گئے لیکن شناعت اور بڑھ گئی۔ یعنی امام کو مقتدی کے تابع فرما دیا گیا، یعنی تانگہ گھوڑے کے آگے باندھ دیا گیا۔ یہ تعصب کی کارفرمائیاں ہیں!

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فتاویٰ (٣/ ١٥٣) میں دونوں مسالک کا ذکر کر کے خاموش ہو گئے۔ اندازہ ہوتا ہے ان کا رجحان یہ ہے کہ امام کو مقتدی کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔ ہدایہ کے حاشیہ میں مولانا نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[1]

قاضی خاں وغیرہ فقہاء کی شرائط اور ان کی مراعات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"قُلْتُ: هٰذَا يَرْجِعُ إِلٰى أَنْ يَّصِيْرَ حَنَفِيًّا" (هداية، ص: ١٢٩)

"اس رعایت کا مطلب تو یہ ہوگا کہ شافعی امام حنفی ہو جائے۔"

اس کے بعد ان ساری مراعات و شرائط کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ آخر میں فرمایا ہے:

"وَأَمَّا اشْتِرَاطُ مُرَاعَاةِ مَوَاضِعِ الْخِلَافِ كَمَا اخْتَارَهُ أَكْثَرُ أَصْحَابِنَا فَغَيْرُ مُوَجَّهٍ، إِذْ مُرَاعَاةُ ذٰلِكَ مُسْتَحَبٌّ لَيْسَ بِوَاجِبٍ عِنْدَ أَحَدٍ، فَلَوْ لَمْ يُرَاعِ، وَفَعَلَ مَا فَعَلَ عَلٰى طِبْقِ مَذْهَبِهِ لَمْ يَقْدَحْهُ فِيْ ذٰلِكَ قَادِحٌ، فَأَيُّ مَانِعٍ فِيْ

[1] حاشية الهداية للكنوي (١/ ١٥١)

جَوَازِ الْاِقْتِدَاءِ بِهِ؟ فَافْهَمْ هٰذَا بِنَظَرِ الْاِنْصَافِ" (هداية أولين: ١/ ١١٩)

"مواقعِ خلاف میں رعایت کی شرط ہمارے اکثر مشائخ نے لگائی ہے۔ یہ نامناسب ہے، کیوں کہ یہ رعایت کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں۔ اگر وہ تمام کام اپنے مذہب کے مطابق کرے تو اس میں کون سی برائی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک مستحب کا ترک ہو گا، اس سے اقتدا کے عدمِ جواز کی کون سی وجہ ہو گی۔ اسے سمجھو اور انصاف سے غور کرو۔"

بات بالکل صاف ہے لیکن شامی کے "عِنْدَ أَكْثَرِ الْمَشَايِخِ" اور "عَلَى الْأَصَحِّ" کا کیا کیا جائے؟ بہر کیف یہ محاذ بھی معقول معلوم نہیں ہوتا۔

ایک اور محاذ:

اقتدا بالمخالف کے متعلق متقدمین فقہاء کے چھ قسم کے خیالات منقول ہیں جن کا تذکرہ مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے حواشی ہدایہ میں فرمایا اور مطلقاً جواز کو راجح فرمایا ہے۔[1] ہمارے ملک میں شوافع کی جگہ اہلِ حدیث کو ملی ہے، گو ہمارے ہاں احناف اور شوافع کا احترام برابر ہے، اس لیے یہاں بھی اقتدا بالمخالف کا اثر اہلِ حدیث پر پڑا ہے، بلکہ ہمارے بزرگ کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتے ہیں۔

بریلوی حضرات تو "لا مساس" کے قائل ہیں۔ وہ کسی موحد کی اقتدا نہیں فرماتے۔ اہلِ حدیث ہو یا حنفی ان کے ہاں مذہب چند رسوم اور نعروں کا نام ہے اور بس۔ پھر ان کا اندازِ گفتگو علم و استدلال پر مبنی نہیں بلکہ محض جذباتی ہے۔ ہمارے دیوبندی حضرات بعض ان مسائل کی آڑ لیتے ہیں جن کی رعایت کی امید شوافع سے کی گئی ہے لیکن وہ اختلافات اب کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتے، اس لیے ایک نیا محاذ کھولا گیا۔

ہمارے یہ دوست فرماتے ہیں کہ اہلِ حدیث کی اقتدا اس لیے درست نہیں کہ یہ استنجا میں ڈھیلا استعمال نہیں کرتے، ان کی طہارت درست نہیں۔ یہ عذر بے حد کمزور بھی ہے اور غلط بھی۔ یہ تو معلوم ہے کہ طہارت کے بغیر نماز کو کوئی بھی درست نہیں سمجھتا۔ طہارت اہلِ حدیث کے نزدیک بھی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر احناف کے نزدیک۔ فرق صرف طہارت کے طریقے میں ہے: صرف پانی سے ہو گی یا صرف مٹی سے؟ یا پانی اور مٹی دونوں سے؟ تمام ائمہ متفق ہیں کہ طہارت تینوں طرح

[1] حاشيه هداية (١/ ١٢٦) [مؤلف]

ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی مٹی اور پانی دونوں استعمال کرے تو بہتر ہے۔ مطلق طہارت کے سوا ان طریقوں سے کوئی طریقہ امامت اور اقتدا کے لیے شرط نہیں۔ اب مٹی کے استعمال کو ضروری قرار دینا تعجب ہے۔ یہ ذہنی بغض اور عصبیت کی ترجمانی تو کر سکتا ہے، ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ یہ ہمارے ملک کی پیداوار ہے۔

فنِ طہارت یا وہم؟

۱۹۵۳ء تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں علمائے کرام کی طہارت اور اس کی مختلف اقسام اور اس پر اصرار کا تجربہ ہوا۔ بعض حضرات پیشاب سے فارغ ہو کر ازار بند منہ میں تھام لیتے اور کافی دیر ٹہلتے رہتے۔ بائیں ہاتھ سے ڈھیلا استعمال کرتے اور اس میں خاص قسم کی حرکات فرماتے۔ بیس منٹ آدھ گھنٹا تک یہ کھیل جاری رہتا، پھر یقین ہوتا کہ اب طہارت ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک یہ پورا ڈرامہ نہ کیا جائے، طہارت مکمل نہیں ہوتی۔

بعض حضرات مٹی کے ساتھ دونوں رانوں سے بھی طہارت میں کافی مدد لیتے۔ وہ بائیں ہاتھ سے مسلنا کافی نہیں سمجھتے تھے۔ بعض حضرات اس اثنا میں کئی کئی دفعہ ازار بند کے اندر جھانکتے۔ مٹی کو ملاحظہ فرماتے۔ وہ اسی مشق میں مٹی کا خشک ہونا بھی ضروری خیال فرماتے۔ بعض حضرات بڑے اہتمام سے ڈھیلے بناتے اور خاص ترکیب سے بناتے۔ کئی کئی دن خشک ہونے کے لیے دھوپ میں رکھے رہتے اور تحفہ کے طور پر یہ ڈھیلے اس قسم کے وہمی اَتقیاء میں تقسیم فرماتے، اور وہ بھی اسے لے کر بہت ممنون ہوتے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب وہم پرستی ہے۔ اس میں کوئی چیز نہ حنفی مذہب میں ضروری ہے نہ باقی ائمہ میں۔ یہ وہم کا مرض ہے۔ جو اس میں مبتلا ہو وہ تسکینِ قلب کے لیے مجبور ہے، جو چاہے کرے لیکن دوسرے کو اس وہم پرستی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

عموماً یہ مرض کیمبل پور، ہزارہ، راولپنڈی کے لوگوں میں ہوتا تھا، یا پھر یو پی، سی پی کے حضرات میں، خصوصاً وہ لوگ جو تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اہلِ حدیث کی اقتدا ان حضرات کے نزدیک اس وقت درست ہو سکتی ہے جب وہ طہارت کے ان فنون میں مہارت پیدا کریں، پھر شاید اس کی سند حاصل کریں اور اس وہم میں بھی مبتلا ہوں۔ ہمارے اہلِ حدیث حضرات میں بھی بعض حضرات پانچ پانچ چھ چھ لوٹے استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان حضرات کو حافظ ابن القیم

کی ”إغاثة اللهفان“ کے ابتدائی ابواب، نقد العلم والعلماء لابن جوزی اور شوکانی کے رسالہ ذم الموسوسین کا مطالعہ فرمانا چاہیے، شاید ان کو فائدہ ہو۔

اہلِ حدیث تو نہ امامت کے شائق ہیں نہ اس مشق کے لیے تیار۔ دراصل یہ سب امراض اس دور کے ہیں جب ملک میں پانی کی قلت تھی، ورنہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ وہم اور قلتِ علم کی پیداوار ہے اور عوام کے ذہنوں میں عصبیت اور نفرت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ۔ جہاں اَتباعِ ائمہ میں تقلید کے باوجود اس قدر سختی برتی گئی ہو اور جمہور علماء ایک دوسرے کے خلاف اس قدر غلو فرماتے ہوں وہاں بے چارے اہلِ حدیث ان حضرات سے کس وسعتِ ظرف کی امید کر سکتے ہیں اور یہ بزرگ کب اجازت دے سکتے ہیں کہ ان کے علاوہ کوئی اور مسلک بھی دنیا میں زندہ رہے۔ اسی عصبیت کا نتیجہ ہے کہ اچھے پڑھے لکھے حضرات فرماتے ہیں کہ اہلِ حدیث کوئی مکتبِ فکر نہیں۔ یہ محض حفاظ کی جماعت تھی، فقہ اور درایت سے خالی تھی۔ یہ عصبیت قرونِ وسطیٰ میں اہلِ تقلید کے تغلب اور حکومت اور اربابِ اقتدار کی سیاسی مصالح کی پیداوار ہے۔ درباری حضرات کی چیرہ دستیوں نے اس مسلک کو تاریخ کے اندھیروں اور عصبیت کی دلدلوں میں دبا کر رکھ دیا۔

اہلِ حدیث تاریخ کے مختلف ادوار میں:

ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ کی ولادت اور وفات کے سنین پر غور کیا جائے تو ۸۰ھ سے شروع ہو کر امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ تک ختم ہوتا ہے۔ ان ایام کے بعد برسوں اس جمود اور تقلید کا پتا نہیں چلتا جسے آج کل واجب کہا جا رہا ہے اور اس سے اِعراض کو بے دینی وغیرہ القاب سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس پر فخر یا اس کی طرف دعوت کسی صورت میں بھی چوتھی صدی سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ فتح ہند سے پہلے پہلا لشکر جو ساحلِ ہند پر اترا، اس وقت ان مروجہ مذاہب کا نام و نشان عرب میں تھا نہ عجم میں۔ تقلیدِ ائمہ کے موجودہ انداز سے ذہن بالکل خالی تھے۔

معلوم ہے ہند پر پہلا حملہ ۹۲ھ میں ولید بن عبدالملک کی حکومت میں ہوا۔ عرب میں تو اس وقت علمائے تابعین کی کثرت تھی۔ ائمۂ اربعہ کا خیال بھی اس وقت ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ خراسان، ایران اور فارس میں اس وقت ائمۂ حدیث کی کثرت تھی۔ احادیث کا حفظ و ضبط، نقل و روایت ان حضرات کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ حدیث کی جمع و تدوین کے اس دور میں ائمہ کی فقہوں کا احساس بھی

موجود نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بلا تخصیص و تعیین اہلِ علم کی نظر میں تھے۔ وہ مدارِ استناد تو تھے لیکن تقلید کا اس وقت شائبہ تک نہ تھا۔ اس وقت کی شافعیت اور حنفیت محض اساتذہ کے جزوی تاثرات تھے۔ اہلِ حدیث کا مقصد بھی یہی تھا، اس لیے اسلامی قلمرو کے تمام گوشوں میں بھی یہی مسلک پایا جاتا تھا جسے آج ہم اہلِ حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قدمائے احناف کی کتابوں میں اسی مکتبِ فکر کا تذکرہ عام ملتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز بن احمد بخاری مؤلف کشف الاسرار (۷۳۰ھ) شرح اصول بزدوی میں صحابی کی تعریف کے ذکر میں فرماتے ہیں:

"اِخْتَلَفُوْا فِيْ تَفْسِيْرِ الصَّحَابِيِّ، فَذَهَبَ عَامَّةُ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ وَبَعْضُ أَصْحَابِ الشَّافِعِيِّ إِلىٰ أَنَّ مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ لَحْظَةً فَهُوَ صَحَابِيٌّ"

(كشف الأسرار: ٢/ ٧٠٤)

"اکثر اہلِ حدیث اور بعض شافعیہ کا موقف ہے کہ ایک لحظہ جس نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا وہ صحابی ہے۔"

یہاں اصحاب الحدیث کا ذکر ائمۂ اصول کے تذکرے میں آیا ہے۔ "اصولِ بزدوی" اور "کشف الاسرار" (۲/ ۲۹۱) میں مرقوم ہے:

"ذَهَبَ أَكْثَرُ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ إِلىٰ أَنَّ الْأَخْبَارَ الَّتِيْ حَكَمَ أَهْلُ الصَّنْعَةِ بِصِحَّتِهَا تُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ"

"جن احادیث کو ائمۂ فن نے صحیح کہا ہے وہ اہلِ حدیث کے نزدیک یقین کا فائدہ دیتی ہیں۔"

اس کے باوجود ایسے بزرگ دنیا میں موجود رہے جو مروجہ مذاہب سے تعلق اور ائمہ کے احترام کے ساتھ اس عصبیت کو ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ مولانا احمد بن مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ (م ۹۶۸ھ) نے "مفتاح السعادة و مصباح السيادة" میں فقہ اور فقہاء کے متعلق بڑا معنی خیز اور پُر از معلومات مقالہ لکھا ہے۔[1] اس کے آخر میں فقہائے مذاہب اور ان کی فرقہ وارانہ عصبیت کے متعلق بڑا دردمندانہ شکوہ فرمایا ہے۔

آج کل دیوبند کی نوآموز پود اسی ڈگر پر جا رہی ہے جس کی شکایت علامہ نے فرمائی ہے۔ خود

[1] دیکھیں: مفتاح السعادة ومصباح السيادة لطاش كبرىٰ زاده (٢/ ١٦٣)

دیوبند اور اس کی پاک و ہند کی برانچوں میں تعلیم وتربیت کا انداز اس قدر غلط ہو رہا ہے کہ ان مدارس میں علم اور للہیّت کی جگہ تعصب اور فرقہ پرستی پرورش پا رہی ہے۔ مختلف فیہ مسائل پر لکھنے کا انداز اتنا غلط ہو رہا ہے کہ اس پر بد دیانتی اور خیانت کا شبہہ ہوتا ہے۔ تقاریر میں تقویٰ اور عبادت کے بجائے باہم مناقشات بڑھائے جا رہے ہیں۔ مجالسِ درس میں طلبہ کی ذہنی تربیت بھی عصبیت کے جراثیم ہی سے کی جا رہی ہے اور نو آموز حضرات کا یہ غلط رویہ اکابر کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ اہلِ حدیث مدارس میں بھی یہ زہر آلود جراثیم اثر انداز ہو رہے ہیں۔

بریلوی حضرات سے یہ شکایت ہی بے سود ہے۔ ان کے ہاں بظاہر کوئی اصلاحی پروگرام ہی نہیں۔ مذہب کے متعلق چند بدعی تصورات اور عوام کی خوشنودی کے سوا ان کے ہاں مذہب کا کچھ مقصد نہیں۔ علامہ طاش کبریٰ زادہ کا یہ اصلاحی شذرہ دیوبندی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے لیے مستقبل کی اصلاح میں بے حد مفید ثابت ہوسکتا ہے:

''عصبیت دراصل علم و دیانت کی موت کے مرادف ہے۔ جو شخص حدیث ''اِخْتَلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ''[1] کے مفہوم پر غور کرے اور اسے معلوم ہو کہ فرعی مسائل میں اختلاف کی بنیاد ظن پر ہے وہ کسی ایک مجتہد کے حق میں تحکم اور تعصب نہیں رکھ سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مذہب کی صحت اور مخالف کی غلطی کا ظن کر سکتا ہے لیکن اپنے مخالف کو مطلقاً خطا کار نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ کئی مسائل میں ائمۂ اربعہ متفق ہیں۔ جب فرعی مسائل ظن ہی کے مقام پر ہیں تو اس لیے دونوں مخالف فریق صحت اور خطا کا احتمال رکھ سکتے ہیں، صحت اور خطا کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ مقلد اور مجتہد زیادہ سے زیادہ صحت اور خطا کا ظن ہی کر سکتے ہیں، اس لیے اس میں تعصب کا کوئی مقام نہیں۔

''ہمارے زمانے میں بعض مقلد اربابِ مذاہب کو تعصب کا دورہ پڑتا ہے اور وہ الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔ ان سے بعض حضرات میں اتنا شدید تعصب ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی اقتدا کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قبیح اور نا مناسب باتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر افسوس ہے یہ خدا تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ اگر امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ زندہ ہوتے تو

[1] موضوع. تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٧)

ان کی ان حرکات کے خلاف سخت ناپسندیدگی اور ان سے بیزاری کا اظہار فرماتے۔ میں نے لاتعداد آدمیوں کو دیکھا ہے وہ آستینیں چڑھا کر امام شافعی کی مخالفت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ بلاتسمیہ ذبیحہ کو حلال سمجھتے ہیں۔ احناف پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ شرم گاہ کو مس کرتے ہیں اور بے وضو نماز پڑھتے ہیں۔ اور مالکی بسم اللہ کے بغیر نماز پڑھتے ہیں۔ حنبلی زوال سے پہلے جمعہ پڑھتے ہیں۔ اپنا حال یہ ہے کہ وہ ترکِ نماز کو گوارا کرتے ہیں، گھر کے لوگوں کو نماز کے ترک پر سرزنش نہیں کرتے، حالانکہ شوافع، موالک، حنابلہ بے نماز کے متعلق قتل کا فتویٰ دیتے ہیں۔

''افسوس! کیا یہ لوگ فقیہ ہیں؟ ایسے فقیہوں کو خدا تعالیٰ تباہ کرے۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے! ان فرعی مسائل پر اتنا زور دیتے ہو اور ہزاروں اجماعی محرمات اور ناجائز ٹیکسوں کی پروا تک نہیں کرتے اور نہ تمھیں اس پر غیرت ہی محسوس ہوتی ہے۔ تمھاری غیرت کا سارا زور ابوحنیفہ اور شافعی اختلافات پر پڑتا ہے جس سے افتراق ہوتا ہے اور جاہل تم پر مسلّط ہوجاتے ہیں۔ عوام میں تمھاری کرکری ہوتی ہے۔ بیوقوف تمھارے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں جو تمھارے احترام کے سراسر منافی ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں۔ تمھارا گوشت زہریلا ہے۔ بہر کیف تم اہلِ علم ہو۔ ان امور کی وجہ سے تباہی کی طرف جا رہے ہو۔ اللہ تمھیں علم اور علماء کے احترام سے نیکی کی توفیق دے اور ہمیں تعصب سے بچائے۔''

علامہ طاش کبریٰ زادہ نے اپنے وقت کے متعصب علماء کو کس قدر درد انگیز لہجے میں تنبیہ فرمائی اور ترکِ اقتدا اور اس میں شرائط کو ناپسند فرمایا ہے۔ اب ایک اور پاکباز کا ارشاد سنیے جسے اللہ تعالیٰ نے صاف ذہن مرحمت فرمایا ہے۔ ائمہ کے احترام کے ساتھ شریعت کے مصالح بھی اس کے پیشِ نظر ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اسمِ گرامی سے علمی حلقوں سے کون واقف نہیں۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ ایک حنفی وتر کی نماز میں یا جمع بین الصلاتین میں شافعی کی اقتدا کرسکتا ہے؟ اور اسے اجازت ہے کہ ایسے مسائل میں وہ شافعی امام کی تقلید کرے یا ایسا کرنا حنفی کے لیے درست نہیں؟

جواب: ہاں، بارش میں حنفی مقتدی شافعی امام کی تقلید اور اقتدا کرسکتا ہے کیوں کہ یہ جمع بین الصلاتین جمہور علماء کا مذہب ہے۔ شافعی، مالک، احمد رحمہم اللہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ ابن عمر امرائے مدینہ

کے ساتھ بارش میں نماز جمع فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے سوا کسی خاص آدمی کی تمام مسائل میں تقلید درست نہیں۔ مسلمان ہمیشہ علماء سے مسائل دریافت فرماتے رہے۔ کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے۔ کبھی ایک کی بات مانتے کبھی دوسرے کی۔ کسی معین کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ جب مقلد کسی مسئلے کو راجح اور اصلح سمجھے، اس میں ایک کی تقلید کرے اور دوسرے میں دوسرے کی، جمہور علمائے اسلام کے نزدیک درست ہے۔ اسے ائمۂ اربعہ میں سے کسی نے ناجائز نہیں کہا۔ وتر میں بھی یہی حال ہے۔ مقتدی کے لیے مناسب ہے کہ قنوت میں اور وتروں کے وصل و انقطاع میں امام کی پوری پوری اقتدا کرے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ امام اگر دو رکعت فصل کرے مقتدی جوڑ لے لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲/ ۳۸۷)

ناظرین! غور فرمائیں، اتحاد بین المسلمین کا سامان ابن عابدین اور طحطاوی کی رائے میں ہے یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور طاش کبریٰ زادہ کے ارشادِ گرامی میں؟

معتزلہ کا خیال ہے کہ پیغمبر کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ اشاعرہ اور متکلمین نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ عام ائمۂ اصول کا خیال ہے کہ پیغمبر بوقتِ ضرورت اجتہاد کرسکتا ہے اور اسے وحی اور اجتہاد دونوں پر عمل کی اجازت ہے:

"وَهُوَ مَنْقُوْلٌ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ مِنْ أَصْحَابِنَا، وَهُوَ مَذْهَبُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَعَامَّةِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ" (كشف الأسرار: ٣/ ٩٢٥)

''احناف سے امام ابو یوسف، امام شافعی، امام مالک اور عام اہلِ حدیث کا بھی یہی خیال ہے کہ پیغمبر اپنے اجتہاد پر عمل کرسکتا ہے۔''

یہاں اہلِ حدیث کا ذکر مذاہبِ اربعہ کے ساتھ علمائے اصول میں آیا ہے۔ مرسل حدیث کی حجیت کے تذکرے میں اہلِ حدیث پر تشنیع کرتے ہیں کہ وہ مرسل کو حجت نہیں سمجھتے:

"وَفِيْ رَدِّ الْمُرْسَلِ تَعْطِيْلُ كَثِيْرٍ مِنَ السُّنَنِ، فَإِنَّ الْمَرَاسِيْلَ جُمِعَتْ فَبَلَغَتْ قَرِيْبًا مِنْ خَمْسِيْنَ جُزْءًا، وَهٰذَا تَشْنِيْعٌ عَلَيْهِمْ، فَإِنَّهُمْ سَمَّوا أَنْفُسَهُمْ أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ، وَانْتَصَبُوْا أَنْفُسَهُمْ لِحِيَازَةِ الْأَحَادِيْثِ" اهـ (كشف الأسرار: ٣/ ٧٢٥)

''مرسل کی حجیت کے انکار سے حدیث کا بڑا ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ لوگ اہلِ حدیث

کہلا کر حفاظتِ حدیث کے بجائے حدیث کو ضائع کر رہے ہیں۔''

اہلِ حدیث کی یہاں بھی مستقل حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ مرسل کی حجیت کی بحث بالکل الگ مسئلہ ہے۔ جس مرسل کو یہ حضرات حجت فرماتے ہیں وہ دراصل حدیث ہی نہیں۔ اس کے انکار سے حدیث کا انکار لازم نہیں آتا۔ علامہ ابن عابدین رد المحتار میں لفظ حنفی میں یائے نسبت کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

"إِنَّ النِّسْبَةَ إِلىٰ مَذْهَبِ أَبِي حَنِيْفَةَ وَإِلَى الْقَبِيْلَةِ وَهُمْ بَنُوْ حَنِيْفَةَ بِلَفْظٍ وَّاحِدٍ، وَإِنَّ جَمَاعَةً مِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ مِنْهُمْ أَبُو الْفَضْلِ مُحَمَّدُ بْنُ طَاهِرٍ الْمُقْدَسِيُّ يُفَرِّقُوْنَ بَيْنَهُمَا بِزِيَادَةِ يَاءٍ فِيْ النِّسْبَةِ إِلَى الْمَذْهَبِ" اهـ (١/ ١٦)

''عراقی فرماتے ہیں: قبیلہ بنو حنیفہ اور مذہب ابو حنیفہ کی طرف نسبت میں حنفی درست ہے لیکن بعض اہلِ حدیث کا خیال ہے کہ مذہب کی طرف نسبت میں حنیفی کہنا چاہیے۔ محمد بن طاہر مقدسی علمائے اہلِ حدیث سے بھی یہی فرماتے ہیں۔''

اس میں ان کی رائے لغت اور زبان کے ماہر کی حیثیت سے ہے۔

اذان اور اقامت میں لفظ ''اکبر'' کے اعراب کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَثَانِيْهَا مُخَالِفَةٌ لِمَا فَسَّرَهُ أَهْلُ الْحَدِيْثِ وَالْفِقْهِ" اهـ (شامی: ١/ ٤٠١)

''را پر اعراب اہلِ حدیث اور فقہاء کی تفسیر کے خلاف ہے۔''

"وَقَفَ عَلىٰ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ، لَا يَدْخُلُ فِيْهِ الشَّافِعِيُّ إِذَا لَمْ يَكُنْ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ، وَيَدْخُلُ فِيْهِ الْحَنَفِيُّ كَانَ فِيْ طَلَبِه أَوْ لَا" اهـ (شامی: ٣/ ٦٦٥)

''کسی نے اہلِ حدیث کے لیے کوئی چیز وقف کی تو شافعی اگر حدیث کا طالب علم ہو تو اس میں شامل ہوگا اور حنفی بہرحال شامل ہوگا، حدیث پڑھے یا نہ پڑھے۔''

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی [1]

خوارج کے متعلق علماء کے اختلاف کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ذَكَرَ فِيْ فَتْحِ الْقَدِيْرِ أَنَّ الْخَوَارِجَ الَّذِيْنَ يَسْتَحِلُّوْنَ دِمَاءَ الْمُسْلِمِيْنَ وَأَمْوَالَهُمْ، وَيُكَفِّرُوْنَ الصَّحَابَةَ، حُكْمُهُمْ عِنْدَ جُمْهُوْرِ الْفُقَهَاءِ وَأَهْلِ الْحَدِيْثِ حُكْمُ

[1] تیری خنجر آزمائی کے لیے دوستوں کا سر سلامت ہے۔

الْبُغَاةِ، وَذَهَبَ بَعْضُ أَهْلِ الْحَدِيْثِ إِلٰى أَنَّهُمْ مُرْتَدُّوْنَ. قَالَ ابْنُ الْمُنْذِرِ: وَلَا أَعْلَمُ أَحَدًا وَافَقَ أَهْلَ الْحَدِيْثِ عَلٰى تَكْفِيْرِهِمْ" اهـ (شامی: ۱/ ۴۵۳)

''جمہور فقہاء اور اہلِ حدیث کے نزدیک خوارج باغی ہیں۔ بعض اہلِ حدیث انھیں مرتد کہتے ہیں۔ ابن منذر فرماتے ہیں: تکفیر میں ان کی کسی نے تائید نہیں کی۔''

جمہور فقہاء کے ساتھ ان فقراء کا تذکرہ مکتبِ فکر کی حیثیت سے ہوا ہے۔

اسی صفحہ میں اہلِ ہویٰ کے متعلق محدثین کا تذکرہ اپنی تائید میں فرماتے ہیں:

"وَكَذَا نَصَّ الْمُحَدِّثُوْنَ عَلٰى قُبُوْلِ رِوَايَةِ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ" اهـ (۳/ ۴۵۳)

''ائمہ اہلِ حدیث نے اہلِ ہویٰ کی روایت کے قبول کے متعلق تصریح فرمائی ہے۔''

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"حُكِيَ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ خَطَبَ إِلٰى رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ ابْنَتَهُ عَهْدَ أَبِيْ بَكْرٍ الْجَوْزَجَانِيِّ، فَأَبٰى إِلَّا أَنْ يَّتْرُكَ مَذْهَبَهُ فَيَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ"[1]

''ایک حنفی نے شیخ ابوبکر جوزجانی کے وقت کسی اہلِ حدیث سے رشتہ طلب کیا۔ اس نے شرط لگائی کہ اپنا مذہب چھوڑ کر فاتحہ خلف الامام اور رفع الیدین شروع کرو، اس نے ایسا کرلیا۔''

شیخ جوزجانی فرماتے ہیں:

''نکاح تو ہوگیا لیکن خیال ہے نزع کے وقت اس کا ایمان جاتا رہے گا۔ اگر دلائل کی بنا پر سابق مذہب کو ترک کر کے اہلِ حدیث ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے۔''

اس سے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کا تعین بھی ہوگیا اور اگر دلائل کی بنا پر کوئی اس مسلک کو پسند کرے تو ابوبکر جوزجانی فرماتے ہیں یہ بہتر ہے۔ آج کل حضراتِ دیوبند کی اہلِ حدیث پر ناراضی کچھ برمحل معلوم ہوتی ہے۔

بحر العلوم، مسلم الثبوت کی شرح میں جرح و تعدیل کے تعارض کی بحث میں مشاجراتِ صحابہ کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور مظلومیت کا ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان کی شہادت میں صحابہ سے کوئی شریک نہ تھا:

---

[1] رد المحتار (۴/ ۲۴۹)

"وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ وَاحِدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ كَمَا صَرَّحَ بِهِ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيثِ" (ص: ٤٤٢، طبع هند)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں صحابہ سے کوئی شریک نہ تھا۔ اہلِ حدیث نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔''

یہاں اہلِ حدیث کے تاریخی موقف کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان کی نقل رجالِ تاریخ اور مشاجراتِ صحابہ میں قطعیت کی حد تک پہنچ چکی ہے۔

علامہ عبدالعزیز بن احمد بن محمد بخاری (۷۳۰ھ) مؤلف کتاب التحقیق شرح حسامی نے عبادلہ کی تعیین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وَعِنْدَ الْمُحَدِّثِيْنَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ مَقَامَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ"

(ص: ١٦٣، طبع هند)

یہاں فقہاء کے بالمقابل محدثین کا ذکر فرمایا ہے، جس کا مطلب واضح ہے کہ رجال کی تعیین میں ان کا ایک مقام ہے اور اپنی مستقل رائے ہے۔

پیغمبر کے لیے اجتہاد کی اجازت کا ذکر فرماتے ہوئے شارح بزدوی کی طرح کتاب التحقیق کے مؤلف بھی فرماتے ہیں:

"هُوَ مَنْقُوْلٌ عَنْ أَبِي يُوْسُفَ مِنْ أَصْحَابِنَا، وَهُوَ مَذْهَبُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَعَامَّةِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ" (كتاب التحقيق، ص: ٢٠)

''امام ابو یوسف، مالک، شافعی اور عام اہلِ حدیث کا یہی خیال ہے کہ پیغمبر اپنے اجتہاد پر اگر ضرورت ہو تو عمل کر سکتا ہے۔''

مورخین و متکلمین کی رائے:

ابن خلدون اپنے وقت کے نقاد مؤرخ ہیں جنھوں نے فنِ تاریخ کو قصص و حکایات کی دلدل سے نکال کر اسے ایک نئی زندگی بخشی اور فنِ تنقید کے اسالیب کی طرف راہنمائی فرمائی۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں فرائض کے تذکرے میں فرمایا ہے:

"وَانْقَسَمَ الْفِقْهُ فِيهِمْ إِلٰى طَرِيْقَيْنِ: طَرِيْقِ أَهْلِ الرَّأْيِ وَالْقِيَاسِ، وَهُمْ أَهْلُ

الْعِرَاقِ، وَطَرِيْقُ أَهْلِ الْحَدِيْثِ، وَهُمْ أَهْلُ الْحِجَازِ، وَكَانَ الْحَدِيْثُ قَلِيْلًا فِيْ أَهْلِ الْعِرَاقِ لِمَا قَدَّمْنَاهُ، فَاسْتَكْثَرُوْا مِنَ الْقِيَاسِ، وَمَهَرُوْا فِيْهِ، فَلِذٰلِكَ قِيْلَ: أَهْلُ الرَّأْيِ، وَمُقَدَّمُ جَمَاعَتِهِمُ الَّذِيْ اسْتَقَرَّ الْمَذْهَبُ فِيْهِ وَفِيْ أَصْحَابِهِ أَبُوْ حَنِيْفَةَ" (مقدمه ابن خلدون، ص: ۳۸۹، طبع مصر)

''فقہ کے دو طریق ہوگئے: فقہ العراق اور فقہ الحدیث۔ علمائے عراق میں حدیث کم تھی جس کی وجہ ذکر ہو چکی ہے، اس لیے انھوں نے رائے اور قیاس میں مہارت پیدا کی اور اہل الرائے کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے پیش رو امام ابو حنیفہ ہیں اور اہلِ حجاز کی فقہ کا نام فقہ الحدیث ٹھہرا۔''

ملا کاتب چلپی (م ۱۰۶۷ھ) نے اصولِ فقہ کے تذکرہ میں امام علاؤ الدین حنفی کی کتاب میزان الاصول سے نقل فرمایا ہے:

"وَأَكْثَرُ التَّصَانِيْفِ فِيْ أُصُوْلِ الْفِقْهِ لِأَهْلِ الْاِعْتِزَالِ الْمُخَالِفِيْنَ لَنَا فِيْ الْأُصُوْلِ، وَلِأَهْلِ الْحَدِيْثِ الْمُخَالِفِيْنَ لَنَا فِيْ الْفُرُوْعِ، وَلَا اعْتِمَادَ عَلٰى تَصَانِيْفِهِمْ" (کشف الظنون، ص: ۸۹، دار الطباعه مصر)

''اصولِ فقہ میں معتزلہ اور اہلِ حدیث کی تصانیف زیادہ ہیں۔ معتزلہ اصول میں ہمارے مخالف ہیں اور اہلِ حدیث فروع میں، اس لیے ان کی تصانیف پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔''

نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے "أبجد العلوم" (۲/ ۵۶۵) میں "کشف الظنون" کی عبارت نقل فرمائی اور فقہ العراق اور فقہ الحدیث کا تذکرہ فرمایا، پھر تقلید اور عمل بالحدیث پر مختصر تبصرہ فرمایا اور مذاہبِ ائمہ کی اشاعت اور کتبِ طبقات کی عصبیت کا تذکرہ فرمایا کہ وہ خواہ مخواہ ہر آدمی کو ادنیٰ ممارست اور توافق سے اپنے مذہب میں شمار کر لیتے ہیں۔ اور ان اقطار اور بلاد کا ذکر فرمایا جہاں یہ مذاہب عام اور شائع ہوئے اور اہلِ حق کی کتابوں کو کس طرح طاقِ نسیاں کی نذر کیا گیا۔ فرماتے ہیں:

"فَلَمْ يَبْقَ إِلَّا مَذْهَبُ أَهْلِ الرَّأْيِ مِنَ الْعِرَاقِ وَأَهْلِ الْحَدِيْثِ مِنَ الْحِجَازِ" (۲/ ۵۶۶)

''اس تعصب کی دستبرد کے باوجود اہل الرائے عراق میں اور اہلِ حدیث حجاز میں باقی رہ گئے۔''

تقی الدین احمد بن علی مقریزی (م ۸۴۵ھ) نے فرمایا کہ جب ملک ظاہر بیبرس بندقداری (م ۶۷۶ھ) نے ۶۶۲ھ میں مدرسہ ظاہریہ کی بنیاد رکھی اور اس کے مصارف کے لیے بہت بڑا وقف کیا تو اس میں مختلف مکاتبِ فکر کی تدریس کے لیے مختلف ایوان بنائے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

"وَجَلَسَ أَهْلُ الدُّرُوْسِ كُلَّ طَائِفَةٍ فِيْ إِيْوَانٍ، مِنْهَا: الشَّافِعِيَّةُ بِالْإِيْوَانِ الْقَلْبِيِّ، وَمُدَرِّسُهُمُ الشَّيْخُ تَقِيُّ الدِّيْنِ مُحَمَّدُ بْنُ حَسَنِ بْنِ رَزِيْنِ الْحَمَوِيُّ، وَالْحَنَفِيَّةُ بِالْإِيْوَانِ الْبَحْرِيِّ، وَمُدَرِّسُهُمُ الصَّدْرُ مَجْدُ الدِّيْنِ عَبْدُ الرَّحْمَانِ ابْنُ الصَّاحِبِ كَمَالِ الدِّيْنِ عُمَرَ بْنِ الْعَدِيْمِ الْحَلَبِيُّ، وَأَهْلُ الْحَدِيْثِ بِالْإِيْوَانِ الشَّرْقِيِّ، وَمُدَرِّسُهُمُ الشَّيْخُ شَرَفُ الدِّيْنِ عَبْدُ الْمُؤْمِنِ بْنُ خَلَفٍ الدِّمْيَاطِيُّ" اهـ (الخطط: ۲/ ۲۱۷)

"تمام علماء اپنے ایوان میں درس دینے لگے۔ شافعی سامنے کے ایوان میں تھے۔ ان کے صدر مدرس تقی الدین محمد بن حسن حموی تھے۔ حنفی سمندری ایوان میں۔ ان کے صدر مدرس عبدالرحمٰن بن العدیم حلبی تھے۔ اہلِ حدیث مشرقی ایوان میں درس دینے لگے اور ان کے صدر مدرس شیخ شرف الدین عبدالمومن بن خلف دمیاطی تھے۔"

یہ ساتویں صدی ہے۔ اس میں بھی شاہی مدرسے میں دوسرے مکاتب کے مقابل اہلِ حدیث کے لیے مستقل ایوان ہے۔ مقریزی فرماتے ہیں کہ یہ مدرسہ اب بھی موجود ہے۔ کسی قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔ حنفی اور شافعی اس کی نظامت کے متعلق دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں۔

مقریزی اہلِ مصر کے مذاہب اور اربابِ مذاہب کی تبدیلیوں اور اس کے اسباب کا ذکر فرماتے ہیں:

"وَكَانَتْ إِفْرِيْقِيَّةُ الْغَالِبُ عَلَيْهَا السُّنَنُ وَالْآثَارُ إِلىٰ أَنْ قَدِمَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ فَرُّوْجٍ أَبُوْ مُحَمَّدٍ الْفَارِسِيُّ بِمَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ" اهـ (الخطط: ۱/ ۱۴۴)

"افریقہ میں ابتدا میں سب لوگ سنن و آثار (مسلک اہلِ حدیث) کے پابند تھے، یہاں تک کہ شیخ عبداللہ بن فروج حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک لے کر آ گئے۔"

مقریزی افریقہ میں مالکی مذہب کی اشاعت کے متعلق فرماتے ہیں:

"وَصَارَ الْقَضَاءُ فِيْ أَصْحَابِ سُحْنُوْنٍ دَوْلًا يَتَصَاوَلُوْن عَلَى الدُّنْيَا تَصَاوُلَ الْفُحُوْلِ عَلَى الشَّوْلِ" (١/ ١٤٤)

یعنی سحون کے رفقاء محکمۂ قضا پر اس طرح حملہ آور ہوتے جس طرح نر اونٹ مادہ پر۔

اس کے بعد آگے حنفی مذہب کی اشاعت کے متعلق لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف کا مرہونِ منت ہے۔ اہلِ حدیث بے چارے اس جنگ میں کہاں کامیاب ہوتے، جب انھوں نے کسی حکومت کی سرپرستی ہی قبول نہیں فرمائی۔

شعرانی تمام ائمۂ سنت کا احترام کرتے ہیں۔ انھیں سب سے عقیدت ہے۔ اس کے اظہار میں وہ بڑے ہی وسیع الظرف ہیں۔ میزان صغریٰ میں امام شافعی سے نقل فرماتے ہیں:

"كَانَ -رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ- يَقُوْلُ: أَهْلُ الْحَدِيْثِ فِيْ كُلِّ زَمَان كَالصَّحَابَةِ فِيْ زَمَانِهِمْ، وَإِذَا رَأَيْتُ صَاحِبَ حَدِيْثٍ فَكَأَنَّمَا رَأَيْتُ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَ يَقُوْلُ: إِيَّاكُمْ وَالْأَخْذَ بِالْحَدِيْثِ الَّذِيْ جَاءَكُمْ مِنَ الْعِرَاقِ إِلَّا بَعْدَ التَّفْتِيْشِ" (ص: ٥٧)

"امام شافعی فرماتے: اہلِ حدیث ہر دور میں صحابہ کی طرح ہیں۔ جب میں کسی اہلِ حدیث کو دیکھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں میں نے صحابی کو دیکھا۔ اور فرماتے: اہلِ عراق کی حدیث تفتیش کے بغیر مت قبول کرو۔"

ابوبکر بن عیاش نے فرمایا:

"أَهْلُ الْحَدِيْثِ فِيْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ كَالْإِسْلَامِ فِيْ سَائِرِ الْأَدْيَانِ" (ص: ٥٦)

"اہلِ حدیث اسلامی فرقوں میں اس طرح ہیں جیسے اسلام باقی دینوں میں۔"

ابو العباس بن شریح فرماتے تھے:

"أَهْلُ الْحَدِيْثِ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الْفُقَهَاءِ" (ص: ٥٤)

"اہلِ حدیث کا درجہ فقہاء سے اُونچا ہے۔"

امام ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادی کی مختلف مذاہب اور فرقوں کے متعلق بڑی جامع کتاب ہے۔ اہلِ سنت کے مختلف مسالک کا ذکر فرماتے ہیں:

"وَالصِّنْفُ الثَّانِي مِنْهُمْ أَئِمَّةُ الْفِقْهِ مِنْ فَرِيْقَي الرَّأْيِ وَالْحَدِيْثِ مِنَ الَّذِيْنَ اعْتَقَدُوْا فِيْ أُصُوْلِ الدِّيْنِ مَذَاهِبَ الصِّفَاتِيَّةِ فِي اللّٰهِ وَصِفَاتِهِ الْأَزَلِيَّةِ"
(الفرق بين الفرق، ص: ٣٠٠)

"دوسری قسم فقہاء کی ہے جن میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث دونوں شامل ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ازلیہ کو بلا تاویل مانتے ہیں اور تشبیہ اور تعطیل کے قائل نہیں۔"

اسی کتاب میں آگے چل کر اہلِ تصوف کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كَلَامُهُمْ فِيْ طَرِيْقَي الْعِبَارَةِ وَالْإِشَارَةِ عَلٰى سَمْتِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ دُوْنَ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ"

"ان کا اندازِ گفتگو اور اشارات اہلِ حدیث کی طرح ہیں، اہلِ لہو ولعب کی طرح نہیں۔"

اسی طرح ان دونوں فریق کا ذکر صفحات (۳۱۴، ۳۰۲، ۱۱۴، ۷، ۱۳۱۳) میں مرقوم ہے۔ اس کتاب میں اہلِ حدیث کا ذکر اکثر مقامات پر آیا ہے، کہیں بطور رواۃِ حدیث اور کہیں بطور مکتبِ فکر ؎

خُذْ بَطْنَ هَرْشَا أَوْ قَفَاهَا فَإِنَّهُ كِلَا جَانِبَيْ هَرْشَا لَهُنَّ طَرِيْقُ[1]

یہ لوگ دین کا ہر کام کرتے رہے لیکن نہ کسی فرقے کی تاسیس کی نہ کسی دھڑے کے لیے دعوت دی، نہ اشخاص کی محبت ہی ان پر اس قدر غالب ہوئی جس سے دوسرے کی تنقیص لازم آئے۔ ان کی نظر اشخاص سے زیادہ دلائل پر رہی۔ شخصی تنقید سے زیادہ انھوں نے مسائل کی تحقیق فرمائی۔

امام ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (۳۳۰ھ) "مقالات الإسلاميين" میں فرماتے ہیں:

"جُمْلَةُ مَا عَلَيْهِ أَهْلُ الْحَدِيْثِ وَالسُّنَّةِ: اَلْإِقْرَارُ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَمَا رَوَاهُ الثِّقَاتُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَا يَرُدُّوْنَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا، وَأَنَّ اللّٰهَ ـ سُبْحَانَهُ ـ وَاحِدٌ صَمَدٌ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ" (ص: ٢٢)

"اہلِ حدیث اور ائمۂ سنت کا عقیدہ ہے: اللہ تعالیٰ کا اقرار، ملائکہ اور فرشتوں اور رسولوں کا اقرار، کتابوں کا اقرار، جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں، اور جو ثقہ راویوں نے روایت کیا اس

[1] ہرشا کا پیٹ پکڑ یا گدی، یہ دونوں ہی ہرشا کے دو پہلو اور ان کا راستہ ہیں۔ (ہرشا مکہ اور مدینہ کے درمیان میں ایک وادی کا نام ہے۔)

میں وہ کسی چیز کو رد نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ اکیلا اور بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

اس کے بعد آگے اہلِ حدیث کے عقائد کا تذکرہ کئی اوراق میں فرمایا۔ یہ تذکرہ معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقوں کے بالمقابل فرمایا، جس کا مطلب ظاہر ہے کہ اہلِ حدیث ائمۂ اعتزال اور متکلمین کے مدِّمقابل ہیں۔

ابن ندیم نے علمائے عراق، ائمۂ شوافع، موالک، امام داود ظاہری، فقہائے شیعہ کا مبسوط تذکرہ کرنے کے بعد فقہاء المحدثین و اصحاب الحدیث کا تذکرہ فرمایا۔ فنِ سادس سے تقریباً ۶۴ فقہائے حدیث کا تذکرہ فرمایا۔ ان میں امام بخاری، سفیان ثوری، ابن ابی ذئب، سفیان بن عیینہ، ابن ابی عروبہ، اسماعیل بن عبید، عبداللہ بن مبارک، امام احمد، عثمان بن ابی شیبہ، ترمذی، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین، ابو داود، مسلم وغیرہ علماء کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے فقہائے حدیث اگر مکتبِ فکر نہیں تو پھر انھیں ائمۂ عراق وغیرہ سے الگ عنوان کے ماتحت کیوں ذکر فرمایا؟ حالانکہ امام ابوجعفر طحاوی وغیرہ حفاظِ حدیث موجود ہیں لیکن ہر حافظِ حدیث اہلِ حدیث نہیں ہوسکتا۔

امام محی الدین یحییٰ بن شرف النواوی صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں:

"إِنَّ الْوَاجِبَ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ، وَهُوَ مَذْهَبُ عَطَاءٍ، وَمَكْحُولٍ، وَالْأَوْزَاعِيِّ، وَأَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ، وَابْنِ الْمُنْذِرِ، وَعَامَّةِ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ"

(صحيح مسلم مع شرح النووي: ۱/ ۱۰۱۰)

"تیمّم میں چہرے اور ہاتھوں کے لیے ایک ضرب ضروری ہے۔ عطاء، مکحول، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابن منذر اور ائمۂ اہلِ حدیث کا یہی مذہب ہے۔"

طلاق الحائض کے متعلق فرماتے ہیں کہ مطلق کو رجوع کے لیے کہنا چاہیے:

"هٰذَا مَذْهَبُنَا، وَبِهٖ قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ وَأَبُوْ حَنِيْفَةَ وَسَائِرُ الْكُوْفِيِّيْنَ وَأَحْمَدُ وَفُقَهَاءُ الْمُحَدِّثِيْنَ وَآخَرُوْنَ" (صحيح مسلم مع شرح النووي: ۱/ ۴۷۵)

"ہمارا اور اوزاعی، ابو حنیفہ اور تمام اربابِ کوفہ، احمد اور فقہائے محدثین اور بعض دوسرے علماء کا بھی یہی خیال ہے۔"

ذہبی نے طبقات الحفاظ، ابو محمد الفضل بن محمد کے تذکرے میں فرمایا:

"وَلَقَدْ كَانَ فِيْ هٰذَا الْعَصْرِ وَمَا قَارَبَهُ مِنْ أَئِمَّةِ الْحَدِيْثِ النَّبَوِيِّ خَلْقٌ كَثِيْرٌ، وَمَا ذَكَرْنَا عُشْرَهُمْ هُنَا، وَأَكْثَرُهُمْ مَذْكُوْرُوْنَ فِيْ تَارِيْخِيْ، وَكَذٰلِكَ كَانَ فِيْ هٰذَا الْوَقْتِ خَلْقٌ مِنْ أَئِمَّةِ أَهْلِ الرَّأْيِ وَالْفُرُوْعِ، وَعَدَدٌ مِنْ أَسَاطِيْنِ الْمُعْتَزِلَةِ، وَالشِّيْعَةِ، وَأَصْحَابِ الْكَلَامِ الَّذِيْنَ مَشَوْا وَرَاءَ الْعُقُوْلِ، وَأَعْرَضُوْا عَمَّا عَلَيْهِ السَّلَفُ مِنَ التَّمَسُّكِ بِالْآثَارِ النَّبَوِيَّةِ، وَظَهَرَ فِيْ الْفُقَهَاءِ التَّقْلِيْدُ وَتَنَاقُضُ الْاِجْتِهَادِ" اهـ (تذكرة الحفاظ: ٢/ ٦٢٧)

"اس زمانے (۲۸۲ھ) میں ائمۂ حدیث کی بڑی تعداد موجود تھی۔ یہاں میں نے ان کا عُشرِ عشیر بھی نہیں لکھا۔ میں نے ان کا مفصل تذکرہ اپنی تاریخ اسلام میں کیا ہے۔ اسی طرح ائمۂ رائے اور فقہائے فروع اور شیعہ اور معتزلہ سے بھی اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ انھوں نے آثارِ نبویہ اور سلف کی راہ سے اعراض کیا، اور فقہاء میں تقلید اور متناقض اجتہادات کی گرم بازاری ہوئی۔"

ذہبی اس شذرے کے آخر میں فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ جب کہیں دقّت محسوس ہوئی تم ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر کہنے لگو گے: احمد کون ہے؟ علی بن مدینی کیا ہے؟ ابو زرعہ اور ابو داود کی حیثیت کیا ہے؟ یہ لوگ صرف محدث ہیں۔ یہ فقہ نہیں جانتے۔ اصولِ فقہ سے ناواقف ہیں۔ رائے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ معانی، بیان، منطق اور علم البرہان سے ناآشنا ہیں۔ خدا کو دلائل سے نہیں مانتے۔ ذہبی فرماتے ہیں: یا تو چپ رہو یا علم کے ساتھ گفتگو کرو۔ علم وہی ہے جو ان لوگوں کی معرفت آئے۔"

اس مقام پر ائمۂ حدیث کا تذکرہ فقہائے مجتہدین کے بالمقابل ذکر فرمایا ہے۔ ان کے تفقہ اور ان کے علم کی حقانیت کا بھی ذکر فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ مستقبل میں تقلید اور متناقض اجتہادات کا دنیا میں فروغ ہو رہا ہے اور علومِ حقہ اور اہلِ فن پر طعن کی راہیں کھل رہی ہیں۔

بقی بن مخلد کے تذکرے میں مرقوم ہے:

"وَقَدْ تَعَصَّبُوْا عَلٰى بَقِيٍّ لِإِظْهَارِهِ مَذْهَبَ أَهْلِ الْأَثَرِ فَدَفَعَ عَنْهُ أَمِيْرُ

الْأُنْدُلُسِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْمَرْوَانِيُّ، وَاسْتَنْسَخَ كُتُبَهُ وَقَالَ لِبَقِيٍّ: أُنْشُرْ عِلْمَكَ" (تذكرة الحفاظ: ٢/ ٦٣٠)

''بقی بن مخلد نے اہلِ حدیث اور آثار کے مسلک کا اظہار کیا، لوگ ان پر تعصب کرنے لگے۔ اندلس کے امیر محمد بن عبدالرحمٰن مروانی نے ان کو ہٹایا اور ان کی کتابیں نقل کرائیں، اور فرمایا: تم اپنے علم، یعنی آثار اور احادیث، کی اشاعت کرو۔''

ابو عبداللہ محمد بن ابی نصر حمیدی کے تذکرے میں فرمایا:

"كَانَ وَرِعًا ثِقَةً إِمَامًا فِي الْحَدِيْثِ، وَعِلَلِهِ، وَرُوَاتِهِ، مُتَحَقِّقًا فِي عِلْمِ التَّحْقِيْقِ وَالْأُصُوْلِ عَلىٰ مَذْهَبِ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ بِمُوَافَقَةِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ"[1]

''حمیدی پرہیز گار، متقی اور امام تھے۔ حدیث اور رواۃ کے علل کو جانتے تھے۔ اہلِ حدیث کے مذہب کے مطابق اور کتاب وسنت کی روشنی میں انھوں نے اصول وضع فرمائے۔''

امام نووی صحیح مسلم کے باب المساقاۃ کی شرح میں فرماتے ہیں:

"وَبِهِ قَالَ مَالِكٌ، وَالثَّوْرِيُّ، وَاللَّيْثُ، وَالشَّافِعِيُّ، وَأَحْمَدُ، وَجَمِيْعُ فُقَهَاءِ الْمُحَدِّثِيْنَ" (٢/ ١٤)

اسی صفحہ میں مرقوم ہے:

"وَقَالَ ابْنُ أَبِي لَيْلىٰ، وَأَبُوْ يُوْسُفَ، وَمُحَمَّدٌ وَسَائِرُ الْكُوْفِيِّيْنَ، وَفُقَهَاءُ الْمُحَدِّثِيْنَ، وَأَحْمَدُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ" (٢/ ١٤)

''مساقات اور مزارعہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے مالک، ثوری، لیث، شافعی، احمد اور تمام فقہائے محدثین نے۔ اسی طرح مزارعہ کے جواز کا فتویٰ دیا ابن ابی لیلیٰ، ابو یوسف، محمد اور تمام علمائے کوفہ اور فقہائے محدثین اور احمد ابن خزیمہ نے۔''

ابوابِ شفعہ میں امام نووی نے فرمایا:

"وَقَالَ الْحَكَمُ، وَالثَّوْرِيُّ، وَأَبُوْ عُبَيْدٍ، وَطَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ: لَيْسَ لَهُ الْأَخْذُ" (شرح صحیح مسلم: ٢/ ٣٢)

[1] تذكرة الحفاظ (٤/ ١٢١٩)

''مندرجہ ذکر علماء اور اہلِ حدیث کا خیال ہے کہ ہمسایہ کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔''

پڑوسی کی دیوار پر لکڑی رکھنے کے متعلق فرمایا:

"وَالثَّانِي: اَلْإِيْجَابُ، وَبِهِ قَالَ أَحْمَدُ، وَأَبُوْ ثَوْرٍ، وَأَصْحَابُ الْحَدِيْثِ"

(شرح صحيح مسلم: ١/ ٣٢)

''احمد، ابوثور اور اصحاب الحدیث کا خیال ہے کہ ہمسایہ کو دیوار پر لکڑی کی اجازت ضروری ہے۔''

ان تمام مواقع میں اہلِ حدیث کا تذکرہ مکتبِ فکر کے طور پر فرمایا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تیمّم کے تذکرہ میں فرمایا کہ "وجه" اور "كفين" پر تیمّم کے لیے ایک ضرب کے جواز کی طرف ذیل کے ائمہ گئے ہیں:

"وَإِلَيْهِ ذَهَبَ أَحْمَدُ، وَإِسْحَاقُ، وَابْنُ جَرِيْرٍ، وَابْنُ الْمُنْذِرِ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَنَقَلَهُ أَبُوْ الْجَهْمِ وَغَيْرُهُ عَنْ مَالِكٍ، وَنَقَلَهُ الْخَطَّابِيُّ عَنْ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ" (فتح الباري: ١/ ٣٠٤)

''امام احمد، اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن خزیمہ اور امام مالک کا خیال ہے کہ تیمّم منہ اور دونوں کف پر کیا جائے۔ خطابی فرماتے ہیں: اصحاب الحدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے "الأسماء واللغات" میں امام شافعی رحمہ اللہ کا تذکرہ بڑے دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ یہ تذکرہ کئی اوراق میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مقام پر امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ کا قول ذکر فرمایا:

"قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ ـرَحِمَهُ اللّٰهُـ: إِنْ تَكَلَّمَ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ يَوْمًا فَبِلِسَانِ الشَّافِعِيِّ" (١/ ٥٠)

''اصحاب الحدیث اگر گفتگو کریں گے تو وہ امام شافعی ہی کی زبان سے ہوگی۔''

یعنی امام شافعی کی کتابیں ان کی راہنمائی کریں گی۔ حسن بن محمد زعفرانی فرماتے ہیں:

"كَانَ أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ رُقُوْداً فَأَيْقَظَهُمُ الشَّافِعِيُّ (١/ ٥٠)

''اہلِ حدیث سو رہے تھے۔ شافعی رحمہ اللہ نے ان کو جگا دیا۔''

امام احمد کے ایک توصیفی ارشاد میں فرمایا:

"فَهٰذَا قَوْلُ إِمَامِ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ وَأَهْلِهِ" (١/ ٥٠)

''یہ اہلِ حدیث کے امام کا قول ہے۔''

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حدیث امام احمد، امام شافعی اور امام محمد سے پہلے موجود تھے۔ یہ ائمہ بھی اہلِ حدیث تھے۔ ان کے علوم سے اہلِ حدیث کو فائدہ پہنچا۔ ایک مقام پر فرمایا کہ عام علماء اور فقہائے خراسان کی زبان میں امام شافعی کے شاگردوں کا لقب اہلِ حدیث ہوا۔

تقلید اور جمود کا دور:

تقلید اور جمود کی ان تیرہ صدیوں میں کیا کیفیت رہی، اس کے متعلق صحیح اور قطعی رائے اور اس کے مد و جزر کا جائزہ لینے کے لیے گہرے اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہے۔ ائمہ کی تصریحات اور مذہبی فرقوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور مختلف فرق اور ملل ونحل کی کتابوں کے سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ خیر میں تمام علماء مجتہد نہیں تھے لیکن ائمۂ اجتہاد کی کافی تعداد پائی جاتی تھی۔ اور ایسے اہلِ علم جو درجۂ اجتہاد کو تو نہیں پہنچے لیکن مسائل اور دلائل پر بقدرِ ضرورت ان کی نظر تھی ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ احادیث کے حفظ کے ساتھ انھیں اللہ تعالیٰ نے تفقہ بھی عطا فرمایا تھا۔ عوام جو دنیوی مشاغل کی وجہ سے علمی مشغلہ نہ رکھ سکے، بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سب بوقتِ ضرورت اپنے سے بہتر علماء کی طرف توجہ فرماتے۔

ایک عام آدمی کے لیے یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے پہلے مجتہد کی تلاش کرے۔ وہ بے چارا اتنا عالم ہوتا تو اسے دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوتی۔ وہ جسے عالم سمجھتے اس سے دریافت کرتے۔ نہ اجتہاد کا امتحان لیتے نہ مجتہد کا تعین کرتے بلکہ تقلید کی اقسام شخصی اور غیر شخصی سے وہ لوگ ناآشنا تھے۔ جسے قرآن وسنت اور درس و تدریس میں مشغول دیکھتے اس سے دریافت فرماتے۔ دینی فطرت کی بنا پر اطمینان ہوجاتا تو عمل کرتے ورنہ دوسرے عالم کی طرف رجوع کرتے۔ نہ مجتہد کے لیے بے قرار ہوتے نہ کسی ایک عالم کی تعیین فرماتے۔ یہ بالکل فطری اور طبعی سا طریقہ تھا جس کے وہ پابند تھے۔ اس روش کی موجودگی میں فرقہ پروری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی بنا پر فرمایا:

"اِعْلَمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوْا قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَيْرَ مُجْمِعِيْنَ عَلَى التَّقْلِيْدِ الْخَالِصِ لِمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ بِعَيْنِهٖ" اھ (حجة الله البالغة: ١/ ١٢٢)

"لوگ چوتھی صدی سے پہلے کسی خاص شخص کی تقلید پر جمع نہیں تھے۔"

اس کے بعد ابو طالب مکی کی ''قوت القلوب'' (۲/ ۳۶) سے ذکر فرمایا کہ شخصی تقلید اور فقہیات کے مجموعے سب مُحدَث ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دوسری صدی کے بعد کسی قدر تخریجِ مسائل کا رواج ہوا۔ چوتھی صدی تک بھی لوگ ایک امام کی تقلید کے پابند نہ تھے۔ اجماعی مسائل میں وہ صرف آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی پابندی فرماتے۔ نماز، روزہ، وضو، وغیرہ کے تمام مسائل اپنے شہر کے علماء سے بلا تخصیص دریافت فرما لیتے:

''وَإِذَا وَقَعَتْ لَهُمْ وَاقِعَةٌ اِسْتَفْتَوْا فِيهَا أَيَّ مُفْتٍ وَجَدُوْا مِنْ غَيْرِ تَعْيِيْنِ مَذْهَبٍ، وَكَانَ مِنْ خَبَرِ الْخَاصَّةِ أَنَّهُ كَانَ أَهْلُ الْحَدِيْثِ مِنْهُمْ يَشْتَغِلُوْنَ بِالْحَدِيْثِ فَيَخْلُصُ إِلَيْهِمْ مِنْ أَحَادِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ وَآثَارِ الصَّحَابَةِ مَا لَا يَحْتَاجُوْنَ مَعَهُ إِلٰى شَيْءٍ آخَرَ فِي الْمَسْأَلَةِ مِنْ حَدِيْثٍ مُسْتَفِيْضٍ أَوْ صَحِيْحٍ'' (۱/ ۱۶۲)

''اگر کوئی واقعہ ہو جاتا تو بلا تعیین کسی مفتی سے دریافت فرما لیتے۔ خواص کا یہ حال تھا کہ اہلِ حدیث، حدیث میں مشغول ہوتے۔ احادیث اور آثارِ صحابہ سے انھیں اتنا ذخیرہ میسر آ جاتا جس سے انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہتی۔ نہ وہ اقوالِ رجال کی طرف رجوع ہی فرماتے۔''

دوسری صدی تک ائمۂ حدیث کا اثر غالب تھا۔ عوام اسی مسلک کے پابند تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی میں اس کے ساتھ تقلید کی آمیزش ہونے لگی۔ یہ تقلید از قسم جمود نہ تھی۔ اس کا انداز تلمذ اور درس و تدریس کے اثرات سے زیادہ نہ تھا۔ عقیدت تھی لیکن عصبیت نہ تھی۔ علم کم ہو رہا تھا۔ سنت کے حفظ و ضبط سے عوام گھبراتے تھے اور مشہور ائمہ کی آراء اور اجتہادات پر عمل روز بروز بڑھ رہا تھا۔ چوتھی صدی کے اواخر میں تقلید کی رسم عام ہوگئی۔ جمود اور عصبیت کے آثار پیدا ہوگئے۔ ابن حزم رحمہ اللہ، ابن قیم رحمہ اللہ، ابو طالب مکی صاحبِ قوت القلوب، ابو شامہ مؤلف المؤمل اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشادات بھی قریباً اسی طرح ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہوا۔

امام ابو جعفر طحاوی (۳۲۱ھ) کی مختصر اور معانی الآثار ملاحظہ فرمائیں۔ امام ابن تیمیہ کو ان کی روش پر اعتراض ہے کہ وہ حنفیت کی نامناسب حمایت فرماتے ہیں۔ ائمۂ حدیث کی نظر میں وہ متعصب شمار ہوتے ہیں۔ بیہقی نے سننِ کبریٰ معلوم ہوتا ہے انہی کے جواب میں لکھی۔ لیکن آپ ان دونوں

کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امام طحاوی کی روش آج کے دیوبند سے بالکل مختلف ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ امام صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف فرماتے ہیں۔ کبھی صاحبین کا قول اختیار فرماتے ہیں۔ کبھی ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اتفاق فرماتے ہیں۔ بعض مقامات پر امام شافعی کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ امام صاحب اور صاحبین ''ضَبّ'' کو حرام سمجھتے ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں:

''وَنَحْنُ لَا نَرىٰ بِأَكْلِهِ بَأْسًا'' (مختصر الطحاوي، ص: ٤٤١)

''ہم گوہ کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔''

امام طحاوی اونٹ کے پیشاب اور گھوڑے کو حلال سمجھتے ہیں۔ (مختصر الطحاوی، ص: ٤٣٤)

یہ چوتھی صدی کے اس امام کا عمل ہے جسے متعصب سمجھا جاتا تھا۔ آج کے حضراتِ دیوبند غور فرمائیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟!

غرض پانچویں اور چھٹی صدی میں عصبیت اور جمود کے بادل اور بھی گہرے ہو گئے اور محققین کی شدید قلت محسوس ہونے لگی۔ نمائشی القاب اور فقہی موشگافیاں مدارِ علم قرار پائیں۔ اور قریباً آٹھویں صدی تک یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ بحوالہ سخاوی ''شیخ الاسلام'' کے لفظ کے استعمال کے متعلق فرماتے ہیں:

''ثُمَّ اشْتَهَرَ بِهَا جَمَاعَةٌ مِنْ عُلَمَاءِ السَّلَفِ حَتّٰى ابْتُذِلَتْ عَلىٰ رَأْسِ الْمِائَةِ الثَّامِنَةِ، فَوُصِفَ بِهَا مَنْ لَّا يُحْصىٰ، وَصَارَ لَقَبًا لِمَنْ وَلِيَ الْقَضَاءَ الْأَكْبَرَ، وَلَوْ عَرِيَ مِنَ الْعِلْمِ وَالسِّنِّ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!''

''ائمۂ سلف کے بعد شیخ الاسلام کا لقب آٹھویں صدی ہجری میں ذلیل ہو گیا اور بے شمار نوجوان لوگوں پر بولا جانے لگا جو علم سے بالکل خالی تھے۔''

یہ امام سخاوی کی رائے تھی۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں:

''ثُمَّ صَارَتِ الْآنَ لَقَبًا لِمَنْ تَوَلّٰى مَنْصَبَ الْفَتْوىٰ، وَإِنْ عَرِيَ عَنْ لِبَاسِ الْعِلْمِ وَالتَّقْوىٰ'' (الفوائد البهية، ص: ١٠١)

''اب یہ ان لوگوں کا لقب بن گیا جنھیں اتفاقاً فتویٰ نویسی کا موقع مل گیا خواہ علم و تقویٰ سے کلی طور پر خالی ہوں۔''

غرض آٹھویں صدی تک جمود کا مرض چھا گیا۔ اہلِ حق ضرور موجود تھے لیکن ان کی آواز کو غیر وقیع کر دیا گیا۔ ان کی کاوشیں نہاں خانوں کی نذر ہو گئیں۔ اگر کہیں موقع ملا تو بعض کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ لوگوں کو ان کے مطالعہ سے روکا گیا اور ایسے لوگوں کو شدید سزائیں دی گئیں، قید کیا گیا، کوڑے لگائے گئے۔ آٹھویں صدی کے پس وپیش کچھ تیز اور تند آوازیں اس جمود کے خلاف اٹھیں۔ بعض مجدّدین نے اربابِ جمود کے ساتھ وقت کی حکومت کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر ان غلط نواز حضرات کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم، علامہ ابن دقیق العید ان بزرگوں نے اس جامد فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور اصلاح کے ایک ہمہ گیر پروگرام کی طرف متوجہ کر دیا۔ ان حضرات نے پھر سے مسلکِ اہلِ حدیث سے پردہ اٹھایا۔ ائمۂ حدیث اور فقہائے محدثین کی روش سے عوام کو آگاہ کیا۔ ان کی کتابوں میں مسلک اہلِ حدیث کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں:

"وَمِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ مَذْهَبٌ مَعْرُوفٌ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ اللّٰهُ أَبَا حَنِيْفَةَ وَمَالِكًا، وَالشَّافِعِيَّ، وَأَحْمَدَ فَإِنَّهُ مَذْهَبُ الصَّحَابَةِ تَلَقَّوْهُ عَنْ نَبِيِّهِمْ، وَمَنْ خَالَفَ ذٰلِكَ كَانَ مُبْتَدِعًا عِنْدَ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ" (۲/ ۲۵۲)

"اہلِ سنت کا ایک مسلک ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ کی پیدائش سے بھی پہلے دنیا میں موجود تھا۔ وہ صحابہ کا مذہب تھا جو انھوں نے آنحضرت ﷺ سے سیکھا۔ جو اس کے خلاف ہو وہ بدعتی ہے۔"

افعالِ باری کے ذکر میں فرمایا:

"وَهٰذَا جَوَابُ كَثِيْرٍ مِنَ الْحَنَفِيَّةِ، وَالْحَنْبَلِيَّةِ، وَالصُّوْفِيَّةِ، وَأَهْلِ الْحَدِيْثِ"

"یہی جواب ہے اکثر احناف، حنابلہ اور صوفیہ اور اہلِ حدیث کا۔" (ص: ۱۷۹)

چند سطر کے بعد فرمایا:

"فَإِنَّ أَهْلَ الْحَدِيْثِ مِنْ أَعْظَمِ النَّاسِ بَحْثًا عَنْ أَقْوَالِ النَّبِيِّ ﷺ وَطَلَبًا لِعِلْمِهَا وَأَرْغَبِ النَّاسِ فِيْ اتِّبَاعِهَا" (۲/ ۱۷۹)

"اہلِ حدیث آنحضرت ﷺ کے اقوال کی سب سے زیادہ تلاش کرتے ہیں اور اس کے اتباع کے لیے ان کو بے حد رغبت ہے۔"

”فَهُمْ (أهل الحديث) فِيْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ كَأَهْلِ الْإِسْلَامِ فِيْ أَهْلِ الْمِلَلِ، يُؤْمِنُوْنَ بِكُلِّ رَسُوْلٍ وَبِكُلِّ كِتَابٍ، لَا يُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِ اللّٰهِ، وَلَمْ يَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا“ (۲/ ۷۹، نقض المنطق، ص: ۳۳)

”اہلِ حدیث اسلامی ممالک میں ایسے ہیں جیسے اسلام تمام مذاہب میں، ہر رسول اور ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور تفریق نہیں کرتے۔“

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

”وَأَمَّا أَهْلُ الْحَدِيْثِ وَالسُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ فَقَدِ اخْتَصُّوْا بِاتِّبَاعِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الثَّابِتَةِ عَنْ نَبِيِّهِمْ ﷺ فِيْ الْأُصُوْلِ وَالْفُرُوْعِ“ (۲/ ۱۰۳)

”اہلِ حدیث اور اہلِ سنت والجماعت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اصول اور فروع میں کتاب وسنت کا اتباع کرتے ہیں۔“

اس کے بعد مختلف گروہوں کے اختلافات کا ذکر فرما کر فرمایا:

”ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ اخْتِلَافُ أَهْلِ الْحَدِيْثِ، وَهُمْ أَقَلُّ الطَّوَائِفِ اخْتِلَافًا فِيْ أُصُوْلِهِمْ“ (۳/ ۲۱۱)

”اہلِ حدیث کا اصول وعقائد میں بہت کم اختلاف ہے۔“

اہلِ حدیث کا تذکرہ علمائے عقائد کے ضمن میں آیا ہے کہ ان لوگوں میں اختلاف بہت ہی کم ہے۔ اس موضوع کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے شیخ الاسلام نے لکھا ہے:

”فَلَيْسَ الضَّلَالُ وَالْبَغْيُ فِيْ طَائِفَةٍ مِنْ طَوَائِفِ الْأُمَّةِ أَكْثَرَ مِنْهُ فِيْ الرَّافِضَةِ كَمَا أَنَّ الْهُدٰى وَالرَّشَادَ وَالرَّحْمَةَ لَيْسَ فِيْ طَائِفَةٍ مِنْ طَوَائِفِ الْأُمَّةِ أَكْثَرَ مِنْهُ فِيْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ“ (۲/ ۲٤۲)

”سب سے زیادہ بے راہ روی روافض میں ہے اور سب سے زیادہ ہدایت اور نیکی اہلِ حدیث میں پائی جاتی ہے۔“

منہاج السنہ میں سرسری نظر سے اہلِ حدیث کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ استیعاب سے دیکھا جائے تو پوری کتاب اہلِ حدیث کے ذکرِ خیر سے بھرپور ہے۔ شیخ الاسلام نے اپنی کتاب ”نقض المنطق“ کا آغاز مندرجہ ذیل سوال سے کیا ہے اور پوری کتاب اس سوال کے جواب میں ہے۔

سوال:

اعتقادات میں متاخرین اور سلف کے مذہب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور ان دونوں سے آپ اپنی نسبت کس کی طرف کرتے ہیں؟ مسلکِ اہلِ حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حق پر ہیں یا ان کے مخالف؟ فرقہ ناجیہ سے کیا مراد ہے؟ ائمۂ اہلِ حدیث کے بعد کوئی ایسے علوم ہوئے ہیں جسے وہ نہ جانتے ہوں؟ جو لوگ منطق کو فرض کفایہ کہتے ہیں، آیا یہ درست ہے؟

پوری کتاب (۲۱۱) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اسی سوال کا جواب ہے۔ ابتدا میں شیخ الاسلام نے صفاتِ باری میں تفویض کا ذکر فرمایا، تشبیہ وتجسیم اور تعطیل کی نفی فرمائی، اور فرمایا: اس باب میں ائمۂ اربعہ اور اہلِ سنت کا وہی مذہب ہے جو اہلِ حدیث کی طرف منسوب ہے۔ اعتزال، تجہم، تعطیل وتشبیہ اور تجسیم کی راہیں بدعت کی ہیں۔ فلاسفہ اور متکلمین کے مدِ مقابل عقل ونقل ہیں۔ جس جماعت نے ان بدعات کا صدیوں مقابلہ کیا وہ اہلِ حدیث ہی تھے۔ امام اسماعیل بن عبدالرحمٰن صابونی (۴۴۹ھ) کا قول ذکر فرمایا:

> ”إِنَّ أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ الْمُتَمَسِّكِيْنَ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ يَعْرِفُوْنَ رَبَّهُمْ -تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ- بِصِفَاتِهِ الَّتِيْ نَطَقَ بِهَا كِتَابُهُ وَتَنْزِيْلُهُ، وَشَهِدَ لَهُ بِهَا رَسُوْلُهُ عَلىٰ مَا وَرَدَتْ بِهِ الْأَخْبَارُ الصِّحَاحُ، وَنَقَلَهُ الْعُدُوْلُ الثِّقَاتُ، وَلَا يَعْتَقِدُوْنَ تَشْبِيْهًا لِصِفَاتِهِ بِصِفَاتِ خَلْقِهِ، وَلَا يُكَيِّفُوْنَهَا تَكْيِيْفَ الْمُشَبِّهِ، وَلَا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ تَحْرِيْفَ الْمُعْتَزِلَةِ وَالْجَهْمِيَّةِ“ (نقض المنطق، ص: ٤)

> ”اہلِ حدیث کتاب وسنت سے تمسک کرتے ہیں۔ خدا کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو کتاب وسنت میں آئی ہیں یا صحیح احادیث میں ثقات سے منقول ہیں، نہ اس میں تشبیہ ہے نہ کیفیت کا بیان، نہ معتزلہ اور جہمیہ کی طرح تحریف۔“

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

> ”اہلِ حدیث اچھی باتوں میں تمام لوگوں کے ساتھ متفق ہیں۔ بعض چیزوں میں عام لوگوں سے ممتاز ہیں۔ ان کے مخالف معقول، منقول، قیاس، رائے، کلام، نظر و استدلال، حجت، مجادلہ، مکاشفہ، وجد و ذوق وغیرہ سے اہلِ حدیث کا مقابلہ کریں تو اہلِ حدیث ان تمام طریقوں میں ان سے بدرجہا بہتر اور اعلیٰ ہیں۔“

آخر میں فرمایا:

”وَهٰذَا هُوَ لِلْمُسْلِمِيْنَ بِالنِّسْبَةِ إِلٰى سَائِرِ الْأُمَمِ، وَلِأَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَدِيْثِ بِالنِّسْبَةِ إِلٰى سَائِرِ الْمِلَلِ“ (ص: ۸)

”مسلمانوں میں ذہانت اور خوبیاں تمام امتوں سے زیادہ ہیں۔ اہلِ حدیث میں باقی مذاہب سے زیادہ ہیں۔“

فرمایا: ائمۂ اربعہ اور باقی تمام فقہائے محدثین کو دنیا میں اس لیے برتری حاصل ہے کہ وہ ائمۂ اہلِ حدیث اور سنت کے موافق تھے۔ اسی طرح بدعتی فرقوں کا حال ہے۔ جہاں تک وہ اہلِ حدیث کے موافق ہیں ان کی تعریف کی گئی ہے اور جہاں تک وہ اہلِ حدیث کے مخالف ہیں، علمی حلقوں میں ان کی مذمت کی گئی ہے۔ (ص: ٦ سے ١١)

گویا حق و باطل کا معیار ہمیشہ اہلِ حدیث رہے ہیں۔ شیخ الاسلام اسی لقب کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وَنَحْنُ لَا نَعْنِيْ بِأَهْلِ الْحَدِيْثِ الْمُقْتَصِرِيْنَ عَلٰى سَمَاعِهِ، أَوْكِتَابَتِهِ، أَوْ رِوَايَتِهِ بَلْ نَعْنِيْ بِهِمْ: كُلَّ مَنْ كَانَ أَحَقَّ لِحِفْظِهِ وَمَعْرِفَتِهِ وَفَهْمِهِ ظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَاتِّبَاعِهِ بَاطِنًا وَّظَاهِرًا، وَكَذٰلِكَ أَهْلُ الْقُرْآنِ“ (نقض المنطق، ص: ۸۱)

”اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں جو صرف حدیث کے سماع یا روایت یا کتابت تک ہی محدود ہوں بلکہ مراد وہ لوگ ہیں جو حدیث کے حافظ، اس کے مفہوم کو ظاہری اور باطنی طور پر پوری طرح سمجھتے ہوں اور پوری طرح اس کا اتباع بھی کرتے ہوں، یعنی ان میں بصیرت اور تفقہ بدرجۂ اتم موجود ہو۔“

صفحہ (۴۷) پر لکھتے ہیں:

”إِنَّ عَلَامَةَ الزَّنَادِقَةِ تَسْمِيَتُهُمْ لِأَهْلِ الْحَدِيْثِ حَشْوِيَّةً“

”بے دین لوگ اہلِ حدیث کو لفظ پرست اور حشوی کہتے ہیں۔“

اس کے بعد فرمایا:

”فُقَهَاءُ الْحَدِيْثِ أَخْبَرُ بِالرَّسُوْلِ مِنْ فُقَهَاءِ غَيْرِهِمْ، وَصُوْفِيَّتُهُمْ أَتْبَعُ لِلرَّسُوْلِ

مِنْ صُوْفِيَّةِ غَيْرِهِمْ، وَأُمَرَاؤُهُمْ أَحَقُّ بِالسِّيَاسَةِ النَّبَوِيَّةِ مِنْ غَيْرِهِمْ، وَعَامَّتُهُمْ أَحَقُّ بِمَوَالَاةِ الرَّسُوْلِ مِنْ غَيْرِهِمْ" (نقض المنطق، ص: ۸۱)

''فقہائے اہلِ حدیث دوسرے فقہاء سے حدیث کو زیادہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے صوفیوں سے اہلِ حدیث صوفی آنحضرت ﷺ کے زیادہ اطاعت گزار ہیں۔ ان کے اہلِ سیاست، سیاستِ نبوی کو دوسرے امراء سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے عوام دوسرے فرقوں کے عوام سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں۔''

ابن ابی قتیلہ نے اہلِ حدیث کے متعلق ''قَوْمُ سُوْءٍ'' کہا تو امام احمد ناراض ہوئے اور تین دفعہ فرمایا: یہ زندیق ہے۔ ایک جگہ فرمایا: علمائے اہلِ حدیث کا مخالف منافق ہے یا جاہل۔ (ص: ۸۵)

پھر ارشاد فرمایا:

''انتباہ! ضروری ہے کہ جو آدمی کسی طرح بھی سمجھے کہ کوئی گروہ امورِ غیبیہ کے حقائق کو اہلِ حدیث سے بہتر سمجھتا ہے یا اللہ پر ایمان اور واجب الوجود اور نفسِ ناطقہ اور تزکیہ کو زیادہ جانتا ہے تو اس میں نفاق کی بو ہوگی۔'' (ص: ۱۱۵)

"وَالثَّانِيْ: إِنَّا ذَكَرْنَا عَنْ نَقْلِ مَذْهَبِ السَّلَفِ مِنْ جَمِيْعِ طَوَائِفِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ طَوَائِفِ الْفُقَهَاءِ الْأَرْبَعَةِ، وَمِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَالتَّصَوُّفِ وَأَهْلِ الْكَلَامِ كَالْأَشْعَرِيِّ" (ص: ۱۳۵)

''ہم نے سلف کے مسلک کی نقل مسلمانوں کے تمام گروہوں میں سے کی ہے۔ فقہاء، مذاہبِ اربعہ، اہلِ حدیث، اہلِ تصوف اور متکلمین وغیرہ۔''

پوری کتاب میں اسی انداز سے مسلک اہلِ حدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک پرانا اور اہم مکتبِ فکر ہے جس کے تحقیقی کارنامے فقہ، تصوف، حدیث، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، کلام، تجوید؛ غرض علوم کے تمام گوشوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

القواعد النورانية:

شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) نے ''نقض المنطق'' میں متکلمانہ انداز سے مختلف فیہ مسائل کا ذکر فرمایا ہے۔ فقہی فروع میں ان کی کتاب ''القواعد النورانية'' کے نام

سے مشہور ہے۔ اس میں فقہی مکاتبِ فکر کے اختلافی مسائل اور فقہائے محدثین کے فقہیات پر محققانہ بحث فرمائی ہے۔ اس میں مسلک اہلِ حدیث کا تذکرہ بطور مکتبِ فکر بار بار فرمایا ہے۔ کتاب کے شروع ہی میں اہلِ کوفہ اور اہلِ حجاز کے فقہی نظریات کے تذکرے میں اہلِ حدیث کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔ اہلِ مدینہ کے متعلق فرمایا کہ وہ ہر مسکر کو حرام سمجھتے ہیں لیکن کھانے کی چیزوں کے متعلق ان کی رائے مختلف ہے۔ وہ شکاری اور غیر شکاری سب پرندوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ حشرات الارض کے متعلق بھی ان کی قریباً یہی رائے ہے۔ ایک روایت میں حلال اور ایک روایت میں انھیں مکروہ سمجھتے ہیں۔ فقہائے کوفہ کی رائے مشروبات کے متعلق اہلِ مدینہ سے مختلف ہے۔ وہ خمر صرف انگور کی شراب کو سمجھتے ہیں اور باقی مسکرات کو تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ اور کھانے کے متعلق یہ حضرات متشدد ہیں۔ گھوڑے اور ضب کو حرام سمجھتے ہیں۔

شیخ الاسلام اہلِ حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

”وَمَذْهَبُ أَهْلِ الْحَدِيْثِ فِيْ هٰذَا الْأَصْلِ الْعَظِيْمِ الْجَامِعِ وَسَطٌ بَيْنَ الْعِرَاقِيِّيْنَ وَالْحِجَازِيِّيْنَ“[1] (القواعد النورانية، ص:١)

اسی نسق میں شیخ فرماتے ہیں:

”فَأَخَذَ أَهْلُ الْحَدِيْثِ فِيْ الْأَشْرِبَةِ بِقَوْلِ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَسَائِرِ أَهْلِ الْأَمْصَارِ مُوَافَقَةً لِلسُّنَّةِ الْمُسْتَفِيْضَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَصْحَابِهِ فِيْ التَّحْرِيْمِ“ (ص:٣)

”اہلِ حدیث نے اشربہ کے متعلق اہلِ مدینہ اور باقی مسلم ممالک کے عمل کو سنتِ مشہورہ کے موافق حرام سمجھا۔“

اس کے بعد چند سطور میں اس کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

”وَأَخَذُوْا فِيْ الْأَطْعِمَةِ بِقَوْلِ أَهْلِ الْكُوْفَةِ لِصِحَّةِ السُّنَنِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِتَحْرِيْمِ كُلِّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَكُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِنَ الطُّيُوْرِ، وَتَحْرِيْمِ الْخَمْرِ وَلُحُوْمِ الْحُمُرِ“ (ص:٣)

”اور کھانے کے متعلق ائمۂ اہلِ حدیث نے اہلِ کوفہ کے مذہب کو سنت کے مطابق پایا، اڑنے والے اور جنگلی درندوں اور اہلی گدھوں کو حرام تصور فرمایا۔“

[1] ترجمہ: ”اس اہم اصول میں اہلِ حدیث کا مذہب اہلِ عراق اور اہلِ حجاز کے بجائے زیادہ منصفانہ اور بہتر ہے۔“

ان کی نظر میں قرآن اور احادیث کی ایک ہی حیثیت ہے۔ آخر میں اہلِ حدیث نے ان مسائل میں اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ سے کلی اتفاق نہیں فرمایا، بلکہ گھوڑے اور ضب وغیرہ کو حدیث کی بنا پر حلال فرمایا ہے، اور اہلِ مدینہ کے ساتھ بعض اشربہ میں اختلاف کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ نے ان مسائل میں مذہبِ اہلِ حدیث کا تفصیلی تجزیہ فرمایا ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مضمون پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کو مختصر کرنے کے لیے ''قواعد نورانیہ'' کے صفحات لکھے جا رہے ہیں جہاں شیخ الاسلام نے اس مکتبِ فکر کا بطور مکتب ذکر فرمایا ہے۔ عبارات اور ترجمہ دونوں نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

صفحات کے نمبر یہ ہیں: (۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۲، ۲۳)

شیخ الاسلام نے کہیں اہلِ حدیث کہیں فقہائے اہلِ حدیث کا ذکر فرمایا ہے اور یہ تذکرہ دوسرے مکاتبِ فکر ہی کی طرح آیا ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے مسلک اہلِ حدیث کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''فَهُمْ حَمَلَةُ عِلْمِهِ، وَنَقَلَةُ دِيْنِهِ، وَسَفَرَتُهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أُمَّتِهِ، وَأُمَنَاؤُهُ فِي تَبْلِيْغِ الْوَحْيِ مِنْه، فَحَرِيٌّ أَنْ يَّكُوْنُوْا أَوْلَى النَّاسِ بِهِ فِيْ حَيَاتِهِ وَوَفَاتِهِ، وَكُلُّ طَائِفَةٍ مِنَ الْأُمَمِ مَرْجِعُهَا إِلَيْهِمْ فِيْ صِحَّةِ حَدِيْثِهِ وَسَقِيْمِهِ، وَمُعَوَّلُهَا عَلَيْهِمْ فِيْمَا يَخْتَلِفُوْنَ فِيْ أَمْرِهِ، ثُمَّ كُلُّ مَنِ اعْتَقَدَ مَذْهَبًا فَإِلٰى صَاحِبِ مَقَالَةِ الَّتِيْ أَخَذَ بِهَا يَنْتَسِبُ، وَإِلٰى رَأْيِهِ يَنْتَسِبُ إِلَّا أَصْحَابَ الْحَدِيْثِ فَإِنَّ صَاحِبَ مَقَالَتِهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَهُمْ إِلَيْهِ يَنْتَسِبُوْنَ، وَإِلٰى عِلْمِهِ يَسْتَنِدُوْنَ وَإِلَيْهِ يَفْزَعُوْنَ، وَبِرَأْيِهِ يَقْتَدُوْنَ، وَبِذٰلِكَ يَفْتَخِرُوْنَ... الخ'' (صون المنطق والکلام، ص: ۱۱)

''اہلِ حدیث آنحضرت ﷺ کے علم کے حامل، ان کے دین کے ناقل ہیں، آنحضرت ﷺ اور امت کے درمیان سفیر ہیں اور ان کی وحی کی تبلیغ میں ان کے امین ہیں۔ وہ موت اور زندگی میں آپ کے زیادہ قریب ہیں۔ تمام گروہ حدیث کی صحت اور سقم میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے اختلاف میں ان کی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہر صاحبِ مذہب اپنی نسبت اپنے امام کی طرف کرتا ہے اور اس کے مقالات کو اپناتا ہے لیکن اہلِ حدیث اپنا تعلق آنحضرت ﷺ کے ساتھ بتاتے ہیں اور آپ ہی کے مقالات

سے استناد کرتے ہیں، انھی سے استدلال کرتے ہیں۔ ان کے دل کی بے قراریاں آپ ہی کے لیے ہیں، آپ ہی کی اقتدا کرتے ہیں، آپ ہی کی ذاتِ گرامی پر فخر کرتے ہیں۔ ان کی نسبت قرآن کی طرف ہے کیوں کہ وہ احسن الحدیث ہے اور حدیث کی طرف بھی اس لیے کہ وہ اس کے حافظ اور حامل ہیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"فَهِيَ الطَّائِفَةُ الْمَنْصُوْرَةُ، وَالْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ، وَالْعَصَبَةُ الْهَادِيَةُ، وَالْجَمَاعَةُ الْعَادِلَةُ الْمُتَمَسِّكَةُ بِالسُّنَّةِ الَّتِي لَا تُرِيْدُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ بَدِيْلًا، وَلَا عَنْ قَوْلِهِ تَبْدِيْلًا، وَلَا عَنْ سُنَّتِهِ تَحْوِيْلًا" (ص:١١)

"طائفہ منصورہ، فرقہ ناجیہ، اہلِ حدیث کا گروہ، عادل جماعت جس نے سنت سے تمسک کیا۔ کسی کو آنحضرت ﷺ کا بدل نہیں سمجھتے، نہ آپ کے قول اور سنت میں کوئی تبدیلی کرتے ہیں۔"

امام سیوطی رحمہ اللہ نے حافظ ہبۃ اللہ بن حسن ابو القاسم لالکائی (م ۴۱۸ھ) کی کتاب "اصول السنۃ" سے یہ تلخیص فرمائی ہے۔[1] نیز "الانتصار لأهل الحديث" سمعانی (م ۴۸۹ھ) کے حوالے سے نقل فرمایا:

"قَدْ لَهِجَ بِزَمِّ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ صِنْفَانِ: أَهْلُ الْكَلَامِ، وَأَهْلُ الرَّأْيِ، فَهُمْ فِيْ كُلِّ وَقْتٍ يَقْصِدُوْنَهُمْ بِالثَّلْبِ وَالْعَيْبِ، وَيَنْسِبُوْنَهُمْ إِلَى الْجَهْلِ وَقِلَّةِ الْعِلْمِ" (صون المنطق، ص: ٤٧)[2]

"متکلمین اور اہل الرائے کی زبانیں اہلِ حدیث کے خلاف چلتی رہتی ہیں۔ وہ انھیں کم علم اور جاہل کہتے ہیں اور ان کی عیب جوئی کرتے رہتے ہیں۔"

خبرِ واحد کے متعلق فرمایا کہ اس سے علم حاصل ہوتا ہے:

"هٰذَا قَوْلُ عَامَّةِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَالْمُتَقِنِّيْنَ مِنَ الْقَائِمِيْنَ عَلَى السُّنَّةِ، وَإِنَّمَا هٰذَا الْقَوْلُ الَّذِي يُذْكَرُ أَنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ لَا يُفِيْدُ الْعِلْمَ بِحَالٍ، وَلَا بُدَّ مِنْ

---

[1] شرح أصول اعتقاد أهل السنة (١/ ٢٣)

[2] نیز دیکھیں: الانتصار لأصحاب الحديث للسمعاني (ص:١)

نَقْلِهِ بِطَرِيْقِ التَّوَاتُرِ لِوُقُوْعِ الْعِلْمِ شَيْءٌ اِخْتَرَعَتْهُ الْقَدَرِيَّةُ وَالْمُعْتَزِلَةُ، وَكَانَ قَصْدُهُمْ مِنْهُ رَدَّ الْأَخْبَارِ، وَتَلَقَّفَهُ مِنْهُمْ بَعْضُ الْفُقَهَاءِ الَّذِيْنَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ فِي الْعِلْمِ قَدَمٌ ثَابِتٌ" (صون المنطق، ص: ١٦١)

''خبرِ واحد کی حجیت اور مفیدِ علم ہونا اہلِ حدیث اور اربابِ سنت کا قول ہے۔ اور خبرِ واحد کا غیر مفید ہونا اور خبر کے مفیدِ علم ہونے کے لیے تواتر کی شرط یہ معتزلہ اور قدریہ کا اختراع ہے جس سے ان کا مقصد احادیث کے رد کے سوا کچھ نہیں۔ بعض کم علم فقہاء نے ان سے یہ مسئلہ سیکھ لیا ہے۔''

یہ کتاب کئی کتابوں کی تلخیص ہے۔ اس میں سیوطی نے بڑی کثرت سے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کا ذکر فرمایا ہے۔[1] یہ کتاب سیوطی نے منطق اور کلام کی اغلاط کے متعلق لکھی ہے۔ ائمۂ سنت کی کئی کتابوں کی تلخیص فرمائی اور جا بجا مسلک اہلِ حدیث کا ذکر کیا ہے۔[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہائے حنفیہ سے اصولِ فقہ میں جہاں جہاں لغزش ہوئی ہے وہ دراصل معتزلہ کا اثر ہے، کیوں کہ فقہائے عراق ابتدا میں معتزلہ سے متاثر ہو گئے تھے۔ ان حضرات ہی نے بعض کتابیں اصولِ فقہ پر لکھیں جن میں جا بجا اعتزال کا اثر پایا جاتا ہے۔[3] "الجواهر المضية" اور "الفوائد البهية" میں ایسے بہت سے احناف کا ذکر فرمایا ہے جو اعتزال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ متاخرین علمائے اصول زیادہ تر انھی حضرات پر اعتماد فرماتے ہیں۔ آج کل کی درسیاتِ اصولِ فقہ میں اعتزال ہی کا اثر ہے، بے چارے

---

[1] دیکھیں: (ص: ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦، ١٦٨، ١٧١) [مؤلف]

[2] دیکھیں: صون المنطق والكلام (ص: ١٦٤۔ ١٦٨)

[3] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وكذلك يخلط بمذهب أبي حنيفة شيئاً من أصول المعتزلة والكرامية والكلابية، ويضيفه إلى مذهب أبي حنيفة، وهذا من جنس الرفض والتشيع" (منهاج السنة النبوية: ٥/ ١٨١)

نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وبعضهم يزعم أن بناء المذهب على هذه المحاورات الجدلية المذكورة في مبسوط السرخسي والهداية والتبيين ونحو ذلك، ولا يعلم أن أول من أظهر ذلك فيهم المعتزلة، وليس عليه بناء مذهبهم." (حجة الله البالغة، ص: ٣٣٦)

ملا جیون اور علامہ نظام الدین معتزلہ ہی کے خوشہ چین ہیں۔[1]

حافظ ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷٦ھ) نے مسلکِ اہلِ حدیث کی حمایت میں مستقل کتاب "تأويل مختلف الحديث في الرد على أعداء أهل الحديث" لکھی ہے۔ اس میں حدیث اور اہلِ حدیث دونوں کا دفاع فرمایا ہے:

"ذِكْرُ أَصْحَابِ الْحَدِيْثِ: قَالَ أَبُوْ مُحَمَّدٍ: فَأَمَّا أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ فَإِنَّهُمُ الْتَمَسُوا الْحَقَّ مِنْ وِجْهَتِهِ، وَتَتَبَّعُوْهُ مِنْ مَظَانِّهِ، وَتَقَرَّبُوْا مِنَ اللّٰهِ تَعَالىٰ بِاتِّبَاعِهِمْ سُنَنَ رَسُوْلِ اللّٰهِﷺ وَطَلَبِهِمْ لِآثَارِهِ وَأَخْبَارِهِ بَرًّا وَبَحْرًا، شَرْقًا وَغَرْبًا... إِلىٰ أَنْ قَالَ: وَعَرَفُوْا مَنْ خَالَفَهَا مِنَ الْفُقَهَاءِ إِلَى الرَّأْيِ فَنَبَّهُوْا عَلىٰ ذٰلِكَ حَتّٰى نَجَمَ الْحَقُّ بَعْدَ أَنْ كَانَ عَافِيًا، وَبَسَقَ بَعْدَ أَنْ كَانَ دَارِسًا، وَاجْتَمَعَ بَعْدَ أَنْ كَانَ مُتَفَرِّقًا، وَانْقَادَ لِلسُّنَنِ مَنْ كَانَ عَنْهَا مُعْرِضًا، وتَنَبَّهَ عَلَيْهَا مَنْ كَانَ عَنْهَا غَافِلًا، وَحَكَمَ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِﷺ بَعْدَ أَنْ كَانَ يَحْكُمُ بِقَوْلِ فُلَانٍ وَّفُلَانٍ، وَإِنْ كَانَ فِيْهِ خِلَافٌ عَلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِﷺ"[2]

"اہلِ حدیث نے حق کی تلاش اس کے اصل مقام سے کی اور آنحضرت ﷺ کے آثار اور سنن سے اللہ کا قرب تلاش کیا۔ احادیث کی تلاش میں خشکی اور سمندر، مشرق اور مغرب کے سفر کیے۔ ایک حدیث کی تلاش میں طویل سفر کیے، تاکہ اصل راویوں سے صحیح حدیث سن سکیں۔ بحث و تنقید سے صحیح، ضعیف اور منسوخ کا پتا چلایا، اور فقہاء اور اہل الرائے کی مخالفت پر بھی متنبہ کیا، یہاں تک کہ حق ظاہر ہوگیا، متفرق احادیث جمع ہوگئیں اور جو لوگ فلاں فلاں کی اطاعت کرتے تھے وہ حق کی اطاعت کرنے لگے۔"

---

[1] مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فكم من حنفي في الفروع معتزلي عقيدة كالزمخشري وغيره كمؤلف القنية والحاوي، والمجتبى شرح مختصر القدوري نجم الدين الزاهدي۔ وقد ترجمتهما في الفوائد البهية وغيرهم ۔وكم من حنفي حنفي فرعاً مرجئ أو زيدى العقيدة، فمنهم الشيعة، ومنهم المعتزلة، ومنهم المرجئة." (الرفع والتكميل، ص: ۳۸۵)

[2] تأويل مختلف الحديث لابن قتيبة (ص: ۷٤)

ایک مقام میں فرمایا کہ لوگوں نے اہلِ حدیث کے مختلف نام رکھے لیکن نام بے محل استعمال سے صحیح نہیں ہو سکتے۔ صیقل کرنے والا موچی نہیں کہلا سکتا، نہ بڑھئی ہی کو لوہار کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اہلِ حدیث کو حشوی یا ظاہری کہا جائے تو وہ حشوی یا ظاہری نہیں ہوگا۔ نام کی کچھ حقیقت ہوتی ہے جس پر وہ بولا جاتا ہے۔[1]

علامہ ابوبکر محمد بن حسن بن فورک (م ۴۰۶ھ) نے ''مشکل الحدیث'' میں ملحدین کے تذکرے میں تعارف کے طور پر فرمایا:

''وَخُصُّوا بِتَقْبِيحِ ذٰلِكَ الطَّائِفَةَ الَّتِي هِيَ الظَّاهِرَةُ بِالْحَقِّ لِسَانًا وَّبَيَانًا وَقَهْرًا وَعُلُوًّا وَإِمْكَانًا، اَلطَّاهِرَةُ عَقَائِدُهَا مِنْ شَوَائِبِ الْأَبَاطِيْلِ وَشَوَائِبِ الْبِدَعِ وَالْأَهْوَاءِ الْفَاسِدَةِ، وَهِيَ الْمَعْرُوْفَةُ بِأَنَّهَا أَصْحَابُ الْحَدِيْثِ'' (ص: ۳)

''ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس گروہ کی تنقیص کرتے ہیں جن کی زبان و بیان پر ظاہراً باطناً حق غالب ہے۔ ان کے عقائد بدعات اور اباطیل سے پاک ہیں۔ وہ اصحاب الحدیث کے نام سے مشہور ہیں۔''

اس کے بعد ان کی دو قسمیں ہیں: ایک جن کا مشغلہ اسانید اور ان کے متون کا ضبط ہے۔ اور دوسرے وہ جو اسباب و علل اور قیاس و نظر سے احادیث میں بحث کرتے ہیں۔[2]

اسی طرح ابو الفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی (م ۵۴۸ھ) نے ''الملل والنحل'' میں اس مکتبِ فکر کا ذکر فرمایا۔[3]

حافظ ابن حزم اُندلسی (۴۵۶ھ) گو ظاہری ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو اہلِ حدیث شمار فرماتے ہیں۔ تقلید و جمود پر سختی سے تنقید فرماتے ہیں۔ اپنے وقت کے مالکی علماء اور صحابہ کے فروعی اختلافات کے متعلق فرمایا:

''فَأَمَّا مَا اجْتَمَعُوْا عَلَيْهِ فَنَحْنُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا إِجْمَاعَهُمْ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ كَثِيْرًا، وَإِنَّمَا خَالَفَ إِجْمَاعَهُمْ مَنْ دَعَا إِلٰى تَقْلِيْدِ إِنْسَانٍ بِعَيْنِهِ كَمَا فَعَلَ

[1] تأويل مختلف الحديث (ص: ۸۱)

[2] دیکھیں: مشکل الحديث و بیانه لابن فورك الأصبهاني (ص: ۳۷)

[3] دیکھیں: الملل والنحل للشهرستاني (۱/ ۲۰، ۱۰۰، ۱۵۳، ۱۷۲، ۲۰۵)

هٰؤُلَاءِ فِيْ تَقْلِيْدِهِمْ مَالِكًا دُوْنَ غَيْرِهِ، وَلَمْ يَكُنْ قَطُّ فِيْ الصَّحَابَةِ، وَلَا فِيْ التَّابِعِيْنَ، وَلَا فِيْ الْقَرْنِ الثَّالِثِ وَاحِدٌ فَمَا فَوْقَهُ فَعَلَ هٰذَا الْفِعْلَ، وَلَا أَبَاحَهُ لِفَاعِلٍ"[1] (التعنیف، ص: ۸۹)

''اگر صحابہ کا کسی مسئلے پر اجماع ہو تو ہم بحمد اللہ اسے قبول کرتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے تقلیدِ شخصی کی دعوت دی ان لوگوں نے اجماع کی مخالفت کی ہے، جس طرح مالکیوں نے صرف امام مالک کی تقلید کی۔ صحابہ، تابعین اور تیسری صدی تک کوئی آدمی نہیں جس نے یہ فعل کیا ہو یا اس کو جائز کہا ہو۔ اجماع کے مخالف دراصل وہی لوگ ہیں جو تقلیدِ شخصی کی دعوت دیتے ہیں۔''

حافظ ابن حزم کی ''الإحکام''، ''المحلیٰ''، ''الفصل'' وغیرہ اسی مواد سے بھری پڑی ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کے تجدیدی کارناموں سے ساتویں اور آٹھویں صدی دونوں متاثر تھیں۔ شیخ کی آواز مدارس اور ایوانِ حکومت میں یکساں گونجتی تھی۔ شیخ کی تنقید سے حکومت کے دربار لرزتے تھے۔ صوفیوں کی خانقاہیں شیخ کے اصلاحی پروگرام کے سامنے جھکتی تھیں۔ غرض شیخ کے اصلاحی کارنامے زندگی کے ان تمام گوشوں پر اثر انداز ہوتے تھے جن کا دین سے کچھ بھی تعلق تھا۔

شیخ کا حلقۂ درس بھی کافی وسیع تھا۔ دعوت و تبلیغ کی مساعی بھی ہمہ گیر تھیں۔ شیخ کے تلامذہ اور رفقاء کا حلقہ بھی اسی طرح وسیع تھا۔ حافظ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ، حافظ جلال الدین مزی، حافظ ذہبی، حافظ عماد الدین ابن کثیر، محمد بن احمد ابن عبدالہادی مقدسی وغیرہم رحمہم اللہ کبار ائمہ، امام کے علوم سے مستفیض تھے۔ یقیناً شیخ الاسلام کا اثر شیخ کے بعد برسوں قائم رہا ہوگا۔

شیخ کے تلامذہ میں سے ابن القیم رحمہ اللہ، ان کے تلامذہ سے شیخ محمد بن یعقوب رحمہ اللہ فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) صاحبِ قاموس، ان کے تلامذہ سے حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ)۔ احمد بن علی مقریزی مؤرخ (م ۸۴۵ھ) ایسے ائمہ کو ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ پھر حافظ ابن حجر کے تلامذہ میں یہ اثر قائم رہا۔ تحقیق کی یہ شمع جلتی رہی اور جمود کا اثر غالب نہ ہو سکا، گو دونوں نظریات میں تصادم کے آثار ملتے ہیں۔

[1] دیکھیں: رسائل ابن حزم (۳/ ۷۷)

حافظ سیوطی (م ۹۱۱ھ) شیخ علی متقی (م ۹۷۵ھ) شیخ عبدالوہاب متقی (م ۱۰۰۱ھ)، شیخ محمد طاہر پٹنوی صاحب مجمع البحار (م ۹۸۶ھ) اور حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد مجدد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی (۱۲۲۵ھ) مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۲۱۸ھ) فاخر الہ آبادی (م ۱۲۶۴ھ) حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ) شاہ عبدالعزیز (۱۲۳۹ھ) شاہ اسماعیل شہید (۱۲۴۶ھ) ؒ ماحول کی وجہ سے حنفیت کی طرف معمولی رجحان کے باوجود ان میں سے کوئی بھی تقلید اور جمود کا داعی نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں تقلید و جمود کے خلاف جو جذبہ اس وقت کارفرما ہے اس کے مؤسس و بانی دراصل یہی مقدس حضرات ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم.

ان تمام اَعلام کے ارشادات کے تذکرے سے مضمون اور بھی واضح ہوگا۔ ان بزرگوں کے کارنامے اور علمی نوشتے اہلِ علم کی نظروں میں پوشیدہ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ، الانصاف، عقد الجید، الخیر الکثیر، تفہیمات اول و ثانی، المقالہ الوضیہ اور الانتباہ وغیرہ میں اس موضوع پر اتنا لکھا ہے کہ اس سے زیادہ لکھنا مشکل ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ (۱/۱۲۴) میں عزبن عبدالسلام سے نقل فرمایا:

”وَمِنَ الْعَجَبِ الْعَجِيْبِ أَنَّ الْفُقَهَاءَ الْمُقَلِّدِيْنَ يَقِفُ أَحَدُهُمْ عَلٰى ضَعْفِ مَأْخَذِ إِمَامِهِ بِحَيْثُ لَا يَجِدُ لِضَعْفِهِ مَدْفَعًا، وَهُوَ مَعَ ذٰلِكَ يُقَلِّدُهُ فِيْهِ، وَيَتْرُكُ مَنْ شَهِدَ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ، وَالْأَقْيِسَةُ الصَّحِيْحَةُ لِمَذْهَبِهِمْ جُمُوْدًا عَلٰى تَقْلِيْدِ إِمَامِهِ، بَلْ يَتَحَيَّلُ لِدَفْعِ ظَاهِرِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، وَيَتَأَوَّلُهَا، بِالتَّأْوِيلَاتِ الْبَعِيْدَةِ الْبَاطِلَةِ نَضَالًا عَنْ مُقَلَّدِهِ، وَقَالَ: لَمْ يَزَلِ النَّاسُ يَسْأَلُوْنَ مَنِ اتَّفَقَ مِنَ الْعُلَمَاءِ مِنْ غَيْرِ تَقْيِيْدٍ لِمَذْهَبٍ، وَلَا إِنْكَارِ عَلٰى أَحَدٍ مِنَ السَّائِلِيْنَ إِلٰى أَنَّ ظَهَرَتْ هٰذِهِ الْمَذَاهِبُ وَمُتَعَصِّبُوْهَا مِنَ الْمُقَلِّدِيْنَ“

”تعجب ہے کہ فقہائے مقلدین کو اپنے امام کے ماخذ کا ضعف بھی معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس کی مدافعت بھی نہیں کر سکتا، اس کے باوجود اس کی تقلید کرتا ہے اور ظاہر کتاب وسنت اور قیاسِ صحیح کو ترک کر دیتا ہے، اور کتاب وسنت کو ٹالنے کے لیے بہانے بناتا ہے تاکہ اپنے امام کو بچا سکے۔ لوگ ہمیشہ حسبِ اتفاق علماء سے دریافت کرتے رہے یہاں تک

کہ مروجہ مذاہب اور متعصب لوگ پیدا ہو گئے جو امام کو پیغمبر کی طرح سمجھتے ہیں۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"یہ لوگ دوسرے مسلک کے مفتی سے فتویٰ پوچھنا جائز نہیں سمجھتے اور نہ اقتدا ہی کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ صحابہ، تابعین اور قرونِ اولیٰ کے اجماع کے خلاف ہے۔"

(حجة الله البالغة: ١/ ١٢٤)

نیز حجۃ اللہ (١/١٢٢) میں فرمایا:

"وَكَانَ صَاحِبُ الْحَدِيْثِ أَيْضًا قَدْ يُنْسَبُ إِلٰى هٰذِهِ الْمَذَاهِبِ لِكَثْرَةِ مُوَافَقَتِهِ لَهُ كَالنَّسَائِيِّ وَالْبَيْهَقِيِّ يُنْسَبَانِ إِلٰى الشَّافِعِيِّ"

"یعنی طبقات کی کتابوں میں بعض اہلِ حدیث علماء کو مروجہ مذاہب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس کی تحقیق ان سے موافق ہوجاتی ہے، جیسے نسائی اور بیہقی ہیں، لوگ انھیں شافعی کہتے ہیں حالانکہ وہ اہلِ حدیث ہیں۔"

شاہ صاحب نے تفہیمات میں فرمایا:

فقہ حنفی و شافعی کو ملا کر کتاب و سنت پر پیش کرنا چاہیے۔ جو موافق ہو اس پر عمل کیا جائے، ورنہ مختلف فیہ مسائل کو روایات کے طور پر قبول کر لیا جائے۔"[1]

شاہ صاحب عملی فروع میں بھی عموماً شوافع کی طرف جھکتے ہیں۔ آمین بالجہر، رفع الیدین، زیارتِ قبور، قراءتِ فاتحہ وغیرہ میں شافعی مذہب کو راجح سمجھتے ہیں۔ خیرِ کثیر میں تو امام شافعی رحمہ اللہ کی عجیب انداز سے تعریف فرمائی ہے:

"أَمَّا الْمُتَعَمِّقُوْنَ فِيْ الرَّأْيِ فَلَيْسُوْا مِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ فِيْ شَيْءٍ، وَأَمَّا هٰذِهِ الْمَذَاهِبُ الْأَرْبَعَةُ فَأَقْرَبُهَا إِلَى السُّنَّةِ مَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ الْمُنَقَّحُ وَالْمُصَفّٰى، وَكَانَ نَظَرُهُ يَصِلُ إِلٰى حَقِيْقَةِ الْعِلَلِ والْأَسْبَابِ" (خیر کثیر، ص: ١٢٤)

"رائے اور قیاس میں غالی قسم کے لوگ قطعاً اہلِ سنت نہیں ہیں۔ مذاہبِ اربعہ سے امام شافعی کا مسلک سنت سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی نظر اسباب و علل پر زیادہ گہری ہے۔"

---

[1] تفہیمات (١/ ٢١٢)

تفہیمات (۲/ ۲۴۰) میں پہلے عقائد کا ذکر اور تاکید فرمائی ہے کہ تاویل سے بچ کر مسلکِ سلف کا اتباع کیا جائے۔ فروع کے متعلق فرمایا:

''ودر فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن وتفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن وآنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کالائے بد بریش خاوند دادن امت ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغنا حاصل نیست وسخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمے را دست آویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند شنیدن و بدیشاں التفات نہ کردن وقربت خدا جستن بدوری ایناں''[1]

''فروع میں فقہائے محدثین کی پیروی کرنا، فقہی جزئیات کو کتاب وسنت پر پیش کرنا، موافق کو قبول کرنا، مخالف کو پھینک دینا، امت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اجتہادات کو کتاب وسنت پر پیش کریں اور خشک فقہاء نے، جن کے لیے تقلیدِ شخصی سے بڑی کوئی دستاویز نہیں، کتاب وسنت کے تتبع کو ترک کیا ہوا ہے، ان سے دوری میں خدا کی رضا مندی ہے۔''

جامد تقلید کے متعلق شاہ صاحب کے جذبات قابلِ ملاحظہ ہیں:

''وَتَرىٰ الْعَامَّةَ سِيَّمَا الْيَوْمَ فِيْ كُلِّ قَطْرٍ يَتَقَيَّدُوْنَ بِمَذْهَبٍ مِنْ مَذَاهِبِ الْمُتَقَدِّمِيْنَ، يَرَوْنَ خُرُوْجَ الْإِنْسَانِ مِنْ مَذْهَبِ مَنْ قَلَّدَهُ، وَلَوْ فِيْ مَسْأَلَةٍ، كَالْخُرُوْجِ مِنَ الْمِلَّةِ كَأَنَّهُ نَبِيٌّ بُعِثَ إِلَيْهِ، وَافْتُرِضَتْ طَاعَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ أَوَائِلُ الْأُمَّةِ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَيْرَ مُتَقَيِّدِيْنَ بِمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ'' (۱/ ۱۵۱)

''ہر علاقے کے عوام مروجہ مذاہب سے ایک کی تقلید کرتے ہیں، اسے ترک کرنا ارتداد کے برابر سمجھتے ہیں، گویا امام ان کا نبی ہے جس کی اطاعت ان پر فرض ہے۔ چوتھی صدی سے پہلے یہ کیفیت نہ تھی۔''

آج احبابِ دیوبند غور فرمائیں! آپ جس انداز سے تقلید کی دعوت دیتے ہیں، ترکِ تقلید کی مخالفت کرتے ہیں، یہ وہی انداز تو نہیں جس کی شاہ صاحب نے شکایت فرمائی ہے؟!

---

[1] تفہیمات (۲/ ۲۴۰)

اسی طرح ''تفہیمات'' (۱/۱۵۲) میں ایسے محققین کا ذکر فرمایا ہے جو تقلید نہیں کرتے تھے، جیسے ابن العربی، ابو محمد جوینی۔ نیز ''تفہیمات'' (۲/۲۰۲، ۱/ ۲۱۵) میں فرمایا:

''إِنْ آمَنْتُمْ بِنَبِيِّكُمْ فَاتَّبِعُوْهُ خَالَفَ مَذْهَبًا أَوْ وَافَقَهُ''

''اگر آنحضرت ﷺ پر ایمان ہے تو ان کی اطاعت کرو، مذہب کے خلاف ہو یا موافق!''

تفہیمات اس قسم کی دعوت سے بھرپور ہے۔

تفقہ اور ظاہریت:

شاہ صاحب کے نزدیک حق تفقہ اور ظاہریت کے بین بین ہے:

''وَمِنْهَا: إِنِّي أَقُوْلُ لِهٰؤُلَاءِ الْمُسَمِّيْنَ أَنْفُسَهُمْ بِالْفُقَهَاءِ الْجَامِدِيْنَ عَلَى التَّقْلِيْدِ يَبْلُغُهُمُ الْحَدِيْثُ مِنْ أَحَادِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ، وَقَدْ ذَهَبَ إِلَيْهِ جَمْعٌ عَظِيْمٌ مِنَ الْفُقَهَاءِ الْمُتَقَدِّمِيْنَ، وَلَا يَمْنَعُهُمْ إِلَّا التَّقْلِيْدُ لِمَنْ يَّذْهَبُ إِلَيْهِ، وَهٰؤُلَاءِ الظَّاهِرِيَّةُ الْمُنْكِرِيْنَ لِلْفُقَهَاءِ الَّذِيْنَ هُمْ طَرَازُ حَمَلَةِ الْعِلْمِ وَأَئِمَّةِ أَهْلِ الدِّيْنِ إِنَّهُمْ جَمِيْعًا عَلٰى سَفَاهَةٍ وَسَخَافَةِ رَأْيٍ وَضَلَالَةٍ، وَإِنَّ الْحَقَّ بَيْنَ بَيْنَ'' (تفهيمات: ۱/ ۲۰۹)

''میں ان برائے نام فقہاء سے کہنا چاہتا ہوں کہ تقلید جامد کی وجہ سے جن کو صحیح حدیث پہنچتی ہے اور وہ فقہاء کو معلوم بھی ہے لیکن وہ اپنے علماء کی تقلید کے سبب اسے نہیں مانتے، اور یہ ظاہری حضرات جو فقہ کے انکار اور فقہاء اور ائمۂ دین ﷭ پر یقین نہیں رکھتے، یہ سب بے وقوف اور غلط کار ہیں اور حق ان کے بین بین ہے۔''

مسلک اہلِ حدیث بالکل یہی ہے۔ پھر (۱/ ۲۱۱) فرمایا:

''وَأَشْهَدُ لِلّٰهِ بِاللّٰهِ أَنَّهُ كُفْرٌ بِاللّٰهِ أَنْ يُّعْتَقَدَ فِيْ رَجُلٍ مِنَ الْأُمَّةِ مِمَّنْ يُّخْطِئُ وَيُصِيْبُ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيَّ اتِّبَاعَهُ حَتْمًا، وَأَنَّ الْوَاجِبَ عَلَيَّ هُوَ الَّذِيْ يُوْجِبُهُ هٰذَا الرَّجُلُ عَلَيَّ، وَلٰكِنَّ الشَّرِيْعَةَ الْحَقَّةَ قَدْ ثَبَتَ قَبْلَ هٰذَا الرَّجُلِ بِزَمَانٍ، قَدْ وَعَاهَا الْعُلَمَاءُ، وَأَدَّاهَا الرُّوَاةُ، وَحَكَمَ بِهَا الْفُقَهَاءُ، وَإِنَّمَا اتَّفَقَ النَّاسُ عَلٰى تَقْلِيْدِ الْعُلَمَاءِ عَلٰى مَعْنٰى أَنَّهُمْ رُوَاةُ الشَّرِيْعَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ،

وَأَنَّهُمُ اشْتَغَلُوا بِالْعِلْمِ مَا لَمْ نَشْتَغِلْ، فَلِذٰلِكَ قَلَّدُوا الْعُلَمَاءَ، فَلَوْ أَنَّ حَدِيثًا صَحَّ، وَشَهِدَ لِصِحَّتِهَا الْمُحَدِّثُونَ، وَعَمِلَ بِهِ طَوَائِفُ فَظَهَرَ فِيهِ الْأَمْرُ، ثُمَّ لَمْ يَعْمَلْ بِهِ هُوَ؛ لِأَنَّ مَتْبُوعَهُ لَمْ يَقُلْ بِهٖ فَهٰذَا هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ"

"میں اللہ کے لیے اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ایسے آدمی کے متعلق جس سے خطا اور ثواب سرزد ہو سکتے ہیں، یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کی اطاعت فرض ہے، جس چیز کو وہ واجب کہے وہ واجب ہے، حالانکہ شریعت اس شخص سے پہلے موجود ہے، علماء نے اسے حفظ اور روایت کیا، فقہاء نے اس کے مطابق فیصلے کیے۔ تقلید کا مفہوم تو صرف اس قدر ہے کہ علماء شریعت کے راوی ہیں، وہ جانتے ہیں جو عوام نہیں جانتے، علماء نے اسے اپنا مشغلہ قرار دیا کہ عوام ایسا نہیں کر سکتے، اس لیے علماء کی تقلید کی گئی۔ اب اگر ایک حدیث کی صحت ثابت ہو، علماء نے اس پر عمل بھی کیا ہو اور بات واضح ہو جائے، پھر اس پر عمل نہ کیا جائے اس لیے کہ فلاں امام نے اس پر عمل نہیں کیا، یہ سب سے بڑی گمراہی ہے۔"

ایک مقام پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے دل میں ملائے اعلیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے کہ حنفی اور شافعی امتِ مرحومہ میں دونوں مشہور مذہب ہیں اور اکثر لوگ انہی دونوں مذاہب کے متبع ہیں۔ اکثر فقہاء، محدثین، مفسرین اور متکلم صوفی شافعی تھے اور عام بادشاہ اور یونان کے لوگ حنفی تھے۔ ملائے اعلیٰ کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب قرار دیا جائے اور احادیث پر پیش کیا جائے۔ جو موافق ہو اسے رکھ لیا جائے۔ جس کی اصل نہ ملے اسے دو قول یا دو روایت قرار دے دیا جائے۔ (۱/ ۲۱۲)

شاہ صاحب کے ان ارشادات کا آج دیو بند کی دعوتِ جمود میں کیا ربط ہے؟ اس پر اربابِ ربط کو غور کرنا چاہیے۔ مسلک اہلِ حدیث کا اجمالاً یہی تقاضا ہے کہ جمود کو قطعاً جگہ نہ دی جائے اور نصوص پر نظر رکھی جائے۔

اسی دعوت کا ایک اور مقام پر اس طرح اعادہ فرماتے ہیں:

"کیا تم نہیں جانتے کہ حکم صرف اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا؟ بہت سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث پہنچ جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے: میں فلاں مذہب پر عمل کروں گا، حدیث پر عمل نہیں کروں گا۔ پھر یہ خیال کرتا ہے کہ حدیث صرف ائمہ اور ماہرین ہی

سمجھ سکتے ہیں، ائمہ رحمہم اللہ نے ایسی حدیث پر عمل کسی وجہ سے ہی ترک کیا ہوگا، منسوخ ہو یا مرجوح۔ یقیناً جان لو، یہ قطعاً دین نہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے تو آپ کی اطاعت کرو، کسی مذہب کے مطابق ہو یا مخالف۔ اللہ کی رضا اسی میں ہے کہ اللہ کی کتاب اور سنت پر عمل کیا جائے۔ اگر آسانی سے سمجھ میں آجائے تو بہتر ورنہ پہلے علماء کی رائے سے جو کتاب وسنت کے قریب ہو اس پر عمل کرو۔'' (تفہیمات: ۱/ ۲۱۵)

یعنی بلاتعیین ان کے افکار کی اطاعت کی جائے۔ الفاظ کی بحث بے سود ہے۔ حقائق کی وضاحت کے بعد ظاہر ہے کہ مسلک اہلِ حدیث نے ہندوستان کے مذہبی جمود کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جس قدر شاہ صاحب نے فرمایا۔ اس کا نام تقلید رکھیے یا ترکِ تقلید، حنفی کہیے یا اہلِ حدیث، اس میں وہ جمود بہرحال نہیں جس کی دعوت آج کل بریلی اور دیوبند سے دی جا رہی ہے۔ مروجہ تقلید کے خلاف اہلِ حدیث نے اب تک جو کچھ کہا، شاہ صاحب کے ارشادات میں وہ پورا مواد موجود ہے۔ اس کے خلاف اکابر دیوبند یا عظمائے بریلی نے جو فرمایا، شاہ صاحب کے ارشادات کی روح اس کے خلاف ہے۔ شاہ صاحب سے عقیدت کے ساتھ جمود اور تقلید کی دعوت بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔

عرصہ ہوا بعض بزرگانِ دیوبند نے انکشاف فرمایا کہ حضرت مولانا شہید کا ابتدا میں رجحان ترکِ تقلید کی طرف تھا لیکن حضرت سید احمد صاحب کی تفہیم کے بعد یہ رجحان ختم ہوگیا اور رفع الیدین وغیرہ مسنون اعمال پر شاہ صاحب نے عمل ترک کر دیا۔ میرے خیال میں حضرت شہید پر یہ محض بدگمانی ہے جس کے لیے ثبوت ملنا مشکل ہے۔ مصالح جہاد کی وجہ سے ہوسکتا ہے اس پر کسی وقت عمل نہ کیا گیا ہو لیکن ذہن نہیں بدلا۔ سید احمد صاحب کا ذہن یہی تھا، پھر یہ تفہیم کیسی؟!

شاہ صاحب کی مشہور تصانیف میں سے ''إيضاح الحق الصريح في أحكام الميت والضريح'' ہے۔ یہ مرحوم کی نامکمل اور آخری کتاب ہے جس میں مرحوم تجہیز و تکفین وغیرہ سے متعلقہ رسوم کے متعلق لکھنا چاہتے تھے۔ بدعت کے متعلق لکھا تھا کہ شہادت کا حادثہ پیش آ گیا۔ کتاب مطبع اشرفیہ دہلی میں مع ترجمہ چھپی ہے۔ شاہ شہید کا یہ ارشاد قابلِ غور ہے:

''بخلاف قسم ثانی کہ ہر کسے را تحقیق احکام قیاسیہ و اَشغال صوفیہ وقوانین عربیہ ضرور نیست و ارادہ تقلید شخصے معین از مجتہدین مشائخ وارکان دین نہ بلکہ ہمیں قدر کافی است کہ وقتے کہ

حاجتے پیش از کسے از ایشاں استفسار کردہ شود نہ آنکہ ارادہ وتقلید اہم مثل ایمان بالانبیاء از ارکان دین شمردہ شود ولقب حنفی و قادری بمشابہ لقب مسلمان وسنی اظہار کردہ شود‘‘ الخ

(إیضاح، ص: ۸۸)

یعنی ہر آدمی کے لیے قیاسی احکام، صوفیوں کے مشاغل اور عربی قواعد کا جاننا ضروری نہیں۔ ائمہ اجتہاد اور مشائخ میں سے معین آدمی کی تقلید بھی ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہے کہ ضرورت کے وقت علماء اور صوفیہ میں کسی سے دریافت کر لیا جائے۔ تقلید کو انبیاء پر ایمان کی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔ حنفی قادری کا لقب مسلمان سنی کی طرح واجب نہ تصور کیا جائے۔

صفحہ نمبر (۹۰) میں فرمایا:

’’عنوان شعار خود محمدیہ خالصہ وتسنن قدیم باید داشت نہ تمذہب بمذہب خاص وانسلاک در طریقہ مخصوصہ‘‘

’’اپنا عنوان ونشان خالص محمدی رکھنا چاہیے۔ کسی خاص مذہب اور طریقے میں منسلک نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

شاہ صاحب نہ تو فروعِ فقہیہ میں کسی خاص امام یا کسی فرقے کا تعین پسند فرماتے ہیں نہ تصوف کے متعارف سلاسل میں کسی خاص سلسلے سے انسلاک ان کی نظر میں مناسب ہے۔ محمدیتِ خالصہ ان کے پیشِ نظر ہے۔ یہ بالکل شاہ ولی اللہ صاحب کی دعوت ہے جسے ان کے ابناء واحفاد نے رواج دیا بلکہ اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف فرمائیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ، ان کے تلامذہ اور ان کا خاندان ان الفاظ سے بالا رہ کر فقہی جمود اور تصوف میں جمود کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مہم کو کسی تنفر کے بغیر ذہنوں میں نقش کرنا چاہتے تھے۔ ۱۲۴۶ھ میں جب بالاکوٹ میں ان کی شہادت کا دل فگار واقعہ پیش آیا، ترکِ تقلید سے وابستگی میں تصادم نہیں۔ موحدین کے اس شک میں اختلافِ خیال تو ہو گا مگر اسے کبھی اُبھرنے کا موقع نہیں ملا۔

سانحۂ شہادت کے چند ماہ بعد جماعتِ مجاہدین کے پورے نظم کی ذمے داری صادق پوری حضرات نے اپنے سر لے لی۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی وغیرہ نے جہاد اور تبلیغ کے دونوں نظام بڑی کامیابی سے چلائے۔ یہ حضرات شاہ شہید رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر تھے، اس لیے یہ اتباعِ سنت کے ساتھ تقلید اور جمود کی حوصلہ افزائی نہیں ہونے دیتے تھے، چنانچہ ۱۲۴۶ھ کے بعد تقلید پسند طبقہ

پچھلی صفوں میں چلا گیا۔ یہ حضرات فقہیات پر تنقید فرماتے لیکن فقہاء پر تنقید نہ کرتے۔ ائمۂ اربعہ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے اجتہادات کے لیے صحیح محل تلاش فرماتے تھے لیکن حنفی نقطۂ نظر سے نہیں گھبراتے تھے مگر تقلید اور جمود کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ سید شہید رحمہ اللہ کے بعد مولانا ولایت علی ۱۲۶۹ھ میں جماعت کے امیر قرار پائے۔ ان کی کتاب ''عمل بالحدیث'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مولانا نے فرمایا:

''باید دانست کہ انسان اگر عامی باشد و بسبب مشاغل دیگر از نوشت وخواند و در اکتفا بر دریافت از علماء نماید برائے آں مناسب ایں است کہ از علمائے محدثین دیندار کہ در دیانت وخوفِ خدا دانست قرآن وحدیث مشہور شدہ باشند سوال نمایند بایں طور کہ ما را دریں مسئلہ طور محمدی تعلیم نمایندواگر مرد طالب علم است وشوق تعلیم در دل دارد مناسب ایں است اول قرآن و حدیث بخواند بعد ازاں بکتب دیگر نظر ہمت گمارد تا آئینہ دار ظاہر شود کہ رائے کدام بزرگوار در کدام جا صواب یافتہ وکجا روئے خطا دیدہ، پس ہر مسئلہ کہ مصرح بقرآن وحدیث باید درآں تقلید ہیچ مجتہد نہ کنند کہ در مصرحات اجتہاد را دخلے نیست'' (ص:۱۶)

یعنی اگر عام آدمی شغل کی وجہ سے علم نہ حاصل کر سکے تو وہ علمائے اہلِ حدیث کی طرف جن کے علم و دیانت کی شہرت ہو، رجوع کرے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی طرف راہنمائی کی جائے۔ اگر آدمی علم کا شوقین ہو تو اسے سب سے پہلے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ظواہر نصوص میں کسی مجتہد کی تقلید کی ضرورت نہیں۔

یہ بالکل وہی انداز ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ، ان کے رفقاء اور تلامذہ کرتے رہے۔ اس نے تیرھویں صدی ہجری میں سکھوں اور انگریزوں کے اتحاد اور کم فہم علمائے ہند کی مخالفت کی وجہ سے سیاسی اسباب و دواعی کے ماتحت تحریکِ جہاد اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ابتدائی کوشش کی صورت اختیار کی۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نگرانی میں سید احمد کی قیادت اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ، مولانا عبدالحی بڑھانوی وغیرہ کی راہنمائی میں جہاد کا پروگرام بنانا پڑا۔ کلکتہ کے اطراف میں انگریزوں اور پنجاب میں سکھوں کے اثر کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنی حریت پسند مساعی کے لیے صوبہ سرحد کا انتخاب کیا، ان کا خیال تھا کہ یہاں کی مسلمان اکثریت ان کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔

تحریکِ حریت کے مقاصد:

ان کے سامنے اس وقت دو مقصد تھے: پورے ہندوستان کی انگریزوں اور سکھوں سے آزادی اور اس ملک میں ایک ایسی حکومت کی تاسیس جس کی بنیاد قرآن وسنت پر ہو۔ اس ضمن میں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مغل دربار کی لاعلمی کی وجہ سے جو بدعات اور مشرکانہ رسوم اور تشیع کے مہلک اثرات جو اس ملک کی گھریلو زندگی کا جزو بن چکے ہیں، انھیں زائل کیا جائے اور سلفی انداز کی سادہ حکومت اس ملک میں قائم کی جائے۔ اس کے لیے ان کے سامنے دو پروگرام تھے: وعظ وتبلیغ، درس و تدریس اور نشرو اشاعت کے ذریعے سے کتاب و سنت کی اشاعت، اور جہاد کے ذریعے سے انگریزوں اور سکھوں کے ظلم سے نجات۔ جہاد کی تحریک زیرِ زمین چلتی رہی۔ اس کا خاتمہ قریباً ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد ہوا جبکہ پاکستان کے نام سے ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کی تفصیل ایک مستقل موضوع ہے جو مستقل وقت اور فرصت کا محتاج ہے۔

تبلیغ و وعظ اور نشر و اشاعت کے لیے نواب صدیق حسن خاں اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی مساعی اپنے وقت میں غیر مترقبہ نعمت تھیں۔ اس ضمن میں بھوپال، بنارس، کلکتہ، دہلی، لاہور، پشاور، راولپنڈی وغیرہ شہروں سے بے شمار لٹریچر شائع ہوا۔ حدیث، شروحِ حدیث اور تراجمِ حدیث کے انبار لگا دیے گئے۔ فقہ الحدیث کے ذخائر سے اہلِ علم کی الماریاں بھرپور ہوگئیں۔ ان تمام مساعی میں شاہ ولی اللہ اور ان کے حکیمانہ تجدیدی کارنامے جلوہ افروز تھے۔ اس وقت کسی تنفر کے بغیر جمود کو توڑنے اور علم و تحقیق کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حضرت شیخ الکل شیخ الاسلام سید نذیر حسین صاحب اور ان کے تلامذہ کی قریباً یہی حکیمانہ روش رہی کہ کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر حق کی آواز کو دلوں میں جگہ دلائی جائے۔

یمن کی راہ:

تقلید و جمود کے خلاف ایک آواز یمن سے بھی آئی۔ امام شوکانی کے تلامذہ اور ان کی تصانیف میں جمود کے خلاف لہجہ کسی قدر تیز اور جارحانہ تھا۔ مولانا ولایت علی بھی شوکانی کے شاگرد تھے لیکن ان پر ولی اللّٰہی انداز غالب تھا۔ اس کے ساتھ جمود پسند علماء کی جارحیت نے تحریک میں شدت پیدا کر دی۔

جارحانہ رسائل کا باہم تبادلہ ہوا۔ دروس، مواعظ، مدارس، مجالس میں چند سال خاصی گرمی آ گئی۔ انگریزی عدالت تک مقدمات پہنچے۔

شاہ صاحب تقلید و جمود کی مخالفت کے باوجود حنفی شافعی قسم کے القاب سے پرہیز نہیں کرتے بلکہ اسے بسا اوقات پسند کرتے ہیں۔ شاہ صاحب اور ان کے اَتباع ایک حد تک حنفی شافعی کہلانا کچھ عیب نہیں سمجھتے، بشرطیکہ تقلید اور جمود کے زیرِ اثر کتاب و سنت اور فقہ الحدیث کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ شاہ صاحب کی اس واضح حکیمانہ دعوت کے بعد آج کے حضراتِ بریلی اور دیو بند کے لیے دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں: یا جمود کو رخصت کریں اور تقلید کی طرف دعوت سے کلیتًا پرہیز کریں یا پھر شاہ صاحب سے عقیدت کو ختم کریں۔ ان دونوں چیزوں کا معاً چلنا ''منکر بے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن''[1] کے مترادف ہوگا۔ شاہ صاحب کی مصلحت آمیز حنفیت سے کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، یکم جولائی ۱۹۶۶ء تا ۲؍ ستمبر ۱۹۶۶ء)

[1] انکار بھی کرنا اور ہمرنگ مستاں بھی ہونا۔

تحریک اہلِ حدیث
کا
تاریخی موقف اور اس کی خدمات

دنیا میں اچھی اور بُری تحریکیں پیدا ہوتی اور مٹتی رہی ہیں۔ بعض تحریکات کی قوت سے حکومتیں تک متزلزل ہو گئیں۔ حسن بن صباح اور حشیشین کا اتنا رُعب تھا کہ بادشاہ رات کو اپنی آرام گاہوں میں سو نہیں سکتے تھے۔ صالح تحریکوں کا اثر بھی صدیوں تک دلوں کو متاثر کرتا رہا۔ طوعاً و کرہاً لوگ ان تحریکوں سے بہرحال تعاون کرتے۔

تحریکِ معتزلہ نے مامون الرشید جیسے دانشمند بادشاہ کو بُری طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ فتنہ متوکل علی اللہ کے زمانے تک ائمۂ سنت کے لیے وبالِ جان بنا رہا۔ امام احمد اور عبدالعزیز کنانی جیسے اہلِ حق حضرات حق گوئی کی وجہ سے مصائب میں مبتلا رہے۔ بڑے بڑے ائمہ نے "فَازَ أَحْمَدُ وَخَسِرْنَا"[1] کہہ کر حالات کی ناہمواری کا اعتراف فرمایا۔ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ.

تحریک اہلِ حدیث:

یہ بھی اپنے وقت کی ایک تحریک ہے جس کا مقصد:

① اسلام میں اعتقادی اور عملی سادگی کو قائم رکھنا اور افراط و تفریط میں اعتدال کی راہ کا تعین اور اس کی پابندی کرنا۔

② محبت اور بغض میں عموماً انسان اعتدال کی حدوں کو پھاند جاتا ہے۔ ائمۂ حدیث ایسے موقع پر ہمیشہ نقطۂ اعتدال کی تلاش فرماتے اور لوگوں کو اس سے آگاہ فرماتے۔

③ قرآن و سنت اور ان کے متعلقہ علوم کی تدوین و اشاعت۔

④ زندگی کے تمام شعبوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام۔

---

[1] "امام احمد کامیاب جبکہ ہم ناکام ہوئے۔"

روافض کو اہلِ بیت کی محبت میں غلو تھا اور خوارج کو ان کے بغض میں۔ اہلِ سنت نے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو عام انسانوں کی طرح مجسم مانتے تھے اور بعض اس کی صفات کو ایک مفہوم کی حد تک سمجھتے اور ان کی حقیقت سے صاف انکار کرتے۔ ائمہ حدیث نے صفات کی حقیقت کو تسلیم فرمایا اور تشبیہ اور مماثلت کی نفی فرمائی۔ یہی معتدل راہ تھی۔

قیاس کے ہمہ گیر اثر نے نصوص اور صحیح احادیث کو بے کار کر کے رکھ دیا اور ظاہریت کی طغیانی نے قیاس کا سرے سے انکار کر دیا حالانکہ نظائر اور ملتی جلتی چیزوں کے احکام بھی باہم متشابہ رہنے چاہییں۔ عقلِ سلیم کا یہی فتویٰ ہے۔ قرآن حکیم نے ﴿ أَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ فرما کر قیاس کے اسی پہلو کو واضح فرمایا ہے۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کی ''محلّی'' کے بعض قیمتی مباحث اہلِ حق کی آنکھوں کے لیے نور ہیں لیکن بعض مضحکہ خیز توجیہات بھی اہلِ علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں جہاں وہ رُکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کو تو منع فرماتے ہیں لیکن پاخانہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔[1]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں اہلِ حق کے موقف کی پوری وضاحت فرمائی ہے۔

قیاس کی سمّیت کا یہ اثر تھا کہ مسکرات اور محرمات کی جزوی رُخصت دے کر حرام کو حلال بنانے کی کوشش کی گئی، چنانچہ نبیذ اور طلا وغیرہ کے مباحث فقہاء رحمہم اللہ کی مستندات میں مرقوم ہیں۔ مفکرینِ قیاس نے پاخانے کی نجاست کو پیشاب سے بھی کم تصور فرمایا ہے، اس لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ میزان اہلِ حدیث کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے نبیذ اور طلا کا فیصلہ « كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ »[2] کی روشنی میں کیا۔ مسکر کا استعمال تو کہیں رہا، اس کی صورت کو بدل کر سرکہ بنانے کی بھی ممانعت فرما دی اور نجاست کے معاملے میں پیشاب وغیرہ اور نجاستوں کا ایک ہی حکم تصور فرمایا۔ قیاس صحیح کا بھی یہی تقاضا تھا اور نصوص کا بھی یہی مفاد۔

اہلِ حدیث اور باقی تحریکات:

عموماً تحریکات وقتی تقاضوں کی پیداوار ہوتی ہیں، اس لیے وقتی اور مخصوص مقاصد کی تحصیل کے بعد ان تحریکوں کی عمر ختم ہو جاتی ہے، مثلاً خاندانِ نبوت کے بہی خواہوں نے سمجھا کہ خلافت کا

[1] دیکھیں: المحلی (۱/ ۱٦٦)

[2] یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٠٨٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۳۳)

حق موروثی طور پر اسی خاندان کو ملنا چاہیے، اس لیے اہلِ بیت کی طہارت وعصمت میں غلو کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی قرار دیا گیا۔ نماز اور اذان تک اسی مقصد کے مطابق تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن جب اموی اقتدار نے محمد بن حنفیہ جیسے خاندانی لوگوں کو یزید کی دوستی پر مجبور کر دیا تو تحریک کی معنویت ختم ہوگئی اور اس کے انقلابی ارادے عدم کی نظر ہوگئے۔ تحریک کے ناکام لیڈروں نے تحریک کو عقیدے اور مذہب کا رنگ دے دیا اور اس طرح یہ وقتی مسئلہ ہمیشہ کی تفریق اور دشمنی کا موجب ہوگیا۔ لیڈروں کی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی یہی صورت تھی جس کے نتیجے میں اہلِ بیت کا تقدس بڑھ چڑھ کر بیان کیا گیا، ان کی قبریں پجنے لگیں، مجلسِ عزا نے ایک جشن کی سی صورت اختیار کر لی اور ماتمی جلسہ تقریبِ شاہی کی نمایش کرنے لگا۔ تحریک مقصدِ حیات کے لحاظ سے ختم ہوگئی لیکن لازوال دشمنی اور تفریق کی ایک بیماری سی اُمت میں چھوڑ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ اور سنی مسلمان میں ایک نوع کا بعد سا پیدا ہوگیا۔

خوارج نے اس غلو کو توڑنا چاہا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ بیت بشری تقاضوں سے بالا نہیں ہیں۔ نہ وہ معصوم اور بے گناہ ہیں اور نہ غلطیوں سے محفوظ بلکہ فی الواقع ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اس اظہارِ بیان نے غلو کی صورت اختیار کی اور اہلِ بیت کی تکفیر تک نوبت پہنچ گئی۔ اہلِ بیت کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ تحریک کی عملی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔ تحریک کے ناکام لیڈروں نے اسے بھی مذہب اور فلسفہ کا رنگ دے کر ایک جدید مذہب کی بنیاد رکھ دی جس کا اسلام سے بہت کم تعلق ہے۔

متکلمین ومبتدعین:

اسی طرح بعض عقل پرست حضرات نے اسلام کو اصطلاحی عقل اور عرفانی فلسفے کے ساتھ آمیز کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اعتزال اور جہمیت پیدا ہوئی۔ خلقِ قرآن اور صفتِ باری کی عینیت اور غیریت کے بے ضرورت مباحث پیدا ہوگئے۔ اسلام کو عقل کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے اسلام کے بعض اساسی اور بنیادی مسائل کا انکار کیا جانے لگا۔ ہمارے متکلمین پر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی یہ پھبتی کس قدر صحیح ہے:

"لَا لِلْإِسْلَامِ نَصَرُوْا، وَلَا لِلْفَلْسَفَةِ كَسَرُوْا"[1]

[1] الصواعق المرسلة (۳/ ۹۷۳)

''نہ اسلام کی مدد کر سکے اور نہ فلاسفہ ہی کی یورش کا مقابلہ کر سکے۔''

آخر علمائے اسلام اور ائمۂ حدیث نے جب یونانی فلسفے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور یونانی فلسفے کے وکیل مقدمہ ہار گئے اور ائمۂ سنت نے مدافعت کے بجائے فلسفے پر براہِ راست حملے شروع کیے تو اعتزال و جہمیت جیسی تحریکیں اور متکلمین کی موشگافیاں ہی ختم ہوگئیں اور یہ تحریک بھی صرف کتابوں کے اوراق کی زینت بن کر رہ گئی۔ غرض ہر وقتی تحریک کا یہی حشر ہوا اور وہ اپنا کام کر کے یا ناسازگاریِ حالات کے اثر سے بے اثر ہوگئی۔

معمّر ترین تحریک:

اس سارے عرصے میں تحریکِ اہلِ حدیث بدستور کام کرتی رہی۔ اس میں جامعیت تھی کہ اس کے خدمت گزاروں کو دنیا کے ہر گوشے میں کام ملتا رہا اور ان کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ پہلی صدی ہجری میں حفظ اور کتابتِ حدیث، دوسری میں تدوینِ حدیث اور تصنیف و تالیف کی تاسیس کے کام، اس کے علاوہ اعتقادی اور عملی بدعات سے دست بدست لڑائی، ان بدعات نے جن چور دروازوں کو تخریب اسلام کے لیے کھولا تھا ان کی نگرانی، اس کے ساتھ مسلمانوں کے جماعتی شیرازے کی حفاظت تاکہ بیرونی حملوں سے اسلام کی سیاسی قوت تباہ نہ ہو جائے۔

یہ وہ دور اندیشیاں ہیں جن کے نتائجِ فکر نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے بحرِ زخّار کو بار بار جیل جانے پر مجبور کیا، پھر بوقتِ ضرورت اسی حکومت کی حمایت میں، جس نے شیخ کو جیل بھیجا، ایک سپاہی کی طرح میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دیتے نظر آئے اور ہلاکو اور چنگیز کی فوجوں سے برسوں سینہ سپر رہے۔ یہ اعتدالِ مزاج اور حفظِ مراتب کے وہ عظیم الشان کارنامے اور فوق العادت کام ہیں جو شاید ائمۂ سنت اور اربابِ حدیث ہی کا حصہ تھا۔ اور یہ تحریک سب سے معمر اور قدیم ترین تحریک ہے جو ان فتنوں سے عہدہ برآ ہو کر زندہ رہی کیوں کہ یہ تحریک نہ وقتی تھی نہ ظروف و احوال کی پیداوار بلکہ اس کا مقصد پورے اسلام کی خدمت تھا۔

فتحِ ہند اور اہلِ حدیث:

سب سے پہلا قافلہ جو فاتحانہ حیثیت میں ساحلِ ہند پر وارد ہوا وہ اہلِ حدیث کا تھا۔ آج

بھی سندھ میں شیخ بدیع الدین[1]، ان کا خاندان اور ایک عظیم الشان مکتبہ ہے جس میں حدیث اور رجال کا بے نظیر ذخیرہ موجود ہے جو قرونِ ماضیہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اس وقت گو سندھ میں اہلِ توحید کو وہ قوت حاصل نہیں لیکن تاریخ کے اوراق ان کی خدمات کو نہیں بھول سکتے۔ اسی طرح مغل فاتحین بھی اسلامی سادگی اور دینِ فطرت کی روشنی سے زیادہ فارسی تہذیب سے آشنا تھے۔

اس لیے ہندوستان میں اسلامی سادگی اور کتاب وسنت کی تعلیمات کا زور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور نہ خدامِ حدیث کی اس قدر کثرت ہو سکی جس قدر بعض دوسرے ممالک میں تھی۔ شیخ علی متقی صاحبِ کنز العمال اور شیخ محمد طاہر مؤلفِ مجمع البحار، شیخ مجدد احمد سرہندی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہم اللہ اس وقت مغتنمات میں سے تھے۔ اکبری فتنوں کے سامنے کوئی طوطی کی آواز کو سنے یا نہ سنے مگر طوطی نے اپنا فرض ادا کرنے میں کمی نہیں کی۔ اس وقت اہلِ حق کس قدر کمزور تھے۔ شیطانی طاقتیں کس قدر جمع ہو رہی تھیں۔ فتنوں کا سیلاب کتنا تباہی خیز تھا۔ حکومت کا لادینی جذبہ اہلِ حق کے لیے کتنی مصیبت کا باعث تھا۔ اَعراس اور موالید کو بعض لوگوں نے اسلام کا بنیادی مسئلہ سمجھ رکھا تھا، تاہم ان بزرگوں نے ان بدعات پر کڑی نکتہ چینی کی۔ غیر اسلامی رسوم اور غیر اسلامی نظریوں کے خلاف ان مجددینِ وقت کی پُرشکوہ آواز فضائے دہر میں گونجتی رہی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَأَرْضَاهُ.

بدعی استیلا:

اس ناخوشگوار ماحول نے اکبر جیسے ملحد انسان پیدا کر کے اہلِ حق کے لیے فضا کو اور بھی مکدّر کر دیا۔ ملاّ مبارک کا خانوادہ اسی ظلمت کدہ میں "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کا حکم رکھتا ہے۔ یہ ایک بدعی ابتلا تھا جس کے لیے ایک تیز مسہل کی ضرورت تھی جس کا نضج تو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے کیا اور آخری تدبیر کار کے لیے کارکنانِ قضا وقدر نے صاحبِ سیف وقلم حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو منتخب فرمایا جن کی مساعی نے مریض کو موت وحیات کی کش مکش سے نکال کر صحت کے آثار نمایاں فرما دیے۔

اس وقت جماعت کے سامنے سب سے اہم اور پہلا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ایک دینی حکومت قائم کرے جس کے اربابِ اقتدار صحابہ کرام کی سیرت رکھتے ہوں، جن کے اسلام پر غیر مسلم اقلیتیں مطمئن ہوں۔

[1] انھوں نے ۸/ جنوری ۱۹۹۶ء کو نیو سعید آباد سندھ میں وفات پائی۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ظالم کا بدلہ مظلوم سے لیا جائے۔ ایسی سفاکانہ حرکتیں غیر مسلم تہذیب گوارا کرسکتی ہے۔ اسلام اسے قطعاً برداشت نہیں کرتا۔

دوسرا مقصد عملی بدعات کے خلاف جہاد تھا۔ اس وقت کے سنّی بھی عجیب وغریب تھے۔ اہلِ سنت کے گھروں سے تعزیہ کے جلوس نکلتے تھے۔ عشرۂ محرم میں سنّی بھی سوگوار رہتے حالانکہ ہمارے ہاں ایسے سوگ تین دن سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال تک سوگ اسلام کا طریقہ نہیں۔ محرم کی نیاز، اس ماہ میں نکاح کی ممانعت اسلامی حکم نہیں۔ اعتقادی خرابیاں، قبر پرستی، مزار پرستی کا عام رواج تھا۔ اخلاق کا یہ حال تھا کہ بازاری عورتیں گانے بجانے کے لیے اچھے اچھے شریف گھرانوں میں آتی تھیں اور پورے معاشرے میں اسے کبھی بُرا نہیں منایا جاتا تھا۔

ارکانِ اسلام عموماً متروک تھے۔ قبور اور مشاہد کے طواف حجِ کعبہ کا نعم البدل تھے۔ تعلیمی اداروں کا زیادہ زور منطق اور یونانی فلسفے پر تھا۔ علومِ سنت قطعاً متروک تھے۔ ربع مشکوٰۃ تبرکاً طلبہ دیکھ لیتے۔ اصلاحِ حال کا سارا بوجھ صرف شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے خاندان پر تھا۔ قرآن کے ترجمے نے شاہ صاحب رحمہ اللہ پر مصیبت برپا کر دی۔ طاغوتی طاقتیں سارے معمورہ میں پھیل رہی تھیں۔ شیطان ننگا ناچ رہا تھا۔ اہلِ حق مجبور تھے کہ مصلحت اندیشی سے کام لیں۔

نتائج وعواقب:

نظامِ حق کی اشاعت کے لیے سنتِ نبوی کے مطابق سید شہید نے حضرو میں آخری جنگ لڑی جس میں بظاہر ناکامی ہوئی اور بقیۃ السیف پنجاب اور پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ انگریز نے عیارانہ طور پر تحریک کا تعاقب کیا۔ تحریک خفیہ (انڈر گراونڈ) ہونے پر مجبور ہوگئی اور جماعت کے کام میں خلفشار سا ہوگیا۔ پنجاب میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی انگریزی حکومت سے تعاون کے حق میں تھے اور بظاہر انگریزی نظام کے ثنا خواں، جس کا سبب انگریزی حکومت کا تشدد اور سخت گیری تھا، اور بعض لادین تحریکوں کا نشو ونما۔ قادیانی اور آریہ سماجی تحریکات کا انگریز کے سہارے زندگی بسر کرنا اور اس کے ساتھ ہی اہلِ حق کی چغل خوری ان لوگوں کا شیوہ تھا۔ اس لیے مجھے یہ ناخوشگوار اعتراف کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ مرحوم مولانا محمد حسین صاحب جید عالم اور دُور اندیش مفکر ہونے کے باوجود اپنے دوسرے رفقاء کی طرح مقامِ عزیمت پر قائم نہ رہ سکے۔ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ

اور حضرت الاستاذ حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم و مغفور وزیر آبادی، لکھوی علمائے کرام اور بعض دوسرے اہلِ فکر صرف قرآن عزیز اور حدیث شریف کی نشر و اشاعت پر قانع ہوگئے۔ ان بزرگوں کے اثر سے قرآن و حدیث کے درس جا بجا کھل گئے۔ اعتقادی و عملی بدعات ایک ایک کر کے رُخصت ہونے لگیں۔ والحمد لله علی ذلك.

مصائب و آلام کے جس سیلاب سے تحریک اہلِ حدیث کو اس وقت گزرنا پڑا، دریائے شور کی سیر جس طرح ہمارے اکابر نے کی، جو جیل کی اذیتیں ان بزرگوں نے سہیں، آج لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مجاہدین کا گروہ:

حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حضرت مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری، صوفی ولی محمد صاحب فیروز پوری، مولوی اکبر شاہ سخانوی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا فضل الٰہی صاحب رحمہ اللہ بدستور نظامِ اسلامی کی اقامت کے لیے کوشش فرماتے رہے۔ یہ کوششیں خفیہ طور پر جاری رہیں اور عام حریت پرور تحریکات میں جماعت کی اکثریت کام کرتی رہی۔ خلافت، کانگریس، احرار، مسلم لیگ وغیرہ جماعتوں میں اہلِ حدیث نے صرف اسی نقطۂ نگاہ سے کام کیا کہ اس ملک میں کلمۃ اللہ کو بلند کیا جائے۔ اس مجاہدانہ تحریک کو ناکام کرنے کے لیے یورپ کے مدبر پوری کوشش سے سرگرم تھے۔ یہاں اقامتِ دین اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور ان کے خاندان کی مساعی کارفرما تھیں۔ اصلاحِ حال کا سارا بوجھ اسی مختصر جماعت پر تھا جن کے پاس دولتِ ایمان کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے شکست خوردہ ذہن ''وہابی'' کے لفظ سے اس قدر بدکتے تھے ﴿ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴾[1] [المدثر: ٥٠۔ ٥١]

مناظرانہ سرگرمیاں:

بعض بزرگوں نے مناظرات کی راہ اختیار کی۔ وقتی خطرات کے لیے یہ ایک مفید علاج تھا۔ ممکن ہے ان کی افادیت میں کسی دوست کو اختلاف ہو لیکن وقت کی ضرورت کے لحاظ سے ان کے مفید ہونے میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ قادیانیت اور بعض دوسرے فرقوں نے عوام میں جس طرح بدعی خیالات

[1] ترجمہ: ''جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں۔ جو شیر سے بھاگے ہیں۔''

کی اشاعت کرنی شروع کی تھی، اگر اس کا بر وقت علاج نہ کیا جاتا تو آج پانی سر سے گزر گیا ہوتا۔ اگر صورت حال کو جلد از جلد درست نہ کیا جاتا تو قادیانیت ایک عظیم فتنے کی صورت اختیار کر لیتی۔

نصف صدی کی یہ کوشش یقیناً ان فتنوں کے دفاع میں کافی مفید ثابت ہوئی، ورنہ انگریز بہادر کی عطا کردہ نبوت آج ایک مصیبت بن چکی ہوتی۔

میرا مقصد ان گزارشات سے جماعت کی ان خدمات کا مختصر سا جائزہ لینا تھا جو جماعت نے مختلف طریقوں سے ادا کیں، تا کہ عامۃ المسلمین اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ اس تحریک نے اسلام کے لیے کیا کچھ کیا اور ماضی اور مستقبل کی تحریکات اور اس تحریک میں کیا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اتفاق، خلوص اور عملِ صالح کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے مفید تر ثابت ہو سکیں۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۱۹/ اگست، ۱۹۴۹ء)

برصغیر پاک و ہند میں

اہلِ توحید کی سرگرمیاں

پاکستان میں کچھ عرصے سے اہلِ بدعت نے انگڑائیاں لینی شروع کی ہیں۔ ادب کے نام سے شرک، توسّل کے بہانے سے ماسوی اللہ کی پرستش، شفاعت کے عنوان سے غیراللہ کی پکار؛ عرب و عجم میں اہلِ بدعت اور اربابِ شرک کا شیوہ رہا ہے۔ یہی صورتِ حال پاکستان میں دہرائی جارہی ہے۔

آباء کی جامد تقلید کے سہارے اور عوام کی جہالت کے کھونٹے پر ہمیشہ مشرکانہ رسوم اور بدعات کو زندگی کا بہانہ ملا۔ خاندانی رسوم اور عادات سے عوام کو عموماً اور عورتوں کو خصوصاً جو تعلق ہوتا ہے اسے اللہ کی یہ مخلوق توڑنا نہیں چاہتی۔ ان عادات کو دراصل عوام آباء و اجداد کی یادگار اور ان کے نام کی زندگی سمجھتے ہیں، اس لیے وہ دانتوں کی پوری قوت سے انھیں تھامنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب وسنت اور انبیاء علیہم السلام کے گرامی قدر ارشادات بھی انھیں روکنے میں بعض اوقات کامیاب نہیں ہوتے۔ یہی تقلیدِ جامد ہے جسے ائمۂ اسلام اور قائدینِ سلف نے شرک کہنے میں بھی حجاب محسوس نہیں فرمایا۔

آنحضرت ﷺ فداہ ابی و امی، نے جب سے شرک کی بستیوں کو ویران فرمایا، مشرکین کی جمعیتوں کو پارہ پارہ کیا اور تقلیدِ آباء اور مشرکانہ جمود کی کمر کو توڑا، اس وقت سے بدعی رسوم اور مشرکانہ عادات کے لشکروں میں انتشار رونما رہا اور ان کے حامیوں کو جمعیت نصیب نہ ہوسکی۔

اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد شرک اور بدعت کو فروغ ہوتا رہا۔ اعوان و انصار بھی کم و بیش ملتے رہے مگر اہلِ حق کے مقابلے کی ہمت نہ ہوسکی اور نہ استدلال و براہین سے مقابلے کا حوصلہ ہوسکا۔

مغل سلاطین کے آخری دور میں محل سرائے میں ہندو رسوم اور شرک و بدعت کے لیے ماحول بے حد سازگار کر دیا گیا تھا۔ رفض و برہمنیت کے جوڑ توڑ سے قرآن وسنت اور سلف کے مکتبِ فکر کی مشکلات بہت بڑھ گئیں۔ فتنہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ علماء کی معمولی کوششیں کچھ بھی کارگر نہیں ہوسکتی تھیں۔ وقت کسی بہت بڑی قربانی کا متقاضی تھا۔ رفض کا سازشی مزاج نمایاں ہوچکا تھا اور شرک و بدعت

کی سرپرستی کے لیے ولایت سے انگریزی فوجیں کلکتہ کے ساحل سے اُتر کر دہلی تک پھیل چکی تھیں۔ اس جوڑ توڑ سے اولیاء الشیطان اور اساطینِ شرک و بدعت کو جس قدر مدد مل سکتی تھی اور جس حد تک وہ مضبوط ہو سکتے تھے ظاہر ہے یہاں معمولی علماء کی دال نہ گلے تو تعجب نہیں۔ ایسے وقت میں اہلِ حق کو یا تو پوری قوت سے میدان میں اُترنا چاہیے یا پھر قوتِ اعجاز کا انتظار کرنا چاہیے۔

ایک قرشی خاندان:

موت و حیات کی اس کارگاہ میں وقت کی آواز کے مطابق ایک نجیب الطرفین قرشی خاندان مقتل کی پوری فضا پر قابض ہوگیا۔ اس قربانی کی داغ بیل گیارھویں صدی کے آغاز میں ایک العمری فاروقی نے ڈالی تھی جس نے تجدید کی شان سے شیطان کے لشکروں کو للکارا۔ اس نے اپنی بے پناہ قوت سے شاہ جہان اور جہانگیر کے تاج کو جھنجھوڑا۔ اس نے حاکموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارا کہ یہ تخت و تاج تمھارے آباء کی میراث نہیں۔ یہ میرے رحمان اور قہار رب کا عطیہ ہے۔ اگر تم اس کی ذمے داریوں کو پورا نہیں کرو گے تو یہ تخت و تاج تم سے بزور واپس لے کر کسی اور کے سپرد کیا جائے گا۔ ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [1] [محمد: ۳۸] رحمانی طاقتیں قہاریت کے رنگ میں ظاہر ہوں گی۔

اس مقدس انسان نے پوری سنجیدگی سے کہا کہ تخت و تاج عوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہے، اللہ کی کتاب اور محمد عربی ﷺ کی سنت کی نگہداشت کے لیے ہے۔ جو یہ خدمت نہیں کر سکتا اسے خود بخود یہ کرسی خالی کر دینی چاہیے۔ اس تخت و تاج کا مقصد خدمت ہے ریاست نہیں۔ یہاں غلامی مطلوب ہے شہزادگی مقصود نہیں۔ اس بادشاہت کا یہ منشا نہیں کہ اللہ کی مخلوق تمھاری تعظیم کے لیے سربسجود ہو اور تمھاری گردنیں رعونت سے تنی رہیں۔ تم رقص و سرود اور فسق و فجور میں زندگی بسر کرو اور مخلوق تمھارے سامنے کورنش بجا لائے۔

اس اخلاص بھری آواز کا جواب قلعہ گوالیار میں قید اور کئی سال تک نظر بندی کی صورت میں دیا گیا لیکن یہ استبداد دیر تک نہ رہ سکا۔ آخر جیل کے دروازے کھولنے پڑے۔ نظر بندیوں کے تار، تار تار ہو کر رہے اور سچائی کے سامنے جھکنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

[1] ترجمہ: ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔''

امام ربانی کے مکتوبات اور مجددِ اعظم کی تعلیمات نے جو صور پھونکا تھا اس نے بتدریج حشر کی صورت اختیار کر لی اور ایک پورا خاندان اصلاحِ حال کے لیے میدان میں آ گیا۔ اس نے ابلیس کو چیلنج کیا کہ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ جائے، خدا سے جنگ کا نتیجہ اچھا نہیں۔

حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ:

اس کارزار کے معرکے میں اسلامی عساکر کی راہنمائی کا ذمہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لیا۔ انھوں نے حکیمانہ انداز سے پورے ماحول پر نگاہ ڈالی۔ انھوں نے مغل بادشاہوں کی عیاشیوں کو دیکھا اور انھیں اس سے دُکھ ہوا۔ ان کے محلوں کی بدعات کو دیکھا تو انھیں رنج ہوا۔ انھیں خواجہ سراؤں کی بدمعاشیاں اور داشتہ عورتوں کی عصمت ریزیاں معلوم تھیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مغل خاندان اپنی زندگی کا حق کھو چکا ہے۔ اس کی بساط کو زود یا بدیر لپٹنا ہے۔

انھوں نے ان جاہل بادشاہوں کی معذوریوں کو بھی دیکھا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ رفض نے حبِ اہلِ بیت کے نام سے کتنا وسیع جال پھیلا رکھا ہے اور یہ ناخواندہ بے خبر شہزادے کس طرح اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ حسینی برہمنوں نے کیسے ڈھونگ رچا رکھے ہیں اور یہی حال اس وقت عام علماء اور پیشہ ور فقراء کا تھا۔

پھر گیارھویں صدی کے آغاز میں جہاں گنتی کے چند ابلیس تھے، اب پڑھے لکھے شیطان ہزاروں کی تعداد میں پھیل رہے تھے جو برائی کو پھیلانے کے لیے پرانے لوگوں کی جگہ سنبھالنے کو منتظر بیٹھے تھے۔ یعنی اس وقت ہزاروں فتنے صرف لمحوں اور گھڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہ صاحب کو دُکھ بھی ہوا اور ان لوگوں پر رحم بھی آیا، اس لیے اس وقت کے مجدد کی آواز میں کڑک کے بجائے ایک لوچ تھی۔ اب للکار نہیں بلکہ ایک سُلجھی ہوئی پکار تھی۔ اسے اس بھٹکی دنیا پر رحم آیا۔ اس نے پورے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ کبھی تصوف کی زبان میں بولا اور کچھ لوگوں نے سمجھا کہ چھٹی صدی کا غزالی تزکیۂ قلب کا پیغام لے کر آیا ہے۔ کبھی وہ پانچویں یا چوتھی صدی کے فقہی جمود کی زبان سے بولا۔ لوگوں نے جانا فقہی فروع کا ماہر اور ائمۂ فقہ کے اجتہاد و استنباط کا بہترین ترجمان دنیا سے ہم کلام ہو رہا ہے۔ کبھی وہ یوں گویا ہوا: ”فی الجملہ مسلک فقہائے محدثین پسند افتاد“[1] دُور اندیش لوگوں نے جانا کہ مسلکِ سلف کا داعی،

---

[1] ”فی الجملہ مجھے فقہائے اہلِ حدیث کا مذہب پسند ہے۔“

فقہی جمود کا محقق و نقادِ قرونِ خیر کا پیغام لے کر دنیا کی راہنمائی کے لیے آ پہنچا ہے۔ غرض ہر گروہ نے اسے اپنا سمجھا اور اسی سے استفادے کی کوشش کی۔ وہ صحیح معنی میں حکیم الامت تھا۔

شاہ صاحب افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے ایسی کوشش فرمائیں جس سے کسی ہنگامے کے بغیر اپنے مقصد میں فائز ہو سکیں۔ لوگ امن کے ساتھ دینِ حق کو قبول کریں۔ دینِ حق پورے سکون کے ساتھ زندگی کے تمام گوشوں پر قابض ہو جائے۔ شیطان کا لشکر پوری خاموشی سے اپنے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرے۔

یعنی تصوف اعتدال پر آئے، فقہی جمود ذرا ڈھیلا ہو اور ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي))[1] کے لیے صلح و آشتی سے راستہ صاف ہو جائے۔ دین کا اصل سرچشمہ بہر کیف اللہ کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی سنت ہی کو رہنا چاہیے۔ ائمۂ مجتہدین کے مکاتبِ فکر راہنمائی کے فرائض انجام دیں گے، خود راہ نہیں بنیں گے۔ حجۃ اللہ البالغہ، مصفیٰ اور مسوی، ازالۃ الخفاء، وغیرہ صحف اس حکمتِ بالغہ، اس رصانتِ فکر، اس اعتدالِ فکر کا پتا دیتے ہیں جو حکیمِ وقت کو عطا فرمائے گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ انقلاب علم و حکمت اور کتاب و سنت کے احیا اور اقامتِ دین کا مدرسہ قرار پائے اور سرزمینِ ہند اللہ کے نور سے جگمگا اُٹھے۔

ابلیس کی فوجیں:

وقت کا حکیم امن کا خواہشمند ہو، دُرست ہے، لیکن شر پسند طاقتیں اسے کیوں کامیاب ہونے دیں۔ ان کے پروگرام کی کامیابی بد امنی میں ہے، کشت و خون میں ہے، ہنگامہ آرائی میں ہے۔ یہ حضرات قرآن عزیز کے ترجمے پر ناراض ہو گئے۔ قبر پرستی کی مخالفت سے لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ تعزیہ داری کو اسلام کا شعار ظاہر کیا جانے لگا۔ دنیا کو باور کرایا گیا کہ خدا کی کتاب کو ولی اللہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ بے ادبی کی ہے۔ انسان کا کہاں مقدور کہ وہ کتاب اللہ کے مقاصد کو پا سکے۔

ان مشکلات کے ہوتے ہوئے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مقصد کے لیے مدرسہ رحیمیہ کی مسند سے کام لیا۔ اس مدرسے میں اساتذہ کی حیثیت مشین کی نہ تھی۔ نہ طلبہ دساور کا مال تھا کہ منڈی سے نکلے اور بازار میں مہنگے سستے بک گئے۔ یہ مدرسہ ایک مکتبِ فکر تھا جس میں تصوف کے ساتھ سنت کو

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

آمیز کرنے کی مشق ہوتی تھی۔ فقہ العراق کے ساتھ فقہ الحدیث کا امتزاج کیا جاتا تھا۔

بظاہر یہ فقہ العراق کی ایک درسگاہ تھی لیکن اس طرح کہ اس پر شیخ علی طاہر المدنی نے حدیث سے اس میں جلا پیدا کر دیا تھا۔ وہاں بدعات کے خلاف خاموش جہاد تھا۔ فقہی جمود میں استنباط اور اجتہاد کی خوشگوار آمیزش ہو رہی تھی۔ یہ مدرسۂ فکر بڑی سنجیدگی سے سنت اور فقہائے محدثین کے مسلک کی طرف ترقی کر رہا تھا۔ اس کے نامور تلامذہ میں صاحبِ "دراسات اللبیب" تھے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی صاحب جیسے فحول اہلِ علم اس مدرسے سے فیض یاب ہوئے۔ پھر ہر ایک اپنی اپنی جگہ امتِ واحدہ تھا۔ وہ اسی مسلک کے مبلّغ تھے جو انھیں اپنے استادِ محترم سے ملا تھا:

"بعد ملاحظہ کتبِ مذاہب اربعہ و اصولِ فقہ و احادیث کہ متمسک است قرار داد خاطر بمدد نورِ غیبی روشنی فقہائے محدثین افتاد"[1]

[مذاہبِ اربعہ، اصول اور احادیث کی کتب ملاحظہ کرنے کے بعد نورِ غیبی کی مدد سے دل فقہائے محدثین پر مطمئن ہوا]

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۱۱۔ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

تحریکِ اہلِ حدیث کے تین دَور

مغل حکومت کے بعض بادشاہوں کی غلط روی کے سبب سے جس قدر بدعات و مفاسد کا رواج ہو چکا تھا، اس کی اصلاح کے لیے ۵۷ء سے پہلے ہی مصلحینِ ملّت و مجدّدینِ امت کی توجہ ہو چکی تھی۔ حجۃ اللہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف اس پرسکون حرکت کا پتا دیتی ہیں۔ خواجہ سراؤں کی بدولت ہندو گھرانوں میں بیسیوں قبیح رسمیں اور بدعی عادات معمولی قطع و برید کے بعد محلاتِ شاہی میں رواج پا جاتی تھیں اور حکومت کی حمایت ان کے ساتھ ہوتی۔ اکثر علماء اس گندگی کو بہ دلِ ناخواستہ برداشت کرتے اور خاموش رہتے۔

۵۷ء کے واقعات کمپنی کے غلط طریقِ حکومت کا نتیجہ تھا۔ چونکہ حکومت کی تحقیق میں یہ مذہبی جنون کا نتیجہ تھا، اس لیے اس کا اثر ان مصلحین پر ہی پڑا جو پوری خاموشی کے ساتھ اخلاق اور سیاست کی اصلاح چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ تحریکِ اصلاح ایک عرصے کے لیے بند ہو گئی اور علماء کی ایک جماعت ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئی۔ ہم آج ان مصلحینِ امت کے نام سے آشنا ہیں اور نہ کام سے۔

بانکی پور پٹنہ کے مقدمات میں ایسے ہی باغی محبوس تھے جو اپنی آنکھوں سے ان مفاسد کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھانسی اور عبور دریائے شور کی سزائیں انھی لوگوں کی آرایش کا موجب ہوئیں جو اسلامی حکومت کا تخیل اپنے سامنے رکھتے تھے اور اصلاحِ خلق سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام میں اصلاح و تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ اتفاقِ زمانہ سمجھیے کہ یہ بے قرار دل اور مضطرب روحیں انھی اجسام میں تھیں جو توحید اور عمل بالحدیث کے داعی تھے۔ جنھیں ان کے خیر اندیش ''وہابیت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را [1]

جونہی حکومت ان اہلِ حق کی سرکوبی سے فارغ ہوئی، حکام کی رنگین کارروائیاں ختم ہوئیں۔ ملک

[1] انھوں نے خاک و خون میں مل کر ایک اچھی رسم کا آغاز کیا ہے، اللہ ان نیک فطرت عاشقوں پر رحمت کرے۔

نے ایک عارضی سکون ختم کیا۔ بقیۃ السیف مصلحین نے اپنا کام پھر سے شروع کر دیا۔ لیکن اب کا پروگرام پہلے پروگرام سے کسی قدر مختلف تھا۔ ۵۷ء کے مظالم کی بربریت کے سبب سے سیاسی تنقید حکومت بجائے خود رہی بلکہ ظلم کیشوں پر اظہارِ تاسف بھی اب کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ ایک طرف دنیا پرست اہلِ علم حکومت کی ہر کج نگاہ کو ادائے ناز سمجھتے تھے اور ہر ظلم کو عین مقتضائے انصاف و دانش۔ مگر اہلِ حق کا یہ حال تھا کہ شمس العلماء ایسے رفیع لقب کو حکومت کی خوشنودی کے لیے مستحقِ شکر یہ بھی نہ سمجھتے تھے۔

دوسرا دور:

غدر کے بعد یہ بے گناہ بندے سلاسل کی جھنکار سے کچھ ایسے مخمور ومست تھے کہ پھانسی سے کم حکومت کی کسی عطا پر وہ راضی ہی نہ ہو سکے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَأَرْضَاهُمْ.

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بعد ایک ایسا ہیبت ناک منظر اور خطرناک ماحول چھوڑ گئے کہ برسوں تک اس مقامِ بلندی کی آرزو بھی حافظوں کی زینت کا موجب نہ بن سکی۔ ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس ظرف میں سیاسیات سے تھکے ہوئے دماغوں نے اپنے لیے اصلاح کی ایک ٹھوس راہ تجویز کی تا کہ وہ مشغول بھی رہیں اور ستا کر کچھ آرام بھی کر لیں، اس لیے ہندوستان کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کتاب وسنت کی اشاعت ہی سب سے بہتر کام تھا جسے شروع کر دیا گیا۔ یہ کام جس ماحول میں شروع کیا گیا وہ بھی ایک جہادِ اصغر تھا۔ مشکلات کا لامتناہی سلسلہ اس راہ کو روکے ہوئے تھا۔ عوام مخالف، علماء مخالف۔ فقہیات کے لیے شروح وحواشی کا ایک انبار علماء کے کتب خانوں میں موجود لیکن کتاب وسنت کے لیے ایسا سامان چند ایک مقامات کے سوا قریباً ناپید۔ غدر کی ہلاکت آفرینیوں کے بعد مال و دولت ناپید، وسائل مفقود۔ گویا کتاب وسنت کی اشاعت صرف ایسی چیز ہی نہ تھی جو حل طلب نہ ہو بلکہ اس وقت یہ ایک ایسی ضمیر تھی جس کی طلب کے تخیل کے لیے بھی دماغوں کے پاس کوئی جگہ نہ تھی۔

ان مشکلات کے باوجود یہ ایک وقت کی ضرورت تھی اور ملائے اعلیٰ کی اس خاکستان کے لیے حقیقی خواہش۔ وہ جیسے دلوں کی آواز تھی، دلوں پر ہی اس کا نشانہ تھا، دلوں میں ہی اس کے تیر پیوست ہوئے۔ گویا آن کی آن میں دہلی پھاٹک حبش خاں کے ایک تنگ و تاریک کوچہ میں ایک دارالعلوم

جس میں اصحابِ صفہ کے جنود مجنّدہ اطرافِ عالم سے جمع ہونے لگے۔

"یَضْرِبُ النَّاسُ أَکْبَادَ الْإِبِلِ"[1] کا سماں مدینہ طیبہ کے بعد دہلی میں بھی نظر آنے لگا۔ چند سال میں اس سراجِ منیر نے تقریباً دنیا کے مشرق و مغرب تک اپنی روشنی کو پھیلا دیا۔ اور عجب یہ ہے کہ وہاں نہ کوئی کالج نما عمارت ہے اور نہ کوئی عظیم الشان بلڈنگ لیکن کثرتِ تلامذہ کا یہ حال ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جایئے، اہلِ علم کی محفلوں میں آپ کو اس مقدس درسگاہ کے تذکرے ملیں گے۔ یہ عریش کا مدرسہ اور دہلی کی تنگ و تاریک گلیاں عجیب محبت بھرے الفاظ سے یاد کی جاتی ہیں۔

لطیفہ:

سفرِ حج میں مجھے اور میرے محترم رفیق برادرم حافظ عنایت اللہ کو خیال ہوا کہ یہاں کے علماء سے اجازتِ حدیث حاصل کریں۔ اس مقصد کے لیے علمائے نجد، یمن، حجاز اور شام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تعجب ہے کہ سب کے پاس سب سے اعلیٰ سلسلہ حضرت شیخ الکل کا تھا۔ شیخ ابوبکر خوقیر[2] کے الفاظ کس قدر لذیذ ہیں: "وَلِي إِجَازَةٌ مِنْ عِدَّةِ أَسَاتِذَةٍ، أَوْثَقُهُمْ عِنْدِي الشَّيْخُ نَذِيرُ حُسَيْنُ الدِّهْلَوِيُّ"[3]

غرض اس دور کی تعلیمی برکات نے اہلِ حدیث خیالات کو اس قدر سربلند کیا کہ بعد کی مساعی میں اس کا عُشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اس مدرسے کے غیر منظّم شعبے امرتسر، لاہور اور بھوپال وغیرہ میں خدمتِ حدیث میں مشغول تھے جنھوں نے علمِ سنت کی بہترین خدمات انجام دیں۔

تیسرا دور:

اس کے بعد یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ درس و تدریس کی مقدس راہ کو چھوڑ کر جماعت کی توجہ یکسر مناظرات کی طرف کیوں ہوگئی اور درسگاہیں کیوں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ بہر حال ترقی کا تیسرا دور

---

[1] یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں مذکور ہے کہ عن قریب ایک وقت آئے گا جب لوگ طلبِ علم کے لیے سواریوں پر نکلیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے بڑا اور کوئی عالم نہ دیکھیں گے۔ (سنن الترمذي، رقم الحديث: ٢٦٨٠) لیکن اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٨٣٣)

[2] شیخ ابوبکر بن محمد بن عارف بن عبدالقادر خوقیر مکی مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں تحصیلِ علم کے بعد مصر اور ہندوستان کے شہر دہلی اور بھوپال کا بھی سفر کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ آپ حرم مکی کے امام اور مدرس تھے۔ متعدد کتب بھی تصنیف کیں۔ طائف میں ۱۳۴۹ھ میں وفات پائی۔

[3] "مجھے کئی اساتذہ سے اجازہ حاصل ہے جن میں سب سے زیادہ میرے نزدیک شیخ نذیر حسین دہلوی ہیں۔"

یہی مناظرات ہیں۔ میری ناقص رائے میں اس کی ابتدا پنڈت دیانند کی ستیارتھ پرکاش سے ہوئی۔ پنڈت جی نے عربیت سے قطعاً نابلد ہونے کے باوجود اپنی طبع آزمائی کے لیے قرآن حکیم کا انتخاب کیا۔ عموماً اعتراض کی بنا لاعلمی پر مبنی تھی۔ اہلِ علم نے پنڈت جی کی اس خامی کو فوراً بھانپ لیا اور اسے وقت کی آواز جان کر درس و تدریس کے سنگلاخ میدان سے نکل کر اس کمزور شکار پر فوراً ٹوٹ پڑے۔ حکومت کو بھی ضرورت تھی کہ ۵۷ء کی تلخیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی نیا مشغلہ ملک کے سامنے رکھے۔ حکومت نے پوری دانش مندی کے ساتھ پنڈت جی کی اس پیشکش کو شرفِ قبول بخشا اور پوری احتیاط کے ساتھ اس تخریبی پہلو کو اختیار کیا۔ پولیس اور انتظامی اداروں نے ان محفلوں کو خوب سجایا۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر پنڈت جی نے ملک کو ایک دوسری آگ میں دھکیل دیا۔ اس پروگرام سے ملک میں بے اعتمادی پیدا ہوئی اور غلامی کی زنجیریں مضبوط سے مضبوط تر ہوگئیں۔ پنجاب کے رنگیلے پیغمبر نے ان اکھاڑوں کو خدمتِ اسلام کا رنگ دے کر حکومت کو اور بھی ممنون کیا اور حکومت کی مشینری کو مدت کے بعد آرام کا سانس نصیب ہوا۔

مناظرات:

مناظرات کے جزوی فائدے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان مناظرات میں بیک وقت ہزاروں کان حق کی آواز سے آشنا ہوتے ہیں۔ سیکڑوں بدظنیاں حسن ظنیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جو لوگ فرقہ وارانہ حیثیت کے سبب مخالف کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتے، مناظرات میں سخت سے سخت باتیں خوشی خوشی میں سن گئے اور اچھا اثر اپنے دلوں پر لے گئے۔ لیکن یہ مجالس جتنی حق پرستوں کے لیے مفید تھیں، باطل پرستوں کے لیے بھی اتنی ہی مفید ثابت ہوئیں۔ کئی مذبذب گمراہ ہوگئے، اور باطل کی آواز بھی ہزاروں کانوں میں بیک وقت پہنچ گئی اور کئی زخمی دل گمراہی کی موت مرے۔

یہ مجالس اس لحاظ سے مفید بھی تھیں اور مضر بھی لیکن سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا کہ حکمت آموزی کی محفلیں یکسر سونی ہوگئیں۔ اور کہیں برائے نام درس و تدریس کا مشغلہ رہا بھی تو انھی اکھاڑوں کے نقطۂ نگاہ سے، نہ کہ حقائق اور بصیرت کے نقطۂ نظر سے۔ گویا مؤولین نے مامون عباسی کی یاد کو پھر تازہ کر دیا اور حقیقت کی جگہ جدلیات نے لے لی۔ نصوص کی تشریحات میں سلفِ ائمہ کے فہم کے بجائے کفار مرتدین کے دماغ کی زیادہ رعایت روا کی گئی۔ گویا ائمۃ الکفر کی قلبی بے قراریوں کو شریعتِ حقہ کا نعم البدل اور اُسوۂ صحابہ کے پاسنگ قرار دے دیا گیا۔ حمایتِ حق کے دعووں سے باطل کی پوری پوری ترجمانی کر

ڈالی گئی، اور بالکل غیر مفید۔ ”لَا لِلْاِسْلَامِ نَصَرُوْا وَلَا لِلْفَلَاسِفَةِ کَسَرُوْا“[1] کی مثال پھر پیدا ہوگئی اور قوم کی بہت بڑی قوت تھوڑے سے ہنگامی مفاد کے لیے تلف کر دی گئی۔

مناظرین:

مناظرین کی طبائع بھی ان مجالس سے اس طرح متاثر ہوئیں کہ آئینہ دار ذہنوں پر کبر وانانیت کا ایسا غبار پڑا کہ ائمۂ سلف اور نصوصِ صحیحہ کے خلاف موٹی موٹی لغزشیں کرنے کے بعد متنبہ ہونے پر بھی رجوع اور تلافی کی توفیق میسر نہ ہوسکی۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ مرزائی تحریک کا ابتدائی تخیل انھی ہنگاموں کا رہینِ منت ہے۔

اسی مذاقِ تاویل نے وفاتِ مسیح، ظلی نبوت، بروزی رسالت ایسے مسائل پیدا کیے۔ اور تاویل کی شناعت ملاحظہ فرمائیے، دمشق سے مراد قادیان، ابن مریم کی جگہ ابن غلام مرتضیٰ، دجال کا مطلب انگریز، گدھے کے معنی ریل مراد لیے گئے۔ غرض کتنے ہی بدبودار مغالطے اس ذہنیت کی بدولت قبول کر لیے گئے، العیاذ باللہ، جو سیکڑوں انسانوں کی گمراہی کا موجب ہوئے۔ هدانا الله وإياهم سواء الطريق.

علم وحکمت اور توحید وسنت کی مجلسیں ویران ہوگئیں۔ طلبۂ علم طلبۂ جدل ہوگئے۔ اگر ان دنگلوں کے ساتھ حضرت مولانا محمد قاسم کی طرح درس وتدریس کے منظم ادارے اور اشاعتِ سنت کے تعلیمی مشغلے تعمیری نقطۂ نگاہ کے ساتھ چلائے جاتے تو جماعت آج کی جگہ سے کہیں آگے پہنچ چکی ہوتی اور موجودہ مرکزیت یقیناً کسی مرکز پر مجتمع ہوجاتی۔ اشاعتِ کتبِ حدیث و دواوینِ سنت کا کوئی بہتر انتظام موجود ہوتا لیکن ؎

مَا کُلُّ مَا یَشْتَهِیهِ الْمَرْءُ یُدْرِکُهُ   تَجْرِي الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ[2]

ہمارا مستقبل:

اب مستقبل کی ہر گھڑی ماضی سے کہیں زیادہ خطرات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ان خطرناک حالات کی ذمے داری آپ کسی پر ڈال لیجیے لیکن اس پر بحث مت کیجیے کہ اس کے ذمے دار قائد

---

[1] یہ امام ابن قیم رحمہ اللہ کا مقولہ ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ فلاسفہ نے حمایتِ اسلام کے دعووں کے باوجود نہ تو دینِ اسلام ہی کو کوئی فائدہ پہنچایا اور نہ ملحد فلسفیوں کا کچھ بگاڑ سکے۔ دیکھیں: مفتاح دار السعادة (۲/ ۱۶۸)

[2] ہر چیز جس کی آدمی خواہش کرتا ہے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ ہوائیں کشتیوں کے مخالف بھی چلا کرتی ہیں۔

ہیں یا عوام، بلکہ اس موت و حیات کی کشمکش میں اس پر غور کیجیے کہ یہ مریض بچ جائے اور یہ ڈوبنے والا کسی طرح کنارے اتر جائے۔ پھر دیکھا جائے گا کہ اسے کس نے دھکیلا اور کس نے اس کو زہر دیا۔ ورنہ اسلاف کی تمام کوشش ناپید ہوجائے گی اور توحید وسنت کے گہوارے اہلِ خلوص کی گمراہی پر صبح وشام رویا کریں گے۔ ؎

حَتَّى الْمَحَارِيْبُ تَبْكِيْ وَهِيَ جَامِدَةٌ　وَهٰذِهِ الْمَنَابِرُ تَرْثِيْ وَهِيَ عِيْدَانُ[1]

دورِ اول اور مطمحِ نظر:

اس طویل سمع خراشی سے مقصد یہ ہے کہ جماعت کی ابتدائی سکیم اصلاحِ تعلیم اور ترویجِ سنت ضرور تھی لیکن نظامِ سیاست کو کم از کم اپنے حسبِ منشا کر کے۔ حقیقی نقطۂ نگاہ اصلاح ہے۔ اس کے بغیر نہ معاشرت ٹھیک ہوسکتی ہے نہ اقتصادیات پر انضباط ممکن۔ اگر آپ کے ہاتھ میں صحیح اختیارات موجود نہیں ہیں تو آپ کی ہر جنبش ایک مجرمانہ حرکت ہے اور ہر اصلاح قانون کی نگاہ میں مفاسد سے لبریز۔ آپ کی ہر نصیحت میں سیکڑوں خطرات کے چیلنج تصور کیے جائیں گے۔ غرض قوتِ حاکمہ اپنے اچھے اور برے ارادوں کے لیے عنوانِ تعبیر خود وضع کر لے گی اور آپ کے سارے کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

حقیقت میں یہی سبب تھا کہ سید شہید رحمہ اللہ نے دہلی کے چاندنی چوک کی رونقوں، باغوں اور سیر گاہوں، سر بفلک محلوں کو یکسر خیر باد کہہ کر سرحدی پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں اور بالاکوٹ کے خشک بیابانوں اور تپتی ہوئی چٹانوں کو پسند فرمایا۔ آہ! اس نے آخری نیند کے لیے بھی کسی آبادی کے بجائے دریائے سندھ کے سنسان کناروں کو ہی ترجیح دی۔ یہ ہے وہ ''دانا کافر'' جس پر کروڑوں ''احمق مُلّا'' قربان کیے جاسکتے ہیں۔ شہید رحمہ اللہ خوب جانتے تھے کہ اصلاحِ حال کی صحیح صورت یہی ہے کہ غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور کفر وتکفیر کے اکھاڑوں کو ختم کر کے علم و دانش و اخلاق وحلم کی بستیاں ان کی جگہ آباد کر دی جائیں۔ آپ کی توجہ کسی طرف کیوں نہ چلی جائے لیکن اصلاحِ حال کی صحیح صورت یہی ہے اور بس۔ ؎

---

[1] ''حتی کہ مسجدوں کی محرابیں جامد ہونے کے باوجود رو رہی ہیں اور ان کے منابر بھی مرثیہ پڑھ رہے ہیں حالانکہ وہ لکڑیاں ہیں۔'' یہ مشہور اندلسی شاعر ابو البقاء صالح الرندی کے اس قصیدے کا ایک شعر ہے جو اس نے سقوطِ اندلس کے بارے میں کہا تھا۔

وَالظُّلْمُ مِنْ شِيَمِ النُّفُوْسِ فَإِنْ تَجِدْ ذَا عِفَّةٍ فَلِعِلَّةٍ لَا يَظْلِمُ[1]

جماعت کا دوسرا دور:

جماعت کا دوسرا دَور ایک ٹھوس دور ہے جس میں گو سیاست کی چاشنی نہیں لیکن کتاب وسنت کی اشاعت کے لیے درس وتدریس کی بہترین مسندیں مزین کی گئیں۔ بڑے مقدس اور فرشتہ سیرت انسانوں نے ان کو زینت دی۔ انہی مجالس کے باقیات صالحات میں مولانا بشیر سہسوانی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا شریف الحسن، شاہ عین الحق، مولانا شمس الحق، مولانا شرف الحق صاحبِ عون المعبود، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا شیخ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا محمد حسین بٹالوی ایسے سیکڑوں اقمارِ علم آپ کو نظر آئیں گے ؎

أُولٰئِكَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ
إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ[2]

علم واخلاق کی بڑائیاں آپ دنیا میں تلاش کریں، زُہد واتقا کی منازل پر آپ عبور کریں اور پھر ان ملائکہ سیرت انسانوں پر ایک نظر دوڑائیں۔ آپ ان ساری خوبیوں کو قریب قریب موجود پائیں گے۔

تیسرا دور:

اب جدل ومناظرات کے تیسرے دَور پر نظر ڈالیے۔ اگر واقعی یہ میدان کوئی جہاد کا میدان تھا تو اہلِ حدیث نے اس میں پوری دادِ شجاعت دی ہے۔ خوش قسمتی ہے کبھی شہید نہیں ہوئے۔ ہمیشہ فتح ان کی غلام رہی۔ لیکن عواقب سے یکسر بے خبر، مستقبل سے یک قلم ناآشنا اپنے بیگانے کو ایک سمجھ کر دفاع ونیابت کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور اس کی جزا میں موکلین کی طرف سے ''جزاک اللہ'' کی دھیمی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ اپنی سادہ لوحی کو دیکھیے کہ اپنے طریق کی اشاعت کے لیے کس قدر منظم ادارے اور سربفلک عمارتیں تعمیر کی گئیں، سیکڑوں اساتذہ ان میں اپنے طریق پر تعلیم میں مشغول ہیں۔

---

[1] ديوان المتنبي مع الشرح (ص: ٤٥) یعنی ظلم کرنا انسانی طبائع کا حصہ ہے، اور اگر تم کسی کو دیکھو کہ وہ ظلم نہیں کرتا تو وہ کسی سبب ظلم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

[2] یہ ہیں میرے آباء واجداد، اے جریر! کوئی ان جیسا محفل میں لا کر تو دکھا!

کتبِ حدیث کی طباعت اور شروح کے انبار لگا دیے ہیں۔ لیکن سب کا انداز اپنے مسلک کی حمایت ہے اور بس!

اس فاتحانہ شغل کے بعد ہمارے پہلوانوں کی خمار آلود نگاہیں کیا دیکھتی ہیں کہ میدان بالکل کسی دوسرے کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔ تعلیمی ادارے ایک حد تک ویران ہیں۔ اشاعتِ کتب کے سلسلے میں کوئی ٹھوس چیز یہاں موجود نہیں۔ ہماری تصانیف کا تمام تر سرمایہ مناظرانہ چٹکلے، کچھ مباحثوں کی روداد یں، کچھ جلسوں کی کارروائیاں ہیں جو ہوا کی نذر ہو چکی ہیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون!

اس کمی کو محسوس کر کے جمعیت تنظیم اہلِ حدیث پنجاب کے زیر اہتمام گوجرانوالہ میں ایک مدرسے کی بنا ڈالی گئی[1] جو بحمداللہ ابتدائی حالات اور احباب کی سرد مہریوں کے باوجود قابلِ قدر ترقی کر رہا ہے۔ اس وقت تین مدرس ہیں اور تقریباً پچاس طلبہ۔ ہر سال تقریباً پانچ دس طلبہ فارغ ہو جاتے ہیں اور اپنی حسبِ مقدور توحید و سنت کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

رہایش و انتظام:

مقامی جماعت اپنی بساط کے موافق مرکزی جماعت کا ہاتھ بٹا رہی ہے لیکن اتنا بڑا اہم ادارہ کسی ایک جماعت کے اعتماد پر نہیں چھوڑا جانا چاہیے بلکہ پورے پنجاب کو اسے اپنانا چاہیے۔

ضروریات:

اس وقت مدرسے میں کتبِ درسیہ کا ذخیرہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ اصحابِ مال اس طرف توجہ کریں اور کتبِ حدیث بھیج کر مدرسے کی اعانت کریں۔ درسیات کے علاوہ طلبہ کو عمومی مطالعہ کے لیے ہر قسم کی کتب یہاں کار آمد ہو سکتی ہیں۔

اردو ہمارے ملک کی مادری زبان ہے لیکن یہاں اس کے سوا کوئی مواد نہیں ہے۔ اخبارات و رسائل مدرسے میں بہت ہی کم آتے ہیں۔ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بے حد ضروری ہیں اور اہلِ خیر کی توجہ کے قابل۔

انگریزی زبان حکومت کی زبان ہے اور آج کل تقریباً دنیا کی مشترکہ زبان کا حکم رکھتی ہے

[1] یہ اشارہ جامعہ محمدیہ نیائیں چوک گوجرانوالہ کی طرف ہے جو اگرچہ ۱۹۲۱ء ہی سے مصروفِ تدریس تھا مگر جمعیت تنظیم اہلِ حدیث پنجاب کے قیام کے بعد جماعت کا تعلیمی مرکز قرار پایا۔ مگر یہ انسلاک زیادہ دیر قائم نہ رہا۔

لیکن عربی پڑھنے والے طلبہ کے لیے ممکن ہی نہیں کہ اسے بقدرِ ضرورت ہی سیکھ لیں۔

فی زمانہ دستکاری تعلیم سے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے جس کے لیے ایک خطیر سرمائے کی ضرورت ہے تا کہ مدارس سے نکل کر طلبہ کی نگاہیں مساجد کی روٹی پر نہ پڑیں بلکہ وہ اپنی روٹی اس کے علاوہ بھی کما سکیں مگر یہ ساری چیزیں دردمندانِ قوم کی توجہ کی مستحق ہیں۔

کھانے کا انتظام گوجرانوالہ کی مقامی جماعت کے سپرد ہے لیکن حالت یہ ہے کہ امراء اس میں دلچسپی نہیں لیتے، غرباء اتنے مستطیع نہیں کہ ضرورت کے مطابق اس بار کو اٹھا سکیں۔ اس لیے سچ عرض کروں کہ کھانے کا انتظام نہ دل پسند ہے نہ تسلی بخش۔ یہ چیزیں گہری توجہ چاہتی ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ احبابِ مال اعانت کے علاوہ اپنے صحیح مشوروں سے بھی ممنون فرمایا کریں تا کہ

آبِ رفتہ باز می آید بجو [1]

طبی امداد:

طبی امداد کا معاملہ بڑا ہی مشکل تھا لیکن شکر ہے کہ محترم جناب خان بہادر ڈاکٹر محمد عظیم صاحب گورنمنٹ پنشنر نے یہ بوجھ حسبتاً للہ اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اللهم بارك له في أهله وماله، و أخلص أعماله لوجهك الكريم.

(ہفت روزہ "تنظیم اہلِ حدیث" روپڑ، ۱۵۔۲۲ر جنوری ۱۹۳۷ء)

[1] نکلا ہوا پانی ندی میں واپس آ جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت کے ماضی اور حال پر ایک نظر
اور
مستقبل کے لیے ایک لمحہ فکریہ کی ضرورت

یہ معلوم ہے کہ جماعتوں کی اصلاح اور صحیح اصولوں کی تشہیر کا سب سے بہتر اور پر امن ذریعہ تعلیم ہی کی اشاعت ہے۔ تعلیمی اداروں کی تکمیل اور درستی بہت سے ایسے وسائل سے مستغنی کر دیتی ہے جن پر لاکھوں روپیہ خرچ ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر میں آپ کی توجہ جماعت اہلِ حدیث کے دو زمانوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

شاہ ولی اللہ صاحب:

بلاشبہہ حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف سے فنِ حدیث کی طرف توجہ ہوئی۔ نکتہ رس طبائع نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا۔ حضرت شہید رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء کا رجحان الی السنۃ اور تقلیدی رسوم سے بیزاری انھی دواعی و اسباب کی مرہون تھی۔

اصلاح کے لیے ایک زبردست اقدام کی ضرورت:

یہ سب کچھ تھا لیکن اصلاحِ مسلمین کے لیے جس زبردست اِقدام اور ہجوم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اس کے لیے بہت سا مواد اور تعلیمی اداروں میں کافی اصلاح درکار تھی جس کا حصول اس ظرف و ماحول میں نہ صرف مشکل تھا بلکہ قریبِ محال۔ حضرت شہید رحمہ اللہ کے معمولی اِقدام پر جو اصلاحِ مسلمین کی طرف کیا گیا، کونسی جہالت تھی جو اس وقت کے نمایشی علماء نے نمایاں نہ کی۔ کونسی غیر مشروع اور غلط راہ تھی جس پر وہ سرپٹ نہ چلے۔ شاہی دربار میں شکایتیں ہوئیں، قتل کے منصوبے ہوئے، مار کی دھمکیاں دی گئیں۔ غرض اس پاکباز کو ناکام کرنے کے لیے

کونسی نارسا کوشش تھی جس کا ارتکاب نہ ہوا۔ اس ماحول میں ظاہر ہے کہ کسی ایسے تعلیمی ادارے کی تشکیل جو تقلیدی بندشوں کو توڑ کر صحیح علم کی طرف راہنمائی کرے کیسے ممکن تھی۔ صرف ربع مشکوٰۃ پر کفایت کرنے والے حضرات، اور وہ بھی تبرکاً، صحاح کی پوری چھے کتابیں پڑھنے کی تکلیف کیسے گوارا فرماتے اور پھر پوری بحث وتنقید کے ساتھ؟!

نظامِ تجدید کی تشکیل کے لیے الٰہی طاقتوں کی سرگرمی:

لیکن رب السماوات کی قوتِ ربوبیہ اصلاح وتجدید کے پروگرام کو پوری سرگرمی سے مرتب فرما رہی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ دنیا کو ایک بار پھر اس سیزدہ سالہ اسوہ کی طرف متوجہ کیا جائے اور تحقیق کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے کتاب وسنت کے میٹھے اور خوشگوار چشموں سے نہ صرف آشنا بلکہ سیراب کر دیا جائے، چنانچہ حضرت شیخ الکل مولانا وشیخنا السید محمد نذیر حسین صاحب مرحوم کی ذات گرامی کو اس مجددانہ کارفرمائی کے لیے انتخاب فرمایا گیا۔

ضرورت کا احساس:

درسِ حدیث کے شروع ہوتے ہی دلوں کی باگیں دہلی کی طرف پھیر دی گئیں۔ مروجہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ مقدس ارادوں کی مرصع سواریاں دہلی کے در و دیوار کو زینت دینے لگیں۔ یہ چرچا صرف ہندوستان تک محدود نہ تھا بلکہ حجاز، عراق، نجد، بحرین، شام، افغانستان، چین تک کے تشنہ لبوں کے لیے سیرابی کا سامان مہیا کیا گیا۔

اس تعلیم کا اثر ہندوستان پر:

ہندوستان پر ان مدارس کا یہ اثر ہوا کہ کوئی شہر یا قصبہ خالی نہ رہا جہاں کتاب وسنت کا چرچا نہ ہو۔ پرانی رسوم کے شیدائی اپنی سابقہ کارکردیوں پر خود ہی مضحکے اُڑانے لگے۔ تقلید کی بندشیں ٹوٹنے لگیں۔ علماء کی وہ کثرت ہوئی جس کی نظیر پہلے زمانوں میں بھی کم ملے گی۔

شیخ حافظ عبدالمنان صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جلسہ آرہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علماء کی تعداد عام سامعین سے کہیں زیادہ تھی۔ حضرت شیخ یہ تذکرہ بڑی حسرت سے فرمایا کرتے تھے۔ حضرت میاں صاحب کے تلامذہ نے کتاب وسنت کے مقفل قلعوں کو ہر سلیم دل کے لیے کھول دیا۔ توحید اور

عمل بالحدیث کے دریا ہر سو بہنے لگے۔ صدیوں کی چھپی ہوئی امانت حق داروں کے ہاتھوں پہنچنے لگی۔ پنجاب اور ہندوستان کے دیہات اور قصبوں تک چھوٹے چھوٹے مکاتب اور مدارس پھیل گئے۔ ہر جگہ حسبِ وسعت تدریسِ حدیث کا چرچا ہونے لگا۔

شوق کی کیفیت:

اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہر جگہ کے مقامی لوگ پورے خلوص سے اس بوجھ کو برداشت کرتے تھے۔ سفراء بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ علماء کو مدارس کی ضروریات کے لیے بادیہ پیمائی اور آوارہ گردی کی تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ سنت کی اشاعت اور دلائل کے وضوح کا یہ اثر تھا کہ دیرینہ رسوم کی تقلیدی بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں۔ نصوص کی اہمیت دلوں میں بڑھ رہی تھی۔ اقوالِ رجال اپنے صحیح مرتبے پر آ چلے تھے۔ مسندِ افتا و ارشاد پر بیٹھ کر اپنی ہر من مانی منوانے والے کتابوں کی ورق گردانی سے ہاتھ گھسنے لگے۔ اقوالِ فقہاء کی جگہ احادیثِ نبویہ فتوؤں کی زینت ہونے لگیں۔ یہ چند بڑی مقدس برکات تھیں جوان مخلصین کی بدولت بروئے کار آئیں۔ ؎

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود ان کی لگائی ہوئی ہے

کاش ہماری آنکھیں اس منظر کو کچھ دیر تک دیکھ پاتیں اور ان مستعار مسرتوں سے ہماری حسرت بھری نگاہیں اس قدر جلد خیرہ نہ ہوتیں۔

جن کو یہ پسند نہ تھا:

مخالفین بلکہ معاندین اس خوش کن اور کیف آور منظر کو اچھی نگاہوں سے نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے اس کے مقابلے میں جدل و مناظرہ کی صحبتیں گرما دیں۔ دیانت نمائی اور علم فروشی کے اڈے قائم کیے۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں طاقتیں حکومت کی غائبانہ اور رضا کارانہ امداد کے بل بوتے پر اس طریقِ تعلیم کے مٹانے میں مصروف ہوگئیں۔

چنانچہ جماعت کے کارکن اور ذکی افراد کی توجہ تعلیم وتعلم سے ہٹ کر یکسر جدل و مناظرہ کی طرف ہوگئی۔ یہ نجس العین اور حرام شے جو بوقتِ ضرورت ہی استعمال کی جا سکتی تھی، علی الاعلان بصورتِ کسب و حرفت استعمال ہونے لگی۔ کسی جماعت کی کارکردگی کی یہ سب سے بڑی دلیل سمجھی

جانے لگی کہ اس نے پورے سال میں کتنے ڈھونگ رچائے۔ اس کے افراد بہت بڑے جدلی ہیں۔ ان کی مناظرہ بازی کا یہ عالم ہے کہ فلاں پنڈت کو انھوں نے باتوں ہی میں ذلیل کر دیا۔ فلاں کو ایسا مذاق کیا کہ وہ کھسیانہ ہو کر رہ گیا۔ غرض کسی کو بے آبرو کر دینا ان مناظروں کا پہلا جوہر قرار پایا۔

بہار جس کی یہ ہے اس کی خزاں نہ پوچھ

غرض جماعت کا ایک بہترین اور ذہین حصہ تو اس غلط کاری میں اس طرح منہمک ہوا کہ گویا قدرت نے انھیں کسی مفید اور تعمیری کام کے لیے پیدا ہی نہیں کیا۔ جہاں کہیں کسی ملحد یا غیر مسلم سے کوئی اس قسم کا اکھاڑا ہوا وہاں رن میں اترنے کے لیے ہمارے ہی پہلوان کی طلبی ہوئی اور اس مہم کو سر کرنے کے لیے وہی لوگ سامنے آئے جن کے آب و گل کی تخمیر کتاب و سنت کے پاکیزہ عناصر سے کی گئی تھی، اور بایں ہمہ وہ صرف وکیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ چونکہ وہ غیر مقلد ہیں، کافر ہیں، اس لیے گردن زدنی ہیں۔ ؎

فَإِذَا تَكُوْنُ كَرِيْهَةٌ أُدْعىٰ لَهَا وَإِذَا يُحَاسُ الْحَيْسُ يُدْعىٰ جُنْدُبٌ[1]

غرض دنیا اپنی تعمیر میں مصروف رہی اور ہم تخریب میں، اپنے اور ساری دنیا کے وکیل!

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس وکالتِ پیشگی کا اثر اپنی جماعت پر یہ ہوا کہ جماعت کا ایک معتدبہ حصہ حال کی کیف آور لیکن محنت طلب محفلوں سے رخصت ہو کر قال کے شورش نواز لیکن سہل الحصول اکھاڑوں میں اُتر پڑا اور نظمِ تدریس جیسی تعمیری چیزوں کو یکسر نظر انداز کر دیا، اور ایک حصہ ان بے کار کارندوں اور بے شغل مشغلوں کے پیچھے آوارہ گردوں کی طرح ہو لیا۔ اکھاڑوں کی رونق اور آبرو ریزوں کی حوصلہ افزائی میں کمائی کا بہترین حصہ صرف نہیں بلکہ تلف ہونے لگا۔ مناظرین بھی اس بیماری کے ایسے خوگر ہو گئے کہ جہاں ایسی کوئی حرکت نہ ہو وہاں ترغیب اور تحریض سے ایسی فضا پیدا کر لی کہ ان کی مناظرانہ قابلیتوں کے اظہار کا موقع بہم آ سکے۔

عارضی فائدہ:

اس مناظرہ بازی سے کچھ معمولی اور عارضی فائدہ بھی ہوا اور تعداد بڑھی، اور ایسے مجادلین کی

---

[1] جب کسی مصیبت کا وقت ہو تب مجھے بلایا جاتا ہے اور جب حلوہ بنایا جاتا ہے تب جندب کو دعوت دی جاتی ہے۔

طرف بھی کافی توجہ ہوئی۔ ان کی ضروریات کا بہت کچھ لحاظ کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی گفتار و رفتار اور خیالات و عزائم سے سرمایہ دارانہ غرور ٹپکنے لگا۔ اور وہ جماعت جو از سرتاپا حال تھی قال کی قبر میں دفن ہو کر بستی کے کھنڈروں کی طرح دوست دشمن کے لیے سامانِ عبرت ہوگئی، بجز چند مدارس اور چند پرانے علماء کے اس کی گذشتہ عظمت کا کوئی نشان بھی دنیا کے سامنے نہیں۔ ؎

اک رفتگانِ عشق سے باقی رہے ہیں یہ
رہنے دے موت انھیں عبرت کے واسطے

میری سمع خراشی کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ میں مناظرات کو بے سود سمجھتا ہوں یا ان اکھاڑوں کو یکسر ناجائز تصور کرتا ہوں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے جسے پہلے بھی غیر مبہم الفاظ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ مناظرات بوقتِ ضرورت ہونے چاہئیں۔ یہ کوئی پیشہ اور صنعت نہیں ہے۔ جو جماعت ان مناظرات کو افراط سے استعمال کرے گی، نقصانِ دیانت کے علاوہ بے عملی کی موت مرے گی۔

جماعت اہلِ حدیث نے یہی غلطی کی کہ تعلیم و تدریس، نظم و انضباط ایسے مفید کام چھوڑ کر اپنی تمام تر توجہ اسی طرف کر لی اور جو لوگ اس غلط راہ کے نتائج سے واقف تھے اور کوئی ٹھوس کام کرنا چاہتے تھے ان کو جماعت کی بے ذوقی اور بے توجہی سے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پرانے مدارس یا تو خالی ہوگئے یا بحالت نیم بسمل زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً!

مناظروں کی پود:

ان مناظرات سے جو لوگ جماعت میں شامل ہوئے وہ عامل اور متقی نہیں بلکہ ہر چڑھتی صبح کے نئے نقال اور قوال کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب انھیں کوئی ایسا آدمی مل جائے تو وہ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی ملحد اور بے دین کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک سچائی کا معیار چند وہ چٹ پٹی باتیں ہیں جو کسی مخالف کے سامنے کر دی جائیں، اور وہ اخلاقاً گرے ہوئے الفاظ جو صرف مقابل کو نادم کرنے کے لیے دہرائے جائیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں نماز کی ذوقی کیفیتیں سچائی کا نشان نہیں ہوسکتیں۔ کسی عالم کے لیے رات کو جاگنا کوئی مستحسن امر نہیں۔ گفتگو میں وقار ضعفِ دلیل بلکہ جھوٹا ہونے کی علامت ہے اور مخالف کی کسی سچائی کا اعتراف شکست کا مرادف۔ ان مناظرات

میں بدزبانی، استہزا، تمسخر، فخر ومباہات کا بہتر سرمایہ ہے۔ یہ ہیں جماعت کے وہ دو دَور جن کی طرف میں جناب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا۔

دونوں کے نتائج:

میری دانست میں پہلے دور کی پیدوار کچھ عبداللہ غزنوی تھے اور کچھ صدیق الحسن۔ کئی عبدالجبار غزنوی ہوئے اور کئی عبدالمنان رحمہم اللہ۔ شمس الحق ڈیانوی، عین الحق آروی، عبداللہ غازی پوری اسی دور کی سرسبز اور شاداب سرزمین کے لہلہاتے اشجار تھے۔

اسی امت کے ایک فرد مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری ہیں جن کی تصانیف جماعت کی پرانی عظمتوں کی بہترین یادگار ہیں

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

انہی مساجد اور مدارس نے محمد حسین بٹالوی، محمد بشیر سہسوانی اور عبدالعزیز رحیم آبادی بھی پیدا کیے جن کی کوہ وقار شخصیتوں کے تخیل سے مخالفین کے دلوں کی بستیاں تھرا اُٹھتی تھیں۔ دوست دشمن کی زبانیں ستائش کے پھول ان پر نچھاور کرتی تھیں۔ موافق اور مخالف ان کے محاسن کا اعتراف کرتے تھے۔

یہ لوگ ایک طرف انتہائی بے سروسامانی میں اگر درس وتدریس کے ایک وسیع سلسلے کے بانی تھے تو دوسری طرف تالیف وتصنیف اور شروحِ حدیث کا اس قدر وسیع مواد ان کی برکات سے موجود ہوگیا جس سے اپنے اور بیگانے سب ہی مستفید ہورہے ہیں۔ معترضین کی تشنہ کامی کے لیے بھی اس قدر سامان مہیا تھا جس سے وہ حسبِ ضرورت ومقتضائے وقت سیراب ہوسکتے تھے۔ غرض یہ وہ دور ہے جس کے خوشگوار نتائج پر اعجاز کا اشتباہ ہونے لگتا ہے۔ ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ﴾

اب دوسرے دور پر بھی غور کریں تو ان کے ثمرات بعض میں عبدالحق پادری اور سلطان احمد پال ایسے لوگ ہیں اور بعض دھرم پال ایسے، اور کچھ ہم ایسے نااہل! ﴿وَهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ﴾[1] [النحل: ۷٦]

[1] ترجمہ: ''اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجتا ہے، کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا۔''

جہاں تک میرا خیال ہے، آج کل کے متعارف مناظرے کبھی اہلِ حق نے کیے اور نہ قرونِ خیر میں ان کا کہیں پتا چلتا ہے۔ تشبث بالحشیش [ڈوبتے کو تنکے کا سہارا] کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے جن وقائع کو اپنی دلجمعی کے لیے مناظرے کا نام دیا جاتا ہے قطع نظر اس سے کہ ان کی حقیقت کیا ہے، وہ اس قدر کم ہیں کہ کوئی قوم ان واقعات کی بنا پر مناظرات کو اپنے لائحہ عمل کا لازمی جز نہیں قرار دے سکتی اور نہ اس کی کارگزاریوں کا یہ کوئی قابلِ فخر کام ہی ہے۔

اب جماعت کا فرض ہے کہ ان دو راہوں سے جسے چاہے پسند کرے۔ اس کے نتائج کی اچھی یا بری توقعات پر آنے والے دور کی بنیاد رکھے۔

فَسَوْفَ تَرىٰ إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ   أَ فَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارٌ

[جب غبار چھٹ جائے گا، تب تو دیکھے گا کہ تیرے پاؤں کے نیچے گھوڑا ہے کہ گدھا۔]

(ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ، یکم دسمبر ۱۹۳۳ء)

آج کل کے مناظروں کی افادی اور شرعی حیثیت پر ایک نظر
اور
جماعت کے لائحۂ عمل میں ایک اہم تبدیلی کی ضرورت

میرا خیال ہے کہ موجودہ مناظرات اور بالفاظِ صحیح تر مجادلات کی ابتدا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی سے پڑی۔ انھوں نے ”براہین“ کے زمانے سے آخر عمر تک اس پیشے کی بدولت کافی سرمایہ پیدا کر لیا۔ آج کل پھر اُن کی جماعت اس بے ہودگی اور دماغی عیاشی کی سب سے زیادہ مشاق ہے۔ آریہ سماج کا دماغی توازن بھی احمدی جماعت کے قریب قریب ہے، انھوں نے اس حرفت کو خوب چمکایا۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے دماغی عیاشیوں سے کافی سرمایہ حاصل کیا۔

اخلاق پر اس کا اثر:

ان دونوں جماعتوں کے دماغ پر یہ جنون اس قدر سوار ہے کہ اگر کچھ مدت ان کو یہ غذا نہ ملے تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ ہنسی اور مذاق کے لحاظ سے یہ مجالس تھیٹر سے کم نہیں۔ اسی لیے حاضری کے لحاظ سے دونوں جگہیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ جھوٹ کی کثرت، آپس کی جنگ، دھوکا دینا، بغض رکھنا؛ یہ ان مجالس کے لوازم سے ہو چکا ہے۔ خلوص اور للّٰہیت صرف نام کے لیے رہ گئی ہے۔ حاضرین کی بے نتیجہ شمولیت کا یہ حال ہے کہ وہ اسے ایک تماشا گاہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ ع

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے

اہلِ دانش کی نگاہ:

سنجیدہ اور عاقبت اندیش نگاہوں نے اس اکھاڑہ بازی کو معیوب سمجھا اور اسے تضیعِ وقت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اکبر مرحوم نے ان مجالس کی غیر افادی حیثیت کو خوب ملاحت سے بیان فرمایا ہے۔ ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

اس مرض کا عموم:

عوام کو چوں کہ ان مجالس سے کافی دلچسپی تھی، اس لیے تمام جماعتیں زود یا بدیر اس میدان میں کود پڑیں۔ مذہب کے مقدس نام، پھر انبیاء اور اہلِ حق کی توہین ہوتی ہے۔ جن کو سب سے زیادہ غیور ہونا چاہیے تھا، وہ انبیاء، اہل اللہ اور مسائلِ حقہ کی تضحیک سن کر کرسی پر ٹیک لگائے بڑی شاندار مسکراہٹ اور ہنگامہ خیز تبسم سے اپنی فراخ حوصلگی اور وسعتِ ظرف کے ثبوت مہیا فرماتے ہیں۔ فإنا لله وإنا إليه راجعون.

جماعت اہلِ حدیث جو ملک کی معتدل اور سیاسی حیثیت سے ایک صحیح الخیال اور عاقبت اندیش جماعت تھی، وہ بھی اس سیلاب میں بہہ نکلی۔ اس ساری مناظرہ بازی کا اثر یہ ہوا کہ سارا ملک ہنگامۂ کار زار ہوگیا۔ مذہب کے مقدس نام پر کشت وخون ہونے لگا۔ سینکڑوں معصوم جانیں بلاقصور ان موثرات کی بدولت خاک وخون میں لوٹتی نظر آنے لگیں۔ ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ﴾ [الشعراء: ٢٢٧]

سیاسی تحریکات:

اس ہنگامہ خیزی پر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حکومت کی استبداد پرور روش نے خصوصاً عالمگیر جنگ کے بعد موت کی نیند سونے والوں کو بیداری کی نعمت سے ہم کنار کر دیا۔ جدل و مرا کے بے پایاں بیابانوں میں سراسیم پھرنے والے، امن و آشتی، صلح وسکون کی بستیوں کا پتا پوچھنے لگے۔ ملک کو آنے والے مصائب سے بچانے کے لیے متحدہ کوشش کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہوا کا رُخ بدلے، چناں چہ بدلا، اور خدا کا شکر ہے کہ ان جھگڑا کمپنیوں کی سرد بازاری کے ساتھ ہی دِلوں کی توجہ اتفاق و اتحاد کی طرف ہوئی اور حسبِ ضرورت اتحادِ عمل پیدا ہونے لگا۔

میری حیرت:

جب حالات یہ تھے تو مجھے حیرت ہوئی کہ جمعیت تنظیم اہلِ حدیث (جس کے موقر ادارے میں مخلص رفقاء کے ساتھ مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے اور آیندہ اس کا ارادہ ہے) کی ششماہی رپوٹ شائع ہوئی جس میں جہاں کچھ تعمیری چیزیں تھیں، وہاں ان تخریبی مجالس کو بھی کافی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا۔ اس لیے مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں چند حقیر خیالات اپنے رفقائے کار کے سامنے رکھوں،

ممکن ہے آیندہ لائحہ عمل کی تجویز میں ہم کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکیں۔ وما ذلك على الله بعزيز.

چناں چہ چند معروضات مورخہ ۲؍ شعبان "تنظیم اہلِ حدیث" میں لکھیں اور آج بھی گویا اس کی دوسری قسط سے جناب کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں۔ آج کی صحبت میں ان مجالس کے فوائد اور بصورتِ موجودہ ان کی شرعی حیثیت کا تذکرہ ہوگا، جیسے عنوان سے ظاہر ہے۔

محلِ نزاع کی تعیین:

آج کل لفظِ مناظرہ "كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلُ" کا مصداق ہو رہا ہے۔ اسی سے میری سابقہ معروضات کو جہاں بہت سے لوگوں نے پسند فرمایا ہے، وہاں بعض بزرگوں نے غلط سمجھ کر اظہارِ خفگی فرماتے ہوئے ان مناظرات کو ثابت کرنے کے لیے استدلال کی کوشش بھی فرماتے ہوئے مناظرہ کو سنتِ انبیاء اور عملِ سلف قرار دیا ہے۔ مجھے بھی ان سے اختلاف نہیں، لیکن آج کل کے مناظرات کو مناظراتِ سلف سے تعبیر کرنا صرف قلبِ حقیقت ہی نہیں، بلکہ ائمہ سلف رحمہم اللہ پر ظلم ہے۔

یہ معلوم ہے کہ سلف کے مناظرات بغض وانا اور ضد و تعجب سے خالی ہوتے تھے۔ وہاں صرف حقیقت کی تلاش مقصود ہوتی تھی۔ اس لیے صرف دو مختلف الخیال آدمی بیٹھ کر منزلِ مطلوب تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے مناظروں کو نہ تصفیہ شرائط کی چنداں تکلیف ہوتی ہے، نہ پولیس کی احتیاج، نہ عوام کے ہجوم کی ضرورت، نہ منٹوں اور گھنٹوں کی تعیین کا مخمصہ، نہ انتخابِ صدر میں جھگڑا۔ بلکہ فیصلے تک نہ پہنچنے کی صورت میں بھی نقضِ امن کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ گفتگو کسی وقت مجمع میں بھی ہو جائے تو اشتعال کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ مجمع کا اشتعال عموماً مناظروں کی بدنیتی یا طریقِ گفتگو کی ناہمواری سے ہوتا ہے۔

ایک سوال:

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر مناظرے کے لیے حق پرست دنیا میں موجود ہوں یا واقعات میں کوئی ایسی صورت پیدا ہونا ممکن نہ ہو، جیسے کہ آج کل قریب قریب یہی حالت ہے تو ایسی صورت میں آیا ایک شریر کو کھلی اجازت دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے عوام کے عقائد کو برباد کرے؟

میرے خیال میں اس کا حل دو طریق سے ہوسکتا ہے:

اولاً: صحیح تعلیم کی اشاعت، مذہبی زبان کی ترویج، جس کی طرف سے مدت ہوئی جماعتِ اہلِ حدیث غافل ہو چکی ہے۔ یہی شکایت تھی جو میں نے پہلے کی تھی، جس کی تلخی نے دور تک ناگوار

اثر کیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر عربیت کی اشاعت کا حسبِ ضرورت صحیح انتظام ہو جائے تو احمدی، اہلِ قرآن، اہلِ بدعت اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ بجز چند فروعی مسائل کے کوئی قابلِ توجہ نزاع نہیں رہ جائے گی جس پر کفر و اسلام کا انحصار کیا جا سکے۔ اور ایسے اختلاف کا وجود قطعاً امت کے لیے مضرت رساں نہیں ہوگا۔

دوسرا طریق:

دوسرا طریق وہی ہے جسے اسلام نے پورے تیرہ سو سال کی فاتحانہ اور کامیاب مصالحانہ مساعی کے بعد ﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾[1] [الحج: ٣٩] کی صورت میں ان لوگوں کے لیے پیش فرمایا جو صرف حق کے منکر ہی نہ تھے، بلکہ سچائی کی راہ میں ایک عظیم الجثہ چٹان تھے جس کو توڑنے اور پاش پاش کرنے کے سوا کوئی دوسرا علاج نہیں۔ کیوں کہ یہاں اصلاحِ عقائد کا سوال نہیں رہ جاتا، افہام و تفہیم کے لیے گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ وہاں شرارت کا قلع قمع مطلوب ہے اور وہ نہ تو طنزیہ الفاظ سے ہوسکتا ہے اور نہ مناظرانہ تمسخر سے، اُس کے لیے تو قوت کا مظاہرہ ہی کار آمد ہوسکتا ہے۔ پس ایسے مخالفین سے ساری دنیا کے علماء پورے عالمِ مناظرہ سے جمع فرما دیجیے، پوری ایک صدی صرف ایک شخص کو سمجھانے پر صَرف فرما دیجیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ وہاں مکمل ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ جیسے آج کل مناظروں میں دیکھا جا رہا ہے۔ اسی سے قرآنِ حکیم نے ایسے لوگوں کو ﴿ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا ﴾ کہہ کر اپنے مصالحانہ پروگرام سے بالکل الگ کر دیا ہے۔

پس ایسے حالات میں وقت اور روپے کو مناظرات میں صَرف کرنا، کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں مدعیانِ سنتِ انبیاء اور متبعانِ طریقۂ سلف کی قوتِ افتا قلم اور دوات میں ہی آلاتِ جہاد کے حصر کا فتویٰ دینے پر مجبور ہوگی۔ حضرت العلماء اس راہ کی مشکلات پر غور کرتے ہوئے بھی تھرا اُٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے میں نے سابق مضمون میں پہلے طریق کی طرف توجہ دلائی۔ جماعت کو صحیح تعلیم کی اشاعت میں ہمہ تن مصروفِ عمل ہونا چاہیے اور مجالسِ جدل سے حسبِ امکان بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ﴿ لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا ﴾ [الطلاق: ١]

---

[1] ترجمہ: ''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔''

مناظراتِ سلف تخریبی نہیں:

ایسے مناظرات جو طریقِ سلف اور سنتِ انبیاء کے مطابق ہوں، ان میں تخریب کا خطرہ ہی نہیں، نہ ان میں اِضاعتِ مال ہے۔ ایسی مجالس سالہا سال میں شاید کوئی ایک ہو جائے۔ پوری زندگی میں متبعِ حق کو شاید ہی ایک دو دفعہ ایسی گفتگو سے سابقہ پڑے۔

حال ہی میں حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب نے ایک مضمون اہلِ حدیث علماء کی مناظرانہ کوششوں کے متعلق سپردِ قلم فرمایا۔[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ابتدائی ایام میں جبکہ اہلِ حدیث طاقت ور تھے، فحول علمائے اہلِ حدیث کو اپنی ساری ساری زندگی میں ایک دو دفعہ سے زیادہ مناظرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، وہ بھی مخالفین کی طلب پر۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے، کیوں کہ اس میں شرکاء اپنی ذاتی ضرورت کے لیے جائیں گے نہ کہ فوائد اور ضروریات کے لیے۔ یہ چیز بطورِ پیشہ وحرفت استعمال نہیں ہوتی اور نہ مناظروں کو ایسے اشتہاروں کی ضرورت ہو گی کہ خادمِ شریعت وہابیوں، دیوبندیوں، مرزائیوں سے مناظرے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے، اور نہ ہی تقررِ فیس کی مصیبت ہوگی۔ آہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوہ اہلِ نظر گئی

اسی صورت میں خادم مخدوموں کو خود ٹٹول لیں گے اور اہلِ حق سیراب کن چشموں کی ٹوہ یقیناً لگا لیں گے۔ ایسے مناظرات میں نہ نزاع ہے نہ تخریب۔ اس لیے یہ جائز تھے، اب ہیں اور آیندہ رہیں گے۔ یہ فطرت کا مطالبہ ہے اور روح کی غذا۔ اسی کا نام قرآنِ حکیم نے حجت، برہان، بینہ اور سلطان رکھا ہے۔ فرمایا: ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [البقرة: ١١١]

[کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو]

اور فرمایا: ﴿ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۚ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٨]

[تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ پر وہ کہتے ہو جو نہیں جانتے؟]

نیز فرمایا: ﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ﴾ [الأنفال: ٤٢]

[تاکہ جو ہلاک ہو واضح دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے واضح دلیل سے زندہ رہے]

اور فرمایا: ﴿ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ﴾ [الأنعام: ١٤٩] [پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے]

[1] ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (١٦ر دسمبر ١٩٣٣ء)

علمائے حق کی دُور اندیشی:

ان صحیح مناظرات میں بھی علمائے حق کی دور اندیشی کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے بھی فروعِ فقہیہ تک ہی محدود رکھنا پسند کرتے ہیں۔ قرآن کی مشکلات اور صفات کی دقائق اور متکلمین کی نکتہ نوازیوں میں پڑنا ان کے ہاں خالی از خطر نہیں۔ حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر اپنی نفیس ترین کتاب "جامع بیان العلم" (۲/ ۹۸) میں ابوامامہ کی مرفوع حدیث: «مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى إِلَّا لُقِّنُوا الْجَدَلَ»[1] یعنی ہدایت کے بعد قوموں کی گمراہی جدل و مناظرہ ہی ہوتی ہے، کے بعد فرماتے ہیں:

"وَتَنَاظَرَ الْقَوْمُ وَتَجَادَلُوْا فِيْ الْفِقْهِ، وَنَهَوْا عَنِ الْجِدَالِ فِيْ الْاِعْتِقَادِ، لِأَنَّهُ يَؤُوْلُ إِلىٰ الْاِنْسِلَاخِ مِنَ الدِّيْنِ، أَلَا تَرىٰ مُنَاظَرَةَ بِشْرٍ فِيْ قَوْلِهِ جَلَّ وَعَزَّ: ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ حِيْنَ قَالَ: هُوَ بِذَاتِهِ فِيْ كُلِّ مَكَان. فَقَالَ لَهُ خَصْمُهُ: هُوَ فِيْ قَلَنْسُوَتِكَ، وَفِيْ حُشِّكَ، وَفِيْ جَوْفِ حِمَارِكَ. تَعَالىٰ اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ. حَكىٰ ذٰلِكَ وَكِيْعٌ، وَأَنَا وَاللّٰهِ أَكْرَهُ أَنْ أَحْكِيَ كَلَامَهُمْ قَبَّحَهُمُ اللّٰهُ فَمِنْ هٰذَا وَشِبْهِهِ نَهىٰ الْعُلَمَاءُ"[2]

"علماء نے فقہی مسائل میں مناظرہ و مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اعتقاد میں ان مناظرات سے روکا ہے، کیوں کہ اس کا نتیجہ بسا اوقات ارتداد ہوتا ہے۔ بشر مریسی کا مناظرہ آپ نے نہیں سنا، جب کہ آیت ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾[3] پر گفتگو ہوئی تو بشر نے کہا: خدا تعالیٰ بالذات ہر جگہ ہے۔ اس کے مخالف نے کہا: کیا وہ تمھاری ٹوپی میں ہے؟ آپ کے پاخانہ میں ہے؟ کیا وہ تیرے گدھی کے پیٹ میں ہے؟ معاذ اللہ. وکیع نے یہ بیان کیا ہے، لیکن میں اس کی حکایت بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ اس قسم کے مناظروں سے اسی لیے علماء نے منع فرمایا ہے۔"

نیز "جامع بیان العلم" (۲/ ۹۲) ہی میں فرمایا:

"وَنَهىٰ السَّلَفُ عَنِ الْجَدَلِ فِيْ اللّٰهِ وَفِيْ أَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ"

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۵۳)

[2] جامع بيان العلم (۲/ ۱۹۹)

[3] ترجمہ: "کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔"

یعنی علمائے امت نے اللہ اور اس کے اسماء وصفات میں مناظرے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا بھی فتویٰ نقل فرما کر حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

"وَالَّذِيْ قَالَهُ مَالِكٌ رَحِمَهُ اللهُ، عَلَيْهِ جَمَاعَةُ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ قَدِيْمًا وَّ حَدِيْثًا مِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَالْفَتْوٰى، وَإِنَّمَا خَالَفَ ذٰلِكَ أَهْلُ الْبِدَعِ وَالْمُعْتَزِلَةُ وَسَائِرُ الْفِرَقِ"

یعنی جمہور فقہا اور علمائے اہلِ حدیث وفتویٰ کا وہی خیال ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فروعِ فقہیہ میں مناظرہ کیا جائے اور عقائد کو جدل ومرا کی آلودگی سے بالا رکھا جائے۔

حافظ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" میں جائز اور ناجائز مناظرات پر سیر کن بحث لکھی ہے۔ اربابِ ذوق کو اس میں مبسوط اور مفید معلومات ملیں گی۔

آج کل کے مناظرات:

آج کل کے مناظرے کا صحیح تر نام مجادلہ ہے۔ اس کی اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی کہ ذہنیتوں کی بربادی، قوموں کی تباہی، جماعتوں کی تخریب کے لیے ایک دل کش اکھاڑہ، جس کو مذہب کے مقدس نام پر بپا کیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے اصلاحی جماعتوں کی رودادِ عمل سے بالکل خارج ہونا چاہیے۔ جس کے نام سے شرافت جھک جاتی ہے۔ انسانیتِ حقہ سر دھن کر رہ جاتی ہے۔ دماغی عیاشی اور اخلاق کی موت کے سوا اس کا کوئی ثمر نہیں۔ اس میں فاتح وہی لوگ سمجھے جا سکتے ہیں جو فحش گوئی میں یدِطولیٰ رکھتے ہوں۔ متانت اور سنجیدگی کا یہاں شکست کے سوا کوئی دوسرا نام ہی نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید میرا ماحول ایسا ہو یا مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہو جو اس قماش کے ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ میری رائے ہے، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے ایسے مناظرات بھی سنے جن میں چوٹی کے آدمی شریک تھے، جن کی مناظرانہ جماعت چار دانگِ عالم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھی، لیکن میری رائے نہ بدلی، بلکہ یہ مجالس میری اس رائے کا صحیح ماخذ ہیں۔ اس کے علاوہ رائے عام ان مجالس سے کافی حد تک بیزار ہو رہی ہے ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست[1]

[1] "اس شراب خانے میں مَیں تنہا ہی مدہوش نہیں، جنید، شبلی اور عطار بھی مدہوش ہیں۔"

ائمہ کی رائے:

ایسے مناظرات کے لیے تحصیلِ علم پر بھی کوئی ثواب نہیں ملتا۔ سنن دارمی اور مجمع الزوائد اور دیگر کتبِ حدیث میں اس قسم کے آثار بہ کثرت ملتے ہیں۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں:

"بَلَغَنِي أَنَّ اللّٰهَ إِذَا أَرَادَ بِقَوْمٍ شَرًّا، أَلْزَمَهُمُ الْجَدَلَ وَمَنَعَهُمُ الْعَمَلَ"

یعنی جب کسی قوم کو اللہ تعالیٰ شر میں مبتلا کرنا چاہتا ہو تو ان کے دِلوں سے عمل کی محبت نکل جاتی ہے اور جدل و مناظرہ ان میں عام ہو جاتا ہے۔

نیز ابو بکر بن نصر بھی یہی فرماتے ہیں:

"إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ شَرًّا، أَلْزَمَهُمُ الْجَدَلَ وَمَنَعَهُمُ الْعَمَلَ"

بالکل یہی الفاظ حضرت ابراہیم نخعی سے مروی ہیں۔ میں خود ایسے مناظروں کو جانتا ہوں جو مناظرے سے فرصت کے بعد تفریح کا نعم البدل تاش کو سمجھتے ہیں۔ بڑے بڑے مشہور مناظرین کا یہ حال ہے کہ وہ مسجد کے پہلو میں بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز ان مناظرات کے عجیب نتائج کا پتا دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مَنْ جَعَلَ دِيْنَهُ عَرَضًا لِلْخُصُوْمَاتِ أَكْثَرَ التَّنَقُّلَ"[1]

یعنی جو شخص دین کی محبت کا معیار مناظرات ہی کو سمجھے، اس کا مذہب و مسلک اکثر بدلتا رہتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أَرَأَيْتَ إِنْ جَاءَ مَنْ هُوَ أَجْدَلُ مِنْهُ أَيَدَعُ دِيْنَه؟ كُلُّ يَوْمٍ لِدِيْنٍ جَدِيْدٍ!"[2]

یعنی کیا ہر جھگڑالو کے لیے روزانہ ایک نئے دین کی تلاش میں پھر جائے؟

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مناظرات کی پود ہر چڑھتی صبح نئے نقال اور اقوال کی متلاشی رہتی ہے۔

فائدہ:

پہلے ذکر ہوا کہ علمائے حق ذات و صفاتِ باری عز اسمہ وغیرہ مسائل میں مناظرات کو پسند نہیں

[1] جامع بيان العلم (٢/ ١٨٧)

[2] مصدر سابق (٢/ ١٩٤)

فرماتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ مسائل اَفہام کی دست گاہ سے بالا ہیں۔ ان پر گفتگو علی وجہ البصیرت نہیں کی جاسکتی۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾[1] [الحج: ۸]

آج کل کے مناظرات بھی چوں کہ علم و بصیرت پر مبنی نہیں ہیں، ان سے مقصد بھی صرف جدل و مکابرہ ہے، اس لیے علتِ نہی ایک ہی ہے۔ وَالْحُكْمُ كَذٰلِكَ، لِأَنَّ الْأَحْكَامَ تَدُوْرُ مَعَ الْعِلَلِ.[2]

میں اپنے رفقائے کار سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اول تو آج کل مناظرات کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور اگر کبھی اس کی ضرورت محسوس ہو تو اسے حتی المقدور اصلح صورت دینے کی کوشش کی جائے۔

مجھ کو بتوں سے عشق ہے، کافر نہیں ہوں میں:

میں اپنی اس قطعی رائے کے ہوتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہوں کہ جب تک دنیا میں مرزائی جماعت موجود ہے اور حکومتِ انگریزی ان کی پشت پر، ایسے مناظرات کا خاتمہ مشکل نہیں، بلکہ محال ہے اور اس کا دفاع بھی ضروری ہے، اس لیے بحکم ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ایسے مناظرے رہنے چاہییں اور بمقتضائے "إِذَا ابْتُلِيَ أَحَدُكُمْ بِبَلِيَّتَيْنِ فَلْيَخْتَرْ أَهْوَنَهُمَا"[3] مناسب ہوگا کہ ایسی مجالس کے ضرر کو حسبِ امکان کم کیا جائے۔ تمسخر، غیر مہذب الفاظ سے حسبِ وسعت بچا جائے۔ خلطِ مبحث سے بچا جائے، تاکہ پبلک کا مذاق درست رہے۔ ممکن ہے یہ اسلوب حقیقت کی طرف راہنمائی کرے اور مناظراتِ سلف کی شان پیدا ہوسکے ع

مجھ کو بتوں سے عشق ہے، کافر نہیں ہوں میں

جدل و مناظرے میں فرق کی آسان راہ:

حافظ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" (ص: ۱۰۸) میں آدابِ مناظرہ کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے جدل و مناظرے میں فرق آسان ہو جاتا ہے:

"وَحَقُّ الْمُنَاظَرَةِ أَنْ يُّرَادَ بِهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ، وَأَنْ يُّقْبَلَ مِنْهَا مَا يَتَبَيَّنُ. وَقَالُوْا:

---

1. ترجمہ: "اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم کے اور بغیر کسی ہدایت کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتا ہے۔"
2. "اس کا حکم بھی یہی ہے، کیوں کہ احکام کا مدار مشترکہ علتوں پر ہوتا ہے۔"
3. جب دو مصیبتوں کا سامنا ہو تو ان میں سے ہلکی کو اختیار کرلو۔

لَا تَصِحُّ الْمُنَاظَرَةُ، وَلَا يَظْهَرُ الْحَقُّ بَيْنَ الْمُنَاظِرِيْنَ حَتّٰى يَكُوْنَا مُتَقَارِبَيْنِ أَوْ مُتَسَاوِيَيْنِ فِيْ مَرْتَبَةٍ وَاحِدَةٍ مِنَ الدِّيْنِ وَالْفَهْمِ وَالْعَقْلِ وَالْإِنْصَافِ وَإِلَّا فَهُوَ مِرَاءٌ وَمُكَابَرَةٌ[1]" اھ

یعنی مناظرے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صرف خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور جس قدر اس میں حق ظاہر ہو، اسے تسلیم کرے۔ علماء نے فرمایا: جب تک دونوں مناظر عقل، فہم، دیانت اور انصاف میں برابر نہ ہوں، حق ظاہر ہوسکتا ہے اور نہ یہ مناظرہ ہے، بلکہ یہ جھگڑا اور مکابرہ ہے۔"

اس لیے آج کل کے مناظرات میں ان شرائط کا فقدان ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ آج کل جہلاء بھی اس میدان کے اس قدر شہسوار ہیں جس قدر مشاہیر علماء نہیں، اس لیے کہ مناظرہ صرف چال چلنے اور چال پہچاننے کا نام رہ گیا ہے۔ ع

ایں ہمہ شد حلال ولے مے حرام شد[2]

میری سابقہ گزارشات سے بعض بزرگوں کا تاثر:

میں نے ایک مضمون اسی موضوع پر اس سے پہلے لکھا تھا جسے اکثر حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، لیکن ۱۶ر دسمبر ۴۳ء کا "اہلِ حدیث" دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کے تاثرات بالکل دگرگوں ہیں۔ انھوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ میں مناظروں کے بالکل خلاف ہوں اور میری معروضات کی بنیاد حسد اور رقابت ہے۔ أعوذ باللہ من ذلك.

امرِ اول کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا، کیوں کہ مضمون پڑھنے والے جو کچھ ہے اسے پڑھ چکے ہیں۔ نیز پچھلے "تنظیم اہلِ حدیث" میں کسی غائبانہ دوست نے اس پہلو کو مجھ سے بہتر لکھا ہے۔ فجزاہ اللہ. اور یہ کہنا کہ حضرت مولانا نے ان معروضات پر غور نہیں فرمایا، علاوہ سوئے ادب کے خلافِ واقع بھی ہے۔

میرا خیال اور معذرت:

مضمون لکھتے وقت مجھے اس چیز کا وہم بھی نہ تھا جس طرف حضرت مولانا کا ذہن منتقل ہوا اور

---

[1] جامع بیان العلم (۲/ ۲۱۸)

[2] "یہ سب کچھ تو حلال ہے مگر حرام صرف شراب ہی ہے۔"

نہ ہی حضرت مولانا کی شخصیت نفیاً و اثباتاً پیشِ نظر تھی۔ محض اصلاح مقصود تھی، لیکن جس چیز کے متعلق میں نے لکھا تھا، حضرت مولانا کے گرامی اوقات کا کافی حصہ اس شغل میں گزرا ہے۔ اس لیے سابق خفگی اور رنجش کی موجودگی میں حضرت مولانا کے یہ احساسات بے جا نہیں ہیں۔ خصوصاً جب کہ ان کے متعلق کوئی کلمہ استثنا بھی موجود نہ ہو۔ اس لیے اس تکلیف اور خفگی کے متعلق میں کھلی معذرت چاہتا ہوں کہ ان کی ذاتِ گرامی اور والا شخصیت سے ان معروضات کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ رقابت کا خیال تو ہم پیشہ اور اصحابِ حرفت کو ہو سکتا ہے اور یہاں اس کی اہلیت ہی مفقود اور ان اَنفال و غنائم سے یکسر نفرت، تو پھر رقابت کیوں ہونے لگی؟!

رہا اصل مسئلہ، اس کے متعلق اب بھی وہی رائے ہے کہ آج کل کے مناظرے نہ سنت ہیں نہ عملِ سلف، بلکہ یہ اضطراری فعل تھا جس کو اختیاری حرفت قرار دے دیا گیا ہے۔

اس کے بعد:

اگر میری یہ معذرت سابق اور موجودہ تکرار کا علاج ہو سکے تو میں حضرت مولانا سے عرض کروں گا کہ میری معروضات پر مکرر غور کیا جائے اور جماعت کی صحیح راہنمائی کی کوشش فرمائی جائے۔ طریقِ کار میں اختلاف اور خیالات میں تفاوت ہو سکتا ہے، لیکن مرض کا نام صحت اور دوا کا نام غذا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی امید کرتا ہوں کہ اختلافِ رائے کی صورت میں جناب اس میں اظہارِ رائے کے حق سے محروم نہیں فرمائیں گے۔ اس پر بے ادبی کی سرزنش امرتسر سے سیالکوٹ تک متعدی نہ ہوگی۔

اُستاذی مولانا محمد ابراہیم صاحب:

مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ مولانا ابراہیم صاحب کا دِن رات کا کام ہے۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ مولانا نے بارہا اس گشت پر نشست کو ترجیح دی۔ کئی دفعہ انھوں نے مسندِ درس کو زینت دینے کی کوشش فرمائی۔ اپنی صحت کو خراب کیا، اپنی ذاتی جائداد کا نقصان کیا، لیکن اس کا کیا علاج کہ ؎

مَا كُلُّ مَا يَشْتَهِيهِ الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

مجبوراً یہ سلسلہ قطع کرنا پڑا۔ میں نہیں کہہ سکتا، اب حضرت الاستاد کے کیا خیالات ہوں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کی افتادِ طبیعت بالکل اس کے منافی ہے۔ انھوں نے اسے کبھی بطورِ پیشہ استعمال نہیں فرمایا۔

اس کے علاوہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ مناظرے کو تمسخر اور متعارف بے ہودگیوں سے پاک رکھیں۔ ان کے مناظرات ہمیشہ دلائل اور متانت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مناظرات کے متعلق جناب کی رائے بھی اچھی نہیں، چناں چہ گوجرانوالہ کے ایک مناظرے کے متعلق آپ نے کئی دفعہ اس کا اظہار فرمایا۔ اسی سے میرا تو یہ خیال ہے کہ ''یہ ان کا دن رات کا کام نہیں ہے۔''[1]

(ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' روپڑ، یکم فروری ۱۹۳۳ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقامتِ دین
اور
آزادی کی پہلی انقلابی جدو جہد

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں، جبکہ فرنگی کارواں در کارواں ہندوستان کے ساحل پر تاجرانہ انداز میں اتر رہے تھے، مغل بادشاہ مکافاتِ عمل میں مبتلا تھے اور یہ طاقت ورحکومت جس نے صدیوں اس ملک کے سیاہ وسفید پر قبضہ جما رکھا تھا، رختِ سفر باندھے پا بہ رکاب تھی۔ یہ چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اربابِ بصیرت جان رہے تھے کہ یہ نظامِ حکومت اب کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ مغل دربار جو صدیوں تک اسلام کی غلامی کے دم بھرتے بلکہ اچھے وقتوں میں اسلام کی بہترین خدمت کر رہے تھے، اب ان کے ہاں عیاشیاں تھیں، رنگ و راگ تھا۔ موسیقی ان کے محلوں، درباروں اور خواب گاہوں میں پوری قوت سے مسلط تھی۔ بدکار اور آوارہ مزاج عورتیں عشوہ و ناز کی وجہ سے گھر کی عفیف اور پاکیزہ خو شہزادیوں سے گویا سبقت لے جا رہی تھیں۔

توحید کے داعی اور سنت کے عاشق بادشاہوں کی اولاد مشرکانہ رسوم اور بدعات میں مبتلا ہو رہی تھی۔ مجالسِ عزا کا اثر درباروں سے نکل کر خلوت گاہوں اور تہ خانوں تک پہنچ چکا تھا۔ ایسا محسوس تھا کہ قضا و قدر ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ﴾[1] [محمد: ۳۸] کا آخری فیصلہ صادر کر چکی تھی۔ علمائے حق مغل درباروں سے بے امید ہو چکے تھے۔ جس طرح عباسی حکومت بدعتِ تجہم اور اعتزال کی وجہ سے آخری ہچکیاں لے کر ختم ہوگئی تھی، مغل درباروں میں مخنث، قوّال اور ذاکر حضرات آخری فاتحہ کے منتظر تھے۔ اکبر کی بین الملی پالیسی اورنگ زیب رحمہ اللہ کی توحید پروری پر فتح حاصل کر چکی تھی۔ حضرت علی متقی، شیخ محمد طاہر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کے پاکیزہ اثرات ایک ایک کر کے فنا ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ابوالفضل، فیضی، ملا مبارک کے خانوادے نے سنبھال لی تھی۔ لالچ اور ابن الوقتی پورے عروج پر تھی۔

[1] ترجمہ: ”تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔“

اہلِ حق کی مساعی:

علمائے حق درباروں سے مایوس ملت کی حفاظت کے لیے کچھ دوسری تجویزیں سوچ رہے تھے۔ ان کے لیے بدعات اور عیاشیوں کی گرم بازاری کے علاوہ فرنگی کا ہمرنگِ زمین جال بھی کافی تشویش کا موجب تھا۔ وہ نہ تو اس برائے نام اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت پسند فرماتے تھے اور نہ جرأت پاتے تھے کہ فرنگی کا داخلہ بند کر دیں، اسے تجارتی مراعات سے محروم کر دیں۔ نہ حالات ہی اس قدر سازگار تھے کہ بدعات کے خلاف جہاد کا علم بلند کر دیں۔ وہ جان رہے تھے کہ ایک بہت بڑی شہنشاہیت پارہ پارہ ہو رہی ہے، جابجا بغاوتیں پھوٹ رہی ہیں، اندرونِ ملک میں جہالت کا دور دورہ ہے۔ عوام کی قوتِ فکر مفلوج ہو چکی ہے، وہ اپنا نفع و نقصان سوچنے سے قاصر ہیں۔

اپنے وقت کا عظیم الشان مفکر:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان سارے حالات کا مطالعہ فرما کر علمی علاج اور فکری اصلاح کے لیے "حجة الله البالغه" اور "إزالة الخفاء" ایسی دو عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ علماء کے جمود کو توڑا۔ قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکیوں کے متعلق بھی کچھ مختصر سے اشارات فرمائے۔ حجۃ اللہ میں ان شبہات کا جواب تھا جو انگریزی تہذیب اور تعلیم کے دامن میں قطار در قطار اتر رہے تھے۔ ازالۃ الخفاء میں ان اعتقادی اور عملی بدعات کی نشاندہی تھی جو صدیوں سے مغل دربار کی غلط بخشیوں کی بدولت پروان چڑھ رہی تھیں۔ یہ کتابیں فکر کی سلامتی اور علم دانا کی جیتی جاگتی دلیل ہیں، نہ ان میں غلو ہے نہ انار کی کے جراثیم۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قیادت اپنی رفعتوں کے باوجود قومی ذہن کی انتہائی پستیوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ دور اندیشی اور ٹھنڈے دماغ سے مرض اور اس کا علاج پوری طرح سوچ لیا گیا ہے۔ شاید حضری طور پر دردمند اور مخلص رفقاء کا ایک تیز رفتار قافلہ منزلِ مقصود کی طرف چل نکلا تھا۔ شاہ ولی اللہ کے شاگرد، ساتھی اور فرشتہ سیرت بیٹے پوری اطاعت شعاری سے اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروگرام کی تکمیل میں مشغول تھے۔ فتاویٰ عزیزی، تحفہ اثنا عشریہ، تفسیر فتح العزیز، قرآن مجید کے تراجم شاہد ہیں کہ یہ قافلہ راہ کی صعوبتوں کے باوجود کس سرعت اور جرأت سے منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ رحمة الله عليهم.

أُولَئِكَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيرُ الْمَجَامِعُ [1]

[1] یہ ہیں میرے آباء و اجداد، اے جریر! کوئی ان جیسا محفل میں لا کر تو دکھا!

اقامتِ دین:

حضری اصطلاح کے مطابق مجھے اعتراف ہے کہ اس مقدس جماعت کا کوئی منشور میرے پاس موجود نہیں لیکن لٹریچر اور پروگرام میں وہ سب کچھ موجود ہے، آج کل کی حضریت کو جس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ خلوص، حسنِ عمل، احساسِ ذمے داری اور اعتمادِ نفسی کے وہ جوہر یہاں موجود ہیں، آج کی حضری تحریکیں جس سے یکسر ناآشنا ہیں۔ عہدوں کی ہوس اور کبر بعنوان خودی کے نام تک موجود نہیں۔ اقامتِ دین کے لیے وہ سب کچھ کیا گیا جس کی اس وقت ضرورت تھی اور جو کچھ ان ظروف واحوال میں ممکن تھا۔ ملت سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا گیا۔ اتنا بڑا مقدس لٹریچر ملک کے سامنے رکھا جس سے صدیوں ملت مستفید ہوگی۔ مگر اس میں بزنس اور بیوپار کا رنگ قطعاً پیدا نہیں ہونے دیا۔ آج کی ''دعایہ'' [پروپیگنڈا] جس کی روح یہ ہے کہ رائی کو پہاڑ دکھایا جائے، وہاں نام تک موجود نہیں۔ بےنوا فقیر جھونپڑیوں میں بیٹھ کر آسمانی بادشاہت کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروڑ کروڑ رحمت فرمائے۔

وقت کی ضرورت:

تحریک بڑھتی گئی۔ لٹریچر پھیلتا گیا۔ دور اندیش دشمن نے پوری طرح بھانپ لیا کہ نشانہ کہاں ہوگا۔ اس نے اپنی ساری طاقتوں کو میدان میں جھونک دیا۔ سکھ انگریز کچھ کم طاقت ور نہ تھے۔ ان کا حاکمانہ نظم ونسق پوری تحریک کو کچل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ علمائے سوء اور رفض کی ظاہری اور باطنی قوتیں صف آرا ہوگئیں۔ ایمان کے ٹھیکیدار کفرِ وہابیت کے گولے اہلِ توحید پر برسانے لگے۔ علم وشعور کی فراوانی کے بعد جب ضرورت محسوس ہوئی کہ اب میدانِ جنگ میں خون مطلوب ہے تو نیپال کی ترائیوں سے لے کر سندھ کے ریگستانوں تک اور سندھ کی بادِ سموم سے گزر کر یاغستان کی برف پوش پہاڑیوں تک شمعِ شہادت کے پروانے خاک وخون میں تڑپتے نظر آئے۔ عشق ومحبت کی داستان جو تیرہ سو سال گزرنے سے کچھ پارینہ ہورہی تھی، اسے پھر تازہ کر دیا گیا۔ عہدِ وفا کی ایک بار پھر تجدید ہوئی۔ آسمان کے فرشتوں نے بدر وحنین کی مثالیں ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را [1]

---

[1] خاک وخون میں لوٹ پوٹ ہو کر انھوں نے اچھی رسم کی بنیاد رکھ دی۔ خدا ان نیک خو عاشقوں پر رحم فرمائے!

اقامتِ دین کا نظم:

بلا معاوضہ اور حسبتاً للہ کام کرنے والوں نے دنیا کے سامنے خلوص کا ایک نمونہ رکھا۔ چنے کھا کر ہزاروں میل کا سفر طے کیا۔ جماعت کے ہزاروں پاؤنڈ بغل میں ہیں لیکن یہ سفر فاقوں سے ہو رہا ہے تاکہ ملت کی امانت جوں کی توں ملت کے خزانوں میں پہنچ جائے۔ نظم کی پابندی، بے مثال اطاعت، تقویٰ اور عبادت میں خلوص، اور شہادت ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی زبان سے سنیے۔ (ملاحظہ ہو: ہمارے ہندوستانی مسلمان)

قافلہ کن راہوں سے گزرا؟

اقامتِ دین اور آزادی کی اس جدوجہد کو کیا کچھ پیش آیا، یہ کن راہوں سے گزری، اس کے لیے انبالہ بم کیس کی مِسل ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا جعفر تھانیسری کی تواریخ عجیبہ اور کالا پانی پڑھیے۔ مولانا احمد اللہ ایسے مقدس اور فاضل بزرگ کے حالات پڑھیے جس نے اسّی سال کی عمر میں بیڑیاں زیبِ تن کیں۔ زنجیروں کے بوجھ سے گردنیں جھکی جا رہی تھیں۔ بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ عدالت کے کمرے اذان کی آواز سے گونج گئے۔ ہر دو تحریک حق نے ۱۸۵۷ء سے شروع کر کے آج تک آزادیٔ وطن اور اقامتِ دین کا کام کیا۔ صادق پوری خاندان کو دیکھیے جنھیں آج بمشکل اسی شغل سے کسی قدر فرصت ملی۔ مولانا قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور حضرت عبداللہ غازی پوری، جن کی قیمتی عمریں اور لاکھوں روپیہ کی جائداد تھی جو آزادیٔ وطن اور اقامتِ دین کی نذر ہو گئیں۔

انبالہ بم کیس سے قاضی کوٹ بم کیس تک، جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء کے پس و پیش واقع ہوا، اہلِ توحید اور اصحابِ سنت نے اس تحریک میں پیہم کام کیا۔ کبھی یہ تحریک میدانِ جنگ کی زینت تھی اور کبھی مصالح نے اسے انڈر گراؤنڈ ہونے پر مجبور کر دیا۔ کبھی یہ تحریک فرنگی انتظامیہ کے لیے دردِ سر بنی اور کبھی عدلیہ نے اس پر طبع آزمائی کی لیکن اس کی کوششیں اس وقت تک جاری رہیں جب تک پاکستان کی صورت میں اسے جزوی کامیابی نہیں ہو گئی۔ پرانے حضرات کو جانے دیجیے، شاید وہ حافظوں میں نہ ہوں۔ مولانا عبدالرحیم عرف مولانا بشیر احمد کو آپ جانتے ہیں جو لاہور سے ہجرت کر کے ہمیشہ کے لیے یاغستان میں جا بسے اور وہیں شہید ہوئے۔ مولانا محمد علی قصوری مرحوم مدتوں کابل اور یاغستان میں رہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کی دلچسپیاں کسے معلوم نہیں۔ مولانا عبدالاول غزنوی

کو کون نہیں جانتا۔ امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی مرحوم سے کون ناواقف ہے۔ قاضی عبدالرؤف بم کیس مجرم ابھی زندہ ہیں۔ محمد حسین مرحوم ضلع گجرانوالہ جس نے عمر قید کاٹی، جبل پور جیل سے اسے رہا کیا گیا جبکہ عزرائیل اس کے انتظار میں موجود تھا!

آج کی تحریکاتِ اقامتِ دین:

میں بھول نہیں رہا، ان ایام میں بعض بزرگوں نے اقامتِ دین کے نام سے کچھ کام کیا، اس کے لیے لٹریچر چھپایا، بیچا، جلسے کیے، حضری پروپیگنڈا کیا، شرائط کو کافی حد تک پورا فرمایا۔ میرے خیال میں اس سے فائدہ بھی ہوا۔ مجھے کسی کی تنقیص مقصود نہیں، مقصود ان مساعی کا تذکرہ ہے جو اہلِ حق نے اس راہ میں کیں اور ان مصائب کی یاد کو تازہ کرنا ہے جو آزادی کی راہ میں ان کو پیش آئیں۔ یومِ آزادی کا سہرا کسی شہرت پسند اور ابن الوقت جماعتوں کے سر باندھ دیا گیا تو یہ مخلص کارکنوں پر ظلم ہوگا اور ان جماعتوں کی توہین ہوگی جنھوں نے برسوں اس میں پورے خلوص سے کام کیا اور انگریز کے پاؤں اکھیڑنے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت مسیح اور حضرت مہدی کو سارے مسلمان مانتے ہیں اور صدیوں سے مانتے چلے آئے ہیں۔ کتنا بڑا ظلم ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ مسیح اور مہدی کے تذکرے صرف قادیانی تحریک سے زندہ ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ علمائے امت نے حضرت مسیح کا تذکرہ پورے عقیدے سے کیا لیکن ہمارے قادیانی دوستوں نے اس میں صرف اس قدر جدت فرمائی کہ مسیح اور مہدی کو فروخت کرانے میں ان کی تجارت کی ایک راہ پیدا کر دی۔ بہر حال دستورِ اسلامی اور تحریک اقامتِ دین کے ہر کسی پجاری نے اس پر برسوں عقیدت مندی سے کام کیا۔ کسی نے وقتی طور پر اس سے فائدہ اٹھایا۔
كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ،[1] وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.[2]

(المنبر۔ استقلال نمبر۔ فیصل آباد، ۱۶/ اگست ۱۹۶۰ء)

---

[1] ''ہر شخص کے لیے اسی عمل میں آسانی پیدا کر دی گئی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔'' صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧)

[2] ''اعمال کا صلہ نیتوں کے مطابق ملتا ہے۔'' صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریکِ جہاد میں علمائے اہلِ حدیث کا حصہ

ایک واقعاتی جائزہ

آج مختلف جماعتیں ۱۸۵۷ء کی یادگار میں شامل ہو رہی ہیں۔ دینی جماعتوں کو تو یہ حق پہنچتا ہی ہے کہ یہ مقدس یادگار منائیں مگر اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لا دینی جماعتیں بھی اس یادگار کو منا رہی ہیں۔ اس کے طویل پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی جماعتیں بھی پورے انہماک سے اس یادگار کو منانے کے فیصلے کر رہی ہیں۔

حکومتِ پاکستان:

حکومتِ پاکستان نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ اس مقدس واقعے کی یادگار منائے۔ خدا کرے انگریز کو بھی عقل آئے، وہ بھی اپنے مظالم کی یادگار منائے۔ اپنی بداعمالی پر رونے کی کوشش کرے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور آیندہ کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں ۱۸۵۷ء کے حوادث کو دہرانے کی کوشش نہ کرے۔

خدا سے ڈر کر نہ سہی، وقت سے مجبور ہو کر مصر کی جرأت، شام کی آزاد روی، سعودی عرب کی حق گوئی سے متاثر ہو کر ہی سہی مگر انگریز کے دماغ میں اس قسم کی ندامت کا پرزہ ہی نہیں رکھا گیا۔ وہ آج بھی اسرائیل کی گود میں جانا پسند کر رہا ہے۔ فرانس ایسی ظالم، مستبد، عیاش اور بے حیا طاقت کے ساتھ اس کے مراسم روز بروز استوار ہو رہے ہیں۔ ﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴾ [الشعراء: ۲۲۷]

قبولیتِ عامہ کے خطرات:

اہلِ توحید کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی مساعی کو آج دنیا سراہ رہی ہے۔ ان کی حریت پسندی کو آج تاریخی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ان کے غدر پر دنیا کی وفاداریاں نچھاور کی جا رہی ہیں۔ آج ان کا کفر اس اسلام پر بھاری ہو رہا ہے جو کسی وقت انگریز کی بارگاہ سے عطا کیا گیا تھا۔ وقت آ گیا ہے کہ کفر

کے دفتر سمیٹ کر دریا بُرد کر دیے جائیں یا دیا سلائی دکھا کر انھیں ہمیشہ کے لیے عدم کی نذر کر دیا جائے۔

مگر اس قبولیتِ عامہ سے ایک خطرہ بھی ہے کہ کہیں اس تحریک کی رُوح ہی کو ختم نہ کر دیا جائے۔ اسے اکبر کے دینِ الٰہی کی برکات نہ سمجھ لیا جائے۔ کمیونزم کے لیے اسے پیش خیمہ نہ بنایا جائے۔ اس لیے اہلِ حق کا فرض ہے کہ اس تحریک کے خد و خال کو پوری طرح نمایاں کریں۔ اس کی دینی حیثیت واضح کریں۔ ان تمام حقائق کو منظرِ عام پر لائیں جن کی بنا پر ۱۸۵۷ء کا واقعہ تاریخ کی مقدس امانت سمجھا جائے اور ایمان و دیانت کا شاہکار بنے۔

تاریخ کی روشنی میں واضح کیا جائے کہ یہ اجتماعی ہنگامہ جس میں ہندو اور مسلمان یکساں شریک تھے، اس میں فعال قوت کون سی تھی؟ اس ہنگامے کے بعد برسوں ہندو سیاستدان انگریز کے ساتھ ٹکرانے سے پرہیز کرتے رہے۔ مسلمانوں کی جائیدادیں بنگال اور سی پی میں ہندو کسانوں کے نام یونہی منتقل ہوتی رہیں۔ مسلمان تو معتوب تھے ہی، ہندو لیڈر بھی آرام سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ پوری انگریز قلمرو میں مسلمان پستا رہا لیکن انصاف پسند دنیا کے آنسو خشک ہو گئے۔ جس طرح آج فرانس کے انصاف کی چکی الجزائر میں مسلمانوں کو پیس رہی ہے۔ دنیا کی زبانیں گنگ، قلم بے حرکت ہیں۔ اخبارات میں مختصر خبروں کے سوا کچھ نہیں۔ عرب طاقتیں احتجاج کرتی ہیں لیکن انصاف کے ایوان میں ان کے لیے شنوائی نہیں۔ ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾[1] [الحج:٤٦]

اس سے کہیں زیادہ مسلمان پستا رہا۔ کبھی اسے وہابیت کی سزا دی گئی۔ کبھی حسنِ عمل اور تقویٰ کو مستحقِ دار سمجھا گیا۔ انبالہ کیس، وہابی کیس، قاضی کوٹ کیس؛ یہ سارے عنوان ہیں۔ اس کے ماتحت پچاس سال مسلم خون کی ارزانی رہی۔ ہندو قیادت نے نصف صدی میں ملک کی تجارت پر قبضہ کیا۔ زمینداریاں ہتھیائیں۔ غرض ﴿وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً﴾[2] کے اصول کے مطابق ملک میں گروہ بندی قائم کر کے اہلِ وطن ہی سے اہلِ وطن کا خون گرایا گیا اور مسلمان کو پچاس سال میں تباہ کر کے رکھ دیا گیا۔

ان حوادث سے ظاہر ہے کہ ۵۷ء کے انقلاب میں قیادت مسلمان کے ہاتھ میں تھی۔ تعلقات اور سابقہ بالا دستی کی وجہ سے تھوڑی دیر ہندو قیادت نے ساتھ دیا لیکن آخر میں انھوں نے قوتِ حاکمہ

---

[1] ترجمہ: ”پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

[2] ترجمہ: ”اور اس کے رہنے والوں کو کئی گروہ بنا دیا، جن میں سے ایک گروہ کو وہ نہایت کمزور کر رہا تھا۔“

سے ساز باز کر لیا اور مسلمان اکیلا انگریز کے مظالم کا تختۂ مشق بنا رہا۔ عدل و انصاف کی آنکھوں کے سامنے پوری نصف صدی یہ ڈرامہ کھیلا جاتا رہا۔

یہ انتقام:

یہ انتقام صرف اس لیے تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں کلیدی قوت مسلمان تھا۔ اس سے انگریز کو خطرہ تھا۔ جغرافیائی طور پر ہندوستان کے اطراف میں مسلمان پھیلے ہوئے تھے۔ افغانستان، ایران، عرب برائے نام ہی سہی مگر مسلمان تھے۔ ہندو سے قطعاً اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ اگر اکثریت کو ہندوستان میں کچھ دے دلا کر مطمئن کر دیا جائے تو جغرافیائی ماحول سے ان لوگوں کو تعلق نہیں ہوگا۔ اس لیے پچاس برس تک انگریز کے منتقم ہاتھ مسلمان کے خون سے رنگین رہے۔

یہ قدرتاً صحیح بھی تھا:

منطقی طور پر یہ درست بھی تھا۔ مغل حکومت مسلمان تھی۔ ان میں بعض بادشاہ نہایت نیک اور انصاف پسند ہونے کے علاوہ بے حد متدین اور پختہ مسلمان تھے۔ چند غلطیوں اور حکومت کی بعض عیاشیوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہاں اسلامی قوانین رائج تھے۔ حکومت اسلام کو عزت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اکبر ایسے چند مطلب پرست عیاشوں کے سوا عموماً حکّام اسلام کا احترام کرتے تھے۔

مغل حکومت کی تباہی کا اثر مسلمانوں ہی پر ہونا چاہیے تھا۔ دارالاسلام کے رہنے والے جب یکا یک دارالحرب میں آ جائیں، ان کی طبائع کا تاثر لازمی تھا۔ مغلوں کی غلط روی کے باوجود ملک میں اسلام سر بلند تھا۔ ان کی عدلیہ اور انتظامیہ دونوں میں ان کو اقتدار حاصل تھا۔ اب چند مہینوں میں یہ اقتدار ایسی قوم کی طرف منتقل ہوا جو سمندر پار سے آئی تھی۔ وہ عادات کے لحاظ سے غیر مانوس تھے۔ بود و باش کے لحاظ سے اجنبی تھے۔ کتنی جہالت کیوں نہ ہو، کوئی زندہ قوم اس قدر بے حس نہیں ہو سکتی کہ وہ اتنے بڑے انقلاب کو معمولی تصور کرے۔

اس انقلاب کی تہہ میں آزادی کے ساتھ مذہبی جذبات تھے، رضائیتِ دین کے اثرات تھے۔ دینی انقلاب کے لیے ایک ولولہ تھا۔ گو غیر مسلم مغل حکومت میں صدیوں آزاد زندگی بسر کر چکے تھے، ذمہ دارانہ عہدوں پر رہ چکے تھے۔ حکومت کے فیوض ان کی وفاداری کی وجہ سے ان پر ہمیشہ رہے مگر حکومت کا مذہب بہر حال اسلام تھا۔

مذہبی اثر اور دینی تربیت:

جب سے مغل حکومت میں بدعات کا رواج ہوا، دینی حس کمزور ہونا شروع ہوئی۔ علمائے حق نے اسے بھانپ لیا تھا۔ شیخ محمد طاہر پٹنوی نے ۹۱۶ھ میں بدعات کے خلاف جس عزم کا اظہار کیا وہ اکبر جیسے آزاد مزاج بادشاہ کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اکبر نے ان کے سر پر پگڑی رکھی اور بدعات کے ازالے کا پختہ وعدہ کیا۔ شیخ نے نذر مانی تھی کہ جب تک بدعات ختم نہ کرلیں، پگڑی سر پر نہیں رکھیں گے۔

حضرت شیخ احمد الفاروقی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ۱۰۳۴ھ میں اس لیے جیل میں بند رہے کہ وہ جہانگیر کو رسمی طور پر سجدۂ تعظیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ حضرت تین سال متواتر گوالیار کے قلعے میں بند رہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کے رفقاء میں سے مرزا مظہر جان جاناں بڑے وسیع الظرف تھے۔ ان ایام میں بدعات کی مخالفت فرماتے اور نماز قریباً حضرات شوافع رحمہم اللہ کے مسلک کے مطابق ادا فرماتے۔ ان کے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی تھے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے ان کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے بھی ظاہری اور باطنی علوم کا استفادہ فرمایا۔ قاضی صاحب جہاں تصوف اور دینی علوم کے جامع تھے وہاں فقہ الحدیث میں بھی ان کی راہ حضرت شاہ ولی اللہ اور مظہر جان جاناں کے اتباع و تتبع پر مبنی تھی۔ متاخرینِ فقہاء اور عوام سے وہ کئی مسائل میں منفرد تھے۔ اس علمی خاندان کو سنت کے ساتھ ایک شغف تھا اور بدعت سے نفرت، اور اسلام اور اس کی تعلیمات کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ دہلی اور اس کے پورے ماحول پر ان حضرات کے علمی اور عملی فیوض محیط تھے۔ قاضی صاحب کا اثر پانی پت سے پنجاب اور ملحقہ علاقوں تک پہنچا ہوا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ:

دینی حکومت کا قیام، دینی علوم کی اشاعت اور اقامتِ دین کا جذبہ، علومِ حدیث کی طرف راہنمائی حضرت شاہ صاحب اور ان کے خلفاء کے لازمی مشاغل تھے۔ حجۃ اللہ، البلاغ المبین، تحفۃ الموحدین، ازالۃ الخفاء ایسی قیمتی کتابیں پتا دیتی ہیں کہ حضرت شاہ صاحب میں کس قدر جامعیت تھی۔ مغل بادشاہ مادی سطوت کے باوجود اس بے تاج بادشاہ کے سامنے جھکتے تھے اور اس کی بے نیازی اور صاف گوئی سے وہ لوگ گھبراتے تھے۔ شاہ صاحب علمی دنیا میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کی

وجہ سے بھی متعارف تھے۔ حضرت کے سفرِ حجاز اور فنونِ حدیث کی تحصیل سے شاہ صاحب کا حلقہ اثر اور بھی وسیع تر ہو گیا تھا۔

بعد ازاں مغل حکومت کا زوال شاہ صاحب کی زندگی میں ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح اُبھر آیا تھا۔ مغل بادشاہوں کی جہالت، بدعملی، سیاسی بے شعوری ضرب المثل ہو چکی تھی۔ ان کی طبائع میں دوست اور دُشمن کا امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ ملکی معاملات ایسے لوگوں کے سپرد تھے جو کسی طرح بھی قابلِ اعتماد نہ تھے۔ شاہ صاحب کے سیاسی خطوط سے بھی ان خطرات کا پتا چلتا ہے۔

لیکن وہ اپنی قوت کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لیڈری چمکانے کے لیے سیاسیات میں دخل دینا چنداں مفید نہیں ہوگا۔ وہ اپنے اسباب و وسائل کو بھی سمجھتے تھے۔ جو قدم اٹھ سکتا تھا شاہ صاحب نے وہی اٹھایا۔ قیادت کا بزنس نہ شاہ صاحب نے کیا نہ ان رفعتوں کے لیے ایسا کرنا مناسب ہی تھا لیکن اپنی زندگی میں مستقبل کی اصلاحات کے لیے شاہ صاحب نے زمین بہت حد تک ہموار کر دی، اور کسی لیڈر کے لیے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ظروف و حالات کے مطابق قدم اُٹھائے اور قوم کو تہور کا عادی نہ بنائے اور نہ انھیں مصائب ہی میں دھکیل دے۔ شاہ صاحب کی زندگی اس دانش وری کا زندہ نمونہ ہے۔

شاہ عبدالعزیز:

شاہ عبدالعزیز صاحب نے مقتدر والد کی مسند پر بیٹھتے ہی حالات کا جائزہ لیا۔ شاہ صاحب کی مساعی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ فتاویٰ عزیزیہ میں دارالحرب اور دارالاسلام کے مباحث جہاں عمیق علم کا پتا دیتے ہیں وہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی سیاسی بصیرت کا بھی پتا دیتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کا قلم شاہ ولی اللہ سے زیادہ تیز ہے۔ وہ نظریاتی سیاست سے عملی سیاست کی طرف تیزی سے بڑھے۔ انھوں نے وقتی سیاسیات پر سنجیدہ تنقید فرمائی اور ان تمام دُشواریوں میں اسلامی تعلیمات سے ایک بال کے برابر انحراف نہیں فرمایا۔ جو کچھ کیا اسلام کی روشنی میں، شریعت کی ہدایات کے مطابق فرمایا۔

اپنے بھائیوں میں اس ذہن کو پیدا کیا۔ شاگردوں کی تربیت اسی نہج پر کی۔ سید اسماعیل شہید کے بچپن میں بڑھاپے کی دانش مندیاں شاہ عبدالعزیز کی تربیت کا اثر تھیں۔ کھیل اور غفلت کی عمر میں یہ بیدار مغزی، یہ دُور اندیشی، حالات کا تجزیہ، کفر کے ساتھ بدعت اور تشیع کے اثرات بھی اس نوجوان پیر کی نظر سے اوجھل نہ رہ سکے ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی   مے تافت ستارۂ بلندی[1]

یہ سارے ولی اللہ کے فیوض تھے۔ مجدد الفِ ثانی کی علمی برکتیں تھیں۔ شاہ عبدالعزیز کی تربیت تھی، اس جوہرِ قابل میں ان تمام علوم کی جامعیت تھی جو علی متقی سے شروع ہو کر شاہ عبدالعزیز تک کئی تجربوں کی کسوٹیوں پر گھسے جا چکے تھے۔

شاہ اسماعیل شہید:

شہید وقت کی آواز تھے اور ضرورت کے واجبی تقاضے۔ جو زمین مجدد الفِ ثانی نے تیار کی، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے اس کی اصلاح پر اپنے بہترین اوقات صرف فرمائے۔ اب اس میں بیج ڈالنے کا وقت آ گیا تھا۔ جو توحید و سنت کا بیج گیارھویں صدی کے اوائل میں بویا گیا تھا، اب اسے بار آور ہونا تھا۔ سید احمد شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی، شاہ اسماعیل اور ان کے رفقاء کو ایک ایسا مزاج مرحمت فرمایا گیا تھا جو اس کام اور اس وقت کے لیے پوری طرح سازگار تھا۔

مزاج شناسی:

آپ حضرات حیران ہوں گے کہ دینی بصیرت میں یہ لوگ اپنے اپنے ڈھب پر سوچتے تھے۔ شاہ اسماعیل آزادیِ فکر کے حامی تھے۔ فقہی جمود اور اس پابندی کو پسند نہیں فرماتے تھے جو اس وقت پورے ماحول پر محیط تھی۔ حضرت سید احمد صاحب رحمہ اللہ کو توحید کے ساتھ وابستگی تھی لیکن مروجہ فقہی اعمال سے انحراف نہیں فرماتے تھے۔ جمود تو نہیں تھا لیکن وہ تمسکاً حضرت امام ابو حنیفہ کے طریقِ فکر کے عملاً پابند تھے۔ بدعات کی مخالفت اسی طرح فرماتے جس طرح ایک سچے حنفی کو اس کی مخالفت کرنا چاہیے۔ مولانا عبدالحی کے رجحانات حضرت سید صاحب سے ملتے جلتے تھے لیکن باہم تصادم کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اس اختلاف میں اس قدر اعتدال تھا کہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں کبھی ان حضرات کو غلطی نہیں لگی۔

راہ کی دُشواریاں:

جس کو کفر سے لڑنا ہے اس کی نظر میں سکھ اور انگریز ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب اور ان کے رفقاء کا معاملہ اس سے مختلف نہ تھا۔ دہلی میں انگریز کا اثر اور قبضہ تھا اور پنجاب پر سکھوں کا۔ مجاہدین کو یہ دونوں ناگوار تھے لیکن ان کے ماتحت رہ کر ان سے لڑنا ناممکن تھا۔ اس لیے مصالح کی بنا پر مرکز سرحد

[1] اس کے سر پر، عقلمندی کی وجہ سے، بلندی کا ستارہ چمک رہا تھا۔

کو قرار دیا گیا اور وہاں پہنچنے کے لیے سکھوں کے پنجاب کو ایک طرف چھوڑ کر راستہ اختیار فرمایا۔ اس راہ کی دشواریاں وہی سمجھ سکتا ہے جسے ان ریگستانوں اور پہاڑوں سے گزرنے کا موقع ملے۔ اس مقدس گروہ نے ان دُشواریوں کو خوشی سے قبول فرمایا اور مہینوں کا سفر طے کر کے صوبہ سرحد میں پہنچے۔ ؎

در طریقِ عشق بازی امن و آسایش بلاست
ریش باد آں ''دل'' کہ با درد تو جوید مرہمے [1]

اس مرکز سے سکھوں سے لڑنا آسان تھا۔ یہ لڑائی مسلسل حسبِ موقع کئی سال تک ہوتی رہی۔ اس کی تفصیل آپ کو اس دور کی تاریخ سے ملے گی۔

میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک محض قومی یا وطنی نہ تھی۔ نہ زبان کی بنا پر کوئی عصبیت پیدا کرنا مطلوب تھا۔ مقصد ملک میں اسلامی قوانین کی اشاعت، کلمۂ حق کا استیلا تھا، اور مسلم اور غیر مسلم اقوام کے لیے مساوی آرام اور ترقی کے مواقع بہم پہنچانا تھا۔

سید احمد اور ان کے رفقاء:

سید احمد اور ان کے رفقاء کا مزاج دوسو سال کی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس دور کے علماء کی دُوربین نگاہیں اپنے بادشاہوں کی غلطیاں دیکھتی اور سمجھتی تھیں۔ وہ ان پر تنقید بھی کرتے تھے لیکن ان سے بغاوت نہیں کرتے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے لٹریچر کی اشاعت اور ان کے اخلاق کی اصلاح کے لیے یہ ساری کوششیں اپنی استطاعت کے مطابق جاری رہیں لیکن اس قدر نتیجہ خیز نہ ہوسکیں جس قدر ہونا چاہیے تھا۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ ان سب ساتھیوں نے سکھوں سے جنگ چھیڑ دی۔ مجھے اس وقت نہ تو اس کی تفصیلات میں جانا ہے، نہ کامیابی اور ناکامی کے اسباب سے بحث کرنا ہے بلکہ دوسو سال کی کوشش کے نتائج میں اس تحریک کے مزاج کی وضاحت کرنا ہے۔

بالاکوٹ کا سانحہ:

بالاکوٹ کا دل گداز حادثہ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ رمئی ۱۸۳۱ء) کو واقع ہوا۔ مولانا ولایت علی کو سید صاحب نے اس سے پہلے ہی تنظیمِ جماعت کے لیے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ اس حادثے کا اثر سید صاحب کے رفقاء اور فوج پر پڑنا تو قدرتی تھا، ہندوستان کے ہمدردوں کا حلقہ بھی اس سے پریشان

[1] عشق کی راہ میں امن و آسایش کی بازی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دل تیرے درد سے مرہم چاہتا ہے۔

ہوگیا۔ مخالفین بے حد متاثر ہوئے۔ خونِ شہادت کا رنگ اتنا گہرا اور شوخ تھا کہ اس نے کفر کے تمام دھبوں کو بے نشان کر دیا۔ مکفرین پر ایک سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اہلِ توحید کی تکفیر میں حضراتِ بریلی، علمائے بدایوں اور خیر آباد کے مقدسین پیش پیش تھے۔ بالاکوٹ کا معرکہ ایک طرف میدانِ کارزار تھا تو دوسری طرف محفلِ مناظرہ۔ کفر کے فتوے پہنچتے۔ منطقی مباحث اور علمی سوالات کا سلسلہ تھا جو ہندوستان اور بالاکوٹ کے درمیان پوری سرگرمی سے جاری تھا۔

شاہ شہید رحمہ اللہ جنگی خدمات بھی انجام دیتے، گھوڑے کو کھرکھرا بھی کرتے، سوالات کا جواب بھی لکھواتے۔ شہادت کی اطلاع سے کہرام مچ گیا۔ اتنی مقدس قربانی کے بعد کسے جراَت تھی کہ کفر کا فتویٰ دے۔ اور اگر کہیں یہ بے حیائی ہو بھی جائے تو اسے سنتا کون۔ کچھ عرصہ کے لیے قلموں کی حرکت بند ہوگئی۔ دواتوں کی روشنائی خشک ہوگئی۔

خیر آبادی خاندان مخالف کیمپ میں زیادہ دُور اندیش اور نکتہ رس واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز کی عیاریوں سے بتدریج واقف ہو چکا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بالاکوٹ کی تحریک کو صحیح سمجھنے لگے تھے۔ ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی بڑے پائے کے عالم تھے اور ایوانِ حکومت تک بھی ان کو بہت زیادہ رسوخ حاصل تھا۔

سُنا ہے جب شاہ شہید کی شہادت کی اطلاع ملی تو طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ اسی وقت کتاب بند کر دی گئی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ فرمایا تھا۔ اس حادثے کی اطلاع نے مولانا کا ذہن بالکل بدل دیا۔ مولانا تحریکِ بالاکوٹ کے حامی ہوگئے۔ بقدرِ امکان ان کی حمایت فرماتے رہے۔ بقیۃ السیف کی امداد فرماتے رہے۔

مولانا عالم ہونے کے علاوہ بڑی امیرانہ زندگی کے عادی تھے۔ وہ دور اندیش تھے۔ انگریز کے مزاج اور سخت گیری کو بھی سمجھتے تھے۔ بہادر شاہ کی کمزوریوں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی کامیابی کے متعلق چنداں پُر امید نہ تھے۔ تاہم وہ بہادر شاہ سے ملے۔ جہاد کا فتویٰ مرتب کرنے میں علماء کی مدد فرمائی۔ مناسب الفاظ میں انگریزی مظالم کی تنقیص فرماتے رہے۔ اسی کی پاداش میں مولانا پر مقدمہ بنایا گیا اور مولانا کو عمر قید بعبور دریائے شور دی گئی۔ مولانا کا انتقال جزیرۂ انڈیمان میں ہوا۔ مولانا کے صاحبزادے شمس العلماء مولوی عبدالحق صاحب مولانا کی رہائی کا حکم لے کر جب انڈیمان پہنچے تو ایک بہت بڑا جنازہ جا رہا تھا۔ جنازہ مولانا فضل حق خیر آبادی کا تھا جو ہمیشہ کے لیے انگریزی مظالم سے نجات حاصل کر کے جنت کے لیے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ حسنِ اتفاق

ملاحظہ ہو کہ بیٹا کس طرح والد کے جنازے میں شریک ہوا۔

مولانا کی آخری زندگی میں وہ تمام اختلافات رفع ہو چکے تھے جو ابتدا میں وجۂ نزاع بنے رہے۔ اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الجنة.

بدایوں اور دہلی کے بزرگ اس حادثے کے بعد قریباً خاموش ہوگئے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاموشی عرصہ تک جاری رہی۔ انگریز بہادر نے اپنے استحکام اور مظالم پوشی کے لیے جب ملک میں حزبی اختلافات پیدا کیے اور گروہ بندیوں اور باہم لڑانے کا سلسلہ جب شروع کیا تو ان حضرات کے قلم پھر حرکت میں آگئے اور اِکفار و تکفیر اور مسلمانوں کو باہم لڑانے میں انگریز کی جس قدر خدمت کر سکے کرتے رہے۔ كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ.[1] ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾[2] [الأحزاب: ٢٣]

مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادی نے ہنگامہ ۵۷ء میں پورا حصہ لیا۔ دہلی، کان پور، الٰہ آباد وغیرہ میں جہاں آزادی کی تحریک گئی مولانا نے اپنی بساط کے مطابق کام کیا۔ جہاد کے لیے اشتہار دیا جس میں مولانا خرم علی بلہوری کے رجزیہ اشعار مرقوم تھے جو مجاہدینِ سرحد کے عساکر اثنائے جنگ میں پڑھا کرتے تھے۔ (۱۸۵۷ء مصنفہ مولانا مہر)

اس سے ظاہر ہے کہ مولانا اس تحریکِ توحید سے متاثر تھے جو آزادیِ وطن کے لیے آج سے چھبیس سال پہلے شروع کی گئی۔ ناکامی کے باوجود جس کے اثرات سکھ اور انگریز کو برسوں تک متاثر کرتے رہے اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔ سکھ جس طرح مصائب میں مبتلا ہوا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے وہ شاید اپنی قومی زندگی کھودے گا۔ دائمی غلامی اس کی قسمت میں یقینی ہے۔ ﴿إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾[3] [آل عمران: ١١٢]

حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب:

حضرت شیخ الکل علمی آدمی تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ انتہائی دور اندیش تھے اور بالغ النظر مفکر۔

---

[1] ہر کوئی اپنے مقصدِ پیدائش کے لیے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٦٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٧)

[2] ترجمہ: ''پھر ان میں سے کوئی تو وہ ہے جو اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وہ ہے جو انتظار کر رہا ہے اور انھوں نے نہیں بدلا، کچھ بھی بدلنا۔''

[3] ترجمہ: ''مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ۔''

وہ ۵۷ء میں زندہ تھے۔ دہلی میں تشریف فرما تھے۔ آپ کا سپاہیوں کی طرح اس ہنگامے میں نام نہیں، نہ ان کے مقام اور رفعتِ شان کے لحاظ سے یہ مناسب تھا لیکن معلوم ہے کہ ان کی ہمدردیاں دین پسند طبقات کے ساتھ تھیں۔ وہ انقلاب کی بے عنوانیوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ وہ انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کو ناپسند فرماتے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ امر شرعاً ممنوع ہونے کے باوجود کسی نہ کسی وقت بدنامی اور ندامت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ ایسے ہنگامے میں جو انگریز عورتیں اور بچے پھاٹک حبش خاں میں پہنچے، حضرت نے ان کی پوری حفاظت فرمائی اور انھیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا حالانکہ ان ایام میں ایسا کرنا اپنی جان پر کھیلنے کے مترادف تھا۔ لیکن حضرت میاں صاحب نے ان کی پوری طرح حفاظت کی اور اس کے عوض ان سے ایک پائی تک وصول نہیں فرمائی۔ انگریز نے حضرت کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔ یہ انگریز کی پالیسی تھی لیکن میاں صاحب نے اس خطاب کا اپنے مکاتیب میں کہیں ذکر تک نہیں فرمایا۔

میاں صاحب دہلی میں حضرت شاہ اسحاق کی مسند پر تشریف فرما تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد کے تمام حوادث ان کی نظر میں تھے۔ انگریز کی عیاریاں قریباً معلوم تھیں۔ انگریز دشمنی گویا حضرت کو ورثے میں ملی تھی اور طبیعت میں سموئی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں یہ روح بدستور زندہ رہی۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، شاہ عبدالحق صاحب پھلواروی، حضرت مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی، حضرت مولانا ابراہیم صاحب آروی، پٹنہ اور مبارک پور کے علماء نے پوری زندگیاں انگریز کے خلاف وقف فرمائیں۔

مختلف راہ:

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد حضرات علمائے دیوبند نے بالکل دوسری راہ اختیار فرمائی۔ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ مظاہر العلوم سہارن پور میں جاری ہوا۔ سیاسیات میں کھلے طور پر کام کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ اس معاملے میں انگریزی حکومت کا احتساب روز بروز بڑھ رہا تھا۔

بریلوی اور بدایوانی خاندان نے انگریزوں کے ایما اور سہارے پر اپنے پرپرزے نکال لیے تھے۔ وہابیت کی تہمت محمد بن عبدالوہاب اور ان کے اَتباع کی کامیابیوں کی وجہ سے دو آتشہ ہو کر ہندوستان میں آچکی تھی۔ اکابر دیوبند اس تہمت کی زد سے بچنا چاہتے تھے۔ اس لیے اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ فقہی جمود کی پوری پوری حمایت کریں اور جو لوگ اس کی اصلاح چاہتے ہیں انھیں غیر مقلد یا شتر بے مہار

ایسے خطابات سے نوازیں اور سید احمد شہید کی تحریک سے کسی قدر علاحدگی اختیار فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے شروع ہو کر حضرات دیوبند میں اسی نہج سے عصبیت بڑھتی رہی اور اس میں شک نہیں کہ اہلِ حدیث حضرات کا پارہ بھی خاصا تیز رہا۔ جو لوگ علمی مسندوں پر کام کر رہے تھے یا تصنیف و تالیف کے شعبوں میں کام کر رہے تھے ان کے لہجے خاصے تلخ ہو گئے۔ شیخ الکل سید نذیر حسین کی معیار الحق کا لہجہ بالکل علمی اور معیاری تھا۔ اس میں قطعی تلخی نہ تھی۔ اس میں فقہی جمود کے خلاف قریباً وہی لب و لہجہ اختیار فرمایا گیا تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی اصلاحی تعلیمات کا منطقی نتیجہ ہونا چاہیے یا بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم فقہ جدید کی تدوین یا اس کے اندازِ بیان کی اصلاح سے تعبیر ہے۔

میاں صاحب کا اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ جمود کو توڑنا چاہتے ہیں۔ مسائل کی تحقیق میں ایک گونہ آزادی چاہتے ہیں۔ ائمہ کا احترام پوری طرح ان کو ملحوظ ہے۔ لیکن معیار الحق کے جواب میں حضرات علماء نے جو لہجہ اختیار فرمایا وہ یقیناً قابلِ شکایت حد تک تلخ ہے۔ اس دور کی کتابوں میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی کتاب ''ایضاح الادلہ'' خاصی تلخ اور تیز ہے۔ اور یہ جس کتاب کے جواب میں لکھی گئی غالباً وہ مولوی احسن امروہی نے قادیانی بپتسمہ لینے سے پہلے لکھی تھی۔ اس کا لب و لہجہ بھی کافی ناہموار اور قابلِ شکایت ہے۔[1]

تحریکِ جہاد کا مزاج:

سید احمد صاحب شہید کی تحریک میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور محدثین کرام دونوں مکاتبِ فکر کے آدمی موجود تھے لیکن فقہی جمود بالکل ناپید تھا۔ صراطِ مستقیم کے چار باب ہیں۔ یہ اصل میں سید احمد صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کے دو ابواب کا ترجمہ مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید نے کیا اور دو کا ترجمہ مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی نے فرمایا۔

[1] مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ (م ۱۹۲۰ء) نے دس سوالات پر مشتمل ایک اشتہار شائع کیا جس میں تقلید اور بعض دیگر مسائل کی بابت اربابِ تقلید سے استفسارات تھے اور جواب دینے پر انعام کا اعلان بھی کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں اصحابِ دیوبند نے ''اَدلہ کاملہ'' کے نام سے جواب رقم کیا جو بقول مولانا بٹالوی رحمہ اللہ مولانا قاسم نانوتوی کا تحریر کردہ تھا لیکن اسے مولانا محمود الحسن کی طرف منسوب کیا گیا۔ بعد ازیں ادلہ کاملہ کے جواب میں مولوی محمد احسن امروہی نے ''مصباح الاَدلہ'' کے نام سے کتاب لکھی جس کا مولانا محمود الحسن نے ''ایضاح الاَدلہ'' کے نام سے جواب دیا۔ اسی آخر الذکر کتاب میں ایک جگہ قرآنی آیت میں اضافے کا ارتکاب ہوا۔ دیکھیں: ایضاح الاَدلہ (ص: ۹۷)

اول الذکر اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے حامی تھے اور مولانا عبدالحی صاحب حنفی مکتبِ فکر کی حمایت فرماتے تھے۔ پوری زندگی میں باہم آویزش نہیں لیکن یہ جمود جس کی دعوت آج کل دی جا رہی ہے اور جس تعصب کا مظاہرہ اب کیا جا رہا ہے ان بزرگوں سے کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ سفرِ حج میں سید صاحب کے رفقاء نے جابجا اس وسعتِ ظرف کا اظہار فرمایا جس کا تذکرہ سید احمد صاحب کے سیرت نگاروں نے اکثر کیا ہے۔

چونکہ جماعت میں جمود نہ تھا اور وہ تقلید کے شکنجے کو اتنا نہیں کسنا چاہتے تھے جس کا مظاہرہ آج کل دیوبند کے بعض حلقوں میں کیا جا رہا ہے، اس لیے اکابر دیوبند قلبی تعلق کے باوجود تحریک سے کچھ دُور دُور رہنے لگے اور سیاسیات میں سرحد کے بجائے ترکی سے وابستگی بڑھنے لگی۔

اہلِ حدیث حضرات:

اس کے مرکز پر زیادہ اقتدار عظیم آبادی بزرگوں کا تھا۔ یہ حضرات اہلِ حدیث مکتبِ فکر کی طرف زیادہ مائل تھے۔ یہ اثر تحریکِ دہلی کے علاوہ تحریک میں یمن سے بھی آیا۔ سید صاحب کے بعض رفقاء حج سے فارغ ہو کر یمن چلے گئے۔ امام محمد بن علی شوکانی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ ان حضرات نے بھی جماعت کے مزاج کو متاثر کیا۔ قدرتی طور پر ہندوستان میں بھی جماعت کی اعانت کے متعلق جوہری تعلق اہلِ حدیث سے ہوتا گیا۔ چنانچہ انبالہ کیس کے بعد انگریزی حکومت نے ساری دار و گیر میں اہلِ حدیث ہی کو نشانہ بنایا۔

۱۹۱۵ء میں مولوی عبدالرحیم صاحب اور کچھ لڑکے کالج سے بھاگ کر سرحد پار چلے گئے۔ ان میں مولانا محمد علی قصوری بھی تھے۔ گرفتاریوں میں پورے علمائے اہلِ حدیث کی کھیپ حکومت کی زد میں آ گئی۔ میاں عبدالعزیز ان دنوں محکمہ سی آئی ڈی کے انچارج تھے۔ وہ خاندانی طور پر علمائے اہلِ حدیث کی ان مساعی کو جانتے تھے۔ وارنٹ جاری ہونے کو تھے کہ مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری وغیرہ علمائے اہلِ حدیث حکامِ بالا سے ملے۔ بمشکل یہ گرفتاریوں کی وبا ٹل سکی۔

حضرت میاں صاحب:

اس سے قبل انبالہ کیس میں حضرت میاں صاحب کو خواہ مخواہ دھر لیا گیا۔ حضرت میاں صاحب، میر عبدالغنی صاحب سورج گڑھی اور میاں عطا محمد صاحب تینوں حضرات ایک سال تک

راولپنڈی جیل میں رہے۔مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے میاں صاحب کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی۔کوئی ثبوت نہ ملنے پر سال کے بعد میاں صاحب کو رہا کر دیا گیا۔

ایک دفعہ مسٹر چیمبرلین نے حضرت میاں صاحب کو تحقیقات کے سلسلے میں پشاور طلب کیا۔ میاں صاحب پشاور پہنچے۔ چیمبرلین راولپنڈی آ گیا۔میاں صاحب راولپنڈی پہنچے تو چیمبرلین صاحب انبالہ آ گئے۔ چیمبرلین کا انتقال انبالہ میں ہوگیا۔میاں صاحب کے بیانات کسی قائم مقام نے راولپنڈی میں لیے۔بمشکل پیچھا چھوٹا۔

انبالہ کیس کے بعد:

انبالہ کیس کے بعد عظیم آبادی خاندان کے علاوہ یوپی، بنگال، بہار میں تحریک کے اکثر کارکن اہلِ حدیث تھے۔۱۹۲۱ء کے قاضی کوٹ بم کیس کے تمام ماخوذین اہلِ حدیث تھے۔

محترم بابو عبدالعزیز صاحب دفتر اکاؤنٹینٹ لاہور، مولوی الٰہی بخش صاحب بمبانوالہ، میاں محمد رمضان صاحب وزیر آبادی، مستری محمد ابراہیم صاحب نظام آبادی، قاضی عبدالرؤف صاحب قاضی کوٹ، قاضی عبیداللہ صاحب قاضی کوٹ، میاں محمد حسین صاحب کوٹ بھوانیداس (گوجرانوالہ) میاں خان محمد صاحب فیروز پوری مرحوم، مولانا فضل الٰہی صاحب وزیر آبادی انہی ایام میں یہاں سے مفرور ہوکر چمرقند چلے گئے۔ یہ سب حضرات اہلِ حدیث تھے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے متعلق اس گئے گزرے دور میں بھی سنتِ صحیحہ کے مطابق خدمت ان گنہگاروں نے کی جن کی تکفیر اور وہابیت کی منادیاں آج بھی ہو رہی ہیں۔توقع ہے کہ اپنے حسنِ عمل سے نہ سہی، ان حضرات کی طنز آمیز عنایات اور توہب و تکفیر کے فتوے ہی شاید نجات کا ذریعہ ہوجائیں ؎

أَجِدُ الْمَلَامَةَ فِيْ هَوَاكِ لَذِيْذَةً حُبًّا لِذِكْرِكِ فَلْيَلُمْنِي اللَّوْمُ[1]

پاکستان بن جانے کے بعد:

آج جبکہ پاکستان بن چکا، انگریز بظاہر چلا گیا، ہندو اور سکھ بھی چلے گئے، ایک عامی ذہن محسوس کرتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔لیکن ذرا غور سے آپ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کافر کے چلے جانے سے کفر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بے حیائی، بدمعاملگی، عیاشی، بدکاری انگریزی دور

[1] تیرے عشق میں مجھے ملامت لذیذ محسوس ہوتی ہے۔تیری یاد کی محبت میں مجھے کمینگی بھی ملامت کرے تو کر لے۔

سے زیادہ مضبوط ہے اور تقویٰ، خدا ترسی آج بھی یتیم ہے۔ اس کی مسکنت اور غربت آج بھی کسی ایسے سید احمد اور کسی اسماعیل کی منتظر ہے۔ آج کی دنیا بھی گوش برآواز ہے کوئی ولی اللہ اور کوئی شاہ عبدالعزیز پیدا ہو۔

یہ داعیہ روز بروز بڑھ رہا ہے کہ تجدیدِ دین کے لیے پھر کوئی مجدد الفِ ثانی میدان میں آئے۔ شرک و بدعت کا شیوع، تشیع اور قادیانیت کی طغیانیاں آج کسی حریف اور رقیب کے لیے چشم براہ ہیں۔ حق و صداقت کے داعی اور طلب گار دست بدعا ہیں کہ طاغوتی طاقتوں سے دو ہاتھ کرنے کے لیے پھر کوئی بالاکوٹ بنایا جائے۔ دریائے سندھ کی لہریں خونی شہادت سے پھر غسل کریں۔ مجاہدین کی لاشیں اٹک کی لہروں پر پھر سوار ہوں۔ آسمان کے قدوسی فرشتے پھر صف بہ صف اسی نظارے کو دیکھنے کے لیے زمین پر اتریں اور امتِ محمدیہ کے پرشکوہ نوجوانوں کی خاک آلود پیشانیاں آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھیں اور کفرستانِ ہند آسمان کے پاکبازوں سے پھر آشنائی پیدا کریں اور خدائے قدوس پھر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ آسمانِ دنیا سے پھر آواز آئے: ((هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ؟)) [1]

بجرم عشق تو ام می کشند وغوغائیست تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست [2]

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۲۴ رمئی ۱۹۵۷ء)

---

[1] کیا کوئی معافی کا خواستگار ہے کہ میں اسے معاف کروں۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۵۸)

[2] تیرے عشق کا جرم مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔ تم بھی بر سر بام خوش تماشا ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اہلِ حدیث
اور
''نوائے پاکستان'' کا ایک خط

''نوائے پاکستان'' (مورخہ یکم ستمبر ۱۹۵۷ء) میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ غلط تحریکات کی فہرست میں مولانا نے جماعت اہلِ حدیث کا تذکرہ فرمایا۔ مرحوم زندہ ہوتے تو شاید ہماری گزارشات کا لہجہ آج سے کسی قدر مختلف ہوتا مگر اب مولانا اُس دنیا میں چلے گئے ہیں جہاں ان کے لیے دعائے مغفرت کے علاوہ کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا، اس لیے ہم اس کے سوا ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے، البتہ جماعت اہلِ حدیث یا تحریک اہلِ حدیث کے متعلق عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ مولانا کے خط سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں ان سے ذہن محفوظ رہیں۔

مولانا کے خط سے مندرجہ ذیل اغلاط پیدا ہوسکتی ہیں:

١ تحریک اہلِ حدیث مدراس سے شروع ہوئی۔

٢ سید احمد شہید رحمہ اللہ، شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی تحریک وہابی تحریک تھی۔

٣ بعض غلط تحریکوں میں اہلِ حدیث زیادہ شامل ہوئے۔

٤ سیاست میں اہلِ حدیث انگریز کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

٥ کانگرس میں اشتراک کے لیے مولانا کے دادا نے فتویٰ دیا۔ اہلِ حدیث نے اس کی تصدیق نہیں کی۔

٦ بریلویوں نے اس فتوے کی تصدیق کی، اہلِ حدیث نے نہیں کی۔

ذیل کی گزارشات ان مغالطات کی اصلاح کے لیے پیش کی جا رہی ہیں۔

کیا اہلِ حدیث مکتبِ فکر مدراس سے شروع ہوا؟

اہلِ حدیث مکتبِ فکر کا تعلق مدراس یا کسی دوسرے ملک سے نہیں۔ یہ مکتبِ فکر اتنا قدیم ہے جس قدر متعارف ائمہ مجتہدین کے مکاتب، بلکہ اتنا فرید تقدم جس قدر کہ قرآنِ عزیز اور احادیثِ نبویہ کو ائمہ مجتہدین سے حاصل ہے۔ اگر اس نام کی کوئی تحریک مدراس سے شروع ہوئی ہو تو مولانا مرحوم واقف ہوں گے۔ ہم لوگ باوجود اہلِ حدیث ہونے کے مدراسی تحریک سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ اگر یہ فقرہ از قسم طنز ہے، جیسا کہ مرحوم اور ان کے خاندان کی عادت ہے، تو اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔ وہ ایسی دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں انھیں عفو کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اہلِ حدیث اور اہل الرائے:

ابن خلدون فرماتے ہیں:

”وَانْقَسَمَ الْفِقْهُ فِيهِمْ إِلٰى طَرِيقَيْنِ: طَرِيقَةِ أَهْلِ الرَّأْيِ وَالْقِيَاسِ، وَهُمْ أَهْلُ الْعِرَاقِ، وَطَرِيقَةِ أَهْلِ الْحَدِيثِ، وَهُمْ أَهْلُ الْحِجَازِ“

(مقدمہ ابن خلدون، ص: ۳۸۹)

”فقہ کے دو طریق ہوگئے: اہلِ عراق کا طریق جو اہل الرأی والقیاس کے نام سے مشہور تھے اور اہلِ حدیث کا طریق جن کا مرکز حجاز تھا۔“

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ جلد اول کے متعدد اوراق میں ان دونوں مکاتبِ فکر کا تذکرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ (۱/ ۱۱۸) ایک باب کا عنوان یہ ہے:

”باب الفرق بين أهل الحديث وأهل الرأي“

اس کی تفصیلات (۱/ ۱۲۹) تک چلی گئی ہیں۔

امام عبدالعزیز بن احمد بخاری (م ۷۳۰ھ) شارح اصولِ بزدوی ”کشف الاسرار شرح اصولِ بزدوی“ میں اہلِ حدیث کا تذکرہ بار بار فرماتے ہیں۔ فتح الباری، نووی شرح مسلم، غایۃ التحقیق شرح حسامی وغیرہ کتبِ شروح میں یہ تذکرہ آپ کو عام طور پر ملے گا۔[1] وہ باقی مکاتبِ فکر کے ساتھ اہلِ سنت کے اس مکتبِ فکر کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔

[1] اس کی تفصیل گذشتہ صفحات (۱۶۲، ۱۶۸) میں گزر چکی ہے۔

علمائے مقالات میں سے شہرستانی اور ابن حزم نے بھی یہ تذکرہ فرمایا ہے۔ حضرت امام ابومنصور عبدالقاہر بغدادی (۴۲۹ء) نے ''اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْفِرَقِ'' میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث کے دونوں مکاتبِ فکر کو ''أهل السنة والجماعة'' کے مکتبِ فکر سے تعبیر فرمایا ہے:

''وَالصِّنْفُ الثَّانِيْ مِنْهُمْ أَئِمَّةُ الْفِقْهِ مِنْ فَرِيْقَي الرَّأْيِ وَالْحَدِيْثِ مِنَ الَّذِيْنَ اعْتَقَدُوْا فِيْ أُصُوْلِ الدِّيْنِ مَذْهَبَ الصِّفَاتِ'' (ص: ۱۰۰)

''دوسری قسم وہ ائمہ فقہ ہیں جن کا تعلق اہل الرائے سے ہے یا اہلِ حدیث جن کا مسلک اصولِ دین میں صفات پر بلا تاویل ایمان لانے کا ہے۔''

مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے اس انکشاف کو کہ یہ تحریک مدراس سے شروع ہوئی ''الہامی'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ واقعات سے تو اس کی تائید مشکل ہے۔ بعض اہلِ علم میں یہ مرض ہے کہ وہ حقیقتِ حال کا اظہار فرماتے ہوئے بسا اوقات حقائق پر کثیر پردے ڈال دیتے ہیں۔ ہر مکتبِ فکر میں کم و بیش یہ مرض پایا جاتا ہے۔ إِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ. مولانا کے اس انکشاف کو مسامحت ہی کہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے!

وہابی تحریک:

مولانا موصوف نے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کو وہابی تحریک سے تعبیر فرمایا ہے۔ انگریز نے واقعی اپنی مصالح کے پیشِ نظر اس تحریک کو بدنام کرنے کے لیے وہابی تحریک کہا ہے مگر یہ حقائق اور واقعات کے لحاظ سے قطعی جھوٹ ہے اور دجل۔ میں یہ یقین نہیں کرتا کہ مولانا ایسا فرنگی دشمن انسان اس جھوٹ اور دجل کو نقل کے طور پر بھی قبول کر لے۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، شہیدین کی تحریک کو محمد بن عبدالوہاب کی نجدی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ سید صاحب رحمہ اللہ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ جب حج کے لیے تشریف لے گئے، اہلِ نجد کی آمد و رفت حجاز میں بالکل بند تھی۔ تاریخی طور پر کوئی وقت ایسا معلوم نہیں ہوتا جس میں ان دونوں تحریکوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہو، البتہ مولانا ولایت علی اور مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی کا امام شوکانی سے استفادہ ثابت ہوتا ہے جو اس وقت یمن کے بہت بڑے محقق عالم تھے لیکن سیاستاً یمن بھی ان دنوں نجد سے برسرِ پیکار تھا۔ یمن کی زیدی حکومت کو نجدی مسلمان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے قربِ مکان کے باوجود ممکن

نہیں کہ یہ حضرات اثنائے تلمذ میں نجدی عقائد یا سیاسیات سے کوئی اثر لے سکے ہوں، البتہ توحید اور اس کی اشاعت میں یہ دونوں تحریکیں دوش بدوش ہیں، کیوں کہ تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید دونوں کا ماخذ قرآن ہے اور سنتِ صحیحہ۔ اس لیے ہندوستان کے اہلِ توحید کو وہابی کہنا اتنا ہی بے محل ہے جیسے سرورِ عالم ﷺ کو ابن ابی کبشہ[1] !!

متحدہ ہندوستان کی تحریکِ جہاد کو وہابی تحریک سے تعبیر کرنا اسی پس منظر کا نتیجہ ہے جو مولانا کے ذہن کو کبھی کبھی گدگداتی رہتی تھی۔ عفا اللّٰہ عنه!

اہلِ حدیث اور انگریز:

یہ حقیقت ہے کہ مئی ۱۸۳۱ء کے سانحۂ بالاکوٹ تک سید احمد شہید رحمہ اللہ کے رفقاء میں دونوں مکاتبِ فکر کے آدمی موجود تھے۔ سرحد کی مصالح کی بنا پر لشکر کے لوگ ظاہری سنن پر عمل نہیں کرتے تھے لیکن جن لوگوں نے تقویۃ الایمان، تذکیر الاخوان، صراط مستقیم، تنویر العینین، ایضاح الحق الصریح وغیرہ جماعت کے لٹریچر کو بغور پڑھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ تحریک کا رخ کس طرف تھا۔ وہ لوگ جہاں ظاہری بدعات کے خلاف تھے فقہی جمود کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ شہیدین کی قوتِ قدسی تھی کہ لشکر میں دونوں مکاتبِ فکر میں نمایاں طور پر کبھی تصادم نہیں ہوا لیکن سانحہ بالاکوٹ کے بعد ہو سکتا ہے کہ حضرات دیوبند کی دلی ہمدردیاں تحریک کے ساتھ ہوں مگر عملی طور پر ذمے داریوں سے قریباً الگ ہی رہے۔ تحریک کی تنظیمِ جدید میں صادقپوری خاندان آگے آ گیا۔ یہ لوگ اہلِ حدیث مکتبِ فکر سے کافی متاثر تھے۔ اکابر دیوبند اس وقت تحریک سے بے امید ہو کر تعلیم میں مشغول ہو چکے تھے۔ اس میں انھیں یہ بھی تسکین تھی کہ وہ اس طرح حنفی مکتبِ فکر کی بھی خدمت کر سکیں گے اور انھیں اس پریشانی سے بھی آرام مل سکے گا جو جہاد اور اس کے اسباب کی فراہمی میں ناگزیر ہے، لیکن صادق پوری حضرات نے تحریکِ حریت کی ساری ذمے داریاں اپنے سر لے لیں۔ جب تک کام کھلے طور پر چل سکا چلتا رہا۔

[1] قریشِ مکہ نبی کریم ﷺ کو استخفاف کے پیشِ نظر ابو کبشہ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: ۷، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۷۷۳) ابو کبشہ کون تھا؟ اس بارے میں علمائے انساب کی مختلف آراء ہیں۔ بیشتر شارحین اسے نبی اکرم ﷺ کے اجداد میں سے کوئی غیر معروف شخص قرار دیتے ہیں۔ اہلِ عرب کی عادت تھی کہ جب وہ کسی شخص کی اہانت کا ارادہ کرتے تو اسے غیر معروف نسب کے ساتھ ذکر کر دیتے۔ دیکھیں: فتح الباري (۱/ ۴۰) شرح صحیح مسلم للنووي (۱۲/ ۱۱۰)

جب اِخفا کے سوا چارہ نہ رہا تو کام مخفی کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ سے اس تحریک کے مختلف ادوار کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں ہر دو مکتبِ فکر کے آدمی موجود تھے لیکن ذمے داری اربابِ صادق پور پر تھی۔ یہی لوگ اس وقت پوری تحریک کی روحِ رواں تھے۔

عراقی مکتبِ فکر کے اساطین تحریک سے روز بروز الگ ہو رہے تھے اور دُور سے دور تر ہوتے گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی مرحوم، مولانا رشید احمد مرحوم انگریز کے مخالف تھے مگر عملاً تحریک میں کوئی نمایاں حصہ ان کا دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمود الحسن مرحوم نے ۱۹۱۴ء کی بڑی جنگ میں جب ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تو جماعت مجاہدین کے بجائے ترکی سے تعلقات استوار کیے اور ریشمی خطوط کے افسانے نے انگریز مصنفین اور یورپین سیاستدانوں میں بے حد شہرت پائی۔ رولٹ کی تحقیقاتی رپورٹ میں خاص طور پر اس کا تذکرہ آیا، حالانکہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن جو کام کرنا چاہتے تھے سرحد اس کے لیے زیادہ ساز گار میدان تھا لیکن یہ سابقہ تحریک سے بالکل الگ ایک نئی تحریک تھی جس کے اسباب و دواعی کی پوری تفصیل مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ یا مولانا حسن احمد ہی کو معلوم ہو سکتی ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ یہ مسئلہ سابقہ تحریک سے بالکل الگ تھا اور طریقِ کار بھی بالکل مختلف۔

حضرات اہلِ حدیث:

اس وقت ملک میں مختلف محاذ بن گئے۔ مسیحی اور سماجی تحریکیں ملک میں شروع ہوگئیں۔ تھوڑی دیر بعد قادیانی اور چکڑالوی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی۔ ایک زندہ جماعت کے لیے کسی محاذ سے صرفِ نظر مشکل تھا۔ حضرات دیوبند کا لب و لہجہ بھی اہلِ حدیث تحریک کے متعلق خاصا تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ عراقی مکتبِ فکر کے مدارس نے یہ احساس بھی پیدا کر دیا تھا کہ تعلیمی اور تعمیری کام کے سوا بھی جماعت کا قیام اور استحکام مشکل ہے۔ سر سید احمد خاں کی نیچر نوازی اور حکومت پرستی نے ایک نئی صورتِ حال کو نمایاں کر دیا تھا۔ سر سید کے اس نئے اندازِ فکر سے اہلِ حدیث کے عقائد اور اعمال سے براہِ راست تصادم تھا جسے اہلِ حدیث کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ سر سید کے بعض اعمال اور افکار سے تحریک کو بالواسطہ کچھ فائدہ پہنچا، کیوں کہ سر سید کے مقاصد کے لیے دیوبند اور بریلی کے فقہی جمود یکساں مضر تھے۔ سر سید نے اس راہ میں جو کام کیا اس سے بالواسطہ تحریکِ حریتِ فکر کو فائدہ پہنچا جسے مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایسے ظاہر بین اور جماعت کی نقل و حرکت سے بے خبر حضرات نے انگریز کے ساتھ تعاون سے تعبیر فرمایا۔ وَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا!

قدرتی تقسیم:

میری معلومات کے مطابق اکابر جماعت اتفاقاً ایسی راہ پر چل پڑے جسے تقسیمِ کار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب (پشاور) حضرت مولانا عبدالجبار صاحب عمر پوری، مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، حضرت مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی تعلیم کے میدان میں آ گئے۔ قلتِ وسائل کے باوجود ان حضرات نے اتنا کام کیا جس پر حیرت ہوتی ہے۔ ہر طرح دنیوی وسائل سے بے نیاز ہو کر ان بزرگوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں اہلِ علم ان سے مستفید ہوئے۔ اس وقت تک ان مدارس کے فضلاء کی ایک بہت بڑی تعداد ملک کے اطراف و اکناف میں تعلیم و تعلم کے ذریعے سے علومِ دین اور مسلک کی خدمت کرتی رہی ہے۔

تصنیف و تالیف:

حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خاں صاحب رحمہ اللہ، مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی، مولانا ابوالحسن سیالکوٹی (صاحبِ فیض الباری شرح اردو صحیح بخاری) مولانا شمس الحق صاحب، مولا تلطف حسین صاحب عظیم آبادی، نواب وحید الزمان مرحوم، مولانا عبدالرحمان صاحب مبارکپوری، حضرت مولانا غلام حسن صاحب سیالکوٹی، مولانا محمد غزنوی، مولانا عبدالاول غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، شیخ محی الدین مرحوم، قاضی سلیمان صاحب پٹیالوی، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا محمد حسین بٹالوی نے تالیف و تصنیف اور طبع و اشاعت کا کام سنبھال لیا اور لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا لٹریچر شائع کر دیا۔ ان حضرات کی مساعی سے بہت بڑا خلا پُر ہوگیا۔ حدیث، شروح و تراجمِ حدیث اور سلفی مکتبِ فکر کی بہت سی کتب ہندوستان میں آ گئیں۔ فتح الباری، حجۃ اللہ، سبل السلام، نیل الاوطار، ازالۃ الخفا ایسے نایاب جواہر ان حضرات کی مساعی سے دستیاب ہوئے۔

جہادِ اسلامی:

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا سعید الحق، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، مولانا حافظ

عبداللہ غازی پوری، حضرت مولانا عبدالقادر قصوری، حضرت مولانا عبدالاول غزنوی، امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی صاحب وزیر آبادی، مولانا عبدالرحیم عرف مولانا محمد بشیر، مولانا اکبر شاہ ستھانوی، صوفی ولی محمد فتوحی والا، صادق پوری حضرات نے سید شہید کے مشن کو کامیاب بنانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی اور اس نظم سے کام کیا کہ پون صدی تک انگریز کو پریشان کر دیا۔ کوہستان کی برفانی پہاڑیاں انگریز کے لیے جہنم سے کم نہ تھیں۔ معمولی سی دانشمندانہ حرکت سے یہ حضرات انگریز کے خزانے خالی کر دیتے تھے۔

حضرات دیوبند کا طرزِ عمل:

اس دور میں انگریز کے ساتھ دشمنی کی حد تک حضرات دیوبند اسی تحریک کے ساتھ تھے مگر عملی مساعی کی حد تک ان حضرات نے اس نہج پر کچھ نمایاں کام نہیں کیا۔ اس تلخ نوائی سے معاف کیا جائے کہ کتاب ”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ تاریخ پر ایک ظلم ہے، جس میں یا تو علمائے اہلِ حدیث کا نام ہی نہیں لیا گیا اور اگر کہیں لینا پڑا ہے تو اس پر اتنا کثیف پردہ چڑھایا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ صاحبِ واقعہ کا مسلک کیا تھا بلکہ یہ کوشش فرمائی گئی ہے کہ ہر تحریک حضرات علمائے دیوبند کا ضمیمہ قرار پائے، حالانکہ اکثر تحریکِ دیوبند کے سوا تمام سیاسی تحریکات میں حضرات اکابر دیوبند ضمیمہ کی حیثیت سے رہے۔ یہی حال ہمارے محترم بزرگ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی ”حقیقتِ حال“ کا ہے جسے انھوں نے ڈر کر لکھا ہے۔ اگر نڈر ہو کر لکھتے تو ہم پر کیا کرم فرماتے؟ ع

خدانخواستہ گر خشمگیں ہوتے تو کیا ہوتے!

حال کی سیاسی تحریکات:

اہلِ حدیث کی ہندوستانی نشأت میں انگریز کی مخالفت ان کی تحریک کا جزو تھا، اس لیے اس کے علاوہ بھی جو تحریک اس بنیاد پر اٹھی یا جب وہ اس مقام پر پہنچی اہلِ حدیث اپنی پوری قوت کے ساتھ اس میں موجود تھے۔ کانگرس، خلافت، احرار کون سی قومی یا دینی تحریک تھی جس میں اہلِ حدیث نے جاں نثارانہ کام نہیں کیا؟ آپ کے دوش بدوش نہیں چلے؟ دہلی میں حاجی علی جان کی کوٹھی کیا ان سیاسی دیوانوں کا مرکز نہ تھی؟ پنجاب میں سیدی العلام مولانا عبدالقادر قصوری کی قیادت میں کیا کانگرس اور خلافت کا کام نہیں ہوا؟ مولانا محمد علی قصوری مرحوم کی تبلیغی اور سیاسی مساعی نظر انداز کرنا کہاں تک ممکن ہے؟ احرار کے اسٹیج پر مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولوی عبیداللہ احرار فیروز پوری، شیخ

عبدالرشید صدیقی ایسے مخلص کارکنوں کو کوئی بھول سکتا ہے؟ آج کی بدنام مسلم لیگ نے جب انگریز کی مخالفت کا مصنوعی مظاہرہ کیا اہلِ حدیث اس کی پہلی صفوں میں موجود تھے۔

انگریز کا ساتھ؟

''وہ لوگ انگریز کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔'' یہ کس قدر بدبو دار طعن ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی طرف منسوب ہے۔ کاش قلم کی آنکھیں ہوتیں تو وہ حیا سے عرقِ انفعال میں ڈوب جاتا۔ بالاکوٹ کے بعد کون نہیں جانتا کہ سید شہید کے خلفاء کی ٹکر براہ راست انگریز سے رہی۔ انبالہ کیس ۱۸۶۴ء میں کیا اہلِ حدیث پھانسیوں پر نہ لٹکے؟ عبور دریائے شور کی سزائیں ان کو نہ ملیں؟ کیا یہ انگریز کے ساتھ رہنے کی سزا تھی؟ قلبِ حقائق کی کیا یہ بدترین صورت نہیں جو مولانا موصوف کی طرف منسوب ہے؟ اگر درست ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔

تابوت میں آخری میخ:

انگریز کے تابوت میں آخری میخ ۱۹۲۱ء میں قاضی کوٹ بم کیس ہے۔ اس میں متہم، ماخوذ، سزا یافتہ تمام کے تمام اہلِ حدیث تھے۔ قاضی عبدالرؤف، قاضی عبیداللہ اور محمد حسین مرحوم، مولانا فضل الٰہی، مستری محمد ابراہیم صاحب، بہادر خاں مرحوم یہ سب اہلِ حدیث تھے جن کو ۲۱، ۱۴ اور ۷ سال سزائیں ہوئیں۔ ۱۹۲۱ء کے بعد انگریز کے پاؤں اکھڑنے شروع ہوئے تاآنکہ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو یہ نحوست بظاہر ہمیشہ کے لیے اس ملک سے رخصت ہوگئی۔ معلوم نہیں مولانا موصوف کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہوئی کہ ''اہلِ حدیث انگریز کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔'' غالباً ان دنوں کسی اہلِ حدیث احراری دوست کی علاحدگی کے رنج میں یہ فقرے نوکِ قلم پر آگئے ورنہ مولانا ایسے حقیقت آگاہ سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اتنی بڑی غلط بیانی کریں۔ اللهم اغفرله واعف عنه وتجاوز عن سيآته.

مولانا بٹالوی رحمہ اللہ:

اہلِ حدیث کی طرف سے انگریز کی حمایت میں اگر کوئی قابلِ ذکر آواز اٹھی تو وہ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی تھے۔ یقیناً مولانا اس رائے میں اکیلے تھے۔ یہ ان کی شخصی رائے تھی۔ پورے ملک میں کوئی قابلِ ذکر اہلِ حدیث اس نظریے میں ان کے ساتھ نہ تھا بلکہ عین اس وقت جبکہ مولانا اپنے رسالے

میں انگریز کی حمایت فرما رہے تھے، ہندوستان اور پنجاب میں اکابر جماعت سید احمد شہید کی تحریک کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ کیا کسی غزنوی اور لکھوی خاندان یا صادقپوری اور رحیم آبادی اور قصوری اکابر نے مولانا بٹالوی کی کبھی حمایت فرمائی؟ اسے جماعتی فعل تصور کرنا واقعات پر ظلم ہے۔

مولانا بٹالوی کا دور اور لدھیانوی بزرگوں کی نوازشیں!

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مسلک اہلِ حدیث کی مخالفت میں حضرات دیوبند بھی بریلی کی سڑک پر سوار ہو چکے تھے۔ لدھیانہ میں مولانا حبیب الرحمان کے خاندان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ جب مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے ان کی مسجد میں نماز پڑھی تو مسجد کو پورے اہتمام سے دھویا گیا۔ اس واقعے کی عینی شہادت آج بھی مل سکتی ہے۔ مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی امید ہے اس شہادتِ حق سے گریز نہیں فرمائیں گے۔ انتظام المساجد[1] کے نام سے مولوی محمد صاحب نے بڑی ہی ذلیل کتاب

[1] اس رسالے کا پورا نام اس طرح تھا: ''انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد'' اس رسالے کو مولوی محمد صاحب ولد مولوی عبدالقادر صاحب لدھیانوی مصنف ''نصرۃ الابرار'' ہی نے ۱۸۸۳ء کے لگ بھگ تصنیف فرمایا تھا۔ اس رسالے کا موضوع کیا تھا؟ کس غرض کے لیے لکھا گیا؟ اس کی اشاعت کے نتائج کیا نکلے؟ اس کے لیے ماہنامہ اشاعۃ السنۃ لاہور کے چند اقتباسات پیش کرنا شاید بصیرت و عبرت کا موجب ہوگا۔

''تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ لدھیانہ کے مولوی صاحب نے صوبہ بہار میں پہنچ کر اہل حدیث کو مسجدوں سے نکالنے میں بہت زور لگایا اور اس مضمون کا ایک رسالہ، جس کا نام نامی ''انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد'' ہے، شہر پٹنہ عظیم آباد میں چھپوا کر مشتہر کیا۔ اس میں آپ نے اہلِ حدیث کو قتل کر ڈالنے کا فتویٰ دیا ہے جس کا اثر تھوڑے دنوں کے بعد اس نواح میں یہ پیدا ہوا کہ ضلع شاہ آباد میں اہلِ حدیث و حنفیہ میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے پر لڑائی ہوئی۔ اس رسالے میں مولوی صاحب موصوف نے اہلِ حدیث کو مسجد سے خارج کرنے پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ لوگ مشرک ہیں۔''

(اشاعۃ السنۃ، ص: ۲۴۷ نمبر: ۸، جلد: ۶، ستمبر ۱۸۸۳ء)

''لدھیانہ والے مولویوں نے اہل حدیث کی نسبت واجب القتل ہونے کا صاف فتویٰ دیا ہے، چنانچہ رسالہ ''انتظام المساجد'' میں لکھ دیا ہے کہ ''حکام اہلِ اسلام کو لازم ہے کہ ان کو قتل کریں۔ اگر وہ لاعلمی کے عذر سے توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہ کریں۔'' اس رسالے کا مؤلف مولوی محمد پسر مولوی عبدالقادر لدھیانوی ہے۔''

(اشاعۃ السنۃ، ص: ۲۹۱، نمبر: ۱۰، جلد: ۶)

غور کیجیے: یہاں چار امر قابلِ ذکر ہیں:

① یہ وہ زمانہ ہے جس میں سرحد پر اہلِ حدیث مجاہدین انگریز سے جہاد کرنے میں مصروف تھے اور اندرونِ ملک ←

لکھی۔ اگر مولانا کے آباء و اجداد واقعی دیوبندی تھے تو فرمایا جائے کہ ایسے بے وفا دوستوں کے ساتھ کوئی سنجیدہ آدمی کیسے چل سکتا ہے۔ مولانا کے خاندان کی عصبیت کا یہ حال ہو اور مولانا بٹالوی ''نصرۃ الابرار'' پر دستخط فرما دیں۔ کس قدر سادگی ہے۔ ہندوؤں کو ابرار سمجھیں اور سنت پر عمل کی سزا میں مسجد دھو دی جائے۔

أَوْرَدَهَا سَعْدٌ وَسَعْدٌ مُشْتَغِلٌ مَا هٰكَذَا يَا سَعْدُ تُوْرَدُ الْإِبِلُ[1]

مولانا اور ان کے ہم خیال ہمیں غالباً خلوص اور اصول پروری کا وعظ فرمائیں گے، مگر نفسیات کا کیا کیا جائے کہ مولانا محمد حسین مرحوم انسان تھے، فرشتے نہیں تھے۔ ان کی نماز سے لدھیانہ کی مسجد پلید ہو، مولانا کے دادا اہلِ حدیث کو مساجد سے نکال دینے کا فتویٰ دیں، مولانا محمد پھر ''نصرة الأبرار'' پر دستخط کرائیں، ٹھیک انہی ایام میں شیخ الکل حضرت سید نذیر حسین صاحب دہلوی سفرِ حج کے لیے تشریف لے گئے تو حضرات اکابر دیوبند کے گلِ سرسبد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے حضرت ممدوح کو گرفتار کرانے میں جو کوششیں کیں ان کا تفصیلی تذکرہ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم نے ''اشاعۃ السنۃ'' میں فرمایا ہے۔ حضرات اکابر دیوبند کے ذہن کی اس تبدیلی سے مولانا بٹالوی بے خبر نہ تھے۔ ان غیر متوقع بلکہ خلافِ توقع حوادث کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مغفور اور ان کے ہم خیال جو بھی فرمائیں وہ مختار ہیں مگر ایک حساس اور غیرت مند انسان جو نفسیات کو سمجھتا ہے، وہ مولانا بٹالوی کو معذور سمجھے گا۔ ایسے وقت میں اتفاقی امور میں بھی اشتراک سے گھبرانا بالکل قدرتی چیز ہے۔

کانگرس میں اشتراک:

کانگرس بھی اس وقت آج کی کانگرس نہ تھی، نہ انگریز کے ساتھ لڑنا اس کے پروگرام کا لازمی

← سے جماعت اہلِ حدیث ہی حالات کے مطابق اپنے خاص طریقوں سے ان کو امداد پہنچا رہی تھی۔

② بہت سے اہلِ حدیث مجاہدین انبالہ کیس کے سلسلے میں جزائر انڈیمان میں قید تھے۔

③ مجاہدین صادق پور کے بقیۃ السیف مولانا عبدالرحیم صادق پوری رحمہ اللہ قریباً بیس سالہ قید سے رہا ہو کر کالا پانی سے واپس آئے، درآں حالیکہ سر پر انگریزی نگرانی کی تلوار لٹک رہی تھی جو پورے سات برس تک رہی۔

④ ایسے مناسب وقت میں ان لدھیانوی مولوی صاحب نے سفر کی کیفیتیں برداشت کر کے عظیم آباد (جس کا ایک محلہ صادق پور ہے) کو منتخب فرمایا کہ اس اعلیٰ شاہکار لٹریچر کو وہاں پھیلایا جائے!

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے! (مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ)

[1] سعد اونٹوں کو پانی پلانے لایا اور وہ غافل ہو گیا۔ اس طرح تو اونٹوں کو پانی نہیں پلایا جاتا اے سعد!

جزو تھا مگر جب وہ انگریز کی مخالفت کے لیے مستعد ہوئی تو اہلِ حدیث نے اس میں ہر ممکن اشتراک کیا۔ مولانا ابو القاسم بنارسی مرحوم، مولانا عبدالوہاب صاحب آروی، حاجی محمد صالح صاحب کوٹھی علی جان، مولانا عبدالقادر صاحب قصوری، مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب غزنوی، مولانا سید عبدالغفار صاحب رحمہ اللہ غزنوی، مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ صاحب مرحوم، خود راقم الحروف نے اپنی بساط کے مطابق سالہا سال کانگرس میں کام کیا۔

بلکہ ایک وقت آیا کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب کانگرس قیادت سے بدگمان ہوکر کانگرس سے نکل گئے اور مجلسِ احرار کی بنیاد ڈالی۔ برسوں کانگرس کے خلاف حرفِ شکایت بنے رہے۔ مسلمانوں سے پوری ایک کارکن پارٹی مرحوم چوہدری افضل حق کی راہنمائی میں کانگرس سے باہر کام کرتی رہی۔ کشمیر کی تحریک احرار کے ان دنوں کا شاہکار ہے۔ اگر شکایتاً یا کسی مقصد کے لیے کانگرس سے باہر رہنا جرم ہے تو مولانا نے اپنے رفقاء سمیت برسوں اُس جرم کا ارتکاب فرمایا اور اپنے دادا مولانا محمد مرحوم کے فتوے کے خلاف عمل کیا۔

ایک اور چیز ''ڈرڈر کے کہہ رہا ہوں'' مگر کیا کروں حقیقت یہی ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کانگرس میں چنداں نیک نام نہیں تھے۔ جس قسم کی شکایات مرحوم کے خلاف کانگرس سٹیج اور پبلک میں آئیں، بحمداللہ اہلِ حدیث کا دامن ان آلودگیوں سے پاک رہا۔ مولانا عبدالقادر قصوری رحمہ اللہ کی سیاسی خدمات سے کون بے خبر ہے مگر خوبی یہ ہے کہ کانگرس سے کبھی ممنون نہیں ہوئے۔ ایک پائی تک کے لیے متہم نہیں ہوئے۔ کانگرس کے ساتھ اکابر اہلِ حدیث کی وابستگی مولانا حبیب الرحمان صاحب اور ان کے بعض رفقاء کی وابستگی سے بہر حال بہتر ہی رہی۔ اس لحاظ سے بھی مولانا کی تہمت کے لیے کوئی بنیاد نہیں۔

مولانا نے اپنے ارشاد میں ''بطور جماعت'' کی قید لگائی ہے۔ اگر یہ قید اتفاقی ہے تو خیر۔ اگر احترازی ہے تو ادباً گزارش ہے کہ آج تک کوئی دینی جماعت بحیثیتِ جماعت کانگرس میں شامل نہیں ہوئی۔ نہ کانگرس نے کسی جماعت کو بلحاظ جماعت اندر آنے کی اجازت دی۔ اور محترم مرحوم کا تو یہ حال ہے کہ جب وہ ''بحیثیتِ جماعت'' بنے تو فوراً کانگرس سے باہر آگئے اور اپنی اسٹیج بنالی۔ اور جب رفقاء سے کشمکش ہوئی تو بحیثیت ''حبیب الرحمٰن'' کانگرس میں تشریف لے گئے۔ اہلِ حدیث کو ایسے تجربے سے بحمداللہ سابقہ نہیں پڑا۔

نصرۃ الابرار:

مولانا کے اکابر بریلوی تھے یا دیوبندی، معلوم نہیں ہوسکا مگر بقول مولانا وہ مولوی احمد رضا وغیرہ سے فتویٰ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کا ذہن اہلِ توحید سے زیادہ بریلوی حضرات کی طرف مائل ہوگا ورنہ جہاں تک بریلوی حضرات کا تعلق ہے وہ اہلِ توحید کے ساتھ، اہلِ حدیث ہوں یا دیوبندی، چند قدم چلنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ یقین ہے کہ اس وقت اہلِ حدیث علماء کو جناب کے جدامجد پر بدگمانی ہوگی، وہ "نصرۃ الابرار" کو کسی حقیقت پر مبنی نہیں سمجھتے ہوں گے۔

"نصرۃ الابرار" نے معلوم نہیں کانگرس کے ساتھ اشتراک کے لیے اساس اور اصول کیا قرار دیا تھا۔ عنوان سے پتا چلتا ہے کہ مولانا محمد مرحوم نے ان ساتھیوں کو "ابرار" سمجھ کر ان سے عملی اشتراک کیا ہوگا۔ راقم الحروف نے زندگی کا کافی حصہ کانگرس میں کام کیا ہے، بلکہ کانگرس کو اس وقت چھوڑا جب کانگرس ہم لوگوں کو چھوڑ گئی، اس کے باوجود ان ساتھیوں کو "ابرار" سمجھنا تو مشکل ہے۔ آج بھی اگر مولانا اپنے کانگرسی ساتھیوں کو "ابرار" سمجھیں تو میرے جیسا کم سواد آدمی اشتراک سے انکار کر دے گا۔ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود "نصرۃ الابرار" نہیں مل سکا۔ اگر نصرۃ الابرار کی بنیاد انگریز کی مخالفت ہو تو میں یقین نہیں کرتا کہ اہلِ حدیث اس سے کبھی گریز کریں۔

میرا وجدان کہتا ہے کہ مولانا کے جدِ امجد نے شاید عمائدینِ اہلِ حدیث سے دریافت ہی نہ فرمایا اور مولانا محمد حسین صاحب رحمہ اللہ کے عمل اور طریقِ کار سے مایوس ہوگئے ہوں۔

مولانا ۱۹۵۳ء میں جب وہ یہ مکتوب کسی کو لکھ رہے ہیں، بہت سے اہلِ حدیث بمبئی سے دلی تک کانگرس میں شریک ہوں گے، پھر معلوم نہیں ان کو اس شکوے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، جب اہلِ حدیث ان کے دوش بدوش کام کر رہے تھے۔

مصلحت نیست از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست [1]

ابرار کی نئی قسم:

ابرار کی جس پارٹی میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے جدامجد، مولوی احمد رضا، مولوی

[1] اس میں مصلحت نہیں کہ راز سے پردہ اٹھ جائے، وگرنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر بھی نہیں کہ نہیں۔

غلام دستگیر قصوری، مولوی کرامت اللہ دہلوی، مولوی ارشاد حسین صاحب رامپوری، پنڈت مالویہ، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر گوپی چند اور مسٹر پٹیل پنڈت ایسے کریکٹر اور اخلاق کے سیاستدان شامل ہوں، اگر اہلِ حدیث اس میں شامل نہیں ہوئے تو کوئی جرم نہیں۔ معلوم ہے سوال انگریز کے ساتھ دوستی یا دشمنی کا نہیں، سوال اس اتحاد کی نوعیت کا ہے جس میں بریلوی حضرات شامل ہوں حالانکہ وہ ہندوستان کو دارالحرب ہی نہیں سمجھتے۔ مولانا کے جدِ امجد یا علمائے دیوبند سے وہ ''نصرۃ الابرار'' میں کیونکر متفق ہوگئے۔ غالباً اہلِ حدیث نے اس کھوکھلے اتحاد میں جس کی بنیاد شاید اغراض پر ہو، شمولیت مفید نہیں سمجھی۔ اور ''ابرار'' کے اس جدید ایڈیشن میں اشتراک کوئی سمجھدار آدمی پسند بھی کیوں کرتا؟!

اہلِ حدیث کا اپنا نظام:

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اہلِ حدیث میں کام تقسیم کار کے طور پر ہو رہا تھا۔ اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق مختلف شعبوں میں ہمارے علماء تقسیم ہوگئے۔ شہیدین کے مشن کی تکمیل کے لیے علماء کا ایک مقتدر اور ہوشمند طبقہ اپنی زندگیاں وقف کر چکا تھا اور ان کا موقف مذہبی نقطۂ نگاہ سے بہت اونچا تھا۔ کانگرس قومی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی مختلف اقوام کی نمایندگی کا دعویٰ کر سکتی تھی لیکن شہیدین کا مشن پورے ہندوستان میں دینی نظامِ قائم کرنے کے لیے کوشش کرنا تھا۔ اس وقت ان کی پوزیشن کانگرس سے بہت زیادہ مضبوط تھی۔ ان کے وسائل بھی کانگرس سے کافی زیادہ تھے۔ ان کا نظام بنگال سے لے کر پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اس نظام کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان حالات میں کانگرس کے ساتھ اشتراک نہ سیاستاً مناسب تھا اور نہ مقاصد کے لحاظ سے ایسا کرنا مفید تھا، بلکہ کانگرس ان دینی مقاصد کے بالکل مخالف تھی۔

آپ کے جدِ امجد اور بریلوی علماء کا یہ فتویٰ انگریز کی بہترین اعانت تھی اور اسلامی مقاصد کی پشت میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھا۔ اہلِ حدیث اگر آپ کے جدِ امجد کے ساتھ ''نصرۃ الابرار'' میں شریک ہوتے تو اپنی نصف صدی کی محنت پر پانی پھیر دیتے۔ مولانا اور ان کے ہم خیال غور فرمائیں! جن ایام میں احرار زوروں پر تھی اور مولانا حبیب الرحمان صاحب کا توتی احرار کے نخلستان میں بولتا تھا، انھوں نے کانگرس کے ساتھ اشتراک کے متعلق کبھی سوچا تھا؟ مولانا کی اس وقت کی تقریریں میرے کانوں میں ہیں۔ ہندو اور کانگرس پر مولانا کی تنقید کا انداز اتنا ہی مجرمانہ تھا جتنا جرم

۵۳ء میں مولانا اہلِ حدیث کا سمجھ رہے ہیں۔ مولانا کے رفقاء جو معذرت احرار اور مولانا کے متعلق پیش فرمائیں گے وہی معذرت ''نصرۃ الابرار'' پر دستخط نہ کرنے کے متعلق سمجھ لیں۔ کِلَاهُمَا سَوَاءٌ.

بعد کے حالات:

تحریکِ مجاہدین کو جن ناخوشگوار حالات سے سابقہ پڑا، انگریز کے انتقامی جذبوں نے اسے جس طرح کمزور کیا، اس کے نتائج میں انتشار رونما ہوا۔ مولانا بٹالوی کی طرح بعض نے انگریز کے ساتھ سمجھوتہ اور سازگار حالات پیدا کرنا مناسب سمجھا۔ بعض اپنی روش پر قائم رہے۔ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں چلے گئے۔ بعض خاموش ہوگئے۔ بعض نے تعلیم کا رخ کیا۔ بعض تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ حالات کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسے جماعتی فیصلہ نہیں کہنا چاہیے۔ البتہ احرار کا لیگ میں اِدغام ہمارے لیے آج بھی معمہ ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں اور شعور پر اس کے ناگزیر اثرات کو سمجھتے ہیں۔ احراری رفقاء کو کبھی بدنام نہیں کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی نجی چٹھی اور نوائے پاکستان میں ان اغالیط کی اشاعت، ہم اسے جماعتی خدمت سمجھنے سے قاصر ہیں![1]

(ماہنامہ مجلّہ ''رحیق'' لاہور، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریکِ مجاہدین اور مجلّہ رضوان

پچھلے دنوں مجلّہ رحیق کے دفتر میں رضوان لاہور، مارچ ۱۹۵۸ء پر اتفاقاً نظر پڑ گئی۔ چونکہ پیشہ ورانہ مناظرات سے نفرت کی وجہ سے اس انداز کا لٹریچر پڑھنے کی مجھے عادت نہیں، پہلے ہی صفحے پر سوانح احمدی مؤلفہ مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم کا ذکرِ خیر دیکھا تو تعجب ہوا کہ مدیر رضوان کو کیسے ہمت ہوئی کہ وہ اپنے صفحات میں اس مقدس تحریک کا ذکر کرے۔ وہ تو بریلوی خیالات کا ترجمان ہے۔ مگر ورق الٹتے ہی وہ تعجب جلد دور ہوگیا اور معلوم ہوا کہ اس سے ''رضوان'' کا مقصد بریلوی مناظرین کے لیے چند حوالے جمع کرنے اور مناظرانہ و معاندانہ گرفت کے سوا اور کچھ نہیں۔

پچھلے صفحے کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارۂ رضوان کو سوانح احمدی کے چند نسخے کہیں سے ارزاں مل گئے ہیں جنھیں وہ حسبِ منشا قیمت پر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ بک جائیں اور مدیر رضوان کا دماغ ہلکا ہوجائے۔ یوں بھی یہ شکوہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات دینی کاروبار میں پیٹ کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ﴿وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ﴾[1]

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ رضا خوانی حضرات مولوی احمد رضا خان صاحب کی قیادت میں ہمیشہ انگریز بہادر کی کاسہ لیسی فرماتے رہے اور تحریکِ جہادِ اسلامی و آزادیٔ ہند کی ہر ممکن مخالفت کی۔ انگریزی ہند کی دارالاسلامیت پر کتابیں لکھتے رہے۔ ترکوں کے خلاف انگریزی فوجوں کو تعویذ مہیا کرتے رہے۔ جبکہ اہلِ توحید نے اس کے پورے دورِ اقتدار میں نہ صرف ملک کی سرحدوں پر انگریز سے لڑائیاں لڑیں بلکہ اندرونِ ہند بھی ہر قسم کی آزادی کی تحریک چلا کر یا ان میں شامل ہو کر اس کو پریشان کیے رکھا تا آنکہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اہلِ توحید کا یہ ایسا اعلیٰ کردار ہے جس پر انگریز دنگ تھا، ہند و حیران اور سب مسلمان ممنون!

---

[1] ''جبکہ ابن آدم کا پیٹ صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے۔'' صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٧٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٤٩)

مگر مدیر رضوان کو انگریز کی لکیر پیٹنے کی یہ نئی تجویز سوجھی ہے کہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک انگریز کے خلاف نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ اس کے لیے انھیں سوانح احمدی کی کوئی ناقص عبارت مل گئی۔ بس انھیں اپنی انگریز دوستی اور اسلام و ملک دشمنی کو چھپانے کا بہانہ خیال کر لیا اور باور کر لیا کہ اس طرح وہ داغ دھو ڈالیں گے مگر ان کو معلوم نہیں: لَنْ يُّصْلِحَ الْعَطَّارُ مَا أَفْسَدَهُ الدَّهْرُ![1]

مجھے خیال ہوا کہ عوام اور بریلوی مناظرین کے سامنے حقائق اور واقعات بھی رکھ دیے جائیں تاکہ لاعلمی کی وجہ سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾[2] [الأنفال: ٤٢]

سوانح احمدی، تحریکِ سید احمد شہید کی تاریخ ہے جسے مولانا جعفر رحمہ اللہ نے اس وقت لکھا جب انگریز کے دماغ پر بھی حضرات بریلوی کی طرح وہابی خولیا سوار تھا اور وہابی، بریلوی انگریزی ذہن پر اس طرح مسلّط تھے جیسے یہودی علماء پیلاطس کی حکومت پر!

کچھ شک نہیں کہ ان دنوں یہ تحریکِ جہاد بے حد مقہور تھی۔ انگریز ہر قیمت پر اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ حضراتِ شیعہ اور کبرائے بریلی پُر امید تھے کہ یہ حق کی آواز دب جائے گی۔ ان حضرات کے فتاویٰ، وعظ، اخبارات، رسائل؛ ہر چیز اس آواز کے دبانے میں استعمال ہو رہی تھی یا مظالم اس طرح توڑے جا رہے تھے کہ سر سید احمد خاں تک جیسے آزاد منش جو اہلِ حدیث مسلک اور عقیدے کے پورے مخالف تھے، بے تاب ہو گئے۔ انھوں نے ان مظالم کے خلاف محض انسانی ہمدردی کی بنا پر احتجاج فرمایا۔ یہ ان کی انسانی شرافت تھی حالانکہ ان کے خلاف جس قدر علمائے اہلِ حدیث نے لکھا شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ مولانا محمد حسین بٹالوی کا اشاعۃ السنۃ سر سید کی مخالفت سے بھرپور ہوتا تھا مگر سید احمد خاں کی شرافت اور معاملہ فہمی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انھوں نے بڑی جرأت سے احتجاج کیا اور انگریز کو متاثر کرنے میں اچھا کردار ادا کیا، جس سے انگریز تو کسی قدر متاثر ہوا بھی مگر افسوس بریلویت اب تک شرم محسوس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔

ایسے نازک دور میں مولانا جعفر تھانیسری نے اس جماعت کے حالات کو شائع کرنے کی کوشش فرمائی۔ اس وقت یہ حالات یا تو مستند روایات کی صورت میں محفوظ تھے جن کو مولانا جعفر اور دوسرے

---

[1] جسے زمانے نے خراب کر دیا ہو اس کی عطار کیا اصلاح کرے گا!

[2] ترجمہ: ''تاکہ جو ہلاک ہو واضح دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے واضح دلیل سے زندہ رہے۔''

اکابر عرفی تواتر کی صورت سے جانتے تھے یا وہ مکاتیب اور مخطوطات تھے جو طبع نہیں ہوئے تھے اور عقیدت مندوں کے پاس محفوظ تھے، یا پھر وہ سرکاری کاغذات اور جماعتی دستاویزوں کی طرح اصل یا ان کی نقول کہیں محفوظ نہیں۔ مولانا جعفر ایسے ہمدرد اور دور اندیش انسان کے لیے اس وقت عجیب مشکل تھی۔ اگر وہ حقائق کو من وعن سامنے رکھیں تو عام گرفت اور قید و بند کے علاوہ بہت ممکن تھا کہ اشاعت میں رکاوٹ ڈالی جاتی یا پورا مواد ضبط ہو کر حکومت کے قبضے میں چلا جاتا۔

مولانا جعفر نے حالات کے لحاظ سے جہاں تک واقعات میں لچک پیدا کر سکتے تھے، حکومت کی گرفت سے بچنے کی کوشش کی تاکہ اس جہاد کے حالات جس قدر منظرِ عام پر آ سکتے ہیں، آ جائیں۔
مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ جُلُّهُ.

بنا بریں مولانا جعفر سے اس معاملے میں بعض کمزوریوں کا صدور بالکل قدرتی تھا۔ بعض مکاتیب جو تحریک کی روح تھے وہ شائع ہی نہیں فرما سکے بلکہ بعض انھیں دستیاب ہی نہیں ہو سکے، کیوں کہ تحریک کے لٹریچر کا زیادہ تر ذخیرہ نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک کے پاس محفوظ تھا۔ ماخذ کی تفصیل کے لیے بریلوی مناظرین کو سیرت سید احمد شہید مؤلفہ مولانا غلام رسول صاحب مہر اور سیرت سید احمد شہید مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی وغیرہ تصانیف کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ انھیں تحریک کی حقیقت معلوم ہو سکے۔ کیونکہ اول الذکر ایسے وقت لکھی گئی تھی جبکہ انگریزی دور ختم ہو گیا تھا اور ثانی الذکر ایسے وقت لکھی گئی تھی جبکہ انگریز کا انتقامی جذبہ کم ہو گیا بلکہ ختم ہو گیا تھا۔

کچھ لٹریچر صادق پور پٹنہ میں مولانا ولایت علی، عنایت علی مرحوم کے خاندان کے پاس موجود تھا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ موجود ہے یا ضائع ہو چکا ہے۔

نیز بریلوی مناظرین اور خود مدیر رضوان کی حق تعالیٰ کے ان مقبول بندوں سے مخالفت اگر دیانت پر مبنی ہے تو اس امر پر بھی غور فرمائیں کہ خود مولانا جعفر تھانیسری کو انبالہ بم کیس میں عمر قید بعبور دریائے شور کی قید ہوئی۔ آیا یہ مقدمہ رنجیت سنگھ کی عدالت میں پیش آیا تھا؟ مولانا کو یہ سزا کس سنگھ نے دی؟ مولانا جعفر نے اس کیس کی سرگزشت انڈیمان سے واپسی کے بعد ”کالا پانی“ کے نام سے لکھی۔ بریلوی مناظرین ملاحظہ فرمائیں یہ پورا کیس انگریزی حکومت نے مرتب کیا اور انتہائی انتقامی سزائیں دیں۔ جب بقول آپ کے تحریک انگریزوں کے خلاف ہی نہ تھی تو مقدمہ اور انتقامی سزائیں کیوں دی

گئیں؟ یہاں جج انگریز تھا۔ سکھ فریقِ مقدمہ بھی نہیں، پھر کیا یہ انگریز کی حمایت کا نتیجہ تھا؟

سانحہ بالاکوٹ میں سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید ہوگئے۔ تحریک میں قیادت مولانا ولایت علی فرمانے لگے۔ اس اثنا میں سکھوں اور انگریزوں میں تصادم ہوا۔ سکھ حکومت آخری ہچکیاں لے کر ختم ہوگئی لیکن سرحد پر انگریزوں سے ۱۹۲۱ء تک تصادم ہوتا رہا جس میں مجاہدین بدستور گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ بریلویوں اور شیعہ کے سوا تمام مسلمان اس تحریک کی مالی سرپرستی کرتے رہے۔ کشمیر کی جنگ میں ان مجاہدین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی قیادت مرحوم لیاقت علی خاں کے مشورے سے مولانا فضل الٰہی فرماتے رہے۔ سکھوں کے بعد آخر پنجاب پر انگریزوں کے سوا کون قابض تھا جس سے پوری صدی تک شمال مغربی سرحد پر تصادم ہوتے رہے؟

آپ حضرات کو ان کوششوں کے ساتھ جو انگریزوں کے خلاف ہوتی رہیں، چونکہ ذہنی طور پر اختلاف تھا، اس لیے آپ ان سے بے خبر ہیں، ورنہ آپ یقین فرماتے کہ سوانح احمدی کے یہ ناقص حوالے ان واقعات کو نہیں بدل سکتے جو صدی کے پس و پیش وقوع پذیر ہوتے رہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کو آپ نہیں جانتے۔ انھوں نے مصلحت اندیشی کو واقعات میں اس انداز سے سمویا ہے کہ واقعات پر مجموعی نظر خود آپ کی تردید کردے گی اور آپ یقین کریں گے کہ مدیر رضوان کی توجیہ غلط اور من قبیل ''مَا لَا يَرْضىٰ بِهِ الْقَائِلُ'' ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں خلافت کمیٹی ایسی سیاسی جماعتوں نے انگریز کے خلاف سرحد پار کے مجاہدین سے استفادے کی کوشش کی۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی رحمہ اللہ جالندھر میں نظر بند ہوئے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب سے سید مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی تک کے وارنٹ جاری ہوئے جو میاں عبدالعزیز انسپکٹر خفیہ پولیس سے مل ملا کر بمشکل معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس ابتلا میں منشی فضل الدین مرحوم (برانڈرتھ روڈ لاہور) نے بہت زیادہ کوشش فرمائی۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

ہاں تو مولانا محمد جعفر صاحب نے اس مصلحت اندیشی سے کیوں کام لیا؟ پھر سن لیجیے! آپ حضرات اور آپ کے اکابر سیاست میں انگریزوں کے آلہ کار تھے اور عقائد میں طبعاً توحید و سنت کے خلاف۔ مولانا جعفر صاحب مرحوم کے سامنے تحریک کا عروج و زوال گزر رہا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ انگریزوں سے لڑنا مشکل ہے، اس لیے توحید و سنت کی اشاعت کے پروگرام کو جہاں تک ممکن ہو، زندہ رکھنا چاہیے اور سیاسی مشاغل کو کم کر دینا چاہیے۔ گو اس سے بھی مجاہدین ان سے متفق نہیں تھے تاہم

ان کی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔

اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ ۵۳ء میں تحریک ختمِ نبوت شروع ہوئی۔ بریلوی حضرات سے ٹوڈی قسم کے حضرات تو دودھ کے مجنوں نکلے۔ ان کی آنحضرت ﷺ سے محبت جمعرات کے ختموں اور شب برات کے حلوے تک ہی تھی۔ ان سے کوئی بھی آگے نہ بڑھا اور اتفاقاً پھنس گیا تو گڑگڑا کر معافی مانگ لی۔ مولانا ابوالحسنات صاحب، مولانا غلام محمد صاحب ترنم نے جرأت فرمائی۔ یہ دونوں بزرگ بڑی جوانمردی اور استقلال سے جیل گئے۔ ہم نے بریلوی کیمپ میں خدا شاہد ہے ان دونوں بزرگوں کو صاحبِ ہمت پایا۔ خلیل میاں کی سزا سے مولانا کو جو تکلیف ہوئی اس پر مولانا کے استقلال کا ہمیں پورا احساس ہے لیکن جیل سے باہر آنے کے بعد مولانا پر عجیب اثر پڑا۔ ہمیں مولانا کے اس فیصلے پر بے حد تعجب ہوا کہ وہ آیندہ بریلوی بزدلوں کے سٹیج کے سوا کہیں تقریر نہیں فرمائیں گے اور کسی سیاسی تحریک میں شامل نہیں ہوں گے۔ مسجد وزیر خاں کے ادارۂ اہتمام سے جو معاملہ طے ہوا، چنداں جرأت مندانہ نہیں۔ اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے اپنے عقیدے کی بنا ہی پر سوچا ہوگا کہ ختمِ نبوت اور دوسری دینی جماعتوں کے بجائے بریلوی مکتبِ فکر کی خدمت فرمائیں۔ انھوں نے غلط یا صحیح طور پر یہی مناسب سمجھا کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ سید عطاء اللہ شاہ۔ زِیدَ فَضْلُہٗ۔ اور مولوی محمد علی جالندھری کے سپرد کر دیا جائے اور بریلوی طریقۂ کار کے علاوہ تمام نیک کاموں سے کنارہ کش ہوجائیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان مصلحتوں میں یہ حضرات جیل کے دیرینہ تجربہ کار سید فیض الحسن کو بھی لے ڈوبے۔ یہ ہونہار نوجوان اپنی سابقہ حسنات پر پانی پھیرنے کے لیے تیار ہوگیا اور ساری دیرینہ قومی خدمات پر خطِ نسخ کھینچ کر بزدلوں کی راہ نمائی پر مطمئن ہوگئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون!

ان حالات کو دیکھیے! ہم تو یہ گمان بھی نہیں کرسکتے کہ مولانا ابوالحسنات اور مولانا غلام محمد ترنم ختمِ نبوت کے منکر ہیں۔ تو اسے مصالح کا تقاضا ہی کہا جا سکتا ہے جس کا دوسرا نام کمزوری ہے۔ یہی مصالح اگر ذاتی مفاد اور پیٹ کے لیے کیے جائیں تو بددیانتی اور ٹوڈی پن ہے۔ اگر کسی اچھے مقصد کے لیے ان کا ارتکاب ہو تو اس کا نام اجتہادی غلطی ہے۔

ٹھیک اسی قسم کے حالات مولانا جعفر کو پیش آئے۔ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے جب مولانا جعفر نے سوانح احمدی لکھی۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان واقعات میں جہاں بھی مولانا جعفر

سے کچھ جھول رہ گئی ہے وہاں بعد کے واقعات نے اس جھول کو سیدھا کر دیا ہے۔

بقیۃ السیف اہلِ توحید اور باقی اصحابِ سنت میں بحمد اللہ پیر پرستی کا مرض نہیں۔ وہ انبیا علیہم السلام کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ انسان تھے۔ ان سے غلطیاں ہوسکتی ہیں تو مولوی جعفر بیچارے کون ہیں۔ حقائق اور دلائل کی راہ پیر پرستی بھی نہیں روک سکتی چہ جائیکہ جب ذہن اس مرض سے بالکلیہ صاف ہوں تو بریلوی مناظر اور مدیر رضوان کی یہ معاندانہ کوششیں اہلِ حق کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔

اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کسی دوسری صحبت میں وہ تمام واقعات منظرِ عام پر لائیں گے جن پر اہلِ حدیث کے اکابر نے انگریز سے روبرو لڑائیاں لڑیں۔ انگریز نے خود اس کا اعتراف کیا اور باہر تحریک کو دبانے کے لیے مجاہدین کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کیے۔ آپ حضرات کے قیمتی فتووں سے استفادہ کیا۔ بالآخر شکست کھا کر ملک کو خالی کرنے پر مجبور ہوا۔ آپ کو اور قادیانی حضرات کو بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔

معلوم نہیں اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے جو گزشتہ سال لائل پور کے بعض اخبارات میں چھپی کہ لائل پور کے بعض بریلوی دانش وروں نے اسی سلسلے میں سر ظفر اللہ سے چھپ چھپا کر ملاقات کی۔ معلوم نہیں یہ سجود کہاں تک کامیاب ہوا۔ اس خبر کے بعد اہلِ توحید کے خلاف ہنگامے تو تیز تر ہو رہے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گرم بازاری کب تک رہے۔

امید ہے بریلوی مناظرین نے مدیر رضوان سے کتابیں تو مناسب قیمت پر خرید لی ہوں گی۔ اگر کوئی رہ گیا ہو تو وہ کتاب صوفی کمپنی منڈی بہاؤالدین سے اسی نایاب گوہر کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ کتاب اتنی نایاب نہیں جس قدر اس کا اظہار کیا جا رہا ہے، البتہ مدیر رضوان کے مشوروں پر عمل کرنے سے پہلے سو بار سوچ لیں ؏

کہ اسی نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے!

(ماہنامہ مجلّہ ''رحیق'' لاہور۔ مئی ۱۹۵۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر رضوان اور عدالتی چیلنج

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہیں سے بریلوی مذہب شروع ہوا۔ مولوی صاحب موصوف نے بدعات کو ''مدلل'' اور اہلِ بدعت کو منظّم کرنے کی کوشش کی۔ ان ایام میں انگریزی حکومت کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے، اس لیے مولانا نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح جہاد کی مخالفت کی اور ہندوستان کو امن اور اسلام کا گہوارہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انگریز کے خلاف جو طاقتیں زور آزمائی کر رہی تھیں ان کی کھلی مخالفت کی۔ مجاہدینِ سرحد اور اہلِ توحید وسنت پر اتہامات لگائے۔ پوری کوشش کی کہ یہ لوگ بدنام ہوں۔ ان کوششوں سے واقعی انگریز کو کافی فائدہ پہنچا اور کافی وقت ہندوستان میں کاٹ گیا۔

اس مقصد کے لیے مولوی احمد رضا صاحب اور ان کے رفقاء ہر غلط بیان اور حوالوں میں قطع و برید جائز سمجھتے رہے اور ایسی حرکات کر گزرے جو علم و دیانت کی پیشانی پر بدنما داغ بن کر نمایاں ہوئیں۔

مدیر رضوان:

اسی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پچھلے دنوں رسالہ ''رضوان'' لاہور نے مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب ''تواریخ عجیبہ'' کے بعض اقتباسات سے بریلوی مناظرین کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی اور سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریکِ جہاد کو بدنام اور غلط صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا۔

میں نے مدیر رضوان اور بریلوی مناظرین کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ تحریک کے صحیح خدوخال کو واضح کیا تاکہ یہ حضرات غلطی سے بچیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ حضرات اکل وشرب کی بدعات میں مشغولیت اور انگریز کے انعامات سے مستفید ہونے کی وجہ سے اس تحریک کے مبادی اور عواقب دونوں سے بے خبر ہیں، اور عصبیت کی وجہ سے ان کے ذہن پر بے شعوری کی کیفیت طاری ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ حقیقت کی وضاحت سے ان کے دماغوں میں شعور آ جائے اور یہ حضرات حقائق کو سمجھنے

کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ مگر افسوس جون ۵۸ء کا ''رضوان'' دیکھا تو محسوس ہوا کہ توقع غلط تھی۔ وہ اس کے جواب پر آمادہ ہو گئے ہیں، تاہم میری گزارشات کا جواب تو سردست ملتوی کر دیا ہے (جس کے لیے ہم چشم براہ ہیں) مگر مولوی نور احمد زیدی کا ایک مضمون درج کرتے ہوئے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں ان حقائق کو عدالت میں چیلنج کروں۔

مجھے دونوں حضرات سے اس وقت کچھ الگ الگ گزارش کرنا ہے۔

مولوی نور احمد صاحب کے مضمون سے جہاں تک ہم انھیں سمجھ سکے ہیں، وہ دقیانوسی قسم کے مناظر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کو سمجھے بغیر مکھی پر مکھی مارنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ کسی حقیقت پر غور کرنے سے ان کا دماغ قاصر ہے۔ وہ اپنے مطالعہ سے ناظرینِ رضوان کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس کا انھیں پورا پورا حق ہے۔ مجھے اس میں مداخلت کی ضرورت نہیں۔ ان کا مضمون میری گزارشات کے جواب میں نہیں۔ وہ بظاہر مستقل پیش کش ہے، اس لیے اس کے جواب کی ذمے داری اخلاقاً مجھ پر نہیں۔

مولانا نور احمد سے گزارش ہے کہ آپ کا سارا زور حیاتِ طیبہ اور تواریخِ عجیبہ کی ورق گردانی پر ہے لیکن یہ دونوں کتابیں آپ کے مخالف کے نزدیک مسلّم نہیں، اس لیے جناب کی یہ کوشش بے سود ہے۔

آپ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کا مصنف اہلِ حدیث ہے اور سید احمد صاحب کا معتقد۔ یہ خیال درست نہیں۔ مرزا حیرت کو شاہ صاحب کی تحریک کے بعض حصوں سے ہمدردی ہے۔ وہ اس توہّم پرستی کو ناپسند کرتے ہوں گے جو آج کل بریلویت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے لیکن وہ اہلِ حدیث نہیں تھے۔ وہ انگریز کے ایسے وفادار تھے جیسے آپ اور آپ کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی۔ مرزا حیرت نے تحریکِ جہاد کو اسی راہ پر ڈالا جو عین انگریز کا منشا تھا۔ مرزا حیرت کے بعض خیالات ممکن ہے مولانا احمد رضا صاحب سے نہ ملتے ہوں لیکن تحریک کو بدنام کرنے اور انگریز کو اس اذیت سے بچانے میں خان صاحب اور مرزا حیرت کا ایک ہی مقصد ہے۔ اس لیے آپ کا یہ گواہ تو اس قابل نہیں کہ اس کی شہادت پر اعتماد کیا جا سکے۔ مرزا حیرت عقیدتاً منکرِ حدیث تھے۔ واللہ اعلم

مولانا جعفر صاحب تھانیسری رحمہ اللہ:

مولانا جعفر صاحب تھانیسری یقیناً تحریک کے خیر اندیش ہیں۔ انھوں نے تحریک کے متعلق

بہت سا مفید مواد جمع کیا۔ بہت سی دستاویز محفوظ فرمائیں۔ اس راہ میں بے پناہ صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کے خلوص و دیانت میں کوئی شبہہ نہیں لیکن تحریک کے رخ کی تبدیلی کے متعلق ان سے جو غلطی یا لغزش ہوئی اسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ شاہ شہید کے مکاتیب مل سکتے ہیں۔ وہ ناپید نہیں۔ آپ حضرات چونکہ تحقیق کے عادی نہیں، غلط بیانی اور ظنون و اوہام آپ کے ہاں حقائق اور دلائل کا نعم البدل سمجھے جاتے ہیں یا ان کے مرادف، ورنہ معاملہ سمجھنے میں کوئی اِغلاق اور دقت نہیں۔ مکاتیب میں آپ کو وضاحت ملے گی۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بریلویت کے تین ستون ہیں: موسیقی، گالیاں، ظنون و اوہام۔ سرگودھا میں حضرت مولانا ابو الحسنات نے ایک تقریر ان اصولوں سے ہٹ کر فرمائی تھی۔ امیر حزب اللہ نے اسی وقت ان کے متعلق وہابیت کا فتویٰ دے دیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی اسیری کے ایام میں مولانا سید ابو البرکات کے نزدیک وہ بھی وہابی اور کافر تھے۔ معلوم نہیں مولانا ابوالحسنات صاحب کے ایمان کا آپ کے ہاں آج کل کیا حال ہے۔

اگر آپ کو اللہ تعالیٰ ظنون و اوہام سے نجات کی توفیق مرحمت فرمائے تو آپ میری سابقہ گزارشات پر نظر ثانی فرمائیں۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ [1] [قٓ: ۳۷]

ان حقائق کی وضاحت سے قبل ہم خود مولانا تھانیسری کے موقف کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ تعجب ہوتا تھا جو شخص دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہو، شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات، شاہ عبدالعزیز صاحب کی ہدایات کو اپنا راہنما تصور کرتا ہو وہ انگریزوں کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے اور معلوم ہے جب وقت آیا تو ان مجاہدین نے انگریزوں کو بھی پوری ایک صدی تک پریشان کیے رکھا۔ یہ اچھا حلیف ہے جس نے اپنے حلیف کا ناک میں دم کر دیا۔ آخری تصادم انگریز کے ساتھ ۲۰۔ ۱۹۲۱ء میں ہوا جس کا مفصل تذکرہ میں نے سابقہ گزارشات میں کیا۔ آپ کے دونوں گواہ مجروح ہیں۔ کوئی ایسا گواہ لایئے جس پر جرح نہ ہو۔ آپ کے اکابر تو انگریز کے حلیف رہے ہیں۔ ان شہدائے حق کے خلاف فتویٰ دیتے رہے ہیں۔ اپنے ولی النعمہ پر اگر کچھ اعتماد باقی ہو تو ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان''

[1] ترجمہ: ''بلاشبہہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو۔''

ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس حلف کی حقیقت اور تحریک کے مقاصد آپ کو بہتر طور پر بتا سکے گا۔

اگر خدا تعالیٰ کی عدالت پر یقین ہے تو اسی کے خوف سے اپنے حقائق پر نظر ثانی کیجیے اور اس ضمن میں ہنٹر کی کتاب ہمارے ہندوستانی مسلمان، سیرت احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر، سیرت احمد شہید مؤلفہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ پھر مل سکے تو کالا پانی بھی۔ لَعَلَّكَ تَتَذَكَّرُ أَوْ تَخْشٰى!

عدالتی چیلنج:

1 مولانا میری نظر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت سے کوئی عدالت بڑی نہیں۔ میں نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے بحمد اللہ اسی عدالت کی برتری اور انصاف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا أَقُوْلُ شَهِيْدٌ!

2 آپ کی پوری پارٹی میں یہ کمزوری ہے کہ آپ آج کل دنیوی عدالتوں پر زیادہ اعتماد فرماتے ہیں۔ آپ کے اکابر بھی اس غلط فہمی میں رہے کہ شاید موت وحیات کی چابیاں حکومت کے ہاتھ میں ہیں!!

3 آج کی دنیوی عدالتیں کبھی بھی اہلِ حق کے نزدیک سچائی کا معیار نہیں قرار پا سکیں بلکہ صداقت عموماً ان عدالتوں کے خلاف پائی گئی۔ ان عدالتوں نے جن لوگوں کو مجرم قرار دیا، آسمانی عدالت میں وہی کونے کے پتھر قرار پائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے کیس پر ایک نظر فرمائیں!

4 پیلاطس کی عدالت میں فریسیوں (اس وقت کے بریلوی) کی شہادت سے حضرت مسیح مستحقِ دار قرار پائے۔ نمرود کی عدالت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجرم قرار دیا۔ فرعون کی عدالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ جو عدالتی انصاف ہوا وہ آپ حضرات کو معلوم ہو گا۔ جب آپ حضرات کے فتوؤں کی بنا پر ہمارے اکابر کو مساجد سے نکالا گیا، ہم دونوں فریق انگریزی عدالتوں کے سامنے حاضر ہوئے۔ عدالتی انصاف نے جو گل کھلائے وہ ہم دونوں جانتے ہیں۔

5 جسٹس سید محمود جج ہائی کورٹ نے آمین بالجہر کے متعلق جو انصاف فرمایا تھا، کیا آپ اس پر مطمئن ہیں؟

آپ حضرات کا سارا زور گانے اور اعلیٰ حضرت کے رسائل پڑھنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ نہ آپ قرآنِ عزیز کی تاریخ میں تدبر فرماتے ہیں نہ آپ کو اپنی تاریخ پر صحیح عبور ہے۔

6 اگر عدالتی چیلنج ہی جناب کے لیے اطمینان کا موجب ہو سکتے ہیں تو مجلّہ سہ ماہی ''ہلال'' ملاحظہ

فرمایئے۔ یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے۔ فارسی ممالک میں پروپیگنڈے کے لیے یہ مجلّہ حکومت کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو: شمارہ اول جلد ۵ متعلقہ جنبش ۱۸۵۷ء۔ اداریہ میں فرماتے ہیں:

''مسلمانانِ شبہ قارہ بفکر جہاد و مبارزہ برخلاف انگریز وسکھ ہا افتادند و یک نفر مجاہدین قیادت مردم دیگر قیادت مردم مسلمان رابعہدہ گرفت و رسماً برخلاف سکھ ہا اعلام جہاد نمودہ باکمک ای فداکار داز جاں گذشتہ پشاور را اشغال کرد و ایں طور بنظرے رسد کہ اگر عموم مسلمان ہا و جرأت وشہامت و یک جہتی نشان مے دارند تاریخ شبہ قارہ متغیر مے کرد و لے ایں مرد مجاہد قربانی اختلافات بیں خور مسلماناں گردید و درسال ۱۸۳۱ء در جنگ بالاکوٹ جامِ شہادت نوشید۔''[1] (ہلال ۱۹۵۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ، ۱۳۳۴ھ)

اگر عدالتی انصاف ہی جناب کی نظر میں آخری سند ہے تو یہ حکومتِ پاکستان کی ہائی اتھارٹیز کی رائے ہے، اس پر غور فرما لیجیے! ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

7 مولانا! آپ سخت غلطی میں ہیں اور تاریخ کے شدید ترین مجرم۔ آپ کے اختلافات مولانا شہید سے اعتقادی ہیں، سیاسی نہیں۔ غالباً جس کذب و افترا کا آپ حضرات آغاز کر رہے ہیں، آپ کے اکابر مولانا فضل حق مرحوم وغیرہ نے بھی سید شہید اور شاہ شہید رحمہما اللہ پر نہیں لگایا۔ ان کی تگ و دو بھی امکانِ کذب اور امکانِ نظیر کے مفروضات تک ہی رہی اور ستائیس سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی کہ وہ شاہ شہید کے موقف کی صدر دفتر پر گواہ بن کر براستہ انڈیمان خدائے تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں۔ وقت بہترین واعظ ہے۔

مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''مجھے ان بزرگوں کے عقائد سے اختلاف ہے لیکن میں ان کی مجاہدانہ مساعی کی قدر کرتا ہوں۔''

[1] ''برصغیر کے مسلمانوں میں انگریز اور سکھوں کے خلاف جہاد کی سوچ پیدا کی اور مجاہدین کی ایک جماعت نے سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ فداکاروں کی مدد سے پشاور کو جہادی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ صورت یہ ہوگئی تھی کہ اگر عمومی مسلمان جرأت، بہادری اور یکجہتی کا مظاہر کرتے تو برصغیر کی تاریخ بدل جاتی لیکن اس مردِ مجاہد کی قربانی مسلمانوں کے اختلافات کی نظر ہوگئی اور ۱۸۳۱ء میں انھوں نے بالاکوٹ کے مقام پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔''

۸ اگر انسان کو اپنے خالق سے حیا نہ ہو اور دل میں آنحضرت ﷺ کا احترام نہ ہو تو جناب مولانا! عدالتی چیلنج سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا بحمد اللہ یہ جماعتی اخلاق ہے کہ ایسے معاملات کے لیے عدالت میں نہیں جاتے۔ آپ ایسے دوستوں کی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرتے ہیں اور صبر و صلاۃ کے ساتھ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ آپ اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ ایک صدی سے آپ ہمارے ساتھ دست و گریبان ہیں۔ فرمائیے! فائدے میں کون ہے؟ ﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۚ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾[1] [الأنبياء: ٤٤]۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس وقت ہماری تعداد لاکھوں تک ہے۔

۹ آپ کو غلط فہمی ہے۔ مولانا احمد اللہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی یقیناً بریلوی نہیں تھے۔ ''اَلْمُقَارَنَةُ أَصْلُ الْمُعَادَاةِ''[2] کے مطابق مولانا فضل حق صاحب کو شاہ شہید سے کچھ چشمک سی ہوگئی ورنہ وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے۔ علمِ غیب اور آنحضرت ﷺ کا ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا، مختارِ کل ہونا وغیرہ قسم کی جو مزخرفات آپ حضرات نے گھڑی ہیں اور ''اثنا عشری'' اور ''حادی عشری'' جس طرح مل کر مسلمانوں میں جا بجا فساد برپا کر رہے ہیں، کیا ان مسائل کا تذکرہ مولانا فضل حق ایسے دانشمند نے بھی کہیں اپنی کتب میں کیا ہے؟ اور مولانا احمد اللہ کی زندگی کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھی گئیں تو شاید لاہور سے بریلی تک ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ ان حالات کے باوجود وہ سید شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔ اس وقت کے حکومت پرستوں نے انھیں بھی وہابی کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو: ۱۸۵۷ء، مولانا مہر)

اس کے باوجود اگر آپ ان دونوں بزرگوں کو بریلوی کہنے پر مصر ہیں تو ایسے بریلویوں کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ اس وقت انگریز کی مخالفت ایسا عمل تھا جس کے عوض اکبر الکبائر معاف کیے جا سکتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ لوگ یقیناً اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں۔

۱۰ آپ حضرات کی کم فہمی اور بے خبری پر تعجب ہوتا ہے۔ آپ حضرات نے ۱۸۵۷ء کی حرکت کو بہت ہی غلط سمجھا ہے۔ اس تحریک کا حنفی اہلِ حدیث دیوبندی بریلوی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ

[1] ترجمہ: ''پھر کیا وہ دیکھتے نہیں کہ بے شک ہم زمین کو آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے گھٹاتے آتے ہیں، تو کیا وہی غالب آنے والے ہیں؟''

[2] ''معاصرت ہی عداوت کی اساس ہے۔''

ایک عالم گیر ناراضی تھی جو تمام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ ابتداءً اس میں سکھ ہندو بھی پوری طرح شامل ہوئے۔ رانی جھانسی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ کس جرأت سے اس نے قربانی کی۔ کیا وہ بریلن تھی؟ اسے مکاتبِ فکر کی جنگ قرار دینا حماقت ہے اور تحریک کی توہین۔ معلوم نہیں آپ حضرات ملک کی تحریکات سے ناآشنا ہیں یا عمداً اپنے عوام کو غلطی میں رکھنا چاہتے ہیں۔

آخری گزارش:

ہم عدالت میں کیوں جائیں؟ ایک صدی سے زیادہ قریباً آپ اور آپ کے اکابر اہلِ توحید وسنت کے خلاف اتہام تراشی میں مشغول ہیں۔ ہمارا آپ نے کیا بگاڑ لیا۔ آپ ہمارے اشتہار ہیں۔ آپ کے تیز اور تلخ فتوے ہماری ترقی کا سبب ہیں۔ جب مقاصد کے لحاظ سے آپ کی یہ روش ہی ہمارے لیے مفید اور ترقی کا موجب ہو تو کسی کا سر پھرا ہے آپ کو خواہ مخواہ عدالت میں چیلنج کرتا پھرے!

ہم اور ہمارے اکابر یقیناً معصوم نہیں، اور شاید اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے طعن و تشنیع کو ہمارے لیے کفارۂ سیآت بنا دے۔ اگر آپ حضرات (خانصاحب بریلوی، مولانا الوری، مولانا ابو البرکات) سے ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوجائے تو فرمایئے! ہم عدالت میں کیوں جائیں؟ ہم عدالت کے بجائے ان فوائد ہی سے کیوں نہ متمتع ہوں!

مولانا! ایک بات ذہن میں رکھ لیجیے کہ سب سے بڑا دھوکا آپ کے متعلق یہ ہوسکتا تھا کہ آپ آنخضرت ﷺ کا ادب کرتے ہیں مگر تحریک ختمِ نبوت نے اس سلسلے میں آپ کو عریاں کر کے رکھ دیا۔ اور مولانا ابو البرکات اور عام بریلوی حضرات کی بزدلی نے آپ کا وقار ختم کر دیا ہے۔ عوام اب سمجھنے لگے ہیں کہ آپ حضرات کو صرف لفظ ''یا'' سے محبت ہے۔ آنخضرت ﷺ کی ذات سے نہیں، سنت سے نہیں۔ آنخضرت ﷺ پر صلاۃ وسلام سب کرتے ہیں، البتہ لفظ ''یا'' سے آپ کو واقعی محبت ہے!

ہاں! اگر عدالت کے بغیر تسکین نہ ہوسکے تو جناب مجھے عدالت میں چیلنج کیجیے۔ میں ان شاء اللہ حاضر ہوجاؤں گا۔ والسلام

(مجلّہ ''رحیق'' لاہور۔ اگست وستمبر ۱۹۵۸ء)

فقہ اور تفقّہ

لغت کے لحاظ سے لفظِ فقہ کا مفہوم یہ ہے:

''ظاہری علم سے مخفی علم تک رسائی حاصل کرنا۔''[1] (مفرداتِ راغب)

قرآنِ عزیز نے فقہ اور تفقّہ کے الفاظ بہت سے مقامات پر ذکر فرمائے ہیں۔ سورت توبہ میں اسے جہاد کے بالمقابل مقام دیا ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾ [التوبة: ١٢٢]

[سو ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے، تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور تاکہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں، جب ان کی طرف واپس جائیں]

یہاں فقہ سے مراد وہ تمام علوم ہیں جو دینِ اسلام کے فہم میں مدد دے سکتے ہیں۔ قرآن، سنت اور تمام علومِ خادمہ حسبِ مراتب اس میں شامل ہیں۔ گویا آیت میں سفر کی دو قسمیں شمار کی گئی ہیں: ① جہاد کے لیے۔ ② طلبِ علم کے لیے۔ اسی طرح حدیث میں ہے:

«مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ»[2] (الحديث)

یعنی جس سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین میں فہم عطا فرما دیتا ہے۔

''اَلْفِقْهُ -بِالْكَسْرِ-: اَلْعِلْمُ بِالشَّيْءِ، وَالْفَهْمُ لَهُ وَالْفِطْنَةُ، وَغَلَبَ عَلٰى عِلْمِ الدِّيْنِ لِشَرَفِهِ، وَفَقِهَ كَكَرُمَ وَفَرِحَ''[3] (القاموس، أقرب الموارد، مجمع البحار وغيره)

یعنی فقہ بکسر القاف علم و فہم اور دانشمندی کو کہتے ہیں۔ فقہ کا لفظ عموماً علمِ دین پر اس کی

[1] المفردات في غريب القرآن (ص: ٣٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧)

[3] القاموس المحيط (مادة: فقه)

شرافت کی وجہ سے بولا جاتا ہے۔ یہ "کرُم" اور "فرِح" دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔

امام ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (م ۴۶۳ھ) فقہ اور فقیہ کا لغوی اور عربی مفہوم ذکر فرماتے ہیں:

"قَالَ ثَعْلَبُ أَحْمَدُ بْنُ يَحْيىٰ النَّحْوِيُّ: يُقَال: فَقِهَ الرَّجُلُ: إِذَا كَمُلَ، وَفَقُهَ: إِذَا شَدَا شَيْئًا مِنَ الْفِقْهِ ... قَالَ ابْنُ قُتَيْبَةَ الدِّيْنَوَرِيُّ: اَلْفِقْهُ فِيُ اللُّغَةِ: اَلْفَهْمُ. يُقَالُ: فُلَانٌ لَا يَفْقَهُ قَوْلِيُ. قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: ﴿ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] أَيْ: لَا تَفْهَمُوْنَهُ، ثُمَّ يُقَالُ لِلْعِلْمِ: اَلْفِقْهُ، لِأَنَّهُ عَنِ الْفَهْمِ يَكُوْنُ الْعَالِمُ، وَلِلْعَالِمِ فَقِيْهٌ، لِأَنَّهُ إِنَّمَا يَعْلَمُ بِفَهْمِهِ، عَلىٰ مَذْهَبِ الْعَرَبِ فِيُ تَسْمِيَةِ الشَّيْءِ بِمَا كَانَ لَهُ سَبَبًا. قَالَ أَبُوْبَكْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ قَاسِمِ الْأَنْبَارِيُّ: قَوْلُهُمْ: رَجُلٌ فَقِيْهٌ، مَعْنَاهُ: عَالِمٌ، وَكُلُّ عَالِمٍ بِشَيْءٍ فَهُوَ فَقِيْهٌ فِيْهِ، مِنْ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ: يَفْقَهُ وَلَا يَنْقَهُ، مَعْنَاهُ: مَا يَعْلَمُ، وَلَا يَفْهَمُ. يُقَالَ: نَقَهْتَ الْحَدِيْثَ أَنْقَهُهُ: إِذَا فَهِمْتَه. يُقَالُ: نَقَهْتُ مِنَ الْمَرَضِ أَنْقَهُ. وَمِنَ الْفِقْهِ قَوْلُهُمْ: قَالَ فَقِيْهُ الْعَرَبِ، مَعْنَاهُ: عَالِمُ الْعَرَبِ، وَمِنْ ذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالىٰ: ﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ﴾ [التوبة: ١٢٢] مَعْنَاهُ: لِيَكُوْنُوْ عُلَمَاءً بِهِ" (الفقيه والمتفقه قلمي[1]، ص: ٢٩ تا ٧٧)

یعنی احمد بن یحییٰ (ثعلب) نحوی فرماتے ہیں: "فَقِهَ الرَّجُلُ" (بالکسر) اس وقت کہتے ہیں جب کامل ہو جائے اور "فَقُهَ" (بالضم) اس وقت کہتے ہیں جب فقہ سے فی الجملہ واقفیت حاصل ہو جائے۔ ابن قتیبہ دینوری فرماتے ہیں: فقہ کے معنی سمجھ ہے۔ کہا جاتا ہے: "فُلَانٌ لَا يَفْقَهُ قَوْلِيُ" فلاں بندہ میری بات نہیں سمجھتا۔ قرآنِ عزیز میں ﴿ لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "لَا تَفْهَمُوْنَ" (یعنی) علم، فقہ اور فہم ایک ہی چیز ہے۔ عربی زبان میں علم اور فقہ ایک ہی چیز ہے۔ یہ مسبب کو سبب کا نام دیا گیا ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب مطابع القصیم (الریاض) نجد سے طبع ہوگئی ہے۔ مطبوعہ (۱/۳) ملاحظہ ہو۔ [ع۔ ح] نیز دیکھیں: الفقيه والمتفقه (١/ ٧٦) دار ابن الجوزي الدمام.

علامہ انباری فرماتے ہیں: فقیہ کے معنی عالم ہے، ہر عالم فقیہ ہوتا ہے۔ ”یَفْقَهُ وَلَا یَنْقَهُ“ محاورہ ہے۔ ”جانتا ہے، سمجھتا نہیں۔“ ”نَقَهْتُ“ بھی ”فَهِمْتُ“ کا مترادف ہے، اسی طرح مریض کو ناقہ کہا جاتا ہے۔ ”فقیه العرب“ کے معنی عالم العرب ہیں۔
﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ﴾ کے معنی ہیں: ”وہ عالم ہو جائیں۔“

غرض قرآنِ مجید نے فقہ اور علم کو ہم معنی استعمال فرمایا ہے۔ ائمہ کی مروجہ فقہیں گو علم ہیں، مگر یہ نزولِ قرآن کے وقت موجود ہی نہیں تھیں، اس لیے ﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ﴾ سے یہ اصطلاحی فقہ مراد نہیں لی جا سکتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت:

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر فرمایا:

«أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِالْفَقِيهِ كُلَّ الْفَقِيهِ؟» قَالُوْا: بَلٰى. قَالَ: «مَنْ لَمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، وَلَمْ يُؤْيِسْهِمْ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ، وَلَمْ يُؤْمِنْهُمْ مِنْ مَكْرِ اللّٰهِ، وَلَا يَدَعُ الْقُرْآنَ رَغْبَةً عَنْهُ إِلٰى مَا سِوَاهُ. أَلَا لَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَيْسَ فِيْهِ تَفَقُّهٌ، وَلَا عِلْمَ لَيْسَ فِيْهِ تَفَهُّمٌ، وَلَا قِرَاءَةَ لَيْسَ فِيْهَا تَدَبُّرٌ» (جامع بيان العلم وفضله: ٢/ ٤٤)

یعنی پورا ”فقیہ“ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے بے امید نہ کرے اور اللہ کی تدبیر سے بے خوف نہ ہونے دے اور قرآنِ عزیز سے اعراض کر کے دوسری طرف متوجہ نہ ہو جائے۔

تفقہ کے بغیر عبادت نہیں، فہم کے بغیر علم نہیں اور تدبر کے بغیر قراءت کوئی چیز نہیں۔

امام غزالی وغیرہ کا نقطۂ نظر:

علامہ چلپی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قَالَ الْغَزَالِيُّ: إِنَّ النَّاسَ تَصَرَّفُوْا فِيْ اسْمِ الْفِقْهِ فَخَصُّوْهُ بِعِلْمِ الْفَتَاوٰى، وَالْوُقُوْفِ عَلٰى دَقَائِقِهَا وَعِلَلِهَا، وَاسْمُ الْفِقْهِ فِي الْعَصْرِ الْأَوَّلِ كَانَ يُطْلَقُ عَلٰى عِلْمِ الْآخِرَةِ، وَمَعْرِفَةِ دَقَائِقِ آفَاتِ النُّفُوْسِ، وَالْاِطِّلَاعِ عَلٰى عِلْمِ عِظَمِ الْآخِرَةِ وَحَقَارَةِ الدُّنْيَا. قَالَ تَعَالٰى: ﴿ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا

قَوْمَهُمْ﴾ وَالْإِنْذَارُ بِهٰذَا النَّوْعِ مِنَ الْعِلْمِ دُوْنَ تَفَارِيْعِ الْفِقْهِ كَالسَّلَمِ وَالْإِجَارَةِ" اهـ (کشف الظنون: ۲/ ۹۱)

یعنی غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لوگوں نے فقہ کے لفظ میں تصرف کر کے علمِ فتاویٰ کی موشگافیوں پر بولنا شروع کر دیا ہے۔ قرنِ اول میں فقہ کا لفظ آخرت کے علم، نفس کی آفات، دنیا کی حقارت اور آخرت کی عظمت کے تصور پر بولا جاتا تھا۔ آیت: ﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ وغیرہ میں لفظ (مروجہ) فقہ کی تفریعات بیعِ سلم اور اجارہ پر نہیں بولا گیا، کیونکہ فقہ کے ذخائر اس وقت موجود نہ تھے۔

ابجد العلوم (۲/ ۵٦۹) میں ہے:

"اَلْفِقْهُ: مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا. هٰكَذَا نُقِلَ عَنْ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَالْمُرَادُ بِالْمَعْرِفَةِ: إِدْرَاكُ الْجُزْئِيَّاتِ عَنْ دَلِيْلٍ فَخَرَجَ التَّقْلِيْدُ"[1]

اس کے بعد مالہا وما علیہا کی تشریح فرماتے ہوئے فقہ میں علمِ کلام اور علم الاخلاق، تصوف اور فقہ اصطلاحی سب کو شامل فرمایا ہے۔

فقہائے حدیث؛ ایک مستقل مکتبِ فکر:

ابن ندیم (۲۸۵ھ) نے اپنی کتاب فہرست میں فقہائے مذاہب کے بعد فقہاء المحد ثین و اصحاب الحدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اَلْفَنُّ السَّادِسُ مِنَ الْمَقَالَةِ السَّادِسَةِ فِيْ أَخْبَارِ الْعُلَمَاءِ وَأَسْمَاءِ مَا صَنَّفُوْهُ مِنَ الْكُتُبِ، وَيَحْتَوِيْ عَلٰى أَخْبَارِ فُقَهَاءِ الْحَدِيْثِ"

یعنی چھٹا باب فقہائے محدثین کے فکر اور ان کی مصنفات کے تذکرے میں۔

اس باب میں ابن ندیم نے قریباً ٦۴ ائمہ کا ذکر فرمایا ہے جن میں سفیان ثوری (۱٦۱ھ) عبدالرحمان بن ابی الزناد (۱۷۴ھ) سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) امام وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) یحییٰ بن آدم (۲۰۳ھ) مکحول شامی (۱۱٦ھ) امام دارمی (۱۵۷ھ) عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ھ) ابو داود طیالسی

[1] "فقہ نفس کے متعلقات کی معرفت کا نام ہے۔ امام ابوحنیفہ سے یوں ہی منقول ہے۔ معرفت سے مراد دلیل سے جزئیات کا احاطہ کرنا ہے۔ یوں تقلید خارج ہوگئی۔"

(۲۲۷ھ) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)[1] اسحاق بن راہویہ (۲۳۰ھ) امام بخاری (۲۵۶ھ) امام مسلم بن حجاج قشیری (۲۵۸ھ) علی بن مدینی (۲۵۸ھ) یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) امام ابو داود سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۷۵ھ) امام ابوعیسیٰ ترمذی (۲۷۹ھ) وغیرہم کے اسمائے گرامی نقل فرمائے ہیں۔

احناف، موالک، شوافع، متبعینِ ائمۂ اربعہ کے علاوہ جریری (امام طبری) مکتبِ فکر کے علاوہ محدثین کا تذکرہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ بھی ایک مکتبِ فکر تھا جس کی راہیں مسائل کے اِثبات اور استنباط میں باقی ائمہ سے مختلف تھیں، اور سب ائمۂ سنت کی نظر میں نہ صرف کہ پوری عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، بلکہ تمام ائمہ اور ان کے اَتباع اس مکتبِ فکر اور ان کی علمی خدمات کو استناد اور استحسان کی نگاہ سے دیکھتے اور ائمۂ حدیث مذکورہ مکاتبِ فکر اور ان کے مسائل پر تنقید فرماتے تھے۔ ادھر یہ لوگ بھی کوشش فرماتے تھے کہ اہلِ حدیث کو ان پر تنقید کا موقع نہ دیں۔

افسوس! آج کے ''علمی'' حلقوں میں وہ تنقیدات مطاعن تصور ہونے لگی ہیں، اور یہ سب تقلید اور جمود کی کارفرمائیاں ہیں!!

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۷؍ جولائی ۱۹۷۲ء)

---

[1] ابن ندیم نے امام احمد کا سنہ وفات ۱۳۳ھ لکھا ہے جو بداہتاً غلط ہے۔ ۱۶۴ھ تو امام رحمہ اللہ کی پیدائش ہے۔ یہ ابن ندیم سے سہو معلوم ہوتا ہے۔ [مولف]

اختلاف اور حدودِ ادب

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اندازِ بحث

خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے کچھ مسائل دریافت کیے۔ حضرت امام رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا، وہ "کتاب الخراج" کے عنوان سے مصر میں شائع ہوا ہے۔ یہ جوابات تقریباً اڑھائی سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اُس زمانے کے مالی نظام کا بہت حد تک تعارف اس کتاب کی بدولت ہو جاتا ہے اور حضرت امام کی دفتری نظر کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں سے علم حاصل کیا ہے، چنانچہ ان کے مسلک میں دونوں کے طریقِ فکر کی جھلک ہے۔ وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بڑی متانت سے اختلاف فرماتے ہیں اور ان کے مسلک پر بعض جگہ کڑی تنقید بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسلک کی صحت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے، لیکن دامنِ ادب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

گھوڑے کا حصہ:

1 غنیمت کی تقسیم کے متعلق حدیث میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں گھوڑے کے لیے دو حصے عطا فرمائے اور پیدل لڑنے والوں کو ایک ایک حصہ دیا۔

اسی طرح حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"شَهِدْتُ أَنَا وَأَخِي مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حُنَيْنًا، وَمَعْنَا فَرَسَانِ لَنَا فَضَرَبَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سِتَّةَ أَسْهُمٍ: أَرْبَعَةً لِفَرَسَيْنَا، وَسَهْمَيْنِ لَنَا"[1]

"یعنی ہم دونوں بھائی اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حنین کی لڑائی میں شریک

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف (ص: ٥١) سنن الدارقطني (٤/ ١٠١)

ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیں چھ حصے عنایت فرمائے، دو دو گھوڑوں کے اور ایک ایک ہمارا اپنا حصہ۔"

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جانور کو آدمی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، اس لیے گھوڑے اور آدمی کو برابر برابر حصہ ملے گا۔ اس عقلی دلیل کے ساتھ وہ ایک اثر سے بھی استدلال فرماتے ہیں کہ شام کی ایک جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی عامل (کارندہ) نے گھوڑے اور مجاہد کو برابر کا حصہ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول فرمایا۔ فرماتے ہیں:

"قَالَ أَبُوْ يُوسُفَ: كَانَ الْفَقِيهُ الْمُقَدَّمُ أَبُوْ حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ يَقُوْلُ: لِلرَّجُلِ سَهْمٌ وَلِلْفَرَسِ سَهْمٌ، وَقَالَ: لَا أُفَضِّلُ بَهِيمَةً عَلٰى رَجُلٍ مُسْلِمٍ. وَيَحْتَجُّ بِمَا حُدِّثْنَاهُ عَنْ زَكَرِيَّا بْنِ الْحَارِثِ عَنِ الْمُنْذِرِ بْنِ أَبِيْ خَمِيصَةَ الْهَمْدَانِيِّ أَنَّ عَامِلًا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَسَمَ فِيْ بَعْضِ الشَّامِ لِلْفَارِسِ سَهْمٌ وَلِلرَّجُلِ سَهْمٌ، فَرُفِعَ ذٰلِكَ إِلٰى عُمَرَ فَسَلَّمَهُ وَأَجَازَهُ" (الخراج، ص: ٢٢)

حضرت امام کے لیے "فقیہ مقدم" کا لفظ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ خطابات کی بھرمار بھی نہیں فرمائی اور شیخ کے مقام کی رفعت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ رحمه الله، ورضي عنهما، ما أحسن سذاجتهم وأدق في العلوم أفكارهم!

حضرت امام ابویوسف رحمہ اللہ امام صاحب رحمہ اللہ کے اس استدلال سے مطمئن نہیں ہیں، اس لیے وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل کے ہر پہلو پر گفتگو فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے:

"وَمَا جَاءَ مِنَ الْأَحَادِيثِ وَالْآثَارِ أَنَّ لِلْفَرَسِ سَهْمَيْنِ، وَلِلرَّجُلِ سَهْمٌ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَأَوْثَقُ، وَالْعَامَّةُ عَلَيْهِ، وَلَيْسَ هٰذَا عَلٰى وَجْهِ التَّفْضِيلِ، وَلَوْ كَانَ عَلٰى وَجْهِ التَّفْضِيلِ مَا كَانَ يَنْبَغِيْ أَنْ يَّكُوْنَ لِلْفَرَسِ سَهْمٌ وَلِلرَّجُلِ سَهْمٌ، لِأَنَّهُ قَدْ سَوَى بَهِيمَةً بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ، إِنَّمَا هٰذَا عَلٰى أَنْ يَّكُوْنَ عُدَّةُ الرَّجُلِ أَكْثَرَ مِنْ عُدَّةِ الْآخِرِ، وَلِيَرْغَبَ النَّاسُ فِيْ ارْتِبَاطِ الْخَيْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، أَلَا تَرٰى أَنَّ سَهْمَ الْفَرَسِ يُرَدُّ عَلٰى صَاحِبِ الْفَرَسِ فَلَا يَكُوْنُ لِلْفَرَسِ دُوْنَهُ، وَالْمُتَطَوِّعُ وَصَاحِبُ الدِّيْوَانِ فِي الْقِسْمَةِ سَوَاءٌ" (الخراج، ص: ٢٢)

① جن احادیث میں گھوڑے کے دو حصے اور مجاہد کے ایک حصے کا ذکر ہے، وہ صحیح بھی ہیں اور زیادہ بھی۔

② جمہور کا بھی یہی مسلک ہے (یعنی شیخ محترم منفرد ہیں)

③ یہ تقسیم اظہارِ فضیلت کے لیے نہیں، ورنہ ایک مسلمان کا ایک گھوڑے کے برابر ہونا بھی توہین سے خالی نہیں۔

④ اصل مقصد یہ ہے کہ جنگ کی تیاری ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کی جائے، تاکہ اس میں آخرت کے علاوہ دنیوی فائدہ بھی ہو۔

⑤ لوگ گھوڑوں کی پرورش پر زیادہ توجہ دے سکیں۔

⑥ گھوڑے کا حصہ بھی گھوڑے کو نہیں دیا جاتا۔ جو کچھ گھوڑے کو ملے گا، وہ بھی تو مالک ہی کو ملے گا۔

⑦ رضا کار اور عمالِ حکومت تقسیم میں برابر ہیں، اس لیے فضیلت کی بحث برمحل نہیں۔ امیر المومنین جس قول پر چاہے عمل کرے اور جسے عامۃ المسلمین کے لیے مفید سمجھے، اسے قانونی صورت دے دے۔

قابلِ غور معاملہ یہ ہے کہ بحث میں نہ تو طنز ہوا ہے اور نہ ہی ذاتیات کا ذکر۔ حضرت الامام کے مسلک کے تمام پہلوؤں پر شاگردِ رشید نے تنقیدی نظر فرمائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی پہلو بھی سلامت نہیں رہا، لیکن غیر سنجیدہ ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا۔ دوسری طرف ہمارا یہ طریقِ بحث معلوم نہیں، کب سے شروع ہوا ہے کہ پوری بحث ذاتیات میں الجھی رہتی ہے اور ذاتی عداوت کے ساتھ ایک نئی مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے سب ایک ہی مرض کے مریض ہیں۔ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى!

زمین کی بٹائی:

2 زمین کی بٹائی کے متعلق اہلِ علم میں اختلاف ہے۔ اہلِ حجاز اور اہلِ مدینہ سفید زمین کا بٹائی پر دینا مکروہ سمجھتے ہیں، لیکن اگر زمین میں کچھ کھجوریں اور درخت ہوں اور ان درختوں کے ساتھ سفید زمین بھی ہو جس میں کھیتی ہو سکے تو اسے بٹائی پر دینا جائز سمجھتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سفید زمین اور درختوں کے ساتھ ملحقہ زمین دونوں میں بٹائی ناپسند فرماتے ہیں اور ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ دونوں صورتوں کو جائز اور درست سمجھتے ہیں۔

حضرتِ امام اسے اِجارہ فاسدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ثلث (تہائی) اور ربع (چوتھائی) سے اجرت کی مقدار کا تعین نہیں ہوتا اور اجرت مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چوتھائی یا تہائی حصے میں مزدور کو غلے کی اتنی تھوڑی مقدار ملے جو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ نہ ہو اور مزدور

نقصان میں رہے۔ یہ قطعی غلط ہے کہ حضرت امام رحمہ اللہ زمین کی ملکیت ہی کے منکر ہیں۔ یہی زمین اگر نقد روپے پر دے دی جائے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اس سے شرح اجرت کا تعین ہوجاتا ہے اور مزدور کا نفع نقصان واضح ہوجاتا ہے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ (اہلِ حجاز) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (اہلِ کوفہ) دونوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ اس مسئلے میں اہلِ حدیث اور امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کے ہم نوا ہیں۔ موصوف حضرت امام کے دلائل پر متانت سے بحث فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

”فَأَحْسَنُ مَا سمِعْنَاهُ فِيْ ذٰلِكَ -وَاللّٰهُ أَعْلَمُ- أَنَّ ذٰلِكَ كُلَّهُ جَائِزٌ مُسْتَقِيْمٌ صَحِيْحٌ، وَهُوَ عِنْدِيْ مِثْلُ مَالِ الْمُضَارَبَةِ، قَدْ يَدْفَعُ الرَّجُلُ إِلىٰ الرَّجُلِ الْمَالَ مُضَارَبَةً بِالنِّصْفِ وَالثُّلُثِ فَيَجُوْزُ، وَهٰذَا مَجْهُوْلٌ، لَا يَعْلَمُ مَا مَبْلَغُ رِبْحِهِ، وَلَيْسَ فِيْهِ اخْتِلَافٌ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ فِيْمَا عَلِمْتُ، وَكَذٰلِكَ الْأَرْضُ عِنْدِيْ هِيَ بِمَنْزِلَةِ الْمُضَارَبَةِ: اَلْأَرْضُ الْبَيْضَاءُ مِنْهَا وَالنَّخْلُ وَالشَّجَرُ سَوَاءٌ“ (الخراج، ص: ۱۰۵)

”صحیح یہ ہے کہ بٹائی کی دونوں صورتیں بالکل صحیح اور درست ہیں، اس کی نظیر مضاربت ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو مال دیتا ہے کہ وہ کام کرے، منفعت کا نصف یا ثلث اس سے طے پا جاتا ہے۔ یہ مضاربت باتفاقِ ائمہ درست ہے، حالانکہ اس میں نفع مجہول ہے۔ ثلث یا نصف میں کس قدر فائدہ حاصل ہوگا؟ اس کی مقدار معلوم نہیں۔ زمین کی بٹائی کا بھی یہی حال ہے۔ سفید زمین ہو یا باغ حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں برابر ہیں اور درست ہے۔“

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف ہے۔ وجہِ اختلاف کا اظہار فرماتے ہوئے شاگردِ رشید نے حدودِ ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استدلال میں جو نقص تھا اسے واضح کیا ہے، لیکن طنز و تشنیع سے بالکلیہ دور رہے ہیں۔ رحمهم الله رحمة واسعة.

تقلید یا ترکِ تقلید:

ہمارے ملک میں تقلید اور ترکِ تقلید کی بحث تقریباً ایک صدی سے جاری ہے۔ فریقین نے

باہمی مناظرات میں سیکڑوں اوراق لکھ ڈالے ہیں۔ باہمی مقدمات میں ہزاروں روپے صرف ہو گئے ہیں، مگر حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اہلِ حدیث کی یہ خواہش ہے کہ ائمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات اور فتاویٰ کو استشہاد میں وہ مقام نہ دیا جائے کہ اس پر مزید بحث کی گنجایش نہ رہے، بلکہ ان کو وقتی تقاضوں کی حیثیت دی جائے اور ابدی تعلیم اور دائمی استناد کی حیثیت صرف وحی، یعنی قرآنِ عزیز اور سنتِ نبوی کو ہی حاصل ہونی چاہیے۔

ائمۂ اسلام کا علم طریقِ فہم میں معاون ہوسکتا ہے اور وقت کے تقاضوں اور ان کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ان بزرگوں کی حیثیت اساتذہ کی سی ہے اور ان کے علوم بلاشبہہ ہمیں راہنمائی دے سکتے ہیں۔ ان کے اختلافات سے ان وقتی تقاضوں کی اہمیت معلوم کی جاسکتی ہے جس کی بنا پر ان بزرگوں کو اختلافات کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس قسم کے تقاضوں کی بنا پر اگر آج بھی اہلِ علم باہم یا ائمۂ متقدمین سے اختلاف کریں تو ان کو اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

لیکن اس ضمن میں ایک عجیب لغزش ہوئی۔ ائمہ کی محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی اُلفت نے مخالفین پر طعن کے لیے راہ کھول دی اور ایک دوسرے کے علم وفہم پر حملے ہونے لگے۔ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے علم و فضل کے متعلق ایسے الفاظ استعمال فرمائے جو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے مقام کے لحاظ سے قطعاً نامناسب تھے، اسی طرح حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علم و فضل پر دوسری جانب سے حرف گیری کی گئی جس سے امام رحمہ اللہ کا مقام کہیں بلند تھا۔ موالک اور حنابلہ میں بھی بعض اہلِ علم اس حرف گیری سے نہ بچ سکے۔ اس غلط روی کی مثالیں کتبِ اصولِ فقہ سے بہ کثرت مل سکتی ہیں۔

اہلِ حدیث نے اسی بے اعتدالی کی بنا پر ترکِ تقلید کی دعوت دی، تاکہ محبت میں غلو دوسرے ائمہ کے متعلق بدظنی کا سبب نہ بنے۔ ایک امام یا بزرگ سے دلی تعلق یا ربط اس حد تک نہ پہنچے جس سے دوسرے بزرگ یا امام سے بدگمانی پیدا ہو، لیکن افسوس ہے کہ یہ علاج خود مرض کی صورت اختیار کر گیا اور ائمہ کے اجتہادی مسائل کو اَغلاط تصور کیا گیا۔ ان کے علمِ حدیث پر دل خراش عنوان قائم کر کے بعض حضرات نے بالکل وہی صورت پیدا کر دی ہے جس سے بچنے کے لیے ترکِ تقلید کا نسخہ تجویز کیا گیا تھا۔ کسی نے "اَلْجَرْحُ عَلَی الْبُخَارِيِّ" لکھ کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک خالص علمی مشغلہ یکا یک انتقامی جنگ کی صورت اختیار کر گیا اور نیک دل ائمہ ہماری

باہمی کدورتوں کا تختۂ مشق بن گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. اور یہ روش زمانے کے ہزارہا تھپیڑوں کے باوجود ختم نہیں ہوسکی۔

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے تحقیقی ارشادات ہم ایسے طالب علموں کے لیے بہترین راہنما ہیں۔ اگر بحث نفسِ مسئلہ تک محدود رہے اور تنقید کی گرفت دلائل سے آگے نہ بڑھے تو میں سمجھتا ہوں کہ بحث میں تلخی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بحث کی یہی ایک صورت ہے جو دلوں تک رسائی حاصل کرسکتی ہے۔ ائمۂ سلف سے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے یہ ارشادات بہترین عملی نمونہ ہیں۔ رحمه الله ورضي عنه وأرضاه.

امام کا اندازِ خطاب:

حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کاشتکاری کی بحث کا آغاز فرماتے ہوئے اپنے دونوں مخالفین (شوافع اور احناف) کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

"فَإِنَّ أَصْحَابَنَا مِنْ أَهْلِ الْحِجَازِ وَأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى كَرَاهَةِ ذٰلِكَ وَإِفْسَادِهٖ" (الخراج، ص: ۱۰۵)

یعنی ہمارے حجازی رفقاء سفید زمین کے اجارے کو پسند نہیں فرماتے، بلکہ اسے فاسد سمجھتے ہیں۔

"وَأَمَّا أَصْحَابُنَا مِنْ أَهْلِ الْكُوْفَةِ فَاخْتَلَفُوْا فِيْ ذٰلِكَ"

"اور ہمارے کوفہ کے رفقاء اس معاملے میں حجازیوں سے مختلف ہیں۔ وہ سفید زمین اور باغ کے جواز اور عدمِ جواز کو ایک ہی حیثیت میں رکھتے ہیں۔"

اختلافی مسائل کی تحقیق میں اپنے دونوں مخالفوں کے لیے "أَصْحَابُنَا" کا خطاب کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ دلی صفائی کا کتنا بہترین ترجمان ہے۔ کاش! ہم لوگ جب ان بزرگوں کے علم سے فائدہ حاصل کرتے ہیں تو ان کے اخلاق سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کریں!

اپنی رائے کے اظہار میں جس سادگی کا اظہار فرمایا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمایئے:

"قَالَ أَبُوْ يُوْسُفَ: فَكَانَ أَحْسَنُ مَا سَمِعْنَاهُ فِيْ ذٰلِكَ ـوَاللّٰهُ أَعْلَمُـ أَنَّ ذٰلِكَ جَائِزٌ مُسْتَقِيْمٌ، اِتَّبَعْنَا الْأَحَادِيْثَ الَّتِيْ جَاءَتْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مُسَاقَاةِ خَيْبَرَ، لِأَنَّهَا أَوْثَقُ عِنْدَنَا وَأَكْثَرُ وَأَعَمُّ مِمَّا جَاءَ فِيْ خِلَافِهَا مِنَ

الْأَحَادِيْثِ" (الخراج، ص: ۱۰۶)

''ہمارے نزدیک سفید زمین اور باغ دونوں کا بٹائی (ثلث یا نصف) پر دینا درست ہے، کیونکہ خیبر کی زمین اور اس کی بٹائی کے متعلق جو احادیث آئی ہیں، صحیح اور زیادہ عام ہیں اور اس کے خلاف جو احادیث وارد ہوئی ہیں، وہ صحت، کثرت اور عموم میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، اس لیے جوازِ اجارہ میں عموم کو ترجیح ہے۔''

دلائل کی ترجیح میں مخالفین پر طعن تو کہیں رہا، ان کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے اس اسوہ سے اہلِ حدیث اور احناف دونوں کو خصوصاً اور دوسرے اہلِ علم کو عموماً سبق حاصل کرنا چاہیے۔

زکات اور غیر مسلم:

3 اگر کوئی غیر مسلم ایسی زمین خریدے جس پر عشر واجب ہے تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اب اس پر عشر کی جگہ خراج واجب ہوگا اور یہ خراج اس سے بدلا نہیں جائے گا، گو وہ مسلمان ہی سے کیوں نہ خریدی گئی ہو۔ یعنی حضرتِ امام کے نزدیک خراجی زمین مسلمان کے قبضے میں بھی آجائے تو وہ عشری نہیں ہوگی، اس کا معاملہ زکات کی صورت میں نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ خراج کی صورت میں لیا جائے گا، اس کے برعکس حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور عطا رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جب تک یہ زمین غیر مسلم کے قبضے میں ہوگی، اس پر عشر سے دوگنا رقم عائد ہوگی اور یہی اس کا خراج ہوگا، لیکن جب یہ زمین مسلمان خریدے یا اس کا غیر مسلم مالک مسلمان ہوجائے تو اس پر بھی عشر ہی وصول کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف، حضرت حسن اور عطاء کے مسلک کو پسند فرماتے ہیں: "فَكَانَ قَوْلُ الْحَسَنِ وَعَطَاءٍ أَحْسَنَ عِنْدِيْ مِنْ قَوْلِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ". حضرت امام کے استدلالِ گرامی کا جواب ارشاد ہوتا ہے:

"أَلَا تَرَىٰ أَنَّ الْمَالَ يَكُوْنُ لِلْمُسْلِمِ لِلتِّجَارَةِ فَيَمُرُّ بِهِ عَلَى الْعَاشِرِ فَيُجْعَلُ عَلَيْهِ رُبُعَ الْعُشْرِ فَإِذَا اشْتَرَاهُ ذِمِّيٌّ فَمَرَّ بِهِ عَلَىٰ الْعَاشِرِ لِتِجَارَةٍ، جَعَلَ عَلَيْهِ نِصْفَ الْعُشْرِ ضِعْفَ مَا عَلَىٰ الْمُسْلِمِ، فَإِنْ عَادَ إِلَىٰ مُسْلِمٍ جُعِلَتْ فِيْهِ رُبُعُ الْعُشْرِ، فَهٰذَا مَالٌ وَّاحِدٌ، يَخْتَلِفُ الْحُكْمُ فِيْهِ عَلَىٰ مَنْ يَّمْلِكُهُ

فَكَذٰلِكَ الْأَرْضُ مِنْ أَرْضِ الْعُشْرِ" (الخراج، ص: ۱۴۵)

"امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ زمین کی بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں، بلکہ یہ مالک کے تابع ہے۔ جیسے تجارت کا مال اگر مسلمان اسے چنگی سے لے کر گزرے تو اسے ربع العشر (چالیسواں حصہ) دینا ہوگا اور اگر یہی مال غیر مسلم خریدے تو اس سے نصف العشر (بیسواں حصہ) لیا جائے گا، پھر اگر مسلمان خریدے تو اس سے چالیسواں حصہ وصول ہوگا۔"

غرض مالک کی تبدیلی سے خراج وعشر کی نوعیت بھی بدلتی رہے گی۔ حضرت امام اس میں مالک کو زمین کے تابع فرماتے ہیں جو درست نہیں۔ مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھ لینے کے بعد جب اصل دلیل پر بحث کی جائے اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجائے تو طعن وتشنیع کے بغیر ہی مسئلہ صاف ہوجاتا ہے۔ سلف کا یہی انداز تھا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی "کتاب الخراج" میں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے علماء معمولی اختلافات پر عبوساً قمطریراً بنے پھرتے ہیں اور اس کا نام "تقویٰ" رکھا جاتا ہے۔ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكىٰ!

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۲۶/ مئی ۱۹۵۰ء)

اسلافِ کرام کا مطلوب احترام

اور

تقلیدِ جامد کے کرشمے

اپنے اسلافِ کرام رحمہم اللہ کا ادب ضروری ہے اور اخلاق کا بھی یہ اہم مسئلہ ہے۔ مشہور حدیثِ نبوی ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا»[1] (مشکوۃ)

یعنی جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ادب بڑی ضروری چیز ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ عموماً مذہبی گروہ اور فرقے آپس میں اس چیز کا لحاظ نہیں رکھتے، بلکہ جن اکابر ائمہ سے مسلک میں اختلاف ہو، ان سے کم درجے کے لوگ ان کے متعلق بے ادبی کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اسے خوبی بلکہ سچائی سمجھا جاتا اور اس ناروا تعصب کو حق گوئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ کمزوری تقلیدِ جامد کی پیداوار ہے۔ یہ کسی ایک بزرگ کے ساتھ غیر معتدل اور مفرط محبت کا شاید تقاضا ہے کہ اپنے مقلد کے مخالفین سے بغض ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوافع:

امام الحرمین ابو المعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی رحمہ اللہ[2] (م ۴۷۸ھ) فقہ شافعی کے بہت بڑے ترجمان ہیں۔ ان کی رہایش نیشا پور میں تھی۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا، ان کی عمر بیس برس تھی۔ یہ اسی وقت اپنے والد کی مسند پر تعلیم و تدریس کا کام کرنے لگے۔ بعدہٗ یہ بیت اللہ چلے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩١٩)

[2] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، مثلاً: وفیات الاعیان (۳۴/۲) یہ جوین کی طرف منسوب ہیں جو نیشا پور کی طرف ایک گاؤں تھا۔ [مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی]

گئے۔ چار سال تک وہاں ٹھہرنے کے بعد واپس نیشا پور آ گئے، پھر یہیں تیس سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ آپ شافعی فقہ کے بہت بڑے ماہر اور ترجمان تھے۔

معلوم ہوتا ہے پانچویں صدی ہجری کے قریب اس علاقے میں شافعیت کو بہت عروج تھا۔ امام الحرمین نہ صرف درس دیتے رہے، بلکہ اس دیار میں محراب اور منبر پر بھی ان کا ہی قبضہ تھا۔

واضح رہے کہ امام الحرمین کے لقب سے دو آدمی مشہور ہیں: ایک حنفی قاضی ابوالمظفر یوسف الجرجانی، جو فقہ حنفی کے بڑے ماہر امام تھے۔ دوسرے یہی ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ امام الحرمین، جو شافعی تھے۔ (الفوائد البهية، ص: ٢٤٦ طبع مصر)

آخر الذکر شافعی مسلک کے بے حد عقیدت مند ہیں، جیسا کہ اس موضوع پر ان کی ایک کتاب ''مغيث الخلق في ترجيح القول الحق'' کے نام سے پتا چلتا ہے جو انھوں نے شافعی فقہ اور مسلک کی فقہ حنفی پر ترجیح میں لکھی ہے جس میں اگرچہ حضرت امام ابوحنیفہ کا ذکر بڑے احترام سے کیا گیا ہے، تاہم استحقار اس سے ٹپکتا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ یہ تقلیدِ جامد کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جس کی کمی احناف میں بھی نہیں، بلکہ باقی مکاتبِ فکر کے فقہاء سے حنفیہ میں بے ادبی کے اس قسم کے جراثیم زیادہ ہیں۔ بہرحال امام الحرمین جوینی فرماتے ہیں:

''فَإِنَّ الشَّافِعِيَّ كَانَ عَالِمًا فِي الْأُصُولِ وَالْفُرُوعِ وَاللُّغَاتِ وَأَنْوَاعِ الْعُلُومِ، وَأَبُو حَنِيْفَةَ لَمْ يَكُنْ لَهُ قَدَمٌ مُتَرَسِّخَةٌ فِي بَعْضِ هٰذِهِ الْعُلُومِ عَلىٰ مَا لَا يَكَادُ يَخْفىٰ، وَكَانَ أَبُو حَنِيْفَةَ ذَا فَنٍّ وَّاحِدٍ''[1] (ص٢٣ مغيث الخلق طبع مصر ١٣٥٣ھ)

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''امام شافعی جامع العلوم اور نسبتاً قریشی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ائمہ قریش سے ہوں گے اور قریش سے آگے مت بڑھو۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے ان کا مذہب غیر سے بہتر ہے:

''وَأَبُو حَنِيْفَةَ نَبَطِيٌّ لَا عَرَبِيٌّ وَالشَّافِعِيُّ عَرَبِيٌّ فَضْلًا أَنْ يَّكُوْنَ قُرَشِيًّا مِنْ قُرَيْشٍ''[2] (ص: ٣٢)

---

[1] ''امام شافعی اصول و فروع، لغات سمیت دیگر انواعِ علوم میں مہارت رکھتے تھے، جبکہ امام ابوحنیفہ مذکورہ بالا بعض علوم میں زیادہ مہارت کے مالک نہ تھے۔ امام ابوحنیفہ ایک ہی فن جانتے تھے۔''

[2] ''امام ابوحنیفہ عربی نہیں بلکہ نبطی ہیں جبکہ امام شافعی عربی اور قرشی ہیں۔''

بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لِأَبِيْ حَنِيْفَةَ أُصُوْلٌ بَاطِلَةٌ مَقْطُوْعٌ بِهَا مِنْهَا... الخ"

اس کے بعد ان کے مسئلہ ''استحسان'' اور ''قیاس'' کے مخالف خبرِ واحد کے انکار کا ذکر کیا ہے۔
(أيضاً، ص: ٣٢)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حضرت عمر فاروق، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم ایسے کبار صحابہ کی روایات کو رد فرما دیتے ہیں، حالانکہ بقول امام شافعی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہ ان کے درّے نے زمین میں قرار و سکون پیدا کر دیا تھا، جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو برقرار رکھا تو آپ حضرات (حنفیہ) اسے کیسے رد کر سکتے ہیں؟ (أيضاً، ص: ٣٣)

ایک جگہ حدیث میں امام شافعی کی وسعتِ نظر کا ذکر کر کے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"كَانَتْ بِضَاعَتُهُ مِنْ عِلْمِ الْحَدِيْثِ مُزْجَاةً" (أيضاً، ص: ٣٥)

''ان کی نظر فنِ حدیث میں ناقص تھی۔''

پھر امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کی دقتِ نظر کے تقابل کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دقتِ نظر کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَلٰكِنْ نَظَرُ الشَّافِعِيِّ أَدَقُّ، فَالْإِمَامَانِ -رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى- دَقَّقَا نَظَرَيْهِمَا إِلَّا أَنَّ دَقِيْقَةَ أَحَدِهِمَا تُلَائِمُ الْأُصُوْلَ وَالْقَوَاعِدَ وَالْأَسَاسَ، وَنَظَرُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ، وَإِنْ دَقَّ، إِلَّا أَنَّهُ لَا يُوَافِقُ الْأُصُوْلَ، وَيُخَالِفُهَا وَيَحِيْدُ عَنْهَا، وَأَكْثَرُ نَظَرِهِ يُخَالِفُ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَالْآثَارَ وَإِجْمَاعَ الْأُمَّةِ" اھ

خلاصہ یہ کہ امام شافعی کی نظر دقیق اور اصول کے مطابق ہے، جب کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دقتِ نظر اصول سے مطابقت نہیں کھاتی، نیز کتاب و سنت، آثار اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ (ص ٣٧۔ ٣٨)

اس کے بعد بعض مسائلِ فقہ حنفیہ کا اصولی جائزہ لیا ہے اور تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے بعد نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں:

اسی لیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور محمد رحمہ اللہ نے اپنے استاد کی دو تہائی مذہب میں مخالفت فرمائی ہے اور اکثر مسائل میں شافعی رحمہ اللہ کا ساتھ دیا ہے:

"فَلِهٰذَا اسْتَنْكَفَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ وَأَبُوْ يُوْسُفَ عَنْ مُتَابَعَتِهِ فِيْ ثُلُثَيْ مَذْهَبِهِ، وَوَافَقَا الشَّافِعِيَّ فِيْ أَكْثَرِ الْمَسَائِلِ" (ص: ٤٤)

اسی ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ امام شافعی رحمہ اللہ سے استفادہ فرماتے تھے اور ان کی انتہائی عزت کرتے تھے:

"وَيَجْلِسَانِ بَيْنَ يَدَيْهِ كَأَنَّ عَلىٰ رُؤُوْسِهِمَا الطَّيرَ" (ص: ٤٦)

"وہ امام شافعی کے سامنے سر جھکا کر خاموش بیٹھتے تھے۔"

بعدہ ہارون الرشید رحمہ اللہ کے دربار کی بعض مجالس کا ذکر کیا ہے۔ ہارون کے دربار میں امام شافعی کی عزت اور توقیر سے امام ابو محمد اور امام ابو یوسف کو حسد ہوا۔ وہ دربار میں امام شافعی کو ذلیل کرنا چاہتے تھے، مگر معاملہ الٹ ہو گیا اور انھیں خفت ہوئی۔ (ص: ۴۶)

سلطان محمود بن سبکتگین[1] کا ذکر کیا کہ وہ پہلے حنفی تھے۔ قفال شاشی[2] کی دو رکعت نماز، جو انھوں نے بدرجہ اقل حنفی مذہب کے مطابق پڑھائی، دیکھ کر سلطان شافعی ہو گئے۔ (ص ۵۷ تا ۵۹)

یہ وہی قصہ ہے جسے ابن خلکان[3] نے اسی کتاب "مغيث الخلق" سے نقل کیا ہے جس سے فی الواقع حنفی مذہب سے نفرت ہوتی ہے اور یہ نماز کی ایسی صورت ہے جسے برداشت کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد امام الحرمین نے حنفی مذہب کے نماز، حج، صوم، نکاح، املاک، معاملات، زکات، جنایات وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور حنفی اور شافعی کے مسائل کا تقابل کیا ہے اور شافعی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ اس طویل تفصیلی جائزے کے بعد امام الحرمین لکھتے ہیں:

"وَلَسْنَا نَذْكُرُ هٰذَا لِلتَّعَصُّبِ، بَلْ هُمُ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُبَالِغُوْنَ فِيْ التَّعَصُّبِ عَلَى الشَّافِعِيِّ رحمه الله حَتّٰى أُخْبِرَ الشَّافِعِيَّ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ وَأَبَا يُوْسُفَ

---

① متوفی ۴۲۲ھ۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے، مثلاً: ابن خلکان (۴/ ۲۶۲۔ ۲۶۹) طبع محی الدین عبدالحمید [ع۔ح]

② ابوبکر محمد بن علی القفال الکبیر الشافعی کے حالات کے لیے دیکھیے: ابن خلکان (۳/ ۳۳۸) طبع مذکور [ع۔ح]

③ وفیات الاعیان (۴/ ۲۶۷) طبع مذکور۔ [ع۔ح]

كَانَا يَدْعُوَانِ اللّٰهَ تَعَالىٰ وَيَقُوْلَانِ: اَللّٰهُمَّ أَمِتِ الشَّافِعِيَّ فَأَنْشَدَ، وَقَالَ:

تَمَنّٰى رِجَالٌ أَنْ أَمُوْتَ وَإِنْ أَمُتْ فَتِلْكَ سَبِيْلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِأَوْحَدِ

فَقُلْ لِلَّذِيْ خِلَافَ الَّذِيْ مَضٰى تَهَيَّأْ لِأُخْرىٰ مِثْلِهَا فَكَانَ قَدْ

یعنی یہ باتیں حقیتِ حال کی وضاحت کے طور لکھی گئی ہیں، کسی تعصب کے سبب نہیں، کیونکہ امرِ واقع یہ ہے کہ یہ (حنفی) حضرات امام شافعی سے تعصب رکھتے ہیں، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ امام ابو یوسف اور امام ابو محمد بددعا کیا کرتے تھے کہ شافعی مر جائیں، جس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: کئی آدمی میری موت کی آرزو کرتے ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی، جو لوگ پیچھے رہ رہیں ہیں ان سے کہہ دو: وہ بھی اس کے لیے تیار رہیں۔

اس کے بعد ہارون الرشید کی مجلس میں کچھ مسائل کا ذکر کیا ہے جن کا جواب امام ابو یوسف نہ دے سکے۔ اسانید کے لحاظ سے یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں، اس وقت اس سے بحث نہیں، اگر یہ درست ہیں تو یقیناً یہ مناقشہ ان تعلقات کی پیداوار ہے جو ایک فریق کو اپنے فریق سے تھے۔ اگر یہ واقعات غلط ہیں تو امام الحرمین رحمہ اللہ ایسے بڑے فقہی امام سے اس کا ارتکاب انتہائی عصبیت ہوگی جس کی بنیاد تقلیدِ شخصی اور اس پر جمود کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

احناف:

فقہ شافعی اور اس قسم کے مجادلات کا لٹریچر ہمارے ملک میں کم ہے۔ ممکن ہے شوافع میں امام الحرمین سے بھی زیادہ کسی نے حنفیہ پر تنقید کی ہو۔ اس کے بالمقابل جہاں تک احنافِ کرام کا تعلق ہے، یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ بے ادبی کی یہ جنس ان کے ہاں زیادہ اور عام ہے۔

علامہ محمد زاہد کوثری مرحوم:

علامہ مذکور قریبی زمانے کے عالم ہیں۔ ان کی نظر رجال اور متون پر خاصی ہے، لیکن ان کی ساری فنی مہارت شوافع اور اہلِ حدیث کے خلاف صرف ہوئی۔ مرحوم کوثری بلا کے متعصب[1] ہیں۔

[1] اس قدر کہ بعض اہلِ علم ان کو ''مجنون ابی حنیفہ'' کہا کرتے تھے۔ (تعلیق بدع التفاسیر، ص: ۱۷۰ از شیخ عبداللہ غماری) [ع۔ح]

تخریجِ زیلعی کے مقدمہ اوران کی کتاب احقاق الحق وغیرہ اورحواشی اور رسائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔اپنے رسالے "إحقاق الحق" کے صفحہ (۵۔۴) میں امام الحرمین کے متعلق فرماتے ہیں:

"عَلَا جَلَالَةُ قَدْرِهٖ بَيْنَ الشَّافِعِيَّةِ وَكَثُرَتْ مُؤَلَّفَاتُهُ فِي الْفِقْهِ وَالْأُصُوْلِ، لَا خِبْرَةَ لَهُ بِالْحَدِيْثِ"[1] (بحواله تنبيه الباحث السري للعلامة محمد المغربي، ص: ٤٩)

حالانکہ بعض فنون میں کمال اور بعض میں کمزوری احناف میں بھی موجود ہے۔ صاحبِ ہدایہ پر ان کی جلالتِ قدر کے باوجود نقلِ روایت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ امام بزدوی اور ان کی اصول کے شارح علامہ عبدالعزیز بخاری کی بھی یہی حالت ہے۔ اس میں امام الحرمین منفرد نہیں، لیکن علامہ کوثری ان پر اس لیے ناراض ہیں کہ وہ ہمارے امام شافعی رحمہ اللہ سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔

شیخ ملا جیون رحمہ اللہ:

اورنگ زیب عالمگیر کے استاد ہیں۔ اسمِ گرامی احمد ہے۔ اپنے وقت کے مشاہیر سے ہیں۔ اورنگ زیب انھیں بڑی عزت سے دیکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر احمدی اور نور الانوار ان کی مشہور تصانیف سے ہیں۔ نور الانوار اصولِ فقہ میں درسی اور متداول کتاب ہے، ان کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوا۔

شیخ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے جو اہلیت (خطاب) کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان میں بعض سماوی (غیر اختیاری) ہیں اور بعض کسبی (اختیاری)۔ کسبی کی تفصیل میں انھوں نے جہل کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں:

"جَهْلٌ بَاطِلٌ، جَهْلُ صَاحِبِ الْهَوٰى، جَهْلٌ بَاغِيْ، جَهْلُ الْمُجْتَهِدِ بِالْكِتَابِ أَوْ بِالسُّنَّةِ"

آخری قسم کی مثال میں فرماتے ہیں:

"كَجَهْلِ الشَّافِعِيِّ فِيْ حِلِّ مَتْرُوْكِ التَّسْمِيَةِ عَامِدًا قِيَاسًا عَلٰى مَتْرُوْكِ التَّسْمِيَةِ نَاسِيًا"[2] (نور الأنوار، ص: ٢٩٨)

---

[1] "یہ شوافع میں بلند مرتبے کے حامل ہیں اور فقہ و اصول میں ان کی تصانیف بھی بہت ہیں مگر ان کو حدیث کا علم نہیں تھا۔"

[2] "جیسے شافعی کی جہالت ہے کہ وہ ذبح کے وقت عملاً بسم اللہ ترک کرنے پر بھی ذبیحے کو حلال کہتے ہیں، کیوں کہ وہ اسے نسیاناً بسم ترک کرنے پر قیاس کرتے ہیں۔"

اس کے بعد امام داود ظاہری رحمہ اللہ کی اجتہادی جہالت کا ذکر فرمایا کہ وہ بعض احادیث کی بنا پر امہاتِ اولاد کی (جن لونڈیوں کی گود میں اپنے مالک کی پشت سے اولاد ہو) بیع کو جائز سمجھتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کی دوسری اجتہادی جہالت یہ ہے کہ وہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ بناءًا علی الحدیث مدعی کے دعوے کو ثابت سمجھتے ہیں۔

حضرت ملا جیون رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر کے باوجود یہ ترکیب عجیب ہے کہ ''مجتہد ہو اور جاہل'' پھر اس جہالت کا تعلق کتاب اللہ سے ہے اور آنحضرت ﷺ کی سنت سے جاہل بھی اور مجتہد بھی۔ خوب رہی! کیا مقامِ اجتہاد کے ساتھ یہ مذاق اور اس کی توہین نہیں؟

نبوت کے بعد مجتہد کا امت میں جو علمی مقام ہے، معلوم ہے۔ کیا اس رفعت کے باوجود اسے بوقتِ ضرورت جاہل بھی کہا جا سکتا ہے؟ اگر فرعی اور اجتہادی مسائل میں کسی امام سے اختلاف کیا جائے یا کسی جزئی پر تنقید کی جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیا جائے کہ یہ بے ادبی ہے اور خود حضرت اسے جہالت سے تعبیر فرمائیں تو کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ پھر اس پر عجیب شان سے فرماتے ہیں:

''وَقَدْ نَقَلْنَا كُلَّ هٰذَا عَلىٰ نَحْوِ مَا قَالَ أَسْلَافُنَا، وَإِنْ كُنَّا لَمْ نَجْتَرِئْ عَلَيْهِ''

(نور الأنوار، ص: ۲۹۸)

یعنی ہم نے اپنے بزرگوں کی نقل کی ہے، ورنہ ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

امام شافعی اور امام داود رحمہما اللہ کی شان میں اس سے زیادہ اور کیا گستاخی کی جا سکتی تھی؟ لیکن جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا کہ یہ سب تقلیدِ جامد کی برکت ہے، ورنہ جرأت واقعی مشکل ہے۔ امام جوینی کا اندازِ تنقید آپ پڑھ چکے ہیں، وہ اس قدر عریاں نہیں۔ ہمارے برادرانِ احناف اس معاملے میں واقعی دلیر ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ ایسی مسلمہ شخصیت کو جاہل کہنا ان کے ہاں معمول کی بات ہے!!

مسئلہ متروک التسمیۃ:

اب لگے ہاتھوں اس مسئلے پر غور فرمائیں کہ حضرت امام شافعی کا اس میں جرم کیا ہے اور اس اجتہاد میں کون سی جہالت برتی ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ اگر ذبیحہ پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ۱۲۱]

''جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اسے مت کھاؤ۔''

اس کے عموم میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن پر بتوں کا نام لیا گیا، وہ بھی شامل تھیں جن پر بھول اورنسیان کی وجہ سے نام نہیں لیا جا سکا اور وہ اشیاء بھی جن پر عمداً اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ فقہائے احناف نے آیت کے عموم سے بھول کر متروک التسمیۃ مستثنیٰ کیا ہے، یعنی اگر کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو وہ حلال ہے۔ چونکہ کسی عموم سے ایک فرد جب خاص کر لیا جائے تو عام کی قطعیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ظنی ہو جاتا ہے، چنانچہ اصولِ فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے:

''فَإِنْ لَحِقَهُ خُصُوصٌ مَعْلُومٌ أَوْ مَجْهُولٌ لَا يَبْقَىٰ قَطْعِيًّا'' (نور الأنوار، ص: ٦٨)

یعنی اگر کسی معلوم یا مجہول مخصص کی وجہ سے عام میں تخصیص آجائے تو ظنی ہو جائے گا، اپنے مشمولات پر اس کا اطلاق قطعی نہیں ہوگا۔

اب سنیے کہ حضرت امام شافعی کا جرم صرف اس قدر ہے کہ اس ظنی نص سے انھوں نے ایک فرد کی اور تخصیص کر لی جو اصول کے مطابق بالکل درست ہے۔ یعنی متروک التسمیۃ نسیاناً جس طرح حلال ہے اسی طرح عمداً متروک التسمیۃ بھی حلال ہے۔ اگرچہ اس مسئلے میں زیادہ ٹھوس مسلک امام مالک رحمہ اللہ کا ہوگا جو ان سب صورتوں میں ذبیحہ حرام سمجھتے ہیں، تاہم امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے غلط ہو سکتی ہے، اس لیے کہ مجتہد خطا کر سکتا ہے لیکن اسے جہالت سے تعبیر کرنا بہت ہی نامناسب ہے۔

ایسے ہی امام داود ظاہری رحمہ اللہ پر ناراضگی اور جہالت کا فتویٰ بھی کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اواخر تک تو امہات الاولاد کی فروخت بوقتِ ضرورت جائز تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بیع کو حکماً روک دیا۔ فرمائیے! اس میں جہالت کی کیا بات ہوئی؟ بیسیوں روایات کی مخالفت خود فقہائے احناف رحمہم اللہ کرتے ہیں اور صحیح احادیث تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اس زعم میں کہ ان سے مدعا ثابت نہیں، بس اس طرز کو غلط تو کہا جا سکتا ہے، تاہم جہالت کہنا ائمہ کی شان میں بڑی جسارت ہے، لیکن تقلید کی وجہ سے انتقامی جذبے کے سوا اس کا موجب اور کیا ہو سکتا ہے؟

شاہد و یمین:

مسئلے کی صورت یوں ہے کہ مقدمات جب عدالت میں پیش ہوں تو ان کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں: ① مدعی کے پاس مکمل شہادت موجود ہو یا ② مدعی کے پاس شہادت بالکل موجود ہی نہ ہو،

③ مدعی کے پاس شہادت ناقص موجود ہو۔ پہلی صورت میں مدعا علیہ حلف دے گا۔

«اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي، وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ أَنْكَرَ»[1] اس نص کا تعلق ان دوصورتوں سے ہے، ناقص شہادت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ شہادت کی دوسری ایک مستقل صورت ہے۔ یعنی مدعی کے پاس اگر صرف ایک گواہ ہو تو مدعی کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ ایک شہادت کے ساتھ ایک قسم کھا جائے تو قاضی کو فیصلہ اس کے حق میں کرنا چاہیے، بشرطیکہ قاضی شہادت کی صحت کا یقین کرے۔ اگر شہادت قاضی کی نظر میں مشتبہ ہو جائے تو کوئی بھی صورت ہو، شہادت موثر نہیں ہوتی۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا فتویٰ (جن کے ساتھ دوسرے ائمہ بھی ہیں) اس مشہور صحیح حدیث کی رو سے ہے:

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِيَمِيْنٍ وَّشَاهِدٍ“[2] رواه مسلم. (مشكاة المصابيح)

یعنی بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ کی صورت میں دوسرے گواہ کے بجائے مدعی سے قسم لے کر فیصلہ صادر فرما دیا۔

بنا بریں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ نے شاہد اور یمین کو موثر سمجھا۔ فقہائے محدثین بھی اس کے مؤید ہیں۔ فقہائے عراق اسے موثر نہیں سمجھتے۔ انھیں یہ حق ہے کہ اسے قبول نہ فرمائیں، لیکن جہالت کا فتویٰ تو بڑی ہلکی بات ہے اور بے حد نامناسب!!

(ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، ۱۱/ اگست ۱۹۷۲ء)

---

[1] سنن البيهقي (۱۰/ ۲۵۲) نیز دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۳۴۱)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۲)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مسئلہ فاتحہ خلف الامام

اختلاف اگر دیانت اور نیک نیتی سے ہو تو بسا اوقات اس سے مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ائمۂ کرام کے اختلافات اسی قسم کے ہیں جن سے اسلام کو کافی فائدہ پہنچا۔ مسئلہ قراءتِ خلف الامام بھی اسی قسم کا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس میں مدت سے اختلاف رہا ہے۔ علمائے امت نے اپنے فہم و استعداد کے مطابق اپنے عندیے کا اس میں ذکر کیا اور پڑھنے اور نہ پڑھنے کے متعلق انھوں نے کوئی نہ کوئی راہ اپنے لیے پسند فرمائی۔ رضي الله عنهم وأرضاهم.

علمائے دیوبند کی علمی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے مسلک کے مطابق جہاں اور علمی خدمات انجام دیں، وہاں انھوں نے اختلافیات میں بھی اپنے لہجے پر کافی لکھا۔ پہلے بزرگوں نے تحریروں میں اپنے مسلک کی گو حمایت کی ہے، لیکن ہم اعتراف کرتے ہیں کہ وہاں متانت اور قوتِ استدلال کے ساتھ ہی خیانت سے بچنے کی کوشش کی گئی اور عموماً استدلال میں خیانت کی گندگی سے قلم کو آلودہ نہیں کیا گیا، لیکن موجودہ دور کے بزرگانِ دیوبند افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خیانت سے بچ نہیں سکے۔

چناں چہ مولوی بدر عالم صاحب کی تقریر میں نے اپنے کانوں سے سنی اور بعض دیوبند کے خوشہ چینوں کی تحریریں اس وقت بھی میرے پیشِ نظر ہیں، جس میں حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے خیالات سے مسئلہ فاتحہ میں اسی نامناسب طریق پر استدلال کیا گیا ہے، حالاں کہ بداہتاً معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے ارشادات نہ حضرات علمائے دیوبند کے نزدیک حجتِ شرعی ہیں اور نہ قارئینِ فاتحہ کے نزدیک واجب الاطاعت۔ پھر اس سے استدلال اور اس پر یہ زور کون سی قوتِ اجتہاد کی نمایش ہے؟

اور اے کاش کہ حضرت شیخ الاسلام کے خیالات ہی صحیح طور پر بیان کر کے پھر اپنے سے کوئی وجہ ترجیح سوچ لی جاتی۔

شیخ الاسلام کا مسلک اس مسئلے میں قریب قریب حنابلہ کے مسلک کے مطابق ہے جسے وہ جمہور کا مسلک قرار دیتے ہیں۔ میری ان معروضات کا مقصد شیخ کے کلام سے کوئی استفادہ نہیں، صرف

یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آج کل کے دیوبندی علماء جو مقصد شیخ کے کلام سے حاصل کرنا چاہتے ہیں شیخ اس سے بَری ہیں۔ وہ اس مسئلے میں ایسی رائے رکھتے ہیں جو نہ قارئینِ فاتحہ کے بالکل موید ہے اور نہ تارکینِ قراءت کے موافق، بلکہ وہ اپنے مقام پر دونوں کو ڈانٹتے ہیں۔

شیخ الاسلام کی نگاہ میں تو حنفی اور اہلِ حدیث دونوں غلطی پر ہیں، اس لیے بہ حوالہ شیخ الاسلام کسی ایک کو بھی دوسرے پر الزام نہیں دینا چاہیے۔ چناں چہ شیخ الاسلام اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وَأُصُولُ الْأَقْوَالِ ثَلَاثَةٌ: طَرَفَانِ وَوَسَطٌ، فَأَحَدُ الطَّرَفَيْنِ أَنَّهُ لَا يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ بِحَالٍ، وَالثَّانِي: أَنَّهُ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ بِكُلِّ حَالٍ، وَالثَّالِثُ، وَهُوَ قَوْلُ أَكْثَرِ السَّلَفِ: إِنَّهُ إِذَا سَمِعَ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ أَنْصَتَ وَلَمْ يَقْرَأْ، فَإِنَّ اسْتِمَاعَهُ لِقِرَاءَةِ الْإِمَامِ خَيْرٌ مِّنْ قِرَاءَتِهِ (إِلىٰ أَنْ قَالَ) هٰذَا قَوْلُ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ، كَمَالِكٍ وَأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ وَجُمْهُورِ أَصْحَابِهِمَا، وَطَائِفَةٍ مِنْ أَصْحَابِ الشَّافِعِيِّ وَأَبِي حَنِيفَةَ، وَهُوَ الْقَوْلُ الْقَدِيمُ لِلشَّافِعِيِّ، وَقَوْلُ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ“[1]

یعنی مسئلہ قراءتِ خلف الامام میں تین قول ہیں: ① ہر حال میں پڑھنا ② کسی حال میں نہ پڑھنا ③ تیسرا قول جو اکثر کا خیال ہے، وہ یہ کہ اگر قراءتِ امام کو سنے تو نہ پڑھے اور چپ رہے، کیوں کہ اس صورت میں استماع، قراءت سے افضل ہے، اور اگر امام کی آواز کو نہ سنے تو پڑھے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ اور ان کے اکثر اتباع اور بعض شوافع اور بعض احناف بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی کا قولِ قدیم بھی یہی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ (شاگرد امام ابوحنیفہ) کا بھی یہی خیال ہے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

”وَالْمَقْصُودُ هُنَا الْقِرَاءَةُ خَلْفَ الْإِمَامِ، فَنَقُولُ: إِذَا جَهَرَ الْإِمَامُ اسْتَمَعَ لِقِرَاءَتِهِ، فَإِنْ كَانَ لَا يَسْمَعُ لِبُعْدِهِ أَنَّهُ يَقْرَأُ فِي أَصَحِّ الْقَوْلَيْنِ، وَهُوَ قَوْلُ أَحْمَدَ، وَإِنْ كَانَ لَا يَسْمَعُ لِصَمَمِهِ أَوْ كَانَ يَسْمَعُ هَمْهَمَةَ الْإِمَامِ، وَلَا يَفْقَهُ مَا يَقُولُ، فَفِيهِ قَوْلَانِ فِي مَذْهَبِ أَحْمَدَ وَغَيْرِهِ، وَالْأَظْهَرُ أَنَّهُ يَقْرَأُ... الخ“

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/ ۲۶۵)

یعنی جب امام آواز سے پڑھے تو امام کی قراءت کو سنے اور اگر دور ہونے کے سبب سن نہیں سکتا تو صحیح یہی ہے کہ اسے پڑھنا چاہیے۔ اور اگر بہرے پن سے نہیں سن سکتا یا صرف امام کی آواز کی گھن گھناہٹ کو سنتا ہے اور سمجھ نہیں سکتا تو اس میں دو قول ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں پڑھنا چاہیے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام نے اس مسلک کو بیان کیا کہ مانعینِ قراءت کے مردہ جسموں میں جان ڈال دی ہے۔ مختلف احادیثِ قراءت پر جرح فرمائی ہے، بعض مناسب تاویلات کی ہیں۔ اس ضمن میں شیخ رحمہ اللہ نے حدیثِ ابی موسیٰ و ابی ہریرہ رضی اللہ عنہما کی زیادت «وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا»[1] کو بہ حوالہ صحیح مسلم بیان فرمایا ہے اور حدیثِ ابی ہریرہ پر امام مسلم کے کلام کو بھی بالاستیعاب ذکر کیا ہے۔

آخری الفاظ جو شیخ رحمہ اللہ نے اس معرکے میں ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس چیز کا پتا دیتے ہیں کہ شیخ رحمہ اللہ کا اس وقت تک رجحان حنابلہ کی طرف بہ نسبت محققین مستقلین کے زیادہ ہے، ورنہ تحقیقی نظر کے بعد جس کا اعتراف شیخ نے اپنے رسالہ "مناسك الحج" کے شروع میں کیا ہے، یہ تشدد غیر ممکن ہے۔ رحمه الله و رضي الله عنه وأرضاه.

"فَإِذَا كَانُوا مَشْغُوْلِيْنَ عَنْهُ بِالْقِرَاءَةِ فَقَدْ أُمِرَ أَنْ يَّقْرَأَ عَلٰى قَوْمٍ لَا يَسْتَمِعُوْنَ لِقِرَاءَ تِهٖ، وَهُوَ بِمَنْزِلَةِ مَنْ يُّحَدِّثُ مَنْ لَّا يَسْتَمِعُ لِحَدِيْثِهٖ، وَيَخْطُبُ مَنْ لَّا يَسْتَمِعُ لِخُطْبَتِهٖ، وهٰذَا سَفَهٌ، تَنَزَّهَ عَنْهُ الشَّرِيْعَةُ، وَلِهٰذَا رُوِيَ فِي الْحَدِيْثِ: مَثَلُ الَّذِيْ يَتَكَلَّمُ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا.[2] فَهٰكَذَا إِذَا قَرَأَ وَالْإِمَامُ يَقْرَأُ عَلَيْهِ"!

"جب مقتدی اپنی قراءت کے ساتھ امام کی قراءت سے مشغول ہوں تو گویا امام کو ایسی قوم کو سنانے کا حکم ہوا جو اس کی سنتے ہی نہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے ایسے آدمیوں سے گفتگو کرنا جو اس کی نہیں سنتے یا ایسے لوگوں میں خطبہ کہنا جو اس کی طرف توجہ نہیں دیتے اور یہ بے وقوفی ہے جس سے شریعت پاک ہے۔ اسی لیے حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص

[1] دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٠٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٣٠) اس کی سند میں "مجالد بن سعید" ضعیف ہے۔

خطبے میں باتیں کرے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا جائے،
پس اسی طرح ہوگا جب کوئی شخص پڑھے جبکہ امام اس کو سنا رہا ہے۔‘‘

یہ وہ زوردار الفاظ ہیں جنھیں آج کل بزرگانِ دیوبند بڑے مسالے لگا کر خطبوں میں، مجلسوں میں، مناظروں میں بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں۔ جہاں تک حضرت شیخ کی رائے کا تعلق ہے، میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ شیخ جہری نمازوں میں قراءتِ مقتدی کے مخالف ہیں جیسے حنابلہ کا مسلک ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ شیخ کی رائے کا اگلا حصہ بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں جو انھوں نے سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق لکھا ہے (یا جہری نمازوں میں امام سے دور ہونے کی صورت میں یا جہری نمازوں کی سری رکعتوں کی بابت لکھا ہے)۔ شیخ کے بیان فرمودہ دلائل سے کسی ایک کے ساتھ جسے صحیح سمجھے، تمسک کرنا معیوب نہیں، آخر علمی چیزیں اہلِ علم کی امانت ہیں۔ حَيْثُمَا وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا.

لیکن شیخ کی رائے کے کسی حصے سے استدلال اور ان سے خلاف کا ترک امانت، دیانت اور عدالت کی بدترین توہین ہے جس کا آج کل بزرگانِ دیوبند عموماً ارتکاب فرما رہے۔ عفا اللّٰہ عنھم.

اہلِ حدیث بھی عموماً علمائے دیوبند پر اعتماد کرتے تھے۔ عام نزاعی مسائل میں ان کا حکم تسلیم کر لیا جاتا تھا، لیکن اب اس چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ آج کا دیوبند وہ پہلا دیوبند نہیں جس کی شرافت و دیانت قابلِ اعتماد تھی، بلکہ آج کا دیوبند متعصبین کی ایک ایسی منڈلی ہے جو فرقہ پرستی کے جنون میں ان تمام اوصاف کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کا ہونا ایک انسان کے لیے اور خصوصاً ایک عالم کے لیے ازبس ضروری ہے ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ۔۔۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند[1]

کئی سال سے شیخ الاسلام کے فرامین کا یہ حصہ جو علمائے دیوبند کے موافق ہے، ان کی تقاریر میں زینتِ محفل ہو رہا ہے، لیکن وہ حصہ جو ان بزرگوں کے خلاف ہے، اس کو بیان کرتے ان کو کبھی نہیں سنا گیا، اس لیے ان کے چند اقتباسات ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ حضرت شیخ الاسلام کی رائے اور نام سے فائدہ اٹھانا کہاں تک صحیح ہے؟!

---

[1] ’’مجھ کو ایک اشکال ہے، ذرا دانشِ مند مجلس سے پھر پوچھو: توبہ کی تلقین کرنے والے خود کم تر توبہ کیوں کرتے ہیں۔‘‘

شیخ کا مسلک:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شیخ ابتداءً پورے حنبلی تھے اور فتاوے کا اکثر حصہ انھوں نے اسی مسلک کے موافق لکھا ہے۔ ترکِ حنبلیت کا اعلان انھوں نے بہت بعد میں کیا ہے، جب کہ قلعۂ مصر میں قید تھے۔ چناں چہ مجموعہ رسائل (ص: ۳۵۵) میں فرماتے ہیں:

"كُنْتُ كَتَبْتُ مَنْسَكًا أَوَائِلَ عُمْرِي فَذَكَرْتُ فِيهِ أَدْعِيَةً كَثِيرَةً، وَقَلَّدْتُّ فِي الْأَحْكَامِ مَنْ تَبِعَهُ قَبْلِي مِنَ الْعُلَمَاءِ، وَكَتَبْتُ فِي هٰذَا مَا تَبَيَّنَ لِي مِنْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ"

یعنی پہلے مناسک الحج مَیں نے علماء کی تقلید میں لکھے اور اب جو لکھ رہا ہوں یہ سنت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لکھ رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ پہلے پہل اصحابِ تحقیق سے نہ تھے اور مجموعہ فتاویٰ ان کی ساری عمر کے فتوے ہیں، کچھ اوائلِ عمر کے اور کچھ تحقیق کے بعد۔ اس مسئلے میں بھی حضرت شیخ رحمہ اللہ نے مسلکِ حنابلہ کی تائید کی ہے۔ پہلے جہری میں ترکِ قراءت کا ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

"وَأَمَّا الْفَصْلُ الثَّانِي، وَهُوَ الْقِرَاءَةُ إِذَا لَمْ يَسْمَعْ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ، كَحَالِ مُخَافَتَةِ الْإِمَامِ وَسُكُوْتِهِ، فَإِنَّ الْأَمْرَ بِالْقِرَاءَةِ وَالتَّرْغِيبَ فِيهَا يَتَنَاوَلُ الْمُصَلِّي أَعْظَمَ مِمَّا يَتَنَاوَلُ غَيْرَهُ، فَإِنَّ قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ فِي الصَّلَاةِ أَفْضَلُ مِنْهَا خَارِجَ الصَّلَاةِ"

یعنی جب امام کی قراءت کو نہ سنے، جیسے امام کے اخفا اور سکوت کے وقت، پس یقیناً قراءت کا حکم اور اس میں ترغیب نمازی کو غیر نمازی سے زیادہ شامل اور نماز میں قرآن پڑھنا بیرون نماز سے افضل ہے۔

اس کے بعد شیخ نے قراءتِ قرآن کے فیصلے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اور فتویٰ اور بعض دوسری احادیث جن سے قراءت خلف الامام کا ہونا ثابت ہوتا ہے، بیان فرمائے ہیں، یہاں تک کہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"وَفِي السُّنَنِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: كَانُوْا يَقْرَؤُوْنَ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ:

خَلَّطْتُمْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ... وَهٰذَا لَا يَكُوْنُ مِمَّنْ قَرَأَ فِي نَفْسِهِ بِحَيْثُ لَا يَسْمَعُهُ غَيْرُهُ... وَإِنَّمَا يَكُوْنُ مِمَّنْ أَسْمَعَ غَيْرَهُ، وَهٰذَ مَكْرُوْهٌ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْمُنَازَعَةِ لِغَيْرِهِ، لَا لِأَجْلِ كَوْنِهِ قَارِئًا خَلْفَ الْإِمَامِ، وَأَمَّا مَعَ مُخَافَتَةِ الْإِمَامِ فَإِنَّ هٰذَا لَمْ يَرِدْ حَدِيْثٌ فِيْ النَّهْيِ عَنْهُ (إِلٰى أَنْ قَالَ) وَالْقَارِئُ هُنَا لَمْ يَعْتَضْ عَنِ الْقِرَاءَةِ بِاسْتِمَاعٍ فَيَفُوْتُهُ الْاِسْتِمَاعُ وَالْقِرَاءَةُ جَمِيْعًا" (ص: ١٤٩)

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کو خلط کر دیا ہے۔ اور معلوم ہے کہ یہ اختلاط آہستہ پڑھنے سے نہیں ہوسکتا، جب کہ دوسرا اس کو سنتا ہی نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب غیر تک آواز پہنچے اور یہ حقیقتاً مکروہ ہے، اس لیے کہ امام سے تنازع ہے نہ کہ مطلق قراءت خلف الامام کی وجہ سے، لیکن جب امام آہستہ پڑھے تو اس صورت میں پڑھنے سے کسی حدیث میں نہی وارد نہیں ہوئی۔ (یہاں تک کہ فرمایا کہ) سری میں اگر مقتدی نہ پڑھے تو اس نے قراءت اور اس کے عوض استماع دونوں کو ضائع کر دیا، پس اس نے قراءت اور سننا دونوں فوت کر دیے۔"

ایک اصول:

اس کے بعد شیخ الاسلام ایک اصول ذکر فرماتے ہیں کہ جو ذکر امام آہستہ کرے وہ مقتدی کو بھی آہستہ کرنا چاہیے جیسے تسبیح، تشہد، دعا وغیرہ تو قراءت بہ طریقِ اولیٰ مقتدی کو کرنا ہوگی:

"فَجَمِيْعُ الْأَذْكَارِ الَّتِيْ يُشْرَعُ لِلْإِمَامِ أَنْ يَّقُوْلَهَا سِرًّا، يُشْرَعُ لِلْمَأْمُوْمِ أَنْ يَّقُوْلَهَا سِرًّا، كَالتَّسْبِيْحِ فِيْ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ، وَكَالتَّشَهُّدِ وَالدُّعَاءِ، وَمَعْلُوْمٌ أَنَّ الْقُرْآنَ أَفْضَلُ مِنَ الذِكْرِ وَالدُّعَاءِ، فَلِأَيِّ مَعْنًى لَا تُشْرَعُ لَهُ الْقِرَاءَةُ فِي السِّرِّ وَهُوَ لَا يَسْمَعُ قِرَاءَةَ السِّرِّ، وَلَا يُؤَمِّنُ عَلٰى قِرَاءَةِ الْإِمَامِ فِيْ السِّرِّ؟"[1] (فتاویٰ، ص: ١٤٩)

[1] "وہ تمام اذکار جو امام کے لیے آہستہ پڑھنا مشروع ہیں، مقتدی کے لیے بھی آہستہ پڑھنا شرعاً درست ہیں، جیسے رکوع و سجود میں تسبیح کرنا اور نماز میں تشہد و دعا کرنا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ قرآن کی تلاوت، ذکر اور دعا ←

اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام نے سری نمازوں میں پڑھنے کے متعلق ایک عجیب استدلال فرمایا جو آیت ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾ سے استدلال کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجبِ بصیرت ہوگا۔ فرماتے ہیں:

"وَأَيْضًا فَإِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ لَمَّا قَالَ: ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ [الأعراف: ٢٠٤] قَالَ: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ [الأعراف: ٢٠٥] وَهٰذَا أَمْرٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ وَلِأُمَّتِهِ... الخ"

یعنی خداوند تعالیٰ نے جہاں ﴿اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾ کے ساتھ روکا ہے، وہاں آیت ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ﴾ کہہ کر پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ آخر میں فرمایا:

"وَهٰذَا الْأَمْرُ يَتَنَاوَلُ الْإِمَامَ وَالْمَأْمُوْمَ وَالْمُنْفَرِدَ بِأَنْ يَّذْكُرَهُ سِرًّا فِيْ نَفْسِهِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ، وَهُوَ يَتَنَاوَلُ صَلَاةَ الْفَجْرِ وَالظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فَيَكُوْنُ الْمَأْمُوْمُ مَأْمُوْرًا بِهِ بِذِكْرِ رَبِّهِ فِيْ نَفْسِهِ، لٰكِنْ إِذَا كَانَ مُسْتَمِعًا كَانَ مَأْمُوْرًا بِالْاِسْتِمَاعِ، وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ مُسْتَمِعًا كَانَ مَأْمُوْرًا بِذِكْرِ رَبِّهِ فِيْ نَفْسِهِ، وَالْقُرْآنُ أَفْضَلُ الذِّكْرِ، كَمَا قَالَ تَعَالىٰ: ﴿وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ﴾ [الأنبياء: ٥٠] وَقَالَ تَعَالىٰ: ﴿وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا﴾ [طٰهٰ: ٩٩] وَقَالَ: ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰهٰ: ١٢٤] وَقَالَ: ﴿مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢]" (٢/ ١٥٠)

یعنی آیت ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ﴾ میں امر امام، مقتدی، منفرد سب کو شامل ہے اور حکم ہے کہ صبح شام اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، لیکن جب سنا جا سکے تو پھر سننے کا امر ہے اور قرآنِ مجید سے افضل کوئی ذکر نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قرآن مجید برکت والا ذکر

← سے بہرحال افضل ہے تو کس بنا پر مقتدی کو سری نماز میں قراءت کی اجازت نہ ملے جبکہ وہ آہستہ نماز والی قراءت میں تلاوت سنتا ہے نہ امام کی سری نماز میں قراءت پر آمین ہی کہتا ہے؟!"

ہے، جس کو ہم نے اُتارا ہے۔ نیز فرماتا ہے: اے محمد (ﷺ)! ہم نے تجھے اپنی طرف سے ذکر (قرآنِ مجید) دیا۔ نیز فرماتا ہے: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر (قراءتِ خلف الامام) سے اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے تنگ زندگی ہے اور وہ قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے...الخ۔"

(ہفت روزہ "تنظیم اہلِ حدیث" روپڑ، ۱۵؍ستمبر ۱۹۳۳ء)

ترکِ تقلید اور اہلِ حدیث

مدت سے یہ دونوں لفظ عوام کی زبان پر استعمال ہو رہے ہیں اور انھیں عموماً مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں دونوں لفظ ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ اور ان کی طرف منسوب مسالک کی پابندی کے خلاف استعمال کیے گئے ہیں حالانکہ امرِ واقع یہ ہے کہ جمود کی مخالفت ان ائمۂ کرام اور ان کے اَتباع نے بھی کی ہے۔ اس کے بعد محقق اہلِ علم ائمۂ اربعہ کے ساتھ عقیدت اور ان کے علوم سے استفادے کے باوجود بعض فروعی مسائل میں ائمۂ اجتہاد سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے رہے۔

امام ابوجعفر طحاوی رحمہ اللہ (م۳۲۱ھ) امام ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی (م۲۶۴ھ) شیخ الاسلام محمد بن قدامہ حنبلی (م۶۰۷ھ) حافظ ابن تیمیہ (م۷۲۸ھ) وغیرہم ائمۂ اربعہ سے بعض کی طرف انتساب کے باوجود ان سے اختلاف فرماتے ہیں اور اس سے ان بزرگوں اور ان کے متوسلین میں کوئی ذہنی تکدر نہیں پیدا ہوتا، نہ ان کے علم اور دین پر کوئی حرف آتا ہے۔

علامہ ابو زید عبیداللہ بن عمر بن عیسیٰ دبوسی (م۴۳۰ھ) کی کتاب ”تأسیس النظر“ میں حضرات ائمۂ اجتہاد رحمہم اللہ کے اختلافات کی متعدد صورتیں مرقوم ہیں:

① حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین میں اختلاف۔

② حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ میں اختلاف۔

③ امام صاحب رحمہ اللہ، امام محمد اور امام یوسف رحمہ اللہ میں اختلاف۔

④ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ میں اختلاف۔

⑤ امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، حسن بن زیاد اور امام زفر رحمہ اللہ میں اختلاف۔

⑥ احناف اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ میں اختلاف۔

⑦ احناف اور امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ میں اختلاف۔

⑧ احناف اور امام شافعی رحمہ اللہ میں اختلاف۔

علامہ دبوسی رحمہ اللہ نے ان کے اصول کا بھی ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمۂ مجتہدین میں باہم اصولی اختلاف تھے۔ پھر یہ خیال کہ امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام مالک رحمہم اللہ وغیرہم میں تو اصولی اختلاف ہے لیکن ان کے تلامذہ میں اصولی اختلاف نہیں، سطحی معلوم ہوتا ہے۔ یہ کسی تحقیق پر مبنی نہیں بلکہ محض خوش فہمی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تلامذہ اپنے اساتذہ سے اسی طرح اختلاف فرماتے جس طرح اساتذہ میں باہم اختلاف موجود تھا۔ حضرات ائمہ اور ان کے تلامذہ کے اختلافات بھی اسی طرح اصولی ہیں جیسے خود ائمۂ مجتہدین میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، نوعیت میں فرق نہیں۔

لفظ غیر مقلد کی ایجاد:

معلوم ہوتا ہے اس وقت غیر مقلد کا لفظ یا تو ایجاد ہی نہیں ہوا ہو گا یا پھر بطور طعن اس کا استعمال نہیں کیا گیا۔ ائمۂ اسلام، صلحائے امت میں مروج نہیں ہوا تھا یا کوئی سیاسی ضرورت ہی نہ تھی جس کے لیے یہ لفظ ایجاد کیا جاتا۔

اسی طرح تقلید بھی کوئی قابلِ فخر لقب نہیں تھا جس کے ترک کو عیب سمجھا جائے یا اس کے ترک پر کم از کم افسوس ہی کا اظہار کیا جائے بلکہ ائمۂ معقول فلاسفہ و متکلمین کے نزدیک چونکہ منقولات کا مقام کسی طرح بھی ظن سے اُونچا نہیں، اس لیے وہ ائمۂ سنت کو فقیہ ہوں یا غیر فقیہ، مجتہد ہوں یا غیر مجتہد، ''مقلد'' کہتے ہیں اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں دلیل کا انحصار صرف عقلیات پر ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ ''فيصل التفرقة بين الإسلام والزندقة'' میں معتزلہ اور اشاعرہ کے خیالات میں الزامی تقابل اور باہم اکفار و تکفیر کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

''فَإِنْ تَخَبَّطَ فِيْ جَوَابِ هٰذَا أَوْ عَجَزَ عَنْ كَشْفِ الْغِطَاءِ فِيْهِ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ النَّظَرِ، وَإِنَّمَا هُوَ مُقَلِّدٌ، وَشَرْطُ الْمُقَلِّدِ أَنْ يَّسْكُتَ وَيُسْكَتَ عَنْهُ'' (ص: ۱۸)

''اگر کوئی ان الزامات کے جواب سے عاجز آ جائے تو وہ مقلد ہے۔ اور مقلد سے گفتگو کے بجائے خاموشی بہتر ہے۔''

قرونِ خیر کے بعد عمل اور اعتقاد کی دنیا میں عجیب اضطراب معلوم ہوتا ہے۔ تقلید یا جمود تو کیا ہوگا؛ اعتقاد اور فروع کے معاملے میں فکر ونظر اور فقہ و اجتہاد کئی مختلف گوشوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ مثلاً غسان کوفی مرجیہ اور فرقہ غسانیہ کے پیشوا اور امام ہیں اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر ہیں۔ (الخطط للمقريزي: ٤/ ١٧١) اور ایمان کی زیادت اور نقصان کے مسئلے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہمنوا ہیں، یعنی ایمان کی زیادتی اور نقصان کے قائل نہیں۔[1]

فرقہ مریسیہ کے امام بشر بن غیاث مریسی کے متعلق مقریزی لکھتے ہیں:

"كَانَ عِرَاقِيَّ الْمَذْهَبِ فِي الْفِقْهِ تِلْمِيْذًا لِلْقَاضِي أَبِي يُوْسُفَ يَعْقُوْبَ الْحَضْرَمِيِّ"[2]

امام شافعی رحمہ اللہ سے اس کا مناظرہ ہوا۔ امام رحمہ اللہ نے اس کے خیالات کا مذاق اڑایا اور فرمایا:

"نِصْفُكَ كَافِرٌ لِقَوْلِكَ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ وَنَفْيِ الصِّفَاتِ، وَنِصْفُكَ مُؤْمِنٌ لِقَوْلِكَ بِالْقَضَاءِ وَالْقَدَرِ وَخَلْقِ اكْتِسَابِ الْعِبَادِ" (الخطط للمقريزي: ٤/ ١٧١)

''امام شافعی رحمہ اللہ نے بشر مریسی سے کہا کہ تم آدھے کافر ہو کہ تم قرآن کو مخلوق سمجھتے ہو اور صفاتِ باری کی نفی کرتے ہو، اور آدھے مومن ہو کیوں کہ تم قضا و قدر کو مانتے ہو اور انسانی اعمال کا خالق خدا کو سمجھتے ہو۔''

مقلد اور غیر مقلد کی اصطلاح:

عقیدت کی اس تقسیم اور عقائد و فروع میں عقیدت کے اس تضاد کے باوجود غیر مقلد یا مقلد کی اصطلاح اس وقت استعمال نہیں ہوئی بلکہ دونوں عقیدتیں معاً چلتی رہیں۔ مسائل پر بحث ہوتی اور مسائل کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف فتوے بھی شاید استعمال ہوئے لیکن اشخاص سے عقیدت اور اس کے تغیر کی بنا پر نہ باہم نفرت پیدا ہوئی نہ ان جوہری اختلافات کے باوجود تنابز بالالقاب کا شیوہ ہی اختیار کیا گیا۔

"وَعَادَتِ الْفُتْيَا إِلَيْهِ، وَانْتَهَىٰ السُّلْطَانُ وَالْعَامَّةُ إِلَىٰ بَابِهِ، فَلَمْ يُقَلَّدْ فِي

[1] الملل والنحل للشهرستاني (١/ ١٤٠)

[2] المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار للمقريزي (٤/ ١٧١)

سَائِرِ أَعْمَالِ أَنْدَلُسَ قَاضٍ إِلَّا بِإِشَارَتِهِ وَاعْتِنَائِهِ، فَصَارُوْا عَلٰى مَذْهَبِ مَالِكٍ رَحِمَهُ اللهُ بَعْدَ مَا كَانُوْا عَلٰى رَأْيِ الْأَوْزَاعِيِّ" (خطط: ٤/ ١٤٣)

''فتویٰ کا مدار یحییٰ پر تھا۔ سلطان اور عوام ان کے محتاج تھے۔ ان کے خلافِ منشا کوئی قاضی مقرر نہ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے لوگ امام اوزاعی کے عقیدت مند تھے۔ اب سب مالکی ہوگئے۔''

حکومت اور مذاہب کی ترویج:

تقلید کے رواج پا جانے کے بعد مروجہ مذاہب محض علم و تفقہ یا تعلیم و تلمذ کی بنا ہی پر اختیار نہیں کیے گئے بلکہ اس میں حکومت کے رجحان اور وقت کے سیاسی عوامل کو بھی خاصا دخل رہا۔ عہدۂ قضا کا بھی ان عقائد و خیالات کی ترویج میں خاصا حصہ ہے۔ افریقہ میں عموماً سنت اور آثار کی پابندی کا رواج تھا۔ عام لوگ مسلک اہلِ حدیث کے پابند تھے لیکن خلیفہ مرتضیٰ بن ہشام بن عبدالرحمٰن ۱۸۰ھ میں افریقہ کے حاکم مقرر ہوئے تو انھوں نے یحییٰ بن یحییٰ کو افریقہ کا قاضی مقرر کیا۔ یہ امام مالک کے شاگرد تھے اور ابن وہب (م ۱۹۷ھ) اور ابن قاسم سے بھی ان کو تلمذ حاصل تھا۔ اندلس میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ ان کے حکم کے بغیر کوئی قاضی مقرر نہیں کیا جاتا تھا اور یہ انھی علماء کو منتخب فرماتے جو امام مالک کے عقیدت مند ہوتے۔

مقریزی فرماتے ہیں:

اسی طرح جب ہارون الرشید بغداد میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو ۱۷۰ھ میں پوری قلمرو کا قاضی مقرر کیا۔

"فَلَمْ يُقَلَّدْ بِبِلَادِ الْعِرَاقِ، وَخُرَاسَانَ، وَالشَّامِ، وَمِصْرَ إِلَّا مَنْ أَشَارَ بِهِ الْقَاضِي أَبُوْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللهُ وَاعْتَنٰى بِهِ" (مقريزي: ٤/ ١٤٤)

یعنی ہارون الرشید نے ۱۷۰ھ میں محکمۂ قضا کے تمام اختیارات قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے سپرد کر دیے۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی قاضی نہیں بن سکتا تھا۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ عراق اور اس طرف سے آنے والے تمام فاتح اور مبلّغ فقہ العراق سے متاثر ہوگئے اور فقہی مسائل میں امام ابو یوسف وغیرہ سے وابستہ رہے۔

یہ سیاسی اور معاشی اثرات ہیں جو دلائل کے علاوہ ان مذاہب کی اشاعت میں موثر رہے اور

عوام کا تاثر علی العموم انہی وجوہات کا مرہون ہے، ورنہ عوام فہم و بصیرت اور دلائل کی قوت وضعف سے چنداں آشنا نہیں ہوتے، نہ وہ مختلف فیہ امور میں ترجیح دے سکتے ہیں، نہ دلائل میں توازن ہی قائم رکھ سکتے ہیں۔ علماء گو دلائل کی قوت اور ضعف کو سمجھتے ہیں لیکن بیرونی اثرات سے وہ بھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ مدارس اور مساجد کی تاسیس امراء اور ملوک کی کوششوں سے ہوتی اور علماء کو وہاں کام کرنے کے لیے اربابِ اقتدار سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہوتا۔

مقریزی فرماتے ہیں:

"فَلَمَّا انْقَرَضَتِ الدَّوْلَةُ الْفَاطِمِيَّةُ عَلىٰ يَدِ السُّلْطَانِ صَلَاحِ الدِّيْنِ يُوْسُفَ بْنِ أَيُّوْبَ أَبْطَلَ مَذَاهِبَ الشِّيْعَةِ مِنْ دِيَارِ مِصْرَ، وَأَقَامَ بِهَا مَذْهَبَ الْإِمَامِ الشَّافِعِيِّ، وَمَذْهَبَ الْإِمَامِ مَالِكٍ، وَاقْتَدىٰ بِالْمَلِكِ الْعَادِلِ مَحْمُوْدِ بْنِ زَنْكِي فَإِنَّهُ بَنىٰ بِدِمِشْق، وَحَلَبَ وَأَعْمَالِهَا عِدَّةَ مَدَارِسَ لِلشَّافِعِيَّةِ وَالْحَنَفِيَّةِ" (خطط: ٤/ ١٩٢)

"سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے سرزمین مصر سے شیعی مذاہب کو ختم کر کے وہاں شافعی اور مالکی مکتبِ فکر کے مدارس جاری کر دیے جس طرح نور الدین محمود زنگی نے دمشق اور حلب میں شافعی اور حنفی مدارس قائم کر دیے تھے۔"

اس تاریخی پسِ منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہی مکاتبِ فکر اور عقائد کے اختلافات میں جو فرقے نمودار ہوئے ان میں مختلف موثرات کارفرما تھے۔ بعض اوقات اُن کی تبدیلیاں استدلال اور حجت کی وجہ سے ہوئیں۔ کبھی ان تبدیلیوں کی محرک معاشی مشکلات تھیں۔ کبھی اقتدار اور اربابِ اقتدار کے ساتھ تعلق نے مسلک اور خیالات میں تبدیلی کی صورت اختیار کر لی۔ اور ابتدائی زمانوں میں یہ تبدیلیاں اس کثرت اور اس عجلت سے ہوتی رہیں کہ ان سے کوئی ہنگامہ بپا نہیں ہوا بلکہ قدرتی یا طبعی معمول تصور ہوتا رہا۔

عقائد کی تبدیلیاں بعض اوقات غیر معمولی صورت اختیار کرتی رہیں، خصوصاً جب حکومت نے کسی فرقے کی سرپرستی اور حکومتی سطح پر اس فرقے کی حمایت کی، جیسے مامون الرشید کا طبعی رجحان تشیع اور اعتزال کی طرف ہوگیا۔ اس کے بعد واثق باللہ اور معتصم باللہ نے بھی ائمہ سنت اور علمائے حدیث

پر زندگی کی راہیں تنگ کر دیں۔ کچھ لوگ تو خاموش ہو گئے اور بعض نے ظاہراً ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی۔ بعض کھل کر سامنے آ گئے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حکومت سے مقابلہ کیا اور قید و بند کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ائمۂ حدیث پر یہ مصیبت متوکل علی اللہ کے وقت تک قائم رہی۔ متوکل پہلا آدمی ہے جس نے ائمۂ حدیث اور داعیانِ سنت سے پابندیاں اٹھائیں۔ اپنا رجحان بھی بظاہر ائمۂ حدیث کی طرف رکھا لیکن اس کے باوجود کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ ان رجحانات کو ضرور قبول کرے۔

ان اضطرابات میں بھی تقلید یا ترکِ تقلید کے الفاظ کو محبت اور بغض کا معیار نہیں قرار دیا گیا، نہ اسے وہ اہمیت دی گئی جو آج کل کے اہم علمی حلقوں میں اسے دی جا رہی ہے۔

صداقت کا معیار:

عقول کی طغیانیوں اور درایت کی ان بے قراریوں میں صداقت کا معیار ائمۂ حدیث اور علمائے سنت ہی تھے۔ جس قدر یہ گروہ حدیث اور علمائے حدیث سے قریب ہوسکتا اسی قدر وہ اپنی صداقت پر ناز کرتے اور نقلِ روایت میں ان ائمۂ فن پر پورا پورا اعتماد فرماتے۔ جاحظ معتزلی اور ائمۂ اعتزال کے امام ہیں لیکن اس وقت کے حوادث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی اور انہی کو حق پر سمجھتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حمایت میں انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "العثمانية" ہے۔ اس کتاب میں علمائے اہلِ حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

"وَأَصْحَابُ الْأَثَرِ مِنْ شَأْنِهِمْ رِوَايَةُ كُلِّ مَا صَحَّ عِنْدَهُمْ، عَلَيْهِمْ كَانَ أَوْ لَهُمْ" (العثمانية، ص: ١٥٢)

یعنی اہلِ حدیث ہر صحیح چیز کو بیان کر دیتے ہیں، ان کے حق میں ہو یا ان کے خلاف۔

عقائد اور فروع کے اختلاف اور آراء و افکار کی تبدیلیوں کے باوجود مقلد یا غیر مقلد جیسے القاب کا استعمال بطور واقع ہوتا رہا ہے لیکن بطور عیب اور طعن یا تعریف و توصیف بالکل نہیں ہوا۔ غالباً اس لیے کہ اس وقت وہ سیاسی وجوہ موجود نہ تھے جو آج کل اس تنابز بالالقاب کا سبب بن رہے ہیں۔ عوام تو عوام ہیں؛ اچھے علماء اور اصحابِ تدریس بھی ان القاب کا استعمال مدح اور ذم کی نیت سے فرماتے ہیں۔ قدمائے اہلِ علم میں یہ انتساب بھی ہوتا رہا ہے اور ایسے لوگ بھی ہر زمانے میں رہے جو کتاب و سنت سے براہِ راست اپنی بساط کے مطابق استدلال فرماتے اور ان نسبتوں سے بالکل بے نیاز ہوتے۔

امام ابوجعفر منصور نے امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے تجویز پیش کی کہ موطا کو پوری قلمرو میں دستور کی حیثیت دے دی جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے یہ تجویز مسترد کر دی اور فرمایا:

”إِنَّ أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ تَفَرَّقُوْا فِيْ الْبِلَادِ، فَأَفْتٰى كُلٌّ فِيْ مِصْرِهٖ بِمَا رَأٰى، فَلِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ قَوْلٌ، وَلِأَهْلِ الْعِرَاقِ تَعْدُوْا فِيْهِ طَوْرُهُمْ“

(الدیباج المذھب، ص: ۲۵)

یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ ہر ایک نے ہر شہر میں اپنی صواب دید کے مطابق فتویٰ دیا۔ اہلِ مدینہ کا بھی قول ہے اور اہلِ عراق کی بھی ایک رائے جو ان کے حالات کے مطابق نافذ ہو رہی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے شخصی آراء و افکار کی قانونی پابندی سے انکار فرما دیا۔ مختلف اقوال کی مختلف ممالک میں اجازت دے دی اور جمود اور شخصی آراء کی پابندی کو پسند نہیں فرمایا۔ خلیفہ ابوجعفر نے اسے معقول سمجھ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔

شیخ ابواسحاق ابراہیم بن حسین بن خالد (م ۲۴۰ھ) بڑے عالم اور فقیہ تھے:

”وَكَانَ يَذْهَبُ إِلَى النَّظَرِ وَتَرْكِ التَّقْلِيْدِ“ (دیباج، ص:۸٤)

شیخ اسماعیل بن اسحاق بن ابراہیم (م ۳۸۴ھ) کے متعلق مرقوم ہے:

”كَانَ مِنْ أَهْلِ الْفِقْهِ وَالْحَدِيْثِ، وَغَلَبَ عَلَيْهِ الْحَدِيْثُ، وَكَانَ فُتْيَاهُ بِمَا ظَهَرَ مِنَ الْحَدِيْثِ“ (دیباج، ص: ۹۵)

”یعنی شیخ اسماعیل بن اسحاق فقیہ تھے۔ حدیث کی طرف ان کا زیادہ رجحان تھا اور ظاہر الفاظِ حدیث کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔“

شیخ قاسم بن محمد بن قاسم (۲۰۷ھ) کے متعلق مرقوم ہے:

”كَانَ يَذْهَبُ مَذْهَبَ الْحُجَّةِ“ (وہ دلیل کے پابند تھے)

وقت کے بعض مشاہیر کے خلاف کتاب لکھی اور اس کا نام ”رد علی المقلدة“ رکھا۔

(دیباج، ص: ۲۲۲)

ابوعبداللہ بن محمد بشکوال پہلے شافعی تھے، پھر اسے ترک کر دیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے:

”كَانَتْ لَهٗ مَذَاهِبُ أَخَذَ بِهَا فِيْ خَاصَّةِ نَفْسِهٖ، خَالَفَ فِيْهَا أَهْلَ قُطْرِهٖ“

(دیباج، ص: ۲۷۲)

”ان کے کچھ تفردات تھے جن میں وہ اپنے ”ہم وطن علماء“ کے خلاف فتویٰ دیتے تھے۔“

شیخ ابو محمد عبداللہ الاصیلی (م ۳۹۲ھ) امام دارقطنی کے استاد تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے حافظ تھے۔

”تَرَكَ التَّقْلِيدَ، وَكَانَ مِنْ أَعْلَمِ النَّاسِ بِالْحَدِيثِ، وَأَبْصَرِهِمْ“ (دیباج، ص: ۱۳۹)

یعنی انھوں نے تقلید ترک کر دی تھی۔ حدیث کے بہت بڑے ماہر تھے۔

طبقات کی کتابوں کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں ایسے لوگ کثرت سے ملتے ہیں جو مروجہ تقلید کے پابند نہ تھے۔ دلائل سے تمسک کرتے تھے اور اپنے وقت میں قیادت اور امامت کے مقام پر فائز تھے۔ علماء اور عوام میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آج کی طرح تنفر اور تنابز بالالقاب کا رواج اس وقت موجود نہ تھا۔ اہلِ حدیث، اصحاب الحدیث، اصحاب الآثار وغیرہ ناموں سے بوقتِ ضرورت ان کا ذکر ہوتا تھا۔

جمود اور تقلید کے متعلق اجماع کا دعویٰ جس کا ذکر عام سطحی قسم کے لوگ بلا تحقیق کر دیتے ہیں، درست نہیں۔ یہ درست ہے کہ دونوں رجحان موجود رہے اور علم ونظر کی کثرت یا قلت کے سبب ان میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ طعن وتشنیع کے بغیر لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق عمل کرتے رہے۔ علمائے تحقیق بحث ونظر سے مسائل پر گفتگو فرماتے رہے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے اسلام پر عمل کرتے رہے۔

اس طرزِ عمل کا سبب:

اس طرزِ عمل کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرونِ خیر میں کوئی اعتقادی فتنہ نہ تھا۔ باہمی رنجشوں سے بعض اوقات اختلافات ہوئے۔ لڑائی اور نزاع تک بھی نوبت آئی لیکن اعتقاد میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ شیعہ سنی نزاع میں تفضیل یا طبیعت کے رجحان کے سوا کچھ نہ تھا۔ بعض واقعات سے مختلف طبائع نے مختلف اثر لیے اور ان اثرات کی وجہ سے کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومیت اور ایسے وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاموشی سے کسی نتیجے پر پہنچا۔ کوئی حادثۂ کربلا اور اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے متاثر ہوا۔ اسلام وکفر یا اعتقاد کے بگاڑ کی حد تک معاملہ نہیں پہنچا۔ ان مجادلات کی جو اس وقت ہوئے، ہر ایک نے اپنی معلومات اور اپنے نقطۂ نظر سے توجیہ کی۔

دوسری صدی میں جب یونانی علوم سے مسلمان واقف ہوئے، ان سے صفاتِ باری اور اس کی وحدانیت میں شبہات پیدا ہوئے۔ ائمۂ سنت نے ان پر کڑی تنقید فرمائی۔ مصائب میں مبتلا ہوئے۔ حکومت اور بعض اربابِ اقتدار بھی اس رو میں بہہ نکلے۔ ائمۂ سنت نے بھی اپنی ذمے داری کو محسوس کیا، قید و بند اور کوڑوں کی سزا سے بھی نہ گھبرائے۔ ہر ایک نے فکر ونظر کی ان بدعات سے بچ نکلنے کی کوشش کی۔ ائمۂ حدیث اور اربابِ سنت کے پاس تو قرآن و سنت موجود تھے۔ وہ ان اضطرابات سے بہت کم گھبرائے بلکہ مقابلے کے لیے میدان میں آگئے اور قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق راہنمائی فرمائی۔ ائمۂ بدعت کے خلاف مجاہدانہ اقدامات فرمائے۔ ذات اور صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق جو ہنگامہ بپا کیا گیا تھا کتاب وسنت کی ہدایات کے مطابق اہلِ بدعت پر تنقید فرمائی۔ عوام کو بھی سمجھایا کہ وہ ان غلط کار لوگوں سے بچیں۔

جو لوگ کتاب وسنت پر صحیح عبور نہیں رکھتے تھے اُنھوں نے ان بدعات سے ائمۂ سنت اور بعض مخصوص علماء کے ساتھ اپنا تعلق پیدا کیا۔ اُن کے ساتھ اخلاص ومحبت کی بنا پر ان کے خیالات کو اپنا راہنما بنایا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اعتقادی مسائل میں یہ سب حضرات ائمہ رحمہم اللہ متفق تھے۔ اصولِ عقائد کے سبب سے ان بزرگوں میں کوئی اختلاف نہ تھا لیکن فروع میں یہ حضرات مختلف تھے۔ عوام ان اختلافات سے متاثر ہوئے۔ اپنے اپنے بزرگوں سے عقیدت کی بنا پر ان فروعی مسائل کا اتباع کرتے رہے۔

بتدریج اس محبت نے جمود اور تقلید کی صورت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے خلاف تلخ اور تیز الفاظ کا استعمال ہونے لگا اور نوبت سوئے ادب تک بھی پہنچ گئی۔ مقلدینِ ائمہ سے متاخرین کی کتابیں اگر آپ مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو اس بے ادبی کی بڑی مثالیں ملیں گی۔ اور یہ تمام حوالے ائمہ کے اَتباع میں آپ کو ملیں گے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور داود ظاہری رحمہ اللہ کو جاہل تک کہا گیا ہے۔[1] (نور الانوار)

اس تقلید سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ لوگ علمائے بدعت معتزلہ، جہمیہ، معطلہ، مشبہہ، مجسمہ، خوارج اور روافض سے بچ گئے لیکن آپس میں جس محبت کی ضرورت تھی وہ نہ رہی۔ اَتباعِ ائمہ آخری ادوار میں اس طرح اُلجھ گئے: ﴿كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ﴾[2] [النساء: ۳۷]

---

[1] نور الأنوار (ص: ۲۲۸) نیز دیکھیں: کشف الأسرار (۴/ ۴۷۳)

[2] ترجمہ: ''جیسے تمھارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی۔''

متاخرین کے جمود کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ابتدا میں ائمہ کی اقتدا سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا۔ اس دور میں عقیدت کے باوجود ان ائمہ سے اختلاف بھی ہوتا تھا۔ اس دور کے اہلِ علم تصوف سے گھبراتے تھے نہ تلقین کی آڑ میں جمود کی دعوت دیتے تھے اور نہ اس فقہ اور تحقیق یا تلقین کو تنابز بالالقاب کا موجب بناتے تھے۔ اس تقلید سے اس وقت کے ائمۂ تحقیق کو چنداں اعتراض نہ تھا۔

ائمۂ حدیث اس وقت بھی اپنی روش پر قائم تھے اور اس نوع کی تقلید کو بھی اپنے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔ وہ ان بدعات سے بچنے کے لیے ائمۂ سلف کی روش کو کافی سمجھتے تھے۔ اشخاص سے عقیدت، ان کے اجتہادات کی انفراداً اور شخصاً پابندی کے بجائے انھوں نے دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فکر اور اندازِ فکر کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا۔ اس کھلی فضا میں رہ کر وہ وقت کی بدعات، عقیدہ اور عمل کی محدثات سے محفوظ رہے۔ جمود کی مضرتوں سے بھی انھیں کوئی دکھ نہ پہنچ سکا۔ یہ لوگ حدیث سے براہ راست وابستہ رہے۔ نصوص کے فہم میں صحابہ اور تابعین کے مقدس دور پر اعتماد فرما کر متاخرین کی فقہی موشگافیوں سے مستغنی ہو گئے۔ اس روش کو غالباً نہ ان کے مخالفین نے غیر مقلدیت کہا نہ انھوں نے اس عنوان کے اختیار میں کوئی فخر محسوس فرمایا۔ دونوں اسے اہلِ حدیث، اصحاب الحدیث، اہل الاثر وغیرہ عنوانات سے تعبیر فرماتے۔ اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ درس کی مجالس میں اپنی تحقیق سے طلبہ کو متاثر فرماتے۔ بنا بر دلائل خود مسلک بدلنے میں تامل نہ فرماتے۔ اس تبدیلی کے باوجود نہ ایک دوسرے کے متعلق آنکھیں بدلتیں، نہ دلوں میں بغض پیدا ہوتا۔ اختلافات قائم بھی رہتے، گوارا بھی ہوتے۔ اختلاف میں بھی اعتدال قائم رہتا۔

اہلِ حدیث اور غیر مقلد میں ترادف نہیں!

اس وقت عموماً مخالف حلقوں میں اہلِ حدیث اور غیر مقلد دو ہم معنی لفظ سمجھے جاتے ہیں اور اہلِ حدیث حضرات بھی اسے گوارا کرتے ہیں لیکن واقعتاً یہ درست نہیں۔ اعتقادی بدعات کے دور میں ایسے لوگ ملتے ہیں کہ وہ حنفی بھی ہیں، معتزلی بھی، شافعی، مالکی حتی کہ حنابلہ بھی۔ وہ کلام اور فلسفے سے متاثر ہونے کے باوجود فروع میں اپنے ائمہ سے وابستہ رہے۔ اشعریت، ماتریدیت کا بھی ان فرعی مسائل سے بنیادی فرق تھا لیکن اس وقت بھی اہلِ حدیث مروج تقلید سے انحراف کے باوجود کلام کی جدید راہوں سے چنداں متاثر نہیں ہوئے بلکہ یہ لوگ ان جدید اعتقادات اور نئی نئی ایجادی تعبیرات سے برسرِ پیکار رہے۔ عقائد اور فروع میں ان کی راہ قدیم اور جدید تشریحات اور تصریحات سے مختلف رہی۔ وہ مثبت

طور پر اصول اور فروع میں ائمۂ سلف کی روش، ان کے ارشادات اور ان کی تصریحات کے پابند رہے۔ منفی طور پر وہ کسی خاص فرد امام یا مجتہد کی آراء کی جامد اور کلی پابندی نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے ہر غیر مقلد کو اہلِ حدیث نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہر اہلِ حدیث کے لیے ضروری ہے کہ جمود اور تقلید سے الگ رہے۔

ہمارے قریبی دور کے کچھ ایسے افراد اور طبقات ہیں جن کو ترکِ تقلید کے باوجود اہلِ حدیث نہیں کہا جا سکتا بلکہ اہلِ حدیث نے ان کے خلاف تنقید میں قیادت فرمائی، اس لیے کہ ان کا تعلق ائمۂ سلف سے قائم نہ رہ سکا اور فہم میں خیر القرون کے طریقے کو وہ ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی آراء کو بعض دفعہ ترجیح دیتے تھے۔ مثلاً:

1. سر سید احمد خان (بانیِ جامعہ علی گڑھ) بڑے آزاد خیال تھے۔ رفع الیدین اور آمین بالجہر بھی سنا ہے التزام سے کرتے تھے لیکن مستشرقین اور غیر مسلم مشنریوں اور ساجیوں سے مرعوب تھے۔ وہ اسلامی حقائق کی وضاحت میں تقلیدی افکار و نظریات کے پابند تو نہ تھے لیکن معجزات اور بعض دوسرے مسائل میں ان کی آزادی آوارگی کی حد تک تھی۔ اس لیے وہ غیر مقلد تو ہوں گے لیکن وہ اور ان کے ہم خیال ساتھی اہلِ حدیث نہیں تھے۔ غالباً وہ بھی اس لقب کو پسند نہیں کرتے تھے اور اہلِ حدیث نے بھی ان کو کبھی نہیں اپنایا بلکہ "إشاعة السنة"، "ضياء السنة" اور اخبار "اہلِ حدیث" میں ان کے خیالات پر مسلسل تنقید ہوتی رہی۔ اس سے قبل حضرت مولانا سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے اپنی متعدد تالیفات (مثلاً حدیث الغاشیہ اور حجج الکرامہ) میں بھی موصوف کی گمراہیوں اور کجرویوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

2. مرزا غلام احمد قادیانی اپنے آپ کو بریلوی حنفی ظاہر کرتے تھے لیکن حقیقت میں وہ حنفی بھی نہ تھے۔ اہلِ حدیث تو کیا ہوتے البتہ غیر مقلد ہو سکتے ہیں، کیوں کہ وہ نہ فقہ حنفی کے پابند تھے نہ وہ صحابہ اور تابعین، ائمۂ سلف کی روش پر چلنا پسند کرتے تھے۔ تنقیدِ حدیث کے متعلق وہ ائمۂ حدیث کے بجائے اپنی ذات کو معیار سمجھتے ہیں، اس لیے ترکِ تقلید کے باوجود اہلِ حدیث نہیں ہیں۔

3. مولوی عبداللہ چکڑالوی سنا ہے پہلے رسمی حنفی تھے، پھر ترکِ تقلید کے ساتھ حدیث کی طرف جھکے لیکن انھیں جلد ہی معلوم ہوا کہ ان کا مزاج حدیث پر مطمئن نہیں ہو گا۔ سنا ہے طبیعت میں غلو اور تقشف تھا اور ذہین بھی نہیں تھے۔ ایسے آدمی کے لیے اہلِ حدیث ہونا ممکن ہی نہ تھا، چنانچہ وہ اور مولوی حشمت علی، مولوی رمضان گوجرانوالہ، رشید احمد وغیرہم، گجرات، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں

کے منکرینِ حدیث اور ہمارے ہم عصر غلام احمد پرویز ، یہ حضرات آوارہ مزاجی کے لحاظ سے صرف غیر مقلد ہوسکتے ہیں بلکہ نفسِ اسلام کی پابندی سے بھی کافی حد تک آزاد ہیں۔ اس لیے وہ احادیث اور ائمہ سلف کی پابندی خود ہی پسند نہیں کرتے بلکہ قرآن کی مرمت اور ترمیم بھی اپنی خواہش سے فرماتے ہیں۔ ہم بھی انھیں غیر مقلد سمجھنے کے باوجود اہلِ حدیث نہیں سمجھتے۔ انکارِ حدیث کے بعد اہلِ حدیث ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

④ ہمارے پرانے ساتھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب لائل پوری جماعت اسلامی سے علاحدگی کے بعد ''اہلِ حدیث'' سے بھی الگ ہورہے ہیں اور مروجہ تقلیدی مسالک سے بھی ان کا کچھ نمایاں تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ وہ آج کل تقریباً ملائے اعلیٰ کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ وہ کسی ہائی قسم کے اسلام کی دعوت دیتے ہیں یا دینا چاہتے ہیں جو موجودہ اسلام پسند اور دین پرور جماعتوں میں نظر نہیں آرہا، اس لیے وہ اصل اسلام کے لیے آج کل کافی پریشان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی فرمائے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے وہ اہلِ حدیث سے کافی چڑے ہوئے ہیں اور اس غریب جماعت سے خاص طور پر آج کل ناراض ہیں لیکن ہمیں ان سے کوئی بحث نہیں، البتہ خطرہ ضرور ہے۔ ان کی اس تلقین سے نہ مقلد پیدا ہوں گے نہ اہلِ حدیث، البتہ غیر مقلد شاید پیدا ہوجائیں۔ ہماری دانست میں وہ اب بھی اہلِ حدیث ہیں لیکن وہ فرماتے ہیں: ''میں نہیں۔'' ہم انھیں مجبور نہیں کرتے، البتہ اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تفریق عنوان سے نہیں ہوتی، معنون سے ہوتی ہے اور یہ تفریق غالباً آپ کی موجودہ دعوت میں بھی موجود ہے۔

⑤ ہمارے ایک مخلص اور پرانے رفیق گجرات میں تشریف رکھتے ہیں۔[1] وہ اپنے اسم گرامی کے ساتھ ہمیشہ ''اثری'' لکھا کرتے تھے۔ توحید و سنت کی حمایت میں بڑی موثر تقریریں فرماتے تھے۔ اہلِ حدیث مجالس میں بڑے شوق سے شامل ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ سے انھیں جدت پسندی کا عارضہ ہوا۔ بعض غیر معروف مسائل میں انھوں نے تفرد ظاہر فرمایا۔ عوام نے ان پر خاموشی کا اظہار کیا۔ اب انھوں نے بعض متواتر اور منصوص مسائل میں جمہور ائمہ اہلِ حدیث اور اکابر اہلِ سنت کے خلاف راہِ ''اجتہاد'' اختیار فرمائی اور محنت کر کے حضرت مسیح کا باپ تلاش کر لیا۔

[1] حافظ عنایت اللہ وزیر آبادی مراد ہیں۔

احباب نے کئی دفعہ مطالبہ کیا کہ جماعت اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے۔ میں سمجھتا ہوں یہ شخصی تفردات کتنے ہی گمراہ کن کیوں نہ ہوں اس سے کوئی جماعتی مسئلہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایسے حضرات غیر مقلد تو کہلا سکتے ہیں لیکن اہلِ حدیث قطعاً نہیں ہوسکتے۔ متعارف اور مسلمہ مسائل سے اگر انحراف کی کبھی ضرورت محسوس ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کتاب وسنت سے تمسک کیا جائے اور اس کے لیے بھی طریقۂ سلف، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ کا اختیار کیا جائے، جیسا کہ حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے ایک شاگرد کو لکھا تھا:

"أُصُوْلُ السُّنَّةِ عِنْدَنَا التَّمَسُّكُ بِمَا كَانَ عَلَيْهِ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَالْاِقْتِدَاءُ بِهِمْ وَتَرْكُ الْبِدَعِ... وَتَرْكُ الْجُلُوْسِ مَعَ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ... وَالسُّنَّةُ تُفَسِّرُ الْقُرْآنَ، وَهِيَ دَلَائِلُ الْقُرْآنِ... وَمَنْ لَّمْ يَعْرِفْ تَفْسِيْرَ الْحَدِيْثِ وَيَبْلُغْهُ عَقْلُهُ، فَقَدْ كُفِيَ ذٰلِكَ، وَأُحْكِمَ لَهُ فَعَلَيْهِ بِالْإِيْمَانِ بِهِ وَالتَّسْلِيْمِ لَهُ"[1]

(طبقات الحنابلة: ١/ ٢٤١)

اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس جماعت کا تعارف ان لفظوں سے دیا ہے:

"هُمُ الْآخِذُوْنَ فِي الْعَقِيْدَةِ وَالْعَمَلُ جَمِيْعًا بِمَا ظَهَرَ مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، وَجَرىٰ عَلَيْهِ جُمْهُوْرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنِ" الخ[2]

ہر آدمی جو چاہے اس کا نام "تحقیق" رکھ لے تو ساری دنیا کے اہلِ بدعت اور ملاحدہ اربابِ تحقیق قرار پائیں گے۔ اپنے رفقاء اور مخالفین دونوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ترکِ تقلید دوسری چیز ہے اور اہلِ حدیث دوسری چیز، انھیں مرادف اور ہم معنی نہیں سمجھنا چاہیے۔

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۲۔۹۔۱۶؍ جولائی ۱۹۶۵ء)

---

1. "ہمارے نزدیک سنت کے اصول صحابہ کرام کے منہج کی پابندی کرنا، ان کی اقتدا کرنا، بدعات کو چھوڑنا اور اہلِ بدعت کے ساتھ عدمِ مجالست ہے۔ سنت قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔ وہ قرآن کے دلائل ہیں۔ جو شخص حدیث کی تفسیر نہیں جانتا اور نہ اس کی عقل اسے پہنچی ہے تو اس کے لیے یہی کافی و وافی ہے۔ پس اس پر لازم ہے کہ حدیث پر ایمان لائے اور اسے تسلیم کرے۔"
2. "وہ عقیدہ و عمل میں ظواہر کتاب وسنت اور منہجِ صحابہ و تابعین کی پابندی کرنے والے ہیں۔" حجة الله البالغة (١/ ٣٥٩)

اہلِ حدیث کی اقتداء

جناب ابوالخیرات محمود احمد صاحب رضوی بریلوی رضا خانی کے جواب میں

''رضوان'' لاہور (مؤرخہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۱ء) کے ''نماز نمبر'' میں بعض اختلافی مسائل کا تذکرہ مزاحیہ انداز میں ''گل وخار'' کے عنوان سے کیا گیا۔ سنجیدہ مزاح بُری چیز نہیں لیکن دینی مسائل میں یہ طریق کیوں اختیار کیا گیا ہے؟!

''رضوان'' رضا خانی احناف کا ترجمان ہے۔ یہ حضرات فہمِ مسائل میں فقہ حنفی سے کہیں زیادہ اعتماد مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے طریقِ فکر پر رکھتے ہیں۔ فقہ حنفی کے ساتھ ان کا تعلق محض عوام کے ساتھ رابطے کی بنا پر ہے، ورنہ حضرت امام والا مقام کے علم وتفقہ سے انھیں چنداں دلچسپی نہیں۔ جہاں اجتہاد کی طغیانی کا یہ عالم ہو کہ عقائد کے اِثبات میں قیاس سے کام لیا جاتا ہو بلکہ نصوصِ قطعیہ کو نظر انداز کرنے میں بھی پرہیز نہ ہو، وہاں حضرت امام کے طریقِ فکر کی کیا وقعت ہے۔ جہاں اثباتِ عقائد میں ظنیات سے لبریز اور اخبارِ آحاد جیسی واجب التعمیل نصوص میں بھی احتیاط کا دامن چھوٹنے نہ پایا ہے -رَحِمَهُ اللّٰهُ وَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَعَنْ سَائِرِ الْأَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَالْفُقَهَاءِ وَالْمُحَدِّثِيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ قَادَةُ الدِّيْنِ۔ وہاں مقاییس اور اوہام کی اس بے اعتدالی اور طغیانی کا پیوند کیونکر لگ سکتا ہے!!

اکلِ حلال میں جہاں اس قدر پابندی ہو کہ مقروض کی دیوار کے سائے سے استفادہ کرنے میں احتیاط پیشِ نظر رہی ہو وہاں اس حنفیت کا جوڑ کیونکر لگے گا جس سے جمعرات کی صبح ہی سے مسجد کے در ودیوار پر ٹکٹکی بندھ جائے کہ حلال وحرام سے پیٹ کا دوزخ بھر لیا جائے۔ جہاں بھینس اور اس کی کٹیا کی بیماری پر عُرس ومیلاد کی نذریں ماننے کی تلقین ہوتی ہو۔ پیٹ کی پہنائی شبِ ہجر سے میلوں دراز ہو، امام ابوحنیفہ جیسے بے طمع آدمی سے ان کا تعلق کہاں تک قائم رہ سکتا ہے۔ کہاں جیل کی صبر آزما

موت، کہاں قوالیوں کے طواف۔ لیکن چونکہ اہلِ حق پر طعن کے لیے فقہ حنفی کی آڑ لی گئی ہے اور فقہی فروع کو بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس لیے اربابِ توحید ہمیں اس طریقِ گفتگو میں معذور تصور فرمائیں۔ مقصود اسی طریقِ فکر کی وضاحت ہے جسے اہلِ حدیث اور دوسرے ائمۂ سلف نے ترجیح دی ہے لیکن ادارہ ''رضوان'' نے اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ کسی پر طعن مقصود ہے نہ تنقیص۔

گفتگوئے عاشقاں در بابِ رب جذبہ عشق است نے ترکِ ادب [1]

وہابی:

مدیر رضوان نے اہلِ حدیث اور اہلِ حق کے لیے وہابی کا لقب اختیار کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سب وشتم کا پورا دھارا خود بخود ہی کسی اور طرف پھر گیا ہے اور اہلِ حق اس بے ہودہ گوئی سے محفوظ ہوگئے۔ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالصَّلَاةُ: «كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ، يَسُبُّونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ» [2]

فی الجملہ نسبتے تو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیہ بود و بس است [3]

یہاں بحمداللہ نہ کوئی وہابی ہے نہ نجدی، نہ حنفی ہے نہ سہروردی۔ ان وقتی اور اختراعی نسبتوں سے نہ محبت ہے نہ نفرت، نہ کسی سے عشق ہے نہ بغض۔ حقیقت اسی قدر ہے کہ کتاب اللہ اور سنت سے وابستگی ہے۔ وہ بھی اس انداز سے کہ اس کے رد وقبول میں کسی غیر نبی کو کوئی معیاری اہلیت حاصل نہیں ہے۔ کوئی طریقِ فکر ذہن پر محیط نہیں جس کی پابندی کتاب وسنت کے فہم میں حائل ہو۔ آنحضرت ﷺ اور ان کے ارشاداتِ گرامی سے تعلق کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں کسی ایسے واسطے کی گنجایش نہیں جسے فسق وتقویٰ یا کفر واسلام کا معیار قرار دیا جائے۔ فکر ونظر، استنباط واستدلال کے لحاظ سے تمام ائمۂ ہُدیٰ اور اسلافِ امت سے استفادہ خدا تعالیٰ کی نعمت ہے جس سے کبھی انکار نہیں ہوا۔ آج جس قدر علوم ومعارف موجود ہیں، تمام ائمۂ فقہ وحدیث کا فیضان ہے، جس کا شکریہ ہم پر فرض ہے۔ اور ہر وقت دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پاکباز اور مقدس بزرگوں کی قبروں کو رحمت سے بھر دے۔

---

[1] خدا کے بارے میں عاشقوں کی گفتگو جذبۂ عشق ہے نہ کہ ترکِ ادب۔

[2] ترجمہ: ''کس طرح سے اللہ تعالیٰ قریش کے لعن طعن کو مجھ سے دور کر دیتا ہے۔ وہ کسی مذمّم کو گالیاں دیتے ہیں، جب کہ میں تو محمد (ﷺ) ہوں!'' صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٣) مسند أحمد (٢/ ٣٤٠)

[3] بالجملہ تمھاری میرے ساتھ اتنی نسبت ہی کافی ہے کہ قافیے کے تحت بلبل آ گیا اور بس۔

مدیر رضوان نے بڑا کرم فرمایا کہ جس قدر کفر کا ذخیرہ ان کے دل میں موجود تھا اسے ظاہر نہیں فرمایا بلکہ اہلِ سنت و الحدیث کی اقتداء سے روکنے پر کفایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کتمانِ کفر کی جزا عنایت فرمائے، لیکن یہاں ان کے کفر سے گھبراہٹ نہیں بلکہ ان کے مصنوعی ایمان سے ہے، کیوں کہ بریلوی اور رضائی ایمان سے کفر شاید حقیقتِ ایمان ہے!!

مدیر رضوان کی حنفیت کا آغاز قریباً مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی سے ہوا اور ہمارے ایمان کا آغاز آنحضرت ﷺ، فداہ ابي و امي، سے ہوا۔ اگر ایسے حضرات ہماری مساجد میں تشریف نہ لائیں تو ہمیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اور ہم سے حلفِ مؤکد لیجیے کہ ہم آپ کو اپنی اقتداء کے لیے کبھی دعوت نہیں دیں گے۔ اور شاید گذشتہ سالوں میں بھی کبھی نہ دی ہوگی۔ ہماری مساجد بحمداللہ اس گئے گزرے دور میں بھی آپ کی اکثر مساجد سے زیادہ آباد ہیں۔ یہاں اہلِ توحید کی بحمداللہ اتنی کثرت ہے کہ حضرات اہلِ بدعت اور عباد القبور کی ضرورت ہی نہیں۔ یوں بھی اہلِ سنت جس طمانیت سے نماز ادا فرماتے ہیں، آپ کو ان کی اقتداء ویسے ہی گراں ہوگی۔ اس لیے ہماری یہ رائے ہی نہیں بلکہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ کسی اہلِ سنت کی اقتداء نہ فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ لِصَاحِبِ بِدْعَةٍ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا»[1]

یعنی بدعتی کے فرض اور نفل دونوں اللہ تعالیٰ منظور نہیں فرماتا۔

آپ ہی فرمایئے! ایک غیر مقبول نماز کی امامت سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اس لیے آپ اگر اہلِ توحید کی اقتداء نہیں فرماتے تو اطمینان رکھیے، یہاں سے بھی کوئی پیغام بھیجنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ ع پیش آں کس برو کہ خریدار تست[2]

دلائل:

البتہ ان دلائل کے متعلق گزارش کرنا جن سے عوام کو مغالطہ ہوسکتا ہے، ہمارا فرض ہے۔ محترم رضوانی صاحب نے اہلِ حدیث کی اقتداء کے ناجائز ہونے میں پانچ مسائل کا تذکرہ کیا ہے:

---

[1] موضوع. سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩) اس کی سند میں "محمد بن محصن العكاشي" راوی کذاب اور متہم ہے۔

[2] اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کرو جو تمھارا خریدار ہے۔

① حضرت مجدد الوقت مجتہد العصر مولانا الشیخ سید نواب صدیق حسن خاں صاحب کی کتاب "الروضة الندية" کے کسی اُردو ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"پانی کتنا ہی کم ہو، نجاست پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا، جب تک رنگ یا مزہ یا بو نہ بدلے۔"

فتویٰ سنیے:

"سوچیے! یہ لوگ ایک لوٹے پانی میں ایک قطرہ پیشاب گر جائے تو اس کو پاک کہتے ہیں اور اس سے وضو کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بتایئے، ہماری نماز ایسے پانی سے وضو کے ساتھ ہو سکتی ہے!"

اب ہماری گزارشات سنیے:

① درر بہیہ کے نام سے نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمہ اللہ کی کوئی کتاب نہیں، البتہ امام شوکانی رحمہ اللہ کی اس نام کی ایک کتاب ہے جس کی نواب صاحب مرحوم نے شرح لکھی ہے۔

② ائمہ متفق ہیں کہ رنگ، بو، مزہ؛ اگر نجاست کی وجہ سے بدلے تو پانی پلید ہو جائے گا، پانی کم ہو یا زیادہ، بہر حال ایسا پانی پلید ہو جائے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں: اگر پانی قلتین ہو یا اس سے زیادہ، اس میں اگر نجاست گرے تو جب تک اوصافِ ثلاثہ: رنگ، بو، مزہ نہ بدلے پانی پاک ہوگا کیوں کہ یہ کثیر پانی ہے۔ نجاست کے اثر کو قبول نہیں کرتا۔

احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگر عشر در عشر ہو، یعنی دہ در دہ، وہ مائے جاری ہے، یا مائے کثیر کے حکم میں ہے۔ اس میں نجاست کا اثر نہیں ہوگا۔ پانی پاک رہے گا جب تک نجاست رنگ، بو، مزہ کو نہ بدل دے۔ امام مالک فرماتے ہیں: تھوڑے یا زیادہ پانی کی کوئی قید نہیں۔ اصل چیز اوصاف کا تغیر ہے۔ جب تک رنگ، بو اور مزہ نہ بدلے پانی کم ہو یا زیادہ، اس پر نجاست کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔[1]

"قَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ: اَلتَّقْدِيْرُ لِعَشْرٍ فِيْ الْعَشْرِ لَا يَرْجِعُ إِلىٰ أَصْلٍ شَرْعِيٍّ يُعْتَمَدُ عَلَيْهِ" (شرح الوقاية: ١/ ٨٧)

"محی السنہ فرماتے ہیں: دہ در دہ کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔"

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والتَّقْدِيْرُ الَّذِيْ ذَكَرَهُ الْحَنَفِيَّةُ فِيْ عَدَمِ سِرَايَةِ النَّجَاسَةِ إِلَى الْعَشْرِ فِيْ الْعَشْرِ لَيْسَ لَهُ أَصْلٌ شَرْعِيٌّ بِخِلَافِ تَقْدِيْرِ الشَّافِعِيَّةِ بِالْقُلَّتَيْنِ فَإِنَّهُ ثَابِتٌ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: سبل السلام للصنعاني (١/ ١٧) نيل الأوطار (١/ ٣٧)

بِالْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ، وَكَذَا تَقْدِيْرُ الْمَالِكِيَّةِ بِالتَّغَيُّرِ" (عمدة الرعاية، ص: ۸۷)

''حنفیہ نے جو دہ در دہ کا اندازہ مائے کثیر کے لیے فرمایا ہے اس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں، لیکن شافعیہ نے جو قلتین کا اندازہ فرمایا ہے وہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح موالک کا اندازۂ تغیر اوصافِ ثلاثہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔''

مولانا رضوی ''وہابیوں'' پر اس لیے ناراض ہیں کہ وہ پیشاب کے ایک قطرے سے پیالے کو پلید نہیں سمجھتے۔ ایسے پانی سے اگر وضو کیا جائے تو رضائی حنفیوں کی نماز کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ادباً یہ گزارش ہے کہ اگر دو مٹکوں میں ایک پیالہ پیشاب گر جائے تو جناب کی نماز کو تکلیف نہ ہوگی اور اقتداء گوارا فرما لی جائے گی۔ یعنی قلتین کی تحدید جناب کو منظور ہے تو پھر ''وہابیوں'' سے مصالحت کے لیے ایک مجلس بلا لی جائے؟!

① اگر کوئی مالکی اپنے مذہب کے موافق پاک پانی سے وضو کرے تو رضائی نماز ہوگی یا نہیں؟ اگر آپ ان کی نماز نہ ہونے پر بضد ہوں تو چاروں اماموں کی حقانیت کا کیا مطلب ہوگا؟

② جوازِ اقتداء میں کوئی عقیدہ تو حائل نہیں، صرف پانی ہی کی دقت ہے۔ تو اس کا ایک اور بھی حل ہوسکتا ہے۔ آپ کی مسجد کے حوض یا سبیل سے وضو کر کے اگر وہابی امام بنے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جناب کے اس ارشاد کا مطلب میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

③ جناب نے سنا ہوگا کہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایک حمام سے وضو فرمایا جس میں چوہا مر چکا تھا۔ آپ نے نماز پڑھ لی اور فرمایا کہ ہم اپنے حجازی بھائیوں کے قول پر عمل کرتے ہیں۔[1] کیا امام ابو یوسف وہابی تو نہیں تھے؟!

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے حدیثِ قلتین کو صحیح فرمایا ہے حالانکہ اس کی اسناد میں جو بحث ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ احناف نے اس حدیث کے متعلق جو معنوی الجھن پیدا کی ہے وہ بھی معلوم ہے، پھر بھی مولانا عبدالحی مرحوم اسے صحیح فرماتے ہیں۔ اس لیے میں انتظار کروں گا کہ اس اضطراب کو آپ ہی دور کریں!

امام شوکانی اور سید صدیق حسن خاں رحمہما اللہ کا رجحان واقعی حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی طرف ہے۔ وہ پانی کی مقدار کو نجاست اور طہارت میں اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ اس کا انحصار کیفیت

---

① الفتاویٰ البزازية (۲/ ۹) فتح القدير (۱/ ۱۲۸) رد المحتار (۱/ ۱۸۹) حجة الله البالغة (ص: ۳۳۶)

ہی پر فرماتے ہیں۔ پانی کم ہو یا زیادہ رنگ، بو، مزہ بدل جائے تو اسے پلید سمجھتے ہیں، ورنہ ان کی نظر میں وہ پانی پاک ہے۔ اور ان کی دلیل نصِ حدیث ہے:

«اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلٰی طَعْمِهٖ أَوْ رِيْحِهٖ أَوْ لَوْنِهٖ»[1]

"إِلا" کے بعد جو زیادت ہے، باتفاقِ محدثین ضعیف ہے لیکن اس کی تائید اجماعِ ائمہ سے ہے۔[2]

اس لیے امام مالک رحمہ اللہ، امام شوکانی رحمہ اللہ اور نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں نصِ صریح صحیح بھی اور اجماع بھی ہے۔ پانی کی طہارت صریح اور صحیح نص سے ثابت ہے اور زیادت کی تائید اجماع سے۔ رضائی حضرات شاید نہ جانتے ہوں؟!

④ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ حدیث «اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ»[3] بروایتِ ابوسعید خدری ابو داود، احمد، ترمذی میں موجود ہے۔ امام ترمذی اسے حسن فرماتے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔ امام احمد کی روایت میں ہے:

"إِنَّهُ يُسْتَقٰى لَكَ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَةَ"[4]

یعنی آنحضرت ﷺ خود بھی بئرِ بضاعہ کا پانی استعمال فرماتے تھے۔

شافعی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم اور بیہقی نے اسے صحیح فرمایا۔ یحییٰ بن معین، ابن حزم اور حاکم نے بھی اس کی تصحیح فرمائی۔ ابن قطان نے اس کے بعض طرق پر کلام کرنے کے بعد فرمایا:

"وَلَهُ طَرِيْقٌ أَحْسَنُ مِنْ هٰذَا" (یہ حدیث اس سے احسن طریق سے بھی مروی ہے۔)

ابن مندہ فرماتے ہیں: اس کی سند مشہور ہے۔ ابوسعید خدری کے علاوہ یہ حدیث حضرت جابر، ابن عباس، سہل بن سعد، حضرت عائشہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔[5] اگر نواب صدیق حسن خاں

---

① **ضعیف**. سنن ابن ماجه (٥٢١) سنن الدارقطني (١/ ١١) سنن البيهقي (١/ ٢٩٥) اس حدیث کی سند میں "رشدین بن سعد" راوی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: التلخيص الحبير (١/ ١٥) السلسلة الضعيفة (٢٦٤٤) امام بیہقی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "والحديث غير قوي إلا أنا لا نعلم في نجاسة الماء إذا تغير بالنجاسة خلافاً، والله أعلم"

② دیکھیں: الإجماع للإمام ابن المنذر رحمه الله (ص: ٣٣) سنن البيهقي (١/ ٢٩٥)

③ **صحیح**. سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٦) مسند أحمد (٣/ ٣١)

④ مسند أحمد (٣/ ٨٦) سنن الدارقطني (١/ ٣١)

⑤ تفصیل کے لیے دیکھیں: التلخيص الحبير (١/ ١٣) عون المعبود (١/ ٨٩) إرواء الغليل (١/ ٤٥)

نے صحیح احادیث اور اجماع کی بنا پر یہ مسلک اختیار فرمایا ہے تو آپ نے اقتداء ہی کی نفی فرما دی۔ اگر اب بریلوی حضرات نے نواب صاحب کی اقتداء چھوڑ دی تو بے چارے نواب صاحب کیا کریں؟

﴿۵﴾ اور یہ قصہ صرف نواب صاحب رحمہ اللہ اور وہابیوں ہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ائمہ سلف کی ایک مقتدر جماعت کا یہی مسلک ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"وَالْحَدِيثُ يَدُلُّ عَلىٰ أَنَّ الْمَاءَ لَا يَتَنَجَّسُ بِوُقُوعِ شَيْءٍ فِيهِ سَوَاءً كَانَ قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا، وَلَوْ تَغَيَّرَتْ أَوْصَافُهُ أَوْ بَعْضُهَا، لٰكِنَّهُ قَامَ الْإِجْمَاعُ عَلىٰ أَنَّ الْمَاءَ إِذَا تَغَيَّرَ أَحَدُ أَوْصَافِهِ بِالنَّجَاسَةِ خَرَجَ عَنِ الطُّهُورِيَّةِ، فَكَانَ الِاحْتِجَاجُ بِهِ لَا بِتِلْكَ الزِّيَادَةِ كَمَا سَلَفَ، فَلَا يَنْجُسُ الْمَاءُ بِمَا لَاقَاهُ، وَلَوْ كَانَ قَلِيلًا، إِلَّا إِذَا تَغَيَّرَ، وَقَدْ ذَهَبَ إِلىٰ ذٰلِكَ ابْنُ عَبَّاسٍ، وَأَبُو هُرَيْرَةَ، وَالْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ، وَابْنُ الْمُسَيَّبِ، وَعِكْرِمَةُ، وَابْنُ أَبِي لَيْلىٰ، وَالثَّوْرِيُّ، وَدَاوُدَ الظَّاهِرِيُّ، وَالنَّخَعِيُّ، وَجَابِرُ بْنُ زَيْدٍ، وَمَالِكٌ، وَالْغَزَالِيُّ" (نيل الأوطار: ١/ ١٠٦)

"حدیث سے ظاہر ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ کسی چیز کے گرنے سے پلید نہیں ہوتا، گو اس کے اوصاف بھی بدل جائیں لیکن اجماع سے ثابت ہے کہ تمام یا بعض صفات کے بدلنے سے پانی پلید ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی پلید چیز گرے۔ پس یہ استدلال اجماع سے ہے، حدیث کی زیادت سے نہیں۔ پس پانی پلید نہیں ہو گا جب تک اس کے یہ تین اوصاف نہ بدل جائیں۔ حضرت ابو ہریرہ، حسن بصری، ابن مسیّب، عکرمہ، ابن ابی لیلیٰ، امام سفیان ثوری، داود ظاہری، امام نخعی، جابر بن زید، امام مالک اور امام غزالی کا بھی یہی مذہب ہے۔"

محترم رضوی صاحب کو اگر فاتحہ، میلاد شریف یا عرس اور دیگر اسبابِ شکم پروری سے کبھی فرصت ملے تو غور فرمائیں! حدیث صحیح، اجماعِ امت اور ائمہ سنت کی ایک بڑی تعداد نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمہ اللہ اور وہابیوں کے ساتھ ہے۔ فرمایئے! ان بزرگوں کی اقتداء بھی درست ہے یا نہیں؟!

﴿۶﴾ محترم رضوی صاحب! اجتہادی مسائل میں کسی کے مسلک کا اختیار کرنا یا ترجیح دوسری چیز ہے اور مخالف مسلک کی تکفیر یا اقتداء کا عدمِ جواز بالکل دوسری چیز ہے۔ یقیناً تھوڑے پانی کی نجاست کے بھی بہت سے ائمہ قائل ہیں۔ پھر مائے قلیل کی تحدید میں بھی بہت زیادہ اختلاف

ہے جس میں فیصلہ کرنا تقلید کی بنا پر تو شاید ممکن ہو جائے مگر دلیل کی بنا پر سخت مشکل ہے۔

''وَلِلنَّاسِ فِيْ تَقْدِيْرِ الْقَلِيْلِ وَالْكَثِيْرِ أَقْوَالٌ لَيْسَ عَلَيْهَا أَثَارَةٌ مِنَ الْعِلْمِ''

(نیل الأوطار: ۱/ ۳۷)

''قلیل اور کثیر پانی کی مقدار میں لوگوں کے بہت اقوال ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔''

جب ان تحدیدات کی تائید کتاب و سنت کی کسی نصِ صریح سے نہیں ہوتی تو پھر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ آپ سوچیں نجس پانی کا استعمال حرام ہوگا۔ کسی پانی کو پلید ثابت کرنے کے لیے آپ کو ایسے دلائل کی ضرورت ہوگی جو حرمت و حلت کے اثبات میں کامیاب ہوسکیں۔ ایسے ادلہ جو ائمۂ اجتہاد میں محلِ اختلاف ہیں، ان کے مفہوم میں اختلاف، طریقِ ثبوت میں اختلاف، تعیینِ مقاصد میں اختلاف، ان مظنون فرقہ وارانہ دلائل کی بنا پر آپ حرمتِ اقتداء کا فتویٰ کس جرأت سے دے رہے ہیں۔ یہ نہ علم کی شان ہے نہ دیانت کا تقاضا۔ اس کی غایت صرف اسی قدر ہوسکتی ہے کہ جس پانی کو آپ پلید سمجھتے ہیں اسے مت استعمال فرمایئے۔ پوری احتیاط سے اپنے مسلک کی پابندی فرمایئے لیکن نہ آپ کسی دوسرے کو مجبور فرما سکتے ہیں نہ اس پر کوئی فتویٰ لگا سکتے ہیں۔

شوافع، موالک اور حنابلہ کا مقام اپنے ائمہ کے ساتھ احناف سے کم نہیں۔ عقیدہ، طریقِ فکر، صحتِ مسلک کے متعلق یقین بالکل مساوی ہے۔ اگر وہ بھی یہی روش اختیار کریں جو آپ نے اختیار فرمائی ہے تو ملت میں تفریق کی ایسی راہ کھلے گی کہ غیر مقلد آپ کا مضحکہ اڑائیں گے۔ عقل و دانش کی محفلوں میں آپ کے لیے کوئی مقام نہ ہوگا۔ پہلے ہی آپ کا فرقہ تنگیِ نظر اور فقدانِ نظر میں ضرب المثل ہے۔ پابندیِ رسوم، حلوے اور چائے کی تلاش میں کافی بدنام ہے۔ مزید تفریق بین المومنین کی ذمے داری لینے سے پرہیز فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو فہمِ صحیح کی توفیق دے!

7 مناسب ہوگا کہ آپ کے مسلک کی بھی چھان پھٹک کر لی جائے۔ دوسرے پر حملہ کرنے سے پہلے آپ کے شیش محل کا امتحان ہو جائے کہ وہ کہاں تک مضبوط ہے جس کے سہارے پر دوسروں کی اقتداء حرام فرمائی جارہی ہے۔ وہ سہارا سہارا ہے بھی یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احناف کا مسلک پانی کے متعلق نہ روایتاً درست ہے نہ درایتاً، نہ نصوص اس کی مؤید ہیں نہ عقل۔ یہ مسلک محض عوام کی عقیدت مندانہ حمایت سے چل رہا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ حضرات کو

اپنے مخالفین پر فتویٰ دینے کی جرأت کیسے ہوتی ہے!!

مائے کثیر کی تعیین عشر فی العشر یعنی دہ در دہ کا اندازہ بالکل بے ثبوت ہے۔ متاخرینِ حنفیہ نے یہ اندازہ گھڑ لیا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شارح وقایہ نے اسے ثابت کرنے میں جس قدر زور صرف کیا ہے اس کا اصل مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر جناب نے اسے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی تو تفصیلاً عرض کیا جائے گا۔

محی السنۃ کا قول پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ صاحب در المختار (ص:۱۶) بھی امام محی السنۃ سے اس باب میں متفق ہیں کہ یہ تحدید ثابت نہیں بلکہ امام الائمہ حضرت امام ابو حنیفہ سے بھی یہ بات ثابت نہیں۔ مائے کثیر، مائے جاری، غدیر وغیرہ کے متعلق ائمۂ احناف میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: جاری پانی وہ ہے جو تنکوں کو بہا کر لے جائے۔ بعض نے فرمایا: جس میں تکرار نہ ہو۔ اسی طرح غدیر (تالاب) کے متعلق ارشاد ہے جس کو ایک طرف سے اگر حرکت دی جائے تو دوسری طرف سے نہ ملے۔ لیکن حرکت غسل سے ہو یا ہاتھ سے یا وضو سے؟ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف سے مختلف روایات ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ اجتہاد و تفقہ کی پیداوار ہے۔

اسی طرح دہ در دہ کا مسئلہ بھی متاخرین نے پیدا کر دیا۔ مولوی رضوی خود ہی سوچیں کہ اس قسم کے فقہی اختلافات کی بنا پر اقتداء سے روکنے کا فتویٰ دانشمندی نہیں بلکہ جس طرح ائمہ نے ان مسائل میں اختلاف کا حق دیا ہے اور شریعت میں اپنے اجتہادات کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں فرمائی، اب بھی تنگی نہ فرمائی جائے بلکہ اپنے مسلک اور تحقیق کی پابندی کے بعد دوسرے فقہی اختلافات میں رواداری برتی جائے۔ بریلوی حضرات تو سارے ہی تقریباً کم ظرف ہیں۔ دیوبندی حضرات میں اس قسم کی کم ظرفی مولانا تھانوی اور مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کے حصے میں آئی تھی۔ مولانا عبدالحی لکھنوی کا مسلک اس باب میں زیادہ صاف اور واضح ہے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ وَرَضِيَ عَنْهُ.

غالباً آپ حضرات اس کی تو اجازت مرحمت فرمائیں گے کہ اگر کوئی شخص امام ابو یوسف یا امام محمد کے مسلک کی پابندی کرے تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اقتداء بھی درست ہی ہو گی۔ اسی طرح امام شافعی، امام مالک یا امام احمد بھی طہارت میں اپنے مسلک کے مطابق نماز ادا کریں یا امامت فرمائیں تو ان کی نمازوں کو بھی آپ آسمان تک پہنچانے کی فرشتوں کو اجازت دیں گے۔ اگر آپ اتنی

لچک پیدا کریں تو وہابیوں کی فکر مت کریں۔ وہ آپ کے ان وسائل سے بے نیاز ہیں۔ ان کا معاملہ براہِ راست خدا تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا اور ان کا امام شفاعت کے وقت ان کو ان شاء اللہ نہیں بھولے گا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

⑧ طہارت کے مسئلہ میں کنویں اور تالاب کا فرق بھی عجیب ہے۔ گویا یہاں پہنچ کر پانی کی مقدار سے ظرف کی ہیئت کو پاکیزگی اور نجاست میں زیادہ دخل ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک کنویں میں اتنا پانی ہے جس سے کئی تالاب دہ در دہ بھر سکتے ہیں لیکن جب یہ پانی تالاب میں ہو تو کوئی پلیدی اس میں اثر نہیں کر سکتی، تاہم یہ تمام اور اس سے کئی گنا زیادہ پانی کسی گہرے اور وسیع کنویں میں آجائے تو وہ چند تولے نجاست کا بھی متحمل نہ ہوگا۔ گویا گول برتن یا مستطیل برتن سے جلدی پلید ہو سکتا ہے۔ صاحب ہدایہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَمَسَائِلُ الْبِئْرِ مَبْنِيَّةٌ عَلَى اتِّبَاعِ الْآثَارِ دُوْنَ الْقِيَاسِ" (هداية أولين، ص:٢٠)

"کنویں کی نجاست میں قیاس کو دخل نہیں، یہ مسائل سماعی ہیں۔"

پاک اور پلید کا مسئلہ حلال و حرام کے قریب قریب آیا۔ اس میں محض آثارِ صحابہ کفایت کر سکتے ہیں اور ان کی بنا پر حرمتِ اقتداء کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ آیا یہ ممکن ہے کہ ان اہم مسائل کے متعلق آنحضرت ﷺ سے کچھ بھی مروی نہ ہو؟ سارا معاملہ صحابہ پر چھوڑ دیا جائے جو حسبِ عقیدۂ اہلِ سنت معصوم نہیں ہیں؟ اور پھر آپ ہیں کہ بے سوچے سمجھے فتویٰ دینا شروع کر دیتے ہیں! ع

مَا هٰكَذَا يَا سَعْدُ تُوْرَدُ الْإِبِلُ [1]

پھر ان آثار کی اسانید پر بھی کبھی آپ نے غور فرمایا؟ شاید ہی ان میں کوئی سند صحیح طور پر صاحبِ روایت تک پہنچ سکے۔ بشرطِ صحت ان آثار کا مفاد زیادہ سے زیادہ تنزیہ ہو سکتا ہے، ان کی بنا پر کوئی تشریعی حکم نہیں دیا جا سکتا لیکن آپ کے ہاں اِکفار و تکفیر اور اقتداء پر پابندیاں ایک دل لگی ہے اور دل خوش کن مشغلہ ؎

وَالْكُفْرُ عِنْدَكُمْ رَخِيْصٌ سِعْرُهُ حُصُّوا بِلَا كَيْلٍ وَلَا مِيْزَانٍ [2]

① اے سعد! اس طرح تو اونٹوں کو پانی نہیں پلایا جاتا!

② تمھارے ہاں کفر انتہائی رخیص ہے، بغیر ماپے اور تولے اسے پھینکو۔

میری گزارش اس قدر ہے کہ یہ فتویٰ بازی ان دلائل کی بنا پر دیانتاً بھی مناسب نہیں اور آپ کی پارٹی علمی طور پر بھی اس کی اہل نہیں کہ ایسے اہم اور ذمے دار مسائل میں جسارت کر سکے۔ آپ حضرات کے لیے اعراس، موالید، اسقاط، ختم، ساتواں، چالیسواں، جمعرات جیسے مفید مشاغل کیا کم ہیں؟ آپ خواہ مخواہ ایک علمی ذمے داری کے لیے میدان میں تشریف لے آتے ہیں!!

⑨ کنویں کی پاکیزگی، ڈولوں کی مقدار اور تعداد میں جو تفاوت رکھا گیا ہے وہ بھی محض آثار ہی ہیں۔ کتاب اللہ یا سنتِ صحیحہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک کنویں میں چڑیا یا چوہا یا مولا وغیرہ گر جائے تو آپ کے ہاں بیس ڈول نکالنے سے کنواں پاک ہو گا۔ خاموشی سے تقلیداً مان لینا تو اور بات ہے۔ ذرا سوچیے! انیس ڈول نکلنے تک تو کنواں بالکل ناپاک ہو گا، بیسواں ڈول ساری پلیدی لے کر باہر آ جائے گا۔ اور آپ یقین کریں گے اور مطمئن ہوں گے کہ اب کنواں بالکل پاک ہے، لیکن اس بیسویں ڈول سے جو پلیدی کا بقیہ لے کر آ رہا ہے جس قدر قطرے کنویں میں گریں گے، کنواں پھر سے پلید نہ ہو گا؟!

دراصل ان تمام آثار کی بنیاد نزاہت اور طبعی کراہت پر ہے۔ آپ نے اسے تشریعی حکم قرار دے کر پانی کے چند قطروں سے پاک اور پلید کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ چہ عجب!!

اتنی کمزور عمارت اور بودے دلائل کے ہوتے ہوئے آپ اہلِ حدیث اور موالک پر حملہ آور ہوتے ہیں حالانکہ ان کا مسلک استدلال کے لحاظ سے کافی مضبوط ہے۔ یہ مسئلہ کس قدر صاف اور معقول ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ، کنویں میں ہو یا تالاب میں، تالاب دہ در دہ ہو یا چھوٹا، اس میں نجاست گرے اور اس کے بعض یا کل اوصاف یعنی رنگ اور مزہ اور بو کو بدل دے تو پانی پلید ہو جائے گا۔ اور اس میں اگر مزید اتنا پانی داخل کیا جائے جس سے یہ اوصاف درست ہو جائیں، یعنی رنگ، بو اور مزہ درست ہو جائے یا اس نجاست کی مقدار کو اتنا کم کیا جائے کہ اس کا بظاہر کوئی اثر نہ رہے تو پانی پاک ہو گا۔ اتنے صاف مسئلے پر آپ ان اوچھے ہتھیاروں سے حملہ آور ہوتے ہیں!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یوں برادرانہ طور پر صلح صفائی سے مساجد کی امامت کا محکمہ آپ کے سپرد کر دیا جائے، مردہ شوئی، فاتحہ خوانی، اسقاط، چالیسواں وغیرہ کا ٹھیکا آپ لے لیں تو یہ دوسری بات ہے مگر آپ

اپنے دل کی تقدیس کے متعلق یقین دلا دیں کہ اس میں شرک و بدعت کی نجاست نہیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم لوگ ان شاء اللہ امامت آپ کے سپرد کر دیں گے لیکن آپ یقین فرمائیں کہ ان حالات میں یہ امامت پیٹ پوجا کا ذریعہ نہیں بن سکے گی۔

پانی کے مسئلے میں مَیں نے مختصراً چند گزارشات کر دی ہیں۔ وَمَنِ اسْتَزَادَ فَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ!

شراب کی طہارت!

2 مولانا رضوی، مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم پر اس لیے ناراض ہیں کہ نواب صاحب مغفور شراب کی نجاست کے قائل نہیں۔ یہ دوسری دلیل ہے جسے اہلِ حدیث کی اقتداء کے ناجائز ہونے کے متعلق پیش کیا گیا ہے۔ میرا ذاتی رجحان بھی اسی طرف ہے کہ شراب نجس ہے اور حنابلہ اور احناف کا مسلک اس میں صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مسئلہ قیاسی نہیں ہے، اس کے لیے نص کی ضرورت ہے۔ نواب صاحب مرحوم کو اس پر اصرار نہیں، وہ بھی بیّن دلیل چاہتے ہیں جو بوقتِ تعارض ترجیح کا موجب بن سکے۔ فرماتے ہیں:

”وَبِالْجُمْلَةِ فَالْوَاجِبُ عَلَى الْمُنْصِفِ أَنْ يَّقُوْمَ مَقَامَ الْمَنْعِ، وَلَا يَتَزَحْزَحُ عَنْ هٰذَا الْمَقَامِ إِلَّا بِحُجَّةٍ شَرْعِيَّةٍ (الروضة الندية، ص: ١٢)

”منصف مزاج آدمی کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں حجتِ شرعی کے سوا اپنے موقف سے نہ ہٹے۔“

اس لیے بہتر ہوگا کہ رضوی صاحب شراب کی نجاست پر کوئی نص لائیں جیسے شراب کی حرمت پر نص موجود ہے۔ مناسب ہوگا کہ فتووں پر زور ڈالنے سے زیادہ زور دلائل پر دیا جائے۔ ہمارے بریلوی دوستوں میں یہ بنیادی کمزوری ہے کہ یہ حضرات ہمیشہ جذبات سے خطاب فرماتے ہیں اور فتووں پر زیادہ زور ڈالتے ہیں۔ معقول آدمی کے لیے یہ دونوں حربے بے کار ہیں۔

نواب صاحب مرحوم شراب کو پاک نہیں سمجھتے بلکہ وہ آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ شراب نجس ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ﴾

[المائدة: ٩٠]

''شراب، جوا اور بت سب پلید ہیں اور شیطانی عمل۔''

آلاتِ قمار اور انصاب کے پلید ہونے کے باوجود ان کو چھونے سے نہ جسم پلید ہوتا ہے، نہ کپڑے بلکہ ان کی نجاست حکمی ہے، حسی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ﴾ [التوبة: ٢٨]

''مشرک نجس ہیں، اس لیے (وہ بلا اجازت) مسجد حرام میں نہ آئیں۔''

قرآن مجید کا یہ حکم تمام مشرکین کے لیے عام ہے کہ وہ نجس اور پلید ہیں۔ ہند کے مشرک ہوں یا پاکستان کے، عرب کے ہوں یا عجم کے۔ لیکن معلوم ہے کہ ان کے چھونے سے نہ کپڑے پلید ہوتے ہیں نہ جسم۔ نواب صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

''وَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ تِلْكَ النَّجَاسَةَ حُكْمِيَّةٌ لَا حِسِّيَّةٌ، وَالتَّعَبُّدُ إِنَّمَا هُوَ بِالنَّجَاسَةِ الْحِسِّيَّةِ'' (الروضة، ص: ١٢)

''یہ حکمی نجاست ہے، حسی نہیں۔ اور عبادت میں پرہیز حسی نجاست سے ہے۔''

وفدِ ثقیف مسجدِ نبوی میں آیا لیکن آنحضرت ﷺ نے مسجد دھونے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بیت اللہ میں مشرک آتے جاتے رہے۔ آنحضرت ﷺ نے رکاوٹ نہیں فرمائی کیوں کہ یہ نجاست حکمی تھی حسی نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے مشرکین کا پانی استعمال فرمایا۔[1] قرآن حکیم میں محرمات النکاح کا مفصل تذکرہ موجود ہے لیکن ان رشتوں میں کوئی بھی پلید نہیں۔ حرمت دوسری چیز ہے اور نجاست دوسری چیز۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ میری وجدانی کیفیت یہ ہے کہ میں اس مسئلے میں احناف کے مسلک کو صحیح سمجھوں لیکن نواب صاحب مرحوم اور امام شوکانی رحمہ اللہ کی گرفت بھی معمولی نہیں۔ فَتَفَكَّرْ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ!

ان کا مطالبہ ہے کہ ان چیزوں کو حسی نجس ثابت کرنے کے لیے دلیل لائیے۔

سونا، چاندی، ریشم مردوں پر حرام ہیں لیکن ان کے چھونے سے جسم پلید نہیں ہوتا نہ نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔ تمام زہر، کچلہ، سم الفار وغیرہ حرام ہیں نجس نہیں۔ اسی طرح مخدرات حرام ہیں، پلید نہیں۔ نواب صاحب شراب کو حرام بھی سمجھتے ہیں اور پلید بھی لیکن اس کی نجاست کو حسی نہیں سمجھتے۔ یہ ایسا جرم نہیں جس پر آپ حضرات خفگی فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی فرما سکتے ہیں کہ مرحوم نے ٹھیک نہیں سمجھا اور یہ بھی اس وقت جب بیّن دلیل مل جائے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٢)

مولانا! نواب صاحب کا یہ حال ہے کہ نہ وہ شراب کے ساتھ علاج جائز سمجھتے ہیں اور نہ شراب میں گوشت پکانا ان کے ہاں درست ہے لیکن حنفیہ رحمہم اللہ کے ہاں چار قسم کی شراب حرام ہے اور چار قسم کی حلال:

”وَالْحَلَالُ مِنْهَا أَرْبَعَةُ أَنْوَاعٍ: نَبِيْذُ الْقَرِّ، وَالزَّبِيْبِ إِنْ طُبِخَ أَدْنٰى طَبْخَةٍ يَحِلُّ شُرْبُهُ، وَإِنِ اشْتَدَّ، وَهٰذَا إِذَا شَرِبَ مِنْهُ بِلَا لَهْوٍ وَطَرَبٍ مَا لَمْ يُسْكِرُ، وَالثَّانِي: اَلْخَلِيْطَانِ، اَلثَّالِثَةُ: نَبِيْذُ الْعَسَلِ وَالتِّيْنِ، وَالْبُرِّ، وَالشَّعِيْرَةِ، طُبِخَ أَوْ لَا، وَالرَّابِعُ: الْمُثَلَّثُ“ (الدر المختار، ص: ٤٣٨ نولکشور)

”چار قسم کی شراب حلال ہے: کھجور اور منقیٰ کا نبیذ جب اسے تھوڑا سا پکایا جائے۔ دوسرا مخلوط نبیذ۔ تیسرا شہد اور انجیر وغیرہ کا نبیذ اور چوتھا مثلث انگور کا شیرہ جس کا دو تہائی جل چکا ہو۔ یہ سب قسمیں حلال ہیں بشرطیکہ قوت کی نیت سے استعمال کی جائیں، لہو ولعب کا ارادہ نہ ہو۔“

جب حنفی مذہب میں اتنی وسعت ہے کہ نیک نیتی سے بقدرِ ضرورت پی بھی جائے تو حرج نہ ہو، اور وہابیوں پر صرف طہارت مع الحرمت کی بنا پر اتنا سنگین فتویٰ دینا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ ”فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَ قَامَ تَحْتَ الْمِيْزَابِ“ کا معاملہ ہوگا[1] ؎

اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف
تیرے عفو کی امید پہ تھرا کے پی گیا

میرا مقصد ان گزارشات سے الزام ہے نہ عیب چینی۔ مقصد یہ ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات آسکتی ہیں جن کی وجوہات بھی اہلِ علم کے پاس ہوتی ہیں، غلط ہوں یا صحیح، فریقِ مخالف اسے قبول کرے یا نہ کرے لیکن ان جزئیات سے جذباتی طور پر عوام کو انگیز کرنا علم کی شان نہیں!

کون نہیں جانتا کہ شراب کے استعمال میں جس قدر وسعت احناف کے مسلک میں ہے دوسرے ائمہ کے مسلک میں نہیں۔ سنن نسائی کے آخری ابواب پڑھیے اور سوچیے کہ اہلِ علم نے اس ام الخبائث کے استعمال میں کس قدر کمزوریاں دکھائی ہیں جس کی پیشگوئی آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے۔[2]

---

[1] بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٦٨)

سب سے زیادہ محتاط مسلک اس میں اہلِ سنت و الحدیث کا ہے، پھر صرف طہارت پر طعن بازی کیوں کی جائے؟

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ نواب صاحب اور امام شوکانی کی تحقیق تمام اہلِ حدیث کے نزدیک مسلّم ہو۔ آپ کے ہاں جو مقام حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کی فقہیات کو حاصل ہے ہمارے ہاں نواب صاحب اور ان کی تصانیف کو وہ مقام حاصل نہیں۔ ہم نواب صاحب اور امام شوکانی سے کئی مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں، اس لیے ادباً گزارش ہے کہ اسے جماعتی سوال نہ بنایا جائے!

شراب کے مسئلے میں غالباً لفظ نبیذ کی وضاحت میں وقت ضائع نہیں فرمایا جائے گا، غلیان اور اشتداد کے بعد خمارِ عقل تو ضرور ہو گا۔ آپ اسے نبیذ تمر فرمایئے، مجھے خمر النبیذ کہنے کی اجازت دیجیے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ((يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا))[1] (نسائي) تو درست اور حق ہے۔ الفاظ کی ہیرا پھیری کا حقیقت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ علماء نے اسے شراب ہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: طبقات الحنابلہ لابی یعلی (ص: ۱۱۳)۔ امام خلف بن ہشام بن ثعلب (م ۳۲۹ھ) فرماتے ہیں:

"أَعَدْتُ صَلَاةَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً كُنْتُ أَتَنَاوَلُ فِيْهَا الشَّرَابَ عَلٰى مَذْهَبِ الْكُوْفِيِّيْنَ"

"میں نے چالیس سال کی نماز کا اعادہ کیا، کیوں کہ میں اصحابِ کوفہ کے مسلک کے مطابق شراب پیتا رہا۔"

جمہور صحابہ اور تابعین کا مسلک یہ ہے کہ ہر مست کرنے والی چیز تھوڑی ہو یا زیادہ حرام ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ایک روایت اس کی مؤید ہے۔ امام محمد اور مشائخ میں سے ایک گروہ نے بھی یہی مسلک پسند فرمایا ہے۔ امام شعبی، نخعی اور امام ابوحنیفہ سے ایک دوسرا مسلک بھی منقول ہے کہ انگور اور کھجور کے سوا گیہوں کی شراب درست ہے بشرطیکہ حدِ سکر کو نہ پہنچے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ((كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ))[2]

نیز فرمایا: ((مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ))[3]

[1] **صحيح**. سنن أبي داود (٣٦٨٨) سنن النسائي (٥٦٥٨) سنن ابن ماجه (٤٠٢٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣)

[3] **صحيح**. سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٦٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٩٣)

''جو مست کرے وہ خمر ہے۔ مسکر چیز کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔''

اس لیے پہلا مسلک صحیح اور دوسرا مسلک اجتہادی غلطی پر مبنی ہے۔ جب احناف میں شراب کے متعلق اتنا نرم رویہ اختیار فرمایا گیا ہے تو نواب صاحب اور بے چارے اہلِ حدیث پر صرف پاک اور حرام کہنے پر کیوں خفگی فرمائی جا رہی ہے؟

قصۂ پارینہ نوکِ قلم پر آ گیا ہے۔ اجازت دیجیے کہ مبحث اور نکھر جائے تا کہ جناب سنجیدگی سے غور فرما سکیں اور نواب صاحب اور اہلِ حدیث کی قرار دادِ جرم بھی منظرِ عام پر آ جائے تا کہ اربابِ دانش سوچ سکیں کہ معاملہ کہاں تک سنگین ہے۔ کچھ حقیقت بھی ہے یا صرف ''شیر آیا'' تک ہی ساری داستان ختم ہو جاتی ہے۔

قاضی خاں (۱/ ۱۱) فرماتے ہیں:

"ذَكَرَ النَّاطِفِيُّ عَنْ مُحَمَّدٍ: إِذَا صَلّٰى عَلٰى جِلْدِ كَلْبٍ أَوْ ذِئْبٍ قَدْ ذُبِحَ جَازَتْ صَلَاتُهُ" الخ

''امام محمد فرماتے ہیں: اگر کتا یا بھیڑیا ذبح کیا جائے تو اس کے چمڑے پر نماز جائز ہے۔''

"أَمَّا إِذَا ذُبِحَ بِالتَّسْمِيَةِ، وَصَلّٰى مَعَ لَحْمِهِ أَوْ جِلْدِهِ قَبْلَ الدَّبَاغَةِ يَجُوْزُ"

''جب کتا وغیرہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا جائے اور اس کے گوشت یا اس کے چمڑے پر نماز پڑھی جائے رنگنے سے پہلے تو یہ جائز ہے۔''[1]

معلوم ہے درندے حرام ہیں۔ حرمت کے باوجود یہ بسم اللہ کے ساتھ ذبح کیے جائیں تو ان کا گوشت اپنے پاس رکھ کر ان کے چمڑے پر نماز ہو جائے گی!

مولانا! یہ بالکل وہی چیز ہے جو نواب صاحب فرما رہے ہیں۔ شراب حرام ہے لیکن پاک۔ یہاں گوشت اور چمڑا دونوں حرام ہیں مگر ذبح سے پاک ہوگئے ہیں۔ فرمایئے! آپ میں اور نواب صاحب میں کیا فرق ہے؟ نواب صاحب بے چارے صرف پاک کہہ رہے ہیں لیکن جناب کے ہاں نبیذِ مسکر پی کر کتے کا گوشت جیب میں رکھ کر اور اس کے چمڑے کا مصلّٰی (دباغت سے پہلے) پاؤں کے نیچے بچھا کر نماز پڑھنی جائز ہے مگر پھر بھی کافر وہابی ہی ہیں۔ إنا للّٰہ!

[1] منية المصلي (ص: ٤٧)

جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ عادت کے خلاف ہے۔ میں ان اجتہادی لغزشوں کی نمائش کا عادی نہیں مگر آپ کا فتویٰ بے حد دلخراش تھا، اس لیے بہ دلِ نخواستہ حقیقتِ حال سے پردہ اٹھانا پڑا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

آپ غور فرمائیں! اصولاً آپ میں اور نواب صاحب رحمہ اللہ میں کوئی فرق نہیں۔ صرف کتے اور شراب کا فرق ہے۔ اصولی اتحاد کے بعد جزوی اختلاف کی بنا پر اس قدر تیزی اہلِ علم کے لیے مناسب نہیں۔

پھر جو کچھ نواب صاحب نے فرمایا یہ پوری جماعتِ اہلِ حدیث کا مسلک نہیں۔ جماعت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شراب کو احناف اور حنابلہ کی طرح نجاستِ مغلظہ سمجھتے ہیں۔ صریح دلائل کے فقدان کے باوجود میرا ذاتی رجحان اسی طرف ہے۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ آپ بوقتِ ضرورت وہابی امام سے دریافت فرمالیں کہ وہ ام الخبائث کو پاک تو نہیں سمجھتے؟ اور وہ بھی اگر آپ کی طرح متعصب ہو تو دیارفت کرے کہ جناب نے کچھ زیادہ تو نہیں پی اور مصلیٰ بھی ذبیحہ محرمہ سے نہیں بنوایا گیا؟

ہمارا مسلک آپ سے بالکل الگ ہے۔ ہم ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، حنفی ہو یا اہلِ حدیث، اور غیر مسلم حنفی کی اقتداء کے لیے تیار نہیں۔ یہ دونوں قسمیں آج کل عام ہیں۔ اہلِ حدیث اور حنفی کے لیے تو بحث کرتے ہیں لیکن عملاً بلکہ عقیدتاً وہ غیر مسلم ہوتے ہیں۔ جھوٹ، بد دیانتی سب کچھ کرتے ہیں لیکن حنفیت اور وہابیت کے لیے خوب لڑتے ہیں۔ ایسے لوگ کوئی نام رکھیں ان کی نماز، اقتداء سب مشتبہ ہے۔ اور افسوس ہے کہ غیر مسلم حنفیوں کی بڑی کثرت ہے۔

پگڑی پر مسح:

③ سر پر مسح کرنا فرض ہے۔ احناف اس سے چوتھائی سر مراد لیتے ہیں کیوں کہ حدیث میں ((مَسَحَ عَلٰی نَاصِیَتِهٖ))[1] صراحتاً آیا ہے۔ ناصیہ سے مراد ان کے ہاں ربع سر ہے۔ شوافع کا خیال ہے کہ سر کی طرف سے کم از کم چند بالوں کا مسح ہو جائے۔ موالک پورے سر کا مسح ضروری سمجھتے ہیں۔

حدیث شریف میں مسح کی تین صورتیں مروی ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠)

1. پورے سر کا مسح۔
2. سر کے بعض حصے پر اور کچھ پگڑی پر۔
3. پوری پگڑی پر۔

احناف کا معمول احادیث میں بصراحت موجود نہیں۔ صرف مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مختصر ہے۔ صحیح مسلم میں دونوں روایتیں موجود ہیں۔ قرآن کے اطلاق پر صرف موالک کا عمل ہے۔ ایک توضیح احناف نے کی اور پورے سر کو چوتھائی کرایا اور شوافع نے چند بال سے اس کی تفسیر کی۔ یہ چیزیں تو گوارا ہیں، آپ بھی حق پر، شوافع بھی حق پر اور موالک بھی حق پر۔ اور اہلِ حدیث اگر سنتِ صریحہ کے مطابق پگڑی پر مسح کریں تو معتوب!!

اب حدیث سنیے:

"عَنْ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ الضَّمْرِيِّ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ: يَمْسَحُ عَلٰى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ"[1] (صحیح بخاري مع کرمانی، پ:۳، ص: ۵۳)

"آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے موزوں اور پگڑی پر مسح فرمایا۔"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَذَهَبَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ إِلٰى جَوَازِ الْاِقْتِصَارِ عَلَى الْعِمَامَةِ، وَوَافَقَهُ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِنَ السَّلَفِ" (مسلم مع نووی: ۱/ ۱۳٤)

"امام احمد بن حنبل صرف پگڑی پر مسح جائز سمجھتے ہیں اور سلف سے ایک جماعت ان کے ساتھ متفق ہے۔"

حدیث مسح علی العمامہ حضرت بلال، مغیرہ بن شعبہ، حضرت سلیمان اور ثوبان رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔[2] اب آپ سوچ لیں کہ وہابیوں کے ساتھ کون کون بزرگ محروم الاقتداء تصور کرتے ہیں۔ ع

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

مولانا! معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ۔فداہ ابی وامی۔ سخت قسم کے وہابی تھے۔ بریلی اور لاہور کے اربابِ فکر سوچ لیں کہ آنحضرت ﷺ کی اقتداء میں "نماز کا بیڑا غرق" کا فتویٰ صادر فرما سکیں تو

[1] صحيح البخاري (٢٠٢) سنن أبي داود (١٥٣) صحيح ابن حبان (٤/ ١٧٣)

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٨٩)

اپنے بزرگ کی وراثت میں دارالندوہ کی چابیاں آپ حضرات کے حوالے کر دی جائیں گی اور حقدار کو حق مل جانے پر ہمیں بھی مسرت ہو گی۔

وجوبِ غسل:

④ زن و شوہر کے تعلقات میں اگر کسی فتور کی وجہ سے مادہ منویہ نکلنے کی نوبت نہ آئے تو جمہور کا مذہب ہے کہ غسل واجب ہے۔ احناف کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام بخاری اور بعض دوسرے ائمہ سلف کا مذہب ہے کہ اس صورت میں غسل واجب نہیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ غسل کرے۔[1] (بخاری)

دونوں مسلک کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ چونکہ تاریخ معلوم نہیں اس لیے نسخ کا دعویٰ تو صحیح نہیں۔[2] جو مسلک راجح ہو اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ اقتداء کے جواز یا عدم پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ صحیح بخاری، فتح الباری، نیل الاوطار، فتاویٰ ابن تیمیہ میں تفصیل ملے گی۔[3]

---

1. صحیح البخاري (١/ ١١١) امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے: "اَلْغُسْلُ أَحْوَطُ وَذَاكَ الْآخَرُ وَإِنَّمَا بَيَّنَّا لِاخْتِلَافِهِمْ" یعنی غسل کرنا ہی زیادہ محتاط ہے اور یہی آخری امر ہے۔ ہم نے محض اختلاف کی بنا پر اسے واضح کیا ہے۔
امام ابن العربی رحمہ اللہ قولِ امام بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں:
"يحتمل أن يكون مراد البخاري بقوله: الغسل أحوط أي في الدين، وهو باب مشهور في الأصل ... وهو أشبه بإمامة الرجل وعلمه"
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
"وهذا هو الظاهر من تصرفه فإنه لم يترجم بجواز ترك الغسل، وإنما ترجم ببعض ما يستفاد من الحديث من غير هذه المسألة كما استدل به على إيجاب الوضوء فيما تقدم" (فتح الباري: ١/ ٣٩٨)
نیز دیکھیں: دفاع صحیح بخاری از مولانا أبو القاسم بنارسی رحمه الله (ص: ٢٥١)
2. نسخ کی صراحت بھی صحیح روایات سے ثابت ہے جیسا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "إنما كان الماء من الماء رخصة في أول الإسلام ثم نهي عنها" (سنن الترمذي، رقم الحديث: ١١٠)
امام ترمذی رحمہ اللہ یہ اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
"هذا حديث حسن صحيح، وإنما كان الماء من الماء في أول الإسلام، ثم نسخ بعد ذلك، وهكذا روى غير واحد من أصحاب النبي ﷺ منهم: أبي بن كعب، ورافع بن خديج، والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم على أنه إذا جامع الرجل امرأته في الفرج وجب عليهما الغسل وإن لم ينزلا"
3. صحيح البخاري (١/ ١١١) فتح الباري (١/ ٣٩٨) نيل الأوطار (١/ ٢٧٦) شرح العمدة في الفقه لابن تيمية (١/ ٣٥٩) مجموع الفتاویٰ (٢٣/ ٣٩)

پاؤں پر مسح:

5 یہ مولانا رضوی کی آخری دلیل ہے کہ اہلِ حدیث پاؤں پر مسح جائز سمجھتے ہیں۔ یہ فتاویٰ ابراہیمیہ کے حوالے سے لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ مولوی ابراہیم کون سے بزرگ ہیں اور فتاویٰ ابراہیمیہ کیا بلا ہے۔ ہم صراحتاً یہ گزارش کرتے ہیں کہ اہلِ حدیث کا یہ مسلک نہیں اور غالباً شیعوں کے سوا ائمۂ سنت میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں۔

آخری گزارش!

ہم ''رضوان'' اور اس کے ادارے کے محترم ارکان کونظر انداز کر رہے تھے۔ خیال نہ تھا کہ ان بزرگوں کو خواہ مخواہ تکلیف دی جائے۔ یہ پہلی دفعہ جوابی گزارشات کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ آیندہ بھی اسی غلطی کا اعادہ ہو، اس لیے مولانا رضوی اور ان کے رفقاء ایک بات سمجھ لیں کہ اہلِ حدیث علماء اور بزرگوں کے فقہی اقوال ہمارے ہاں اساسِ مذہب نہیں، نہ ہم انھیں ائمۂ اجتہاد کی طرح امام ہی مانتے ہیں، نہ ان کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے یہ چیزیں بطورِ الزام نہ لکھی جائیں۔ واجب التعمیل ہمارے لیے صرف کتاب وسنت اور آثارِ سلف کے سوا کچھ نہیں۔ آثارِ سلف میں اجماعی مسائل کی پابندی ہو گی۔ باقی مسائل میں جہاں سلف مختلف ہوں، ہم کسی کے پابند نہیں۔ مناسب ہو گا کہ لکھتے وقت یہ اصل پیشِ نظر رہے۔ اس سے بحث میں طول نہیں ہو گا اور شاید ہم ایک دوسرے کے کچھ قریب بھی ہو سکیں۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۲۷ / اپریل تا یکم جون ۱۹۵۱ء)

ہماری سرگزشت

آیندہ تبلیغی مساعی گذشتہ حوادث کی روشنی میں

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را [1]

سماک بن حرب نے سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: کیا آپ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (خاص) مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ہاں، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک نماز گاہ میں تشریف رکھتے تھے اور صحابہ جاہلیت کی عادات کا تذکرہ کر کے ہنستے اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تبسّم فرماتے۔[2] (صحیح مسلم: ۱/ ۲۳۵)

زیرِ قلم گزارشات سے نہ گلہ مقصود ہے نہ کسی کی تنقیص۔ وقت گزر چکا ہے۔ ان حوادث پر تقریباً سو سال گزر رہا ہے۔ اس وقت کے مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں جہاں ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً اپنے اعمال کے نتائج سے باخبر ہو چکے ہوں گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض ماضی کے حوادث کبھی مستقبل میں رونما ہوں تو اپنے اس وقت کے لوگ حیران نہ ہوں بلکہ جرأت سے حق کا ساتھ دیں تاکہ کسی کی بڑائی حق کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔

نیز دین جیسی پسندیدہ اور مقدس چیز میں جب تعصب آ جائے تو انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی ایسی باتیں کر گزرتا ہے جن کی اس سے امید نہیں ہوتی۔ اگر کبھی آپ اپنی تاریخ پر غور فرمائیں گے تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ان حرکات پر ہنسیں گے، خصوصاً وہ حضرات جن کے بزرگوں نے کبھی کسی مسلک کے خلاف حصہ لیا تھا لیکن اس کے بعد خدا نے ان کی راہنمائی فرمائی۔

میں خود سوچتا ہوں کہ مسلک اہلِ حدیث سے اختلاف کی گنجایش نہیں۔ ممکن ہے تحقیق سے ان

---

[1] اگر سینے کے داغ تازہ رکھنا چاہتے ہو تو اس پرانے قصے کو کبھی کبھی پھر سے یاد کر لیا کرو۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۲۲)

کی بعض فروع کمزور ثابت ہوں لیکن مسلک کے ساتھ بغض کی کوئی وجہ نہیں۔ معلوم ہے کہ اس وقت بھی اچھے اچھے پڑھے لکھے حضرات اس مسلک سے نفرت کرتے ہیں۔ تقریر وتحریر دونوں میں اس نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہی غلط فہمی اور بغض ہے جس سے ہمارا اور ہمارے اکابر کا مدت سے سابقہ رہا ہے۔

اہلِ حدیث اور ائمہ حدیث:

اہلِ سنت کے مکاتبِ فکر ابتدا ہی سے دو چلے آ رہے ہیں: اہلِ حدیث اور اہل الرائے۔ شیخ عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) فرماتے ہیں:

”وَالصِّنْفُ الثَّانِي مِنْهُمْ أَئِمَّةُ الْفِقْهِ مِنْ فَرِيْقَيِ الرَّأْيِ وَالْحَدِيْثِ مِنَ الَّذِيْنَ اعْتَقَدُوْا فِيْ أُصُوْلِ الدِّيْنِ مَذَاهِبَ التَّفْوِيْضِ فِيْ اللّٰهِ وَصِفَاتِهِ“

(الفرق بین الفرق، ص: ۳۰۰)

”دوسری قسم فقہائے کرام کی ہے جن میں اہل الرائے اور اہلِ حدیث دونوں شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات میں تفویض کے قائل ہیں۔“

یہ دونوں گروہ اہلِ سنت ہیں اور یہ لوگ صفاتِ باری میں تفویض کے قائل ہیں۔[1] فرق صرف اسی قدر ہے کہ حضرات اہل الرائے کتاب وسنت کے فہم میں مخصوص اہلِ علم کے آراء و افکار کا تتبع کرتے ہیں۔ اہلِ حدیث کی روش میں کسی قدر وسعت ہے۔ وہ کتاب وسنت کے فہم میں سلف صحابہ کے پورے دور اور ان کے افکار کو سامنے رکھتے ہیں، اور حضرات صحابہ میں سے کسی کے آراء و افکار سے بھی تطابق ہوجائے تو وہ اسے گوارا کرتے ہیں۔ یہ مسلک ہمیشہ دنیا میں رہا ہے۔ اختلاف کے باوجود یہ دونوں فریق ایک دوسرے کی تکفیر یا تضلیل نہیں کرتے۔ ان کے ہاں اختلافی فروع میں ترجیح تو ہوتی ہے، تکفیر، تفسیق اور تضلیل نہیں ہوتی۔

مسلک کی قدامت:

یہ مسلک ائمہ اربعہ رحمہم اللہ سے بھی پہلے کا ہے لیکن زمانے کے انقلابات، سیاسی مصالح اور عروج و زوال کے مختلف مراحل سے گزرنے کی وجہ سے عددی قلت اور کثرت سے متاثر ہوتا رہا۔ قرونِ خیر

[1] صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں لفظ ”تفویض“ کا اطلاق دو معانی پر کیا جاتا ہے جن میں سے ایک صحیح اور دوسرا نادرست ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں (ص: ۹۲)

کے بعد عموماً حکومت سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے اہلِ حدیث اقلیت ہی میں رہے لیکن خود دار زندگی اور خدمتِ حدیث کی وجہ سے علمی حلقوں میں ائمۂ حدیث ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فروعی عملیات میں حنفی مسلک کے پابند تھے لیکن نظریات میں اہلِ حدیث سے بہت زیادہ قریب تھے۔

دسویں صدی کے بعد ہندوستان میں مسلک اہلِ حدیث کے شیوع کے دو سبب ہیں:

1. فقہ حنفی اور اس کے متوسلین میں انتہائی جمود اور تصلب۔
2. حضرت مجدد الفِ ثانی سے لے کر حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تک اس جمود و تصلب پر محقق اہلِ علم کی تنقید۔

یہ حضرات عموماً اپنے متعلق اظہار فرماتے تھے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اپنا مقتدا اور امام سمجھتے ہیں لیکن فقہ مروج اور اس کی جزئیات پر ان کی محققانہ تنقید کی شہادت ان کی تصانیف سے ملتی ہے۔ بدعات کے خلاف ان کی تصانیف میں بھرپور حملے موجود ہیں۔ آج کل کے حضرات علمائے دیوبند اور بریلوی حملہ آوروں کی روش کو دیکھنے والا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ کو غیر مقلد سمجھے گا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات حنفی تھے لیکن ان میں جمود نہیں تھا۔ وہ محقق تھے، ان میں تقلیدی تصلب نہیں تھا۔ اللھم اغفرلھم وارحمھم واجعلھم من ورثة جنة النعیم.

شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ:

شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ اسی حرکت (تحریک) کا نچوڑ تھے جس کی ابتدا حضرت مجدد الفِ ثانی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ان تمام نظریات کو عمل کی صورت عطا فرمائی جو اس سے پہلے واقعی علم و نظر کی حدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ شاہ صاحب نے سیاسیات میں اپنا مطمحِ نظر اسلامی حکومت قرار دیا۔ شرک و بدعت کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ فرمایا اور تقلید و جمود پر کاری ضرب لگائی۔ صراطِ مستقیم کے بعض مقامات، تذکیر الاخوان، اور اس سے پہلے حجۃ اللہ کے بعض اجزاء، عقد الجید اور الانصاف میں یقیناً تحقیق و نظر کی دعوت ہے، اور تقلید و جمود کے خلاف جذبات کو اس سے خاصی اعانت ملتی ہے۔

اس لیے یقین فرمایئے کہ اس دورِ انحطاط میں مسلک اہلِ حدیث کے احیا کا شرف ان حنفی

بزرگوں کو حاصل ہے جن کو تقلید و جمود سے نفرت تھی۔ وہ حنفیت کو محض تقلیدی مسلک نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ شَکَرَ اللّٰهُ مَسَاعِيَهُمْ.

شہید رحمہ اللہ کے بعد:

۶/ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ جمعہ کے دن شاہ شہید رحمہ اللہ نے مع رفقاء جامِ شہادت نوش فرمایا۔ یہ تحریک اپنے سیاسی مقاصد کے لحاظ سے بظاہر ناکام ہوگئی لیکن سکھوں کی کمر توڑ گئی۔ تھوڑے عرصے میں سکھ کمزور ہوگئے۔ پورے پنجاب پر انگریز قابض ہوگئے۔ تحریک کا کام انگریزی علاقے میں خفیہ ہوگیا لیکن سرحدی علاقے میں انگریزوں سے برسوں تک دو بدو جنگ رہی۔ متحدہ ہندوستان میں اس جماعت پر انگریز نے کئی سازش کیس بنائے۔ عمر قید اور پھانسی تک کی سزائیں دیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔

امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی مرحوم نے کشمیر کے محاذ پر اپنی بساط کے مطابق حکومتِ پاکستان کی مدد کی۔ اس کے باوجود کوئی شبہ نہیں کہ انگریز کی طاقت مضبوط تھی۔ جماعت اس کا مقابلہ دست بدست نہیں کر سکی۔ جو ہوا انڈر گراؤنڈ اور خفیہ ہوا۔

۱۲۴۶ھ کے بعد اہلِ علم کی زیادہ توجہ علمی مشاغل کی طرف ہوگئی۔ دیوبند، سہارن پور اور دہلی میں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مدارس جاری ہوگئے اور فقہ و حدیث کی تدریس شروع ہوگئی۔ اس وقت میاں صاحب یعنی شیخ الکل سید نذیر حسین کا مدرسہ زیادہ بارونق اور فعال تھا۔ اکیلے وجود نے ڈھیر سارا کام کیا۔ عرب و عجم تک میاں صاحب کے اثرات اس قدر پہنچے کہ شاید کوئی یونیورسٹی بھی اتنا اثر نہ پیدا کر سکتی۔ عرب و عجم تک ان کے تلامذہ پھیل گئے۔ نیپال کی ترائیوں تک یہ نورِ مبین ضیا پاش رہا۔

مخالفت کا آغاز:

یہ معلوم نہیں ہو سکا مخالفت کا آغاز کب ہوا؟ کس نے کیا؟ فروع میں اختلاف بہت پرانا تھا اور وہ بھی شوافع، موالک، حنابلہ رحمہم اللہ سے زیادہ سنگین نہ تھا، اس لیے اس تیزی کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ ائمۂ اربعہ کے اَتباع ایک دوسرے کو حق پر مانتے تھے۔ اہلِ حدیث کا مسلک عملاً ائمۂ اربعہ سے چنداں مختلف نہیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ شوافع اعمالِ مسنونہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی اتباع میں کرتے ہیں۔ اہلِ حدیث ان اعمال کو سنت سمجھتے ہیں اور اتباعِ سنت کے جذبے سے کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی

لغزش نہیں جس پر اس قدر ناراضی کا اظہار کیا جائے۔ آخر ائمۂ محققین نے مروجہ تقلید کو زیادہ سے زیادہ اباحت کا مقام دیا ہے لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ وقت کا بہت بڑا بحران تھا۔ میری نظر میں اس دور کے قریباً سات رسائل ہیں جو اتفاقاً مل گئے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک کو کن تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑا۔

نام کتاب	زمانۂ تصنیف	مصنف
① كلام سليم لدفع بهتان عظيم	۱۳۰۰ھ	مولوی عبدالحق صاحب، یکے از رفقائے سید نذیر حسین رحمہ اللہ۔
② جامع الشواهد لإخراج الوهابيين من المساجد	۱۲۹۸ھ قریباً	مولوی وصی احمد صاحب سورتی مع مواہیر علمائے کرام۔
③ صيانة المؤمنين عن تلبيس المبتدعين	۱۳۰۰ھ	مولانا عبداللہ صاحب میواتی، علاقہ بھرت پور، جامع الشواہد کا جواب۔
④ عمارة المساجد بهدم أساس جامع الشواهد	۱۳۰۰ھ	مولانا محمد سعید صاحب کنجاہی بنارسی، جامع الشواہد کا جواب
⑤ كاشف المكائد في رد من منع عن المساجد	۱۳۰۰ھ	مولانا عبدالغنی صاحب جونا گڑھی، جامع الشواہد کا جواب
⑥ انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد	۱۳۲۸ھ	لدھیانوی خاندان (عبدالقادر، عبدالعزیز، محمد رحمہم اللہ)
⑦ إشاعة السنة	۱۳۰۱ھ	مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی
⑧ نصرة الأبرار	۱۳۰۶ھ	مولوی عبد العزیز و مولوی محمد لدھیانوی بن مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی۔

یہ کتابیں چھوٹے چھوٹے رسائل کی صورت میں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداءً تحریک میں اکابر اہلِ حدیث کو کن حالات سے سابقہ پڑا اور اختلافات نے کتنی ناہموار صورت اختیار کی۔

بریلوی حضرات کی مخالفت سے تو تعجب نہیں۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ حضراتِ دیوبند جو جانتے

تھے کہ یہ اختلافات فروعی ہیں اور ناگزیر، اور قرونِ خیر سے اہلِ علم کی آراء ان میں مختلف رہی ہیں، اسی طرح تقلیدِ شخصی کا التزام محض ایک مصلحت ہوسکتی ہے اس میں شرعی لزوم کی کوئی وجہ نہیں، یہ حضرات اس علم وفہم کے باوجود مخالف حلقوں میں کھڑے ہوگئے۔ ان کی اس روش سے دوسرے فریق کو بہت زیادہ مدد ملی۔ پھر یہ اختلافات مدارس اور علمی حلقوں (جو ان کا اصل مقام تھا) سے نکل کر حدیثِ محفل بن گئے۔ پریس اور اخبارات کی زینت بنے۔ مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم جیسے بزرگوں کا تختۂ مشق بنے جہاں وہ تقریر، تحریر، رنگینیٔ محفل کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ "اَلْخَیْرُ فِیْمَا وَقَعَ" کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟!

ان رسائل میں کیا ہے؟

"کلام سلیم لدفع بھتان عظیم" میں ایک چٹھی کا ذکر ہے۔ یہ چٹھی مولانا سید شریف حسین صاحب رحمہ اللہ، مولانا سید محمود صاحب امام جامع مسجد دہلی، مولوی عبدالمجید صاحب اور مرزا عبدالعزیز صاحب کی طرف سے مولوی ولایت علی صاحب فرخ آبادی مدرس کے نام لکھی گئی ہے، پھر اسے چھپوانے کے بجائے بذریعہ نقول اس کی اشاعت کی گئی ہے تاکہ قانون کی زد سے بھی بچا جائے اور فتنہ بھی ابھر سکے۔ یہ فتنہ ۱۲۹۸ھ میں بپا ہوا اور اس کی وجہ سے جابجا لڑائی اور ہنگامے ہوئے۔

چٹھی کا مضمون:

یہ چٹھی واقعی ایک آگ تھی جو کسی بدتمیز نے سلگائی۔ اگر جلدی سے اس کا سدِّ باب نہ ہوتا تو نامعلوم فتنہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ یہ چٹھی بعینہٖ اس وقت طبع شدہ میرے پاس موجود ہے جو اہلِ حدیث کی طرف سے مع تردید طبع کرائی گئی۔ اس کا مضمون اس قدر تکلیف دہ ہے کہ آج بھی اسے نقل کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کس بدتمیز نے یہ مضمون بنایا اور اہلِ حدیث کی طرف منسوب کرنے کی اسے کیسے جرأت ہوئی۔ ناظرین اقتباس پر کفایت فرمائیں:

1. آنحضرت ﷺ نے خنزیر کی چربی سے ملا ہوا پنیر بلا پرسش و تحقیق کھا لیا۔
2. حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سب مرتد اور کافر ہیں۔
3. تمام صوفی مثل خواجہ معین الدین، شیخ عطار، نظام الدین، شیخ عبدالقادر جیلانی کافر ہیں اور جہنمی۔
4. فقہ حنفی کی کتابیں ہدایہ وغیرہ گمراہ کن کتابیں ہیں۔
5. نقشبندی، سہروردی، چشتی، قادری اسلام سے خارج اور واجب القتل ہیں۔

٦ بیس تراویح کی بدعت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایجاد کی۔

٧ بیت اللہ میں شرک ہوتا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی طرح تمام قبوں کو گرا دینا چاہیے۔

٨ امام اعظم (معاذ اللہ) کافر ہیں۔ شیخ عبدالقادر (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں۔

٩ مولانا روم، مولانا جامی، سعدی، امیر خسرو، نظامی، بہاء الحق سب کافر تھے۔

١٠ سید نذیر حسین صاحب، مولانا شہید رحمہ اللہ تمام ائمہ، اہل اللہ، اولیاء اللہ سے افضل ہیں۔

١١ محمد شاہ اور منصور علی ملعون ہیں۔ وغير ذلك من الخرافات والأباطيل.

اس قسم کی بے ہودہ فواحش سے جو خطرات اور مفاسد ہو سکتے تھے وہ ایک عقل مند متدین سے مخفی نہیں۔ شکر ہے کہ اہلِ حدیث کی طرف سے اس کے متعلق اس نوعیت کی کوئی جوابی حرکت نہیں ہوئی بلکہ میاں صاحب مرحوم کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق صاحب نے حالات کی تحقیق فرمائی، مولانا سید شریف حسین، سید محمود، مولوی عبدالمجید صاحب اور مولوی عبدالعزیز صاحب کے نام خط لکھ کر دریافت فرمایا کہ کیا یہ آپ حضرات کی چٹھی ہے؟ پہلے تین حضرات نے تردیدی جوابات بھیج دیے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب کے متعلق معلوم نہ ہو سکا یہ کون بزرگ ہیں۔

رسالہ ''کلام سلیم'' میں ان حضرات کے مکاتیب نقل کر دیے گئے ہیں۔ ان حضرات نے صراحتاً اکثر الزامات سے براءت کا اظہار فرمایا ہے۔ جو مختلف فیہ مسائل تفصیل طلب تھے ان پر علمی طور پر گفتگو کی ہے اور اپنے موقف کی وضاحت فرمائی ہے۔ بعض جگہ مناظرانہ انداز سے مخالفین سے الزامی گفتگو بھی کی ہے۔ رسالہ کافی دلچسپ ہے اور اچھی معلومات کا ذخیرہ۔

تعجب ہے کہ تعصب انسان کو کس قدر پستی میں گرا دیتا ہے۔ فروعی اختلافات میں اہلِ علم اپنے مقام سے اس قدر نیچے آجاتے ہیں جن سے ان کی علمی شان اور ثقاہت یقیناً مجروح ہوتی ہے لیکن اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ قرآن عزیز میں یہود کا یہ حیلہ پڑھ کر تعجب ہوتا تھا:

﴿ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۷۲]

''صبح اہلِ ایمان کے نظریات کا اعتراف کر لو اور بعد دوپہر ان کا انکار کر دینا تاکہ عامۃ المسلمین اشتباہ اور تذبذب میں مبتلا ہو جائیں۔''

ملک میں پارٹی بازی ہو، حکومت اجنبی ہو، اس قسم کے خلفشار سے اسے فائدہ پہنچتا ہو، حکومت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس قسم کی جعل سازیاں کی جائیں اور پھر اسی اقلیت کو الزام دیا جائے کہ یہ انگریز کے حامی ہیں۔ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ؟

سید محمد نذیر حسین رحمہ اللہ کا سینہ ایک سمندر معلوم ہوتا ہے جس میں یہ سب تلاطم سما رہے تھے اور کوئی صدائے بازگشت ادنیٰ تموج کا موجب بھی نہیں ہوسکی۔ رحمه الله وجعل جنة الفردوس مأواه.

ایک اور واقعہ:

اسی رسالے کے شروع میں ایک واقعہ مرقوم ہے۔ اس وقت کوئی صاحب مولوی عبدالغفور موحدانہ خیالات رکھتے تھے۔ ان کے نام سے چند مسائل مطبع حنفی دہلی سے طبع کرا کر شائع کرا دیے گئے۔ یہ مسائل بھی سن لیجیے:

① پھوپھی سے نکاح درست سمجھتے ہیں۔ (اہلِ حدیث)
② خنزیر کی چربی کو پاک سمجھتے ہیں۔
③ پاخانہ پاک سمجھتے ہیں۔
④ منی میں شکر ملا کر کھانا حلال جانتے ہیں۔ وغير ذلك من الخرافات.

یہ واقعہ ذیقعد ۱۲۹۸ھ کا ہے۔ اس سے شہر دہلی میں کہرام سا مچ گیا۔ حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب تک اس ماجرا کی اطلاع پہنچی۔ مرحوم اس سے بالکل بے خبر تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر تحقیق کی گئی تو میاں عبدالرشید صاحب مالک حنفی پریس نے بیان فرمایا کہ یہ اشتہار میرے پاس حنفی پریس میں چھپے ہیں۔ میرے پاس مولوی محمد شاہ[1] اور ان کے شاگرد عبدالغفور آئے اور اس فتویٰ کو بصورتِ اشتہار شائع کرنے کی فرمائش کی۔ یہ اشتہارات ایوانِ حکومت تک بھی پہنچے۔

① یہ محمد شاہ میاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ مدار الحق کے مصنف ہیں۔ ہر شرارت آمیز کوشش میں جو اس وقت توحید و سنت کے خلاف کی گئی، اس شریف انسان کا دخل ہے۔ جامع الشواہد وغیرہ جیسی فساد انگیز کتابوں پر ان کے دستخط ہیں۔ حضرۃ الامام شیخ العرب والعجم مولانا سید نذیر حسین صاحب نے معیار الحق کے ابتدا ہی میں ان حضرت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ شیخ محمد شاہ پیر سکندرہ ضلع پاک پتن (اب پاک پتن ضلع منٹگمری میں شامل کر دیا گیا ہے) کے رہنے والے تھے۔ [مولف]

کمشنر دہلی نے ذاتی طور پر اس کذب نوازی کو ناپسند کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اہلِ حدیث بحیثیت مدعی استغاثہ کریں۔ حضرت میاں صاحب اور ان کے رفقاء سے کوئی بھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ میاں صاحب کی افتادِ طبیعت عام لوگوں سے مختلف تھی، وہ انگریزی عدالتوں پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں وقت گزارنا ناگزیر تھا لیکن اس ملک کے عدالتی نظام کو عام اہلِ حدیث کی طرح طاغوتی نظام سمجھتے تھے۔ استغاثہ تو دائر نہ کیا جا سکا لیکن کمشنر نے اپنے غیر معمولی وسائل سے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کو جمع کر کے ایک معاہدہ مرتب کیا جس میں ہر فریق نے ان مختلف فیہ مسائل میں رواداری اور ایک دوسرے کی اقتداء کے جواز کا عہد کیا۔ یہ معاہدہ سرکاری و غیر سرکاری ذرائع سے عام تقسیم کیا گیا اور اس سے ہیجان فرو ہوا اور امن پسند لوگوں کو کافی فائدہ ہوا۔ اس معاہدے پر محمد شاہ کے بھی دستخط ہیں۔

اس معاہدے پر ہر فریق کے اکابر علماء اور بااثر حضرات کے دستخط اور مواہیر (مہریں) ہیں۔ اس کی اشاعت سے کافی سکون ہوا۔ معاملہ فہم حضرات مطمئن ہو گئے۔

جامع الشواہد:

یہ سکون ان حضرات کو ناپسند تھا جو فساد اور ہنگامہ آرائی کو اپنا ذریعۂ معاش سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ عوام کے ذہنوں کو مغالطوں میں مشغول اور مبتلا رکھا جائے، چنانچہ معاہدۂ کمشنری کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ایک نیا ہنگامہ بپا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ کمشنر صاحب کے سامنے جو معاہدہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء نے کیا ہے وہ ایک باہم گفتگو ہے، وہ کوئی شرعی فیصلہ نہیں ہے۔ اس کی بنا پر تفسیق و تکفیر کے فتوے روکے جا سکتے ہیں نہ اس معاہدے کی پابندی ہی ہم پر ضروری ہے۔

اس کے بعد ایک رسالہ "جامع الشواهد في إخراج الوهابيين عن المساجد" شائع کیا گیا۔ اس میں ان لوگوں کے دستخط اور مہریں بھی شائع ہوئی ہیں جو کمشنر صاحب کے سامنے ایسی خرافات سے اجتناب کا عہد کر چکے تھے۔ مولوی محمد شاہ کے دستخط بھی اس پر موجود ہیں۔

یہ چند اوراق کا ایک فتویٰ ہے جو مولوی وصی احمد صاحب سورتی نے مدراس سے شائع کیا۔ یہ غالباً زرد رنگ کے کاغذ پر طبع ہوا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے اس پر "زرد رو" کی پھبتی کسی ہے۔ اس کے بعد محمد عارف صاحب تاجر سواتی نے مطبع گلزارِ محمدی لاہور سے اُس کو شائع کیا۔ اس فتویٰ کے مفتی

حضرات نے اکیس وجوہ کی بنا پر ثابت فرمایا ہے کہ اہلِ حدیث کو مساجد سے نکالنا درست بلکہ ضروری ہے۔

مفتی صاحبان نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اہلِ حدیث کو خارج از اہلِ سنت اور مساجد سے نکالنے کا فتویٰ دیا ہے:

۱. خدا کا جھوٹ بولنا ممکن جانتے ہیں۔
۲. ان کے ہاں انبیاء احکام کی تبلیغ میں بھول سکتے ہیں۔
۳. آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔
۴. آحاد احادیث سے معجزات کا اثبات جائز نہیں سمجھتے۔
۵. اجماع کو بلا سند حجتِ شرعی نہیں مانتے۔
۶. قیاس کو حجتِ شرعی نہیں مانتے۔
۷. مسئلۂ رجعت کے قائل ہیں۔ (جیسے شیعہ)
۸. اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ کی میراث کے معاملے میں غلطی پر سمجھتے ہیں۔
۹. حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی تھی۔
۱۰. ائمۂ اربعہ اور صوفیہ کو ماننے والے کافر ہیں۔

ان عقائد کو اہلِ حدیث کے ذمے لگا کر اہلِ حدیث کو اہلِ سنت سے خارج قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد گیارہ نزاعی مسائل اپنے فتویٰ کی تائید میں ذکر کیے ہیں:

۱. پانی کتنا ہی کم ہو، نجاست سے جب تک اس کے اوصافِ ثلاثہ نہ بدلیں، پلید نہیں ہوتا۔
۲. اہلِ حدیث کے نزدیک شیر خوار بچے کا پیشاب پاک ہوتا ہے۔
۳. پاؤں پر مسح فرض سمجھتے ہیں۔
۴. استنجا کرنا بدعت ہے۔
۵. مجامعت سے اِنزال نہ ہو تو غسل کے بغیر نماز پڑھ سکتا ہے۔
۶. تیرہ رکعت سے زیادہ نفل اور ثلث رات سے زیادہ قیام بدعت ہے۔
۷. تجارت کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ اسی طرح بھینس اور بھیڑ میں زکوۃ فرض نہیں جانتے۔
۸. سوتیلی خالہ سے نکاح درست سمجھتے ہیں۔

⑨ ایک سے زیادہ طلاقیں ایک وقت میں دی جائیں تو ایک ہی واقع ہو گی۔

⑩ مرد کے لیے سونے کے سوا باقی زیور درست ہے۔

⑪ پنیر میں سور کی چربی ملی ہوتی تو آنحضرت ﷺ بلا تحقیق استعمال فرما لیتے۔

ان اکیس وجوہ کی بنا پر فتویٰ دیا گیا ہے کہ اہلِ حدیث کو مساجد سے نکال دیا جائے اور یہ اہلِ سنت نہیں ہیں۔

۱۳۰۰ھ کے پس و پیش اس کتاب کی مدراس سے پشاور تک اشاعت ہوئی اور اس پر کافی ہنگامہ ہوا، جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے جواب میں اسی وقت کئی کتابیں لکھی گئیں۔ بعض میں تحقیق ہے، بعض میں الزام۔ بعض میں تلخی ہے، بعض میں متانت۔ چار رسائل اس وقت میرے پاس موجود ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[1]

مجھے اس وقت اپنے عقائد اور مسائل پر گفتگو کی ضرورت نہیں البتہ غلط یا صحیح جن حلقوں کی طرف سے یہ عقائد پھیلائے گئے تھے، اب وہ بھی ان کی اشاعت سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ اپنے اکابر کی غلط بیانیوں سے براءت کے بعد انھوں نے اب حنفیت کی ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تو اس حنفیت سے بے خبر تھے، یعنی آنحضرت ﷺ کی حیاتِ دنیوی، آنحضرت ﷺ ہر جگہ موجود، آنحضرت ﷺ مختارِ کل، آنحضرت ﷺ عالم الغیب وغیرہ۔ آج سے چند سال قبل کے احناف کرام رحمہم اللہ بھی ان مسائل سے ناآشنا تھے۔

عملی فروع:

جن عملی فروع کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی عقائد سے مختلف نہیں۔ ان میں بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کی وجہ سے تکفیر کی ذمے داری برداشت کر لی جائے بلکہ عموماً فقہاء میں یہ فروع مشہور ہیں اور مختلف مکاتبِ فکر ان پر عمل کرتے ہیں۔ سو ان کے اسلام اور اہلِ سنت ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بریلوی حضرات:

معلوم ہوتا ہے مولوی وصی احمد بریلوی ہیں اور یہ فتویٰ بھی بریلوی حضرات کی طرف سے

[1] سابق الذکر رسائل کے علاوہ حافظ عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ نے بھی "إبراء أهل الحديث والقرآن مما في جامع الشواهد من التهمة والبهتان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

شائع کیا گیا ہے۔ معلوم ہے کہ اس میں امکانِ کذب باری کو سب سے پہلے کہا گیا ہے۔ یہ مسئلہ حضرات دیوبند کا امتیازی مسئلہ ہے۔ اہلِ حدیث میں سے بعض حضرات کا رجحان بھی اس طرف ہے لیکن ہمارے ہاں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ نہ سنت اور بدعت میں یہ مسئلہ کوئی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں صرف اس قدر کافی ہے کہ ذاتِ حق سے کبھی کذب اور ظلم کا ظہور نہیں ہوگا، اور بس۔ جَلَّ جَلَالُهُ وَعَمَّ نَوَالُهُ.

جامع الشواہد مکہ معظمہ میں:

قریباً ۱۳۰۰ھ میں حضرت شیخ العرب والعجم سید نذیر حسین صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں گرفتار کرانے بلکہ قتل یا قید کرانے کی سرتوڑ کوشش کی گئی۔ اس حادثے کا مفصل ذکر "إشاعة السنة النبوية" (نمبر: ۱۰، ۱۱ بابت ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ، ومحرم الحرام ۱۳۰۱ھ) میں فرمایا گیا ہے اور اس وقت کے ہندوستانی اخبارات "مشیرِ قیصر" اور "وطن" وغیرہ میں یہ تذکرہ پوری تفصیل سے آیا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بیت اللہ میں ترکی مندوب کے سامنے جب سید نذیر حسین رحمہ اللہ صاحب کو پیش کیا گیا تو جامع الشواہد کو حضرت کی تصنیف ظاہر فرمایا گیا تاکہ اس کے مندرجات کو اہلِ حدیث کے عقائد سمجھا جائے۔ ترکی مندوب بچارا اردو زبان سے نابلد تھا۔ بڑی مشکل سے اُس کو سمجھایا گیا کہ یہ میاں صاحب کی تصنیف نہیں۔ میاں صاحب نے اپنا عقیدہ بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا۔ انھوں نے فرمایا: ہم ائمۂ اربعہ کو اپنا مقتدا سمجھتے ہیں۔ ان کی تنقیص اور بے ادبی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ عقائد ہمارے نہیں جن کا ذکر جامع الشواہد میں کیا گیا ہے۔ تب ترکی مندوب نے معافی چاہی اور میاں صاحب کو باعزت بری کیا اور دعا کی درخواست کی۔

پھر مزید تعجب یہ ہے کہ یہاں ہر کوشش کرنے والے چار بزرگ مولانا خیر الدین مرحوم (مولانا ابو الکلام آزاد کے والد) مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور مولانا حاجی امداد اللہ صاحب دیوبندی ہیں۔

پہلے دونوں بزرگ بریلوی تھے اور ایسے سخت بریلوی کہ ان کی نگاہ میں مولوی احمد رضا خاں کا عقیدہ بھی درست نہ تھا بلکہ اس میں بھی کچھ وہابیت کی رمق تھی،[1] اس لیے ان پر کوئی افسوس نہیں۔ ان

[1] دیکھیں: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (ص: ۱۰۰)

کی شان ہمیشہ یہ رہی ہے: ﴿ لَا يَرْقُبُونَ فِيْ مُؤْمِنٍ إِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ﴾[1] [التوبة: ١٠] وہ اہلِ توحید کی اذیت میں تمام اخلاقی حدود کو پھاند جاتے ہیں اور انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی کہ غلط بیانی جرم ہے یا نہیں۔

مولانا رحمت اللہ مغفور و مرحوم مشہور مسیحی مناظر ہیں۔ ان کی تصانیف ”إزالة الشكوك“ وغیرہ عیسائیت کے متعلق کامیاب اور مفید ہیں۔ انگریزوں کے خلاف انھوں نے مجاہدانہ کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں انگریز کے قدم مضبوط ہوگئے تو مولانا ہجرت فرما کر حجاز میں آباد ہوگئے۔ دیوبندی حلقوں میں مولانا بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر صوفی منش بزرگ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ، مولانا حسین احمد رحمہ اللہ کے شیخِ طریقت ہیں۔ تصوف اور ارادت کے متعلق ان کی بڑی پاکیزہ شہرت ہے لیکن حیرانی ہے کہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب جیسے مرنجاں مرنج اور علومِ حدیث کے بے نظیر خادم سفرِ حج میں ان بزرگوں کی ایذا سے نہ بچ سکے۔ ع

خداوند تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں

مولانا محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی نے ”إشاعة السنة“ (٦/ ١٠، ١١) میں میاں صاحب مرحوم کے مصائب اور ان کے خلاف مساعی اور میاں صاحب کی راست گوئی اور استقلال کے متعلق تفصیلی واقعات سپردِ قلم فرمائے ہیں، اور ان رجال کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے جو میاں صاحب کے مصائب اور آلام کا باعث بنے۔ مذہبی عصبیت اتنے بڑے اکابر کو انتہائی کج روی پر آمادہ کر سکتی ہے! انسان تعصب میں وہ کچھ کر گزرتا ہے جس پر کسی وقت اسے خود بھی ندامت ہوتی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس عدالت میں پہنچ چکے ہیں جہاں کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ وہاں دودھ اور پانی بھی آمیز نہیں ہو سکتے، اس لیے ان اکابرِ ملت کے متعلق دعائے مغفرت کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا ﴾[2] [الحشر: ١٠]

لیکن عقل حیران ہے اور زبان گنگ، اور ناطقہ سر بگریباں ہے کہ یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ ایسے اتقیاء کو یہ جراَت کیوں کر ہوئی؟ میاں صاحب عالم ہیں۔ فنِ حدیث میں ان کی مہارت مسلّم ہے۔

[1] ترجمہ: ”نہ کسی قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کا۔“

[2] ترجمہ: ”اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے۔“

ان کی شرافت، تقویٰ، دقتِ نظر اور ذکا علمی حلقوں میں حدیثِ محفل ہے۔ ملک میں ان کی آبرو ہے۔ خدمتِ حدیث میں عرب وعجم پر ان کا احسان معلوم۔ پھر وہ مسافر ہیں۔ ہم وطن ہیں۔ ایک فریضۂ شرعیہ ادا کرنے کے لیے انھیں اس سفر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے مواسات کے مستحق تھے۔

مولانا محمد حسین صاحب مرحوم اسے مذہبی اور سیاسی اختلافات پر محمول فرماتے ہیں۔ مولانا کے خیالات میں اس وقت خود بھی انفرادی رنگ ہے جس سے جماعت نہ اس وقت متفق تھی نہ آج ہے۔ ان خیالات سے اتفاق ممکن نہیں لیکن ان اختلافات کے باوجود ان حوادث کے لیے وجہ جواز سمجھ میں نہیں آئی جو وہاں میاں صاحب کو پیش آئے۔ اختلافات درست بھی ہوسکتے ہیں غلط بھی، لیکن اس کے انتقام میں موت تک کی بازی لگا دینا کسی دانش مند آدمی کے لیے مناسب نہیں۔

پھر جامع الشواہد کو میاں صاحب کی تصنیف ظاہر کرنا ان اکابر کے لیے کیونکر موزوں ہوسکتا تھا؟!

لدھیانہ کے اکابر:

جامع الشواہد بریلوی حضرات کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اسی انداز کی ایک کتاب دیوبندی حضرات کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: "انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد"۔ یہ لدھیانہ سے شائع ہوئی۔ لدھیانہ میں ایک بزرگ مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے: مولانا عبداللہ رحمہ اللہ، مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ، مولانا محمد رحمہ اللہ، مولانا محمد سیف اللہ رحمہ اللہ صاحب۔ اس خاندان کا رجحانِ عقیدہ دیوبندی مکتبِ فکر کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی حقیقت برزخ کی ہے۔ وہ بریلوی اور دیوبندی دونوں حضرات سے ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اہلِ حدیث کی مخالفت میں دیوبند اور بریلوی مکاتب کو ملانے میں ان حضرات نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ سارے بھائی عالم ہونے کے ساتھ بے حد ہوشیار ہیں۔ ان حضرات کی اس وقت ایسی پوزیشن ہے کہ دیوبندی اور بریلوی دونوں ان کی عزت کرتے ہیں اور انھیں خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے مراسم بھی ان دونوں مکاتب سے ہیں۔ انتظام المساجد میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کے اقتباسات مولانا بٹالوی رحمہ اللہ نے "إشاعة السنة" میں دیے ہیں، اور مولانا بٹالوی ہی کی معرفت ان حضرات سے تعارف ہوا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ ایک دفعہ لدھیانہ گئے۔ انھوں نے کسی مسجد میں نماز ادا فرمائی۔ ان حضرات نے مسجد دھونے کا حکم دیا اور مسجد دھو ڈالی گئی۔

انتظام المساجد کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہلِ حدیث کے خلاف بہت پیش پیش تھے۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی فرماتے ہیں:

''ازاں جملہ لدھیانے والے مولویوں نے تو اہلِ حدیث کی نسبت واجب القتل کا فتویٰ دیا ہے، چنانچہ "انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد" میں لکھ دیا ہے کہ حکام اہلِ اسلام کو لازم ہے کہ ان کو قتل کریں۔ اگر وہ لاعلمی کے عذر سے توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہ کریں۔''

(اشاعۃ السنۃ، نمبر: ۱۰ (۲/ ۲۹۱) بابت ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ، و محرم ۱۳۰۱ھ، مطابق اکتوبر و نومبر ۱۸۸۳ء)

اس مسئلے میں دیوبندی اور بریلوی حضرات میں مسابقت کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرات اہلِ حدیث کے خلاف ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مشقِ ستم فرماتے رہے۔ مولانا بٹالوی نے "إشاعة السنة" کے اسی پرچے میں ایک اور رسالے کا حوالہ دیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

''جس قدر شمشیر بدست، زبان کے ذریعہ سے ان (اہلِ حدیث) کا مقابلہ کیا جائے تھوڑا ہے۔''

اسی رسالے (ص: ۲۹) میں مرقوم ہے:

''تھوڑا عرصہ ہوا کہ مکہ میں بعض لوگ بارادہ حج پہنچے تو اس (مولوی رحمت اللہ صاحب) کی زبان سے یہ بات سن آئے ہیں کہ اگر مولوی سید نذیر حسین ایک دفعہ یہاں (مکہ) آجائے تو پھر جان سلامت نہ لے جائے۔ یہ بات مجھے ایسے شخص سے پہنچی ہے جس کو مادر زاد ولی کہہ سکتا ہوں اور میں (مولانا محمد حسین بٹالوی) خود بھی جبکہ مکہ میں مقیم تھا، مولوی رحمت اللہ کی زبان سے مولانا ممدوح (سید نذیر حسین صاحب) کے حق میں مغلّظ دشنام سن چکا ہوں۔ اسی دن سے میں نے مکہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا، ورنہ میں حج کے بعد سال بھر کا ارادۂ قیام رکھتا تھا جس سے صرف چار پانچ مہینے کا عرصہ گزرا تھا۔''

ان گزارشات سے مقصد یہ نہیں کہ مولانا بٹالوی کی اطلاعات قطعاً درست ہیں یا وہ مبالغہ سے خالی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جماعت کے اکابر کو کن مشکلات کا سامنا ہوا۔ میاں صاحب، اس میں شک نہیں چند دن بیت اللہ میں محبوس رہے، ان سے بعض عقائد اور فروع کے متعلق سوال کیا گیا۔ اس کی تصدیق اس وقت کے اخبار سے ہوتی ہے۔ ''پیسہ اخبار''، ''وطن''، اخبار ''مشیر قیصر''۔ ''کشف الاخبار''۔

''اکمل الاخبار''، ''مظہر العجائب'' مدراس۔ ''کارنامہ'' لکھنؤ۔ ''جام جہاں نما'' کلکتہ۔ ''نیمروز'' بجنور۔ ''عین الاخبار'' مراد آباد۔ ''ہزار داستان'' حیدر آباد۔ ''دار السلطنت'' کلکتہ۔ ''طوطی ہند'' میرٹھ۔ ''کوہِ نور'' لاہور۔ ''خیر خواہِ اسلام'' حیدر آباد وغیرہ اخبارات میں یہ حالات شائع ہوئے۔

میاں صاحب کا ایک جعلی توبہ نامہ بھی شائع کیا گیا۔ موافقین اور مخالفین کے نام پھر اس وقت اخبارات میں آئے۔ اخبارات نے اپنی آراء اس کے متعلق لکھیں۔ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ نے اپنے والدِ مرحوم کی ان ناپسندیدہ مساعی کا تذکرہ اپنی سوانح میں اکثر فرمایا۔[1] اس سے بالکل ظاہر ہے کہ دیوبند کے اہلِ توحید اور بریلی کے اربابِ دانش نے اس میں حصہ لیا، اور پھر حکومتِ انگریزی کی عقابی نگاہیں اس کے علاوہ تھیں۔ انبالہ کیس پٹنہ میں اہلِ توحید کی بربادی، مولانا احمد اللہ اور مولانا جعفر تھانیسری کے مصائب سے جو جائزہ لیا جا سکتا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں۔

اس کے باوجود یہ تحریک اور یہ مسلک بچ نکلا۔ سیکڑوں سے ہزاروں، ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچا اور اب کروڑوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور ان بزرگوں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آج ہم بحمد اللہ کافی حد تک مطمئن ہیں۔ دل کا حال تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ بظاہر تعصب کی وہ صورتیں نہیں رہیں جو اس وقت تھیں۔

اب اس تشویش کے سوا جو کبھی کبھی ہوتی ہے اور اہلِ حدیث جماعت میں خلفشار کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جماعت کے سامنے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ میاں صاحب مرحوم اور ان کے تلامذہ کی قربانیوں، نواب صدیق حسن خاں صاحب اور ان کی تصانیف کے ثمرات ہیں۔ حضرت عبد اللہ غزنوی اور ان کے ابنائے کرام کے تقویٰ کے اثرات ہیں۔ مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ مرحوم اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم اور ان کی ہوشمندیوں کا اثر ہے کہ اکثر رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں۔ والحمد للہ علی ذلك.

اب ہمارے نوجوان طلبہ کا کام ہے کہ ان اندرونی خطرات اور شورش پسندیوں کی طبیعت کو سمجھیں اور معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ سوچیں کہ طوطی کہاں بولتے ہیں، کہاں داغتے ہیں، کہاں مارتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا بِفَضْلِكَ مِنْ فِتَنِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ.

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (ص:۵۲)

نصرت الابرار:

لدھیانوی خاندان کی دانش مندی اور وقت شناسی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے!

جن ایام میں اہلِ حدیث اور اس مسلک کے اکابر سے ان حضرات کی ٹھن رہی تھی، ان دنوں سید احمد خاں مرحوم علی گڑھی نے ایک ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس میں راجہ صاحب بنارس بھی شامل تھے۔ سرسید کا مقصد کانگریس کی مخالفت تھی اور کانگریس کا مقصد ہندو قومیت کی حفاظت تھی۔ عام ملکی معاملات میں ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دونوں میں تھی لیکن اس وقت یہ دونوں جماعتیں آزادی کی خواہش مند نہیں تھیں اور نہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنا ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ اس وقت دونوں کا مقصد انگریزوں سے مانگنا تھا۔ کانگریس ہوشیاری اور چالاکی سے مانگتی تھی۔ سرسید منت اور لجاجت سے۔ ہمارے لدھیانوی بزرگ کانگریس کی راہ کو پسند فرماتے تھے اور غالباً کانگریس میں شامل تھے۔

سرسید احمد خاں بالقابہ نے ایک طرف راجہ بنارس کو اپنی جماعت میں شامل کیا، دوسری طرف کانگریس کے بارے میں کہا کہ یہ ہندو جماعت ہے۔ کانگریس نے لدھیانوی برادران کو اس محاذ پر کھڑا کیا تاکہ یہ سرسید کی اسلام نوازی کو ننگا کریں اور علماء سے فتویٰ حاصل کریں کہ کانگریس میں شمولیت مستحسن ہے اور سرسید کی جماعت میں شمولیت گناہ ہے۔

ایسوسی ایشن دراصل اسلامی جماعت نہیں بلکہ یہ سرسید کے سیاسی اور مذہبی نظریات کی ترجمان تھی۔ لدھیانوی برادران نے یہ فریضہ بڑی دانش مندی سے ادا کیا اور ایک فتویٰ ''نصرة الأبرار'' کے نام سے شائع کیا۔ خوبی یہ ہے کہ ان حضرات کا رجحان بظاہر دیوبندی افکار کی طرف تھا لیکن اس فتوے پر بریلوی حضرات کے دستخط موجود ہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے کانگریس میں شمولیت اور سرسید سے الگ رہنے کے متعلق بڑا مفصل فتویٰ لکھا ہے، پھر اس فتوے کی اشاعت مولوی خیر شاہ صاحب نے کی ہے جو کٹر قسم کے بریلوی تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالقادر صاحب مرحوم اور ان کے خاندان کی بڑی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب کا تشدد اور تصلّب اہلِ توحید کے خلاف معلوم ہے۔ ان سے دیوبندی تحریر کی تصدیق اور پھر کانگریس میں شمولیت اور پھر اس کی اشاعت ایک بریلوی کی طرف سے یہ سب کچھ ہوگیا اور ان حضرات کی دیوبندیت پر کوئی اثر نہ

پڑا۔ اس وقت کے اکابر دیوبند نے یہ سب کچھ دیکھا۔ انھیں ان حضرات کے متعلق کوئی شبہہ نہ ہوا۔ سانپ مرگیا۔ لاٹھی پر کوئی آنچ نہ آئی۔ یہ انتہائی دانشمندی ہے۔ یہ سب کام نصرت الابرار سے لیا گیا۔

اصل فتویٰ:

یہ فتویٰ مولانا عبدالعزیز مرحوم بن مولوی عبدالقادر مرحوم لدھیانوی کی ایک تقریر ہے جسے ان کے بڑے بھائی مولوی محمد مرحوم نے مرتب فرمایا اور مولوی خیر شاہ امرتسری نے اسے شائع کیا۔ اصل فتویٰ ملاحظہ فرمایئے:

سوال:

سید احمد نیچری نے جو ایک جماعت ایسوسی ایشن قائم کی اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸/اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ، جو کانگریس کے مخالف ہیں، شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو، پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علی گڑھ میں یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے۔ اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوسی ایشن انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں۔ جو شخص ان سے اختلاف کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعتوں میں مسلمانوں کا شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

جواب:

اَللّٰھُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا. اس شخص کی اعانت کرنی اور اس سے علاقہ اور رابطہ قائم کرنا ہرگز درست نہیں۔ اصل میں یہ شخص شاگرد مولوی نذیر حسین وہابی بنگالی دہلوی غیر مقلد کا ہے، اور بنیاد اس فرقہ کی عبدالوہاب نجدی سے شروع ہوئی ہے۔ (نصرت الابرار، ص: ۱۵)

پھر فرماتے ہیں:

> ’’اب تک یہ حال ہے کہ جس شخص میں کوئی علامت وہابیت کی حکام حرمین شریفین پاتے ہیں، فوراً اس کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ مولوی نذیر حسین مذکور جب حج کو گئے، اسی وجہ سے حکامِ حرمین نے ان کو قید کر دیا۔ آخرش بہزار منت و سفارش تائب ہو کر رہا ہوئے۔ چونکہ

اس ملک کے وہابی، یعنی جو غیر مقلد اور کبھی موحد اور گاہے محمدی اور اہلِ حدیث کے نام سے اپنے آپ کو یاد کرتے ہیں، مولوی نذیر حسین کے مقلد اور تابعدار ہیں، پس ان کو نیچری کی جو ہم سبق ان کا ہے، ضرور بالضرور مدد کرنی چاہیے۔'' (نصرت الابرار، ص: ۱۵)

دانش مندی ملاحظہ فرمائیں! بریلوی حضرات سے فتویٰ لینے کے لیے سرسید کو مولانا سید نذیر حسین صاحب کا شاگرد ظاہر فرمایا گیا ہے۔ میاں صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں ہم نے سید احمد خاں کا نام نہیں دیکھا، پھر میاں صاحب اور ان کے تلامذہ اور اہلِ توحید کا تعلق عبدالوہاب سے جوڑا ہے، پھر عبدالوہاب کو وہابیت کا بانی بتلایا حالانکہ نجدی تحریک کے بانی عبدالوہاب کے بیٹے محمد ہیں۔ بچارا عبدالوہاب تو رسمی عالم تھا۔ کبھی غیر مقلد بتایا، کبھی مولوی نذیر حسین صاحب کا مقلد ظاہر کیا۔

آپ فرمائیں گے کہ یہ سب شاید انگریز کی مخالفت کے لیے کیا گیا ہو۔ ممکن ہے اس وقت مولانا سید نذیر حسین صاحب اور جماعت اہلِ حدیث نے انگریز کی حمایت کی ہو اور حضرات علمائے لدھیانہ اس وجہ سے برافروختہ ہوگئے ہوں۔ چنانچہ دو تین سال ہوئے، لاہور کے ایک اخبار میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی ایک چٹھی شائع ہوئی۔ مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ ان ایام میں جماعتِ اہلِ حدیث نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ میرا تعلق ابتدا ہی سے اہلِ حدیث حلقوں سے رہا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انفرادی طور پر کسی شخص کو غلطی لگی ہو تو ممکن ہے بحیثیت جماعت اہلِ حدیث نے کبھی انگریز کا ساتھ نہیں دیا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی شہادت میرے لیے نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی۔

مجھے اپنی معلومات کے متعلق بے حد تشویش ہوئی۔ میں نے اس وقت اپنی معلومات کی بنا پر اہلِ حدیث کا موقف بذریعہ ''الاعتصام'' ظاہر کیا تاکہ جماعت اہلِ حدیث کے متعلق غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اسی اثنا میں پشاور سے واپسی پر مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی کی معیت میں راولپنڈی تک آنے کا موقع ملا۔ مولانا نے اس فتوے کے متعلق کچھ کوائف ذکر فرمائے۔ غالباً نصرت الابرار کا ذکر بھی ان کی زبان سے سنا۔ محترم مفتی صاحب، ان کے عزیز برادرم ضیاء الحسن صاحب سے یہ بھی دریافت کیا مگر نصرت الابرار نہ ملی۔ بڑی مشکل سے حال ہی میں مجھے یہ کتاب دستیاب ہوئی اور مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ اہلِ حدیث کا دامن بحمداللہ انگریز پرستی سے پاک ہے۔ ہوسکتا ہے وقت کے لحاظ سے اس وقت بعض حضرات سے انفراداً کوئی کمزوری یا لغزش ہوئی ہو، لیکن ان کے مخالفین تو وقتی مصلحت

کے حمام میں ان سے کہیں زیادہ ننگے ہیں، تاہم اہلِ حدیث کے متعلق پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بحیثیتِ جماعت اور ان کی اکثریت انگریز کے خلاف رہی، چنانچہ اسی نصرت الابرار میں ان لدھیانوی اکابر کا ایک فتویٰ درج ہے۔ فرماتے ہیں:

لدھیانوی فتویٰ:

سوال سلطنت انگلشیہ جس میں ہم کو اپنے امورِ دینیہ پر عمل کرنے سے روک نہیں، بہتر ہے یا حکومتِ روس جو سخت متعصب اور دشمن قدیمی سلطانِ روم کی ہے؟

جواب اَللّٰھُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا. سلطنتِ انگلشیہ بہتر ہے، کیوں کہ سرکار دولت مدار مثل روس کے متعصب نہیں اور سلطانِ روم (جو ایک بڑا بادشاہ ذی اقتدار اہلِ اسلام، خادم حرمین شریفین اور حافظ بیت المقدس و کربلا معلّٰی ہے) اور سرکار دولت مدار میں برخلاف روس کے اتحاد چلا آتا ہے۔ اگر بالفرض والتقدیر سرکاری عملداری مملکتِ روس وغیرہ سے بہتر نہ سمجھی جائے تب بھی رعایا اہلِ اسلام کو شرعاً حرام ہے کہ سرکار کے خلاف روس یا سلطانِ روم وغیرہ سے درپردہ رابطہ و اتحاد پیدا کرے۔ (نصرت الابرار، ص: ۹)

ہمارے بزرگوں میں سے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی انگریز کی حمایت کے لیے بدنام تھے۔ اگر وہ یہ فتویٰ ملاحظہ فرماتے تو ادب سے عرض کرتے ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

مولانا بٹالوی نے ''اشاعۃ السنۃ'' (نمبر: ۱۰، ۱۱) میں بالکل یہی کچھ فرمایا ہے جو اس فتویٰ میں مرقوم ہے۔ اس لیے رقابت کا اصل سبب انگریز دوستی یا کانگریس سے تعلق نہیں، اصل سبب مقارنتِ زمانی ہے، تقلید اور ترکِ تقلید کا ذہنی تصادم اور پرانی عادات سے وابستگی۔ معلوم ہے سرسید کے خلاف سب سے زیادہ اور تحقیقی طور پر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے لکھا۔ اہلِ حدیث نے کبھی سرسید سے تعلق نہیں رکھا، نہ کبھی بلحاظِ جماعت اس کی ایسوسی ایشن میں شامل ہوئے بلکہ سرسید کے اکثر رفقاء حنفی العقیدہ تھے، وہ خود بھی عملاً حنفی تھے جیسے زمخشری۔ میاں صاحب مرحوم کا فتاویٰ چھپ چکا ہے، وہ ہندوستان کو دارالاسلام نہیں فرماتے لیکن نصرت الابرار میں مولانا احمد رضا خاں صاحب نے صراحتاً

فتوی دیا کہ ہندوستان انگریزی حکومت کے وقت دارالاسلام ہے۔ (ص: ۲۹)

مولوی احمد رضا صاحب نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام ہے: "إعلام الأعلام بأن هندوستان دار الإسلام" اگر یہ سیاسی اختلاف اہلِ حدیث سے مناقشت کا سبب ہوتا تو مولوی احمد رضا سے صلح کیسے ہوتی؟ یہ حضرات خود بھی انگریزی حکومت سے لڑنا ناجائز سمجھتے تھے۔ اہلِ حدیث نے تو بحمداللہ اس وقت بھی یہ جرم نہیں کیا بلکہ بحیثیتِ جماعت ان کا تعلق سید شہید رحمہ اللہ کی جماعت سے رہا، اور یہ تعلق حال کی جنگِ کشمیر تک بدستور رہا۔ اکابر جماعت مولانا محمد حسین صاحب کے برخلاف انگریز کی مخالفت کرتے رہے۔ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم آروی وغیرہم، مولانا محمد حسین صاحب کی رائے سے کھلی مخالفت کرتے رہے۔

ایک ضروری یادداشت:

"نصرت الابرار" کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن کافی ضخیم کئی سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں تمام فتوے مفصل درج تھے۔ یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرا متوسط ایڈیشن جس میں مولوی محمد صاحب لدھیانوی مغفور اور مولوی احمد رضا خاں صاحب کے فتوے مفصل ہیں، باقی مختصر۔ یہ ایڈیشن میرے پاس موجود ہے جس کی روشنی میں زیرِ قلم گزارشات پیش خدمت کر رہا ہوں۔

تیسرا ایڈیشن:

۱۹۴۷ء میں ملک بھی تقسیم ہوگیا اور لدھیانوی خاندان بھی تقسیم ہوگیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم اور ان کی اولاد ہندوستان چلی گئی۔ مفتی محمد نعیم صاحب اور ان کا عائلہ پاکستان تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ میں میونسپل کمشنر ہوگئے اور منڈی بہاؤ الدین میں بڑی جامع مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ ان کے لڑکے مولانا ضیاء الحسن منٹگمری میں اقامت فرما ہیں اور کچھ خاندان گوجرانوالہ میں مقیم ہے۔ جو حضرات ہندوستان چلے گئے تھے انھوں نے حکومتِ ہند پر اپنی اہمیت جتانے اور اپنی پرانی خدمات کے صلہ کے لیے نصرت الابرار کا ایک نہایت مختصر ایڈیشن شائع فرمایا جس میں انگریز کی انصاف پسندی اور مذہبی آزادی، اس کے ساتھ جنگ کی حرمت کا حصہ اور سرسید اور میاں صاحب مرحوم کی شاگردی، نیز میاں صاحب کی حجاز میں گرفتاری کا حصہ نکال

دیا، غالباً مولوی احمد رضا صاحب کا مفصل فتویٰ بھی حذف کر دیا ہے۔ ہوش مندی سے صرف اتنا حصہ شائع فرمایا ہے جو حکومتِ ہند کو اپیل کر سکے۔ دونوں جگہ آبرو مندی سے گزر کرنا اس خاندان کی ہوش مندانہ روایات کا حصہ ہے۔ سچ ہے ع

یک من علم را دہ من عقل باید [1]

پھر اس عالمانہ دانش وری پر غور فرمایئے! ہندو انگریز سے ہاتھ جوڑ کر مانگے اور اس مانگنے میں بقدرِ ضرورت کچھ حضرات علماء کو بھی شامل کرے تو بارگاہِ علم و دانش سے اسے ''ابرار'' کا نام عطا فرمایا جائے۔ ایک شخص مروجہ تقلید کی پابندیوں سے آزاد ہو کر براہِ راست کتاب و سنت کی طرف سلف کے طریقے پر دعوت دے اور اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اپنی الگ تنظیم بنائے، جیسے سرحد میں مجاہدین نے بنائی اور انگریز کی مخالفت میں جان تک دے دی اور اقامتِ دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تو اسے مفسد اور فتنہ انگیز قرار دیا جائے۔ جو کتاب اس وقت کی کانگریس کے ساتھ اشتراک کے لیے لکھی گئی اس کا نام ''نصرت الابرار'' رکھا گیا اور جو کتاب اہلِ حدیث متبعینِ سنت کو مساجد سے نکالنے کے لیے لکھی گئی اس کا نام ''انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن والمفاسد'' رکھا گیا۔ ہندو ابرار قرار پا گئے اور متبعینِ سنت فتنہ انگیز اور مفسد ٹھہرائے گئے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

یہ سارے واقعات سامنے آنے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مغفور کے متعلق ذہن صاف ہونا چاہیے۔ خاندانی روایات انسان کے گوشت پوست اور خون میں پیوست ہوتی ہیں۔ ان رسمی بندشوں سے نکلنا آسان نہیں۔ ابوالکلام آزاد روز روز پیدا نہیں ہوتے جس نے خاندانی اغلال و سلاسل کو ہوش و حواس سنبھالتے ہی تار تار کر دیا اور اپنے لیے خود اپنی دنیا بسالی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر کروٹ کروٹ اپنی رحمت فرمائے اور انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور ہمیں بھی معاف فرمائے اور ہماری لغزشوں کو اپنی رحمت کے پانی سے دھو دے ؎

أَلَيْسَ رَحْمَةُ رَبِّي حِيْنَ يَقْسِمُهَا عَلىٰ قَدْرِ الْعِصْيَانِ فِي الْقِسَمِ [2]

---

[1] ایک مَن (۴۰ کلو) علم کے لیے دس مَن (۴۰۰ کلو) عقل چاہیے۔

[2] کیا میرے رب کی رحمت، جب وہ اسے تقسیم کرتا ہے، بقدرِ گناہ تقسیم نہیں ہوگی؟

اور ان حضرات کو بھی معاف فرمائے۔ یہ حضرات بھی ماحول، خاندان اور وقت کے تقاضوں سے مجبور تھے۔

ان حوادث کی روشنی میں مستقبل کا جائزہ:

ان واقعات سے چند نتائج واضح ہوئے ہیں:

1. مخالفین نے بے جگری سے مخالفت کی۔ غلط، صحیح، جھوٹ، سچ، مناسب اور نامناسب تک کی پروا نہیں کی۔
2. اپنے ذاتی اور مکتبی اختلافات کو نظر انداز کر کے اہلِ حدیث مکتبِ فکر کو ناپید کرنے کی کوشش کی گئی۔
3. مخالفت کا میدان اقطارِ ہند کے علاوہ حجاز تک وسیع ہوگیا۔ ترکی حکومت بھی نادانستہ ایک فریق قرار پا چکی تھی۔
4. انگریزی عدالتیں بعض دوسری وجوہ کی بنا پر جماعت کو ختم کرنا پسند کرتی تھیں۔
5. اہلِ بدعت نے جہالت اور تعصب سے اور اہلِ توحید نے مستعار حیلوں سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ عفا اللہ عنہم.
6. بریلی، بدایوں، لدھیانہ، دیوبند، سہارن پور، لکھنؤ، لاہور اور گنگوہ نے اپنی بساط کے مطابق اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔
7. مخالفت اس قدر شدید تھی کہ قتل کے فتوے اور حبسِ دوام کی مساعی سے بھی گریز نہیں فرمایا گیا۔

اہلِ حدیث کی حالت:

1. جماعت کا سیاسی نظام بظاہر ۶؍ مئی ۱۸۳۱ء میں درہم برہم ہوگیا تھا۔ کمزور اور پوشیدہ طور پر ۱۹۲۱ء تک بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہا۔
2. البتہ تبلیغی کوششیں فقدانِ نظم کے باوجود اچھی حالت میں تھیں۔ اور سب سے نمایاں یہ چیز تھی کہ ان کی بنیاد ﴿ لَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ؕ ﴾ [الأنعام: ۹۰] پر تھی۔
3. علماء اور مبلغین میں انتہائی خلوص تھا اور عوام میں تقویٰ اور فرائض کی پابندی بدرجۂ اتم تھی۔
4. اہلِ علم کا احترام اور اطاعت بقدرِ امکان موجود تھے۔
5. دینی مدارس جابجا موجود تھے۔ دہلی مدرسے کو حضرت میاں صاحب کی وجہ سے قدرتی اقتدار حاصل تھا۔

6 اکثر اہلِ قلم اور اصحابِ تدریس حضرت شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب سے مستفید تھے۔ میاں صاحب کا احترام باقاعدہ نظام کے بغیر قدرتی طور پر ذہنوں میں موجود تھا۔ مخالفین بھی میاں صاحب کے علم اور شرافت سے متاثر تھے۔

7 نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تصانیف اور سخاوت سے توحید و سنت کی اشاعت میں بے حد مدد ملی، اور یہ اثر بھوپال، بمبئی اور پشاور تک پہنچا۔

8 مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کے بعض نظریات (جہاد کا مفہوم اور انگریز کے ساتھ تعاون) سے جماعت کو شدید اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود مخالفت کی نوبت نہیں آئی۔ مولانا بٹالوی اپنے طریق پر کام کرتے رہے، باقی علماء اپنی صوابدید کے مطابق۔

9 میاں صاحب اور ان کے اکثر تلامذہ انتہائی مخلص تھے۔ مخالفین کی چالاکیوں کے باوجود کبھی بد دیانتی اور برائی میں مماثلت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ عام عمل ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ [الحجر: ۸۵] پر ہی رہا۔

10 ان مقدس بزرگوں میں بعض مبلغ اور مقرر تھے، بعض مدرس، بعض مصنف لیکن مشاہرات اور معاوضوں کے لیے طمع اور اِشراف ان میں نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہے وزیر آباد میں حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ جیسے محدث تشریف لائے تو حضرت میاں صاحب مرحوم کے مشورے سے ان کی تنخواہ مبلغ دس روپے مقرر ہوئی۔ دو تین ماہ کے بعد جماعت اس کی بھی پابندی نہ کر سکی۔ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کا اعزازیہ پندرہ روپے مقرر ہوا۔ (اشاعۃ السنۃ، نمبر ۱۱، ۱۰) مگر اس کی ادائیگی میں بھی باقاعدگی نہ رہ سکی۔ مولانا محمد صاحب بکنوی، مولانا ہدایت اللہ صاحب راولپنڈی، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا عبدالاول صاحب، مولانا علاؤالدین صاحب نے پوری عمر جماعت پر کوئی لازمی بوجھ نہیں ڈالا۔ رحمهم الله.

اس کے باوجود بڑی عزت سے وقت گزارتے تھے۔ مشاہرات کے لیے آج جس مسابقت کو شعار بنایا جا رہا ہے یہ اچھی فال نہیں۔ بظاہر یہ خلوص کے منافی ہے۔ علماء اور طلباء کو اگر مستقبل میں جماعت کی خدمت کرنی ہے اور توحید و سنت کی اشاعت ان کا مقصدِ حیات ہے تو علم کی خدمت، مدارس کی تاسیس اور اختلافات کی تشکیل کاروباری انداز سے نہیں ہونی چاہیے، اور نہ نظریاتی اختلاف کو

فرقہ اور پارٹی کا رنگ ہی دینا چاہیے۔ تعلیمی انتشار، چھوٹے چھوٹے دارالعلوم اور جوامع جماعت کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔ کوئی اجتماعی منصوبہ ہی جماعت کو کامیاب کر سکتا ہے۔

آج کے حالات:

مجھے معلوم ہے آج کے حالات ان حالات سے کافی مختلف ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا۔ آج کے حیرت انگیز قحط نے علماء اور عوام کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ عوام کی دینی علوم سے بے اعتنائی اور اہلِ علم کے متعلق بدگمانیوں نے نئی قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ علماء کی قلت نے انھیں ایک گراں مایہ جنس بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود اخلاص اور خودداری کی راہیں ریا وسمعہ اور طمع و لالچ سے قطعی جدا ہیں۔ اگر اخلاص موجود ہو تو جہاں یہ مشکلات ہیں وہاں بیسیوں آسانیاں بھی اس وقت موجود ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں۔ عام بصیرت، موجودہ تعلیم کی اشاعت اور عموم کی وجہ سے وہم پرستی، پیر پرستی اور قبر پرستی کے لیے زمین روز بروز تنگ ہو رہی ہے۔ علم وتحقیق کے شوق کی وجہ سے تقلید اور جمود کی وسعتیں محدود ہو رہی ہیں۔

کتابوں کی اشاعت بڑی کثرت سے ہو رہی ہے۔ پرانے علمی ذخائر، احادیث کی نایاب کتابیں جو لائبریریوں کے دور افتادہ گوشوں میں گم نامی کی نذر ہو رہی تھیں، آج بازار کی زینت ہو رہی ہیں۔ شروحِ حدیث کا کامیاب ذخیرہ طبع ہو چکا ہے، اس لیے اگر مقصد کے ساتھ محبت ہو اور دل اخلاص کی نعمت کے ساتھ بھرپور ہو تو کامیابی کے امکانات بے حد روشن ہیں۔ اور اگر اہلِ علم ہی وقت کے تقاضوں سے اِعراض فرما لیں تو علم واعتقاد کی اس امانت کا خدا حافظ!

ضرورت ہے تبلیغ و تدریس، تصنیف و تالیف کی طرف کچھ قدم اٹھیں اور پورے اخلاص سے اٹھیں۔ کامیابی ان کے استقبال کے لیے چشم براہ ہوگی اور مشکلات قطعاً راستہ نہیں روک سکیں گی۔

نواب صدیق حسن خاں:

اپنے دور میں نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمہ اللہ کا مقام منفرد ہے۔ ان کے قلم سے زیادہ تر ایجابی انداز کی چیزیں نکلیں۔ اگر کبھی سلبی انداز کی کتاب نوکِ قلم تک آئی تو اس میں بھی اس قدر سنجیدگی غالب تھی کہ اس کی سلبی حیثیت نمایاں نہ ہو سکی۔ تفسیر فتح البیان، عون الباری، السراج الوہاج، فتح العلام، مسک الختام، الروضۃ الندیہ، ابجد العلوم، اتحاف النبلاء وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے

بارِ احسان سے امت سبکدوش نہیں ہو سکے گی۔

اس دور کی خدمات پر تبصرہ طویل صحبت چاہتا ہے۔ میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو ممکن ہے اس دور کی خدمات پر بسط سے کچھ کہا جا سکے۔

اختلافات سے بچنے کی ضرورت:

آج اہلِ حدیث اور علمائے دیوبند دونوں کا یہ حال ہے کہ جو جگہ خالی ہوئی وہ پُر نہیں ہو سکی۔ کام تو بہر حال چل ہی رہا ہے لیکن جو حضرات رخصت ہوئے ان کی جگہ ان کے کسی عدیل نے پُر نہیں کی۔ مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسین علی وغیرہم، اسی طرح مولانا سید نذیر حسین صاحب، مولانا سید شریف حسین صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، شاہ عین الحق پھلواری، مولانا عبدالجبار غزنوی، حافظ محمد صاحب لکھوی، مولانا عبدالاول صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی، ان کی جگہیں خالی ہیں۔ ان مقامات پر جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ کسی طرح بھی ان کے ہمسر نہیں۔

ضرورت ہے کہ فاضل ہونے والے نوجوان کتاب وسنت کی اشاعت کریں۔ اپنے مسلک کی خدمت کریں۔ یہ خدمت، ایجابی ہو یا سلبی، تخریبی نہیں ہونی چاہیے۔ مسلکی اور فروعی اختلافات مجالسِ درس سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ یہ چرچے مجالسِ علم اور مصنفات تک محدود ہو جائیں۔ ائمۂ اربعہ کے مسالک میں علم و تحقیق کی بنا پر اہلِ علم مسلک بدلتے رہے لیکن اس سے نہ رنجش پیدا ہوئی نہ کفر و اسلام کے فتوے چلنے شروع ہوئے۔ اختلافات عوام تک پہنچائے جائیں تو اس سے مختلف خطرات ہو سکتے ہیں۔

اس وقت ذہین طلبہ انگریزی مدارس میں جا رہے ہیں۔ کند ذہن اور کم فہم غیر مستطیع طلبہ عموماً دینی مدارس میں آتے ہیں۔ کچھ دینی مدارس کا نظام مفت خوری پر مبنی ہے۔ اس سے بعض غلط اخلاقی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے مدارس میں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ کم علمی کی وجہ سے تعصب بڑھ رہا ہے۔ بسا اوقات معمولی اختلافات پر اتنا زور دیا جاتا ہے جیسے کفر و اسلام میں تفاوت ہونا چاہیے۔ اگر مستقبل کی تعمیر مقصود ہے تو سر جوڑ کر ایک نظم کے تحت مل کر کام کرنے کی کوشش فرمائیے۔ خود سری اور

انفرادیت موت کی نشانی ہے اور جماعت سے دشمنی کے مترادف!

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی تشکیل انھی مقاصد کے لیے عمل میں آئی ہے۔ اب بحمداللہ یہ نظام پھیل رہا ہے۔ جمعیت کی مختلف شاخیں سیکڑوں کی تعداد میں ملک کے طول وعرض میں پھیل رہی ہیں۔ اس نظام سے وابستہ ہوکر جماعت کی ہدایات کے تحت کام کریں۔ کتاب وسنت کی اشاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق مرحمت فرمائے۔

جماعت کے سامنے مختلف پروگرام ہیں۔ ابتدا تعلیم سے کی گئی ہے۔ علماء روز بروز کم ہو رہے تھے۔ ائمۂ حدیث کی حمایت اور مسلک کی اشاعت میں غیر معمولی انحطاط آ رہا تھا، اس لیے تعلیم کا سلسلہ جامعہ سلفیہ کی تاسیس سے شروع ہوا۔

اس کے بعد ان شاء اللہ پریس کا مرحلہ پیشِ نظر ہے۔ کتابوں کی اشاعت اور شروحِ احادیث کی طباعت کے ساتھ ائمۂ سلف کی مفید تصانیف کے تراجم، غیر مطبوعہ دفاترِ سنت کی اشاعت از بس ضروری ہے۔ اس معاملے میں اہلِ علم سے زیادہ اہلِ ثروت اور جماعت کے دولت مند حضرات کی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں سہولت اسی وقت ہوسکتی ہے کہ پریس اپنا ہو اور یہ ادارہ بالکل کاروباری لائنوں پر چلایا جائے تاکہ اپنے بوجھ کے ساتھ جامعہ کے مصارف کا بھی کسی قدر کفیل ہوسکے۔

مجلسِ شوریٰ اور مجلسِ عاملہ کے اعضاء اگر اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں اور اپنے ماحول میں دردمندی اور ذمے داری سے کام کریں تو تمام مصارف آسانی سے برداشت کیے جا سکتے ہیں۔ اگر جماعت کی طرف سے یہ اعتماد اور اعزاز ہمیں احساس اور سعیِ عمل سے روشناس نہ کر سکے تو یہ بدنصیبی ہوگی اور مشکلات غیر مختتم ہوں گی۔

مجھے امید ہے کہ یہ طویل سمع خراشی احباب کے لیے محرک ثابت ہوگی۔

والسلام علی النبي وأهله.

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ۲۴ جولائی تا ۱۴/ اگست ۱۹۵۹ء)

ہمارے تعلقات... حضراتِ دیوبند سے

حضرت مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ عملاً حنفی تھے، لیکن مکتوبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو چیزوں کے سخت مخالف تھے۔ ایک تو وہ فقہی جمود کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسرے ان کو بدعات سے بے حد نفرت ہے۔ یہ دونوں چیزیں فقہ حنفی کو زندہ رکھنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جمود میں عقیدت مندی کا مظاہرہ تو ہوتا ہے، لیکن اس عقیدت مندی کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ مغل دور نے ان دونوں بیماریوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھنے کا موقع دیا۔ آج کل فتویٰ نویسی میں یہ عادت ہو چکی ہے کہ سائل دریافت کرتا ہے کہ فلاں مسئلے میں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین کیا فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سائل دین اور شریعت کا فیصلہ طلب کرتا ہے۔ اس کے جواب میں قرآنِ عزیز کی کوئی آیت صراحتاً، عبارتاً یا اشارتاً مرقوم ہونی چاہیے، اسی طرح حدیث سے بھی جو کچھ لکھا جائے، وہ اسی اصول سے لکھنا چاہیے۔ اگر قرآن اور حدیث سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو مفتی کو یہ ظاہر کر دینا چاہیے، قرآن و سنت میں مسئلہ بہ ظاہر موجود نہیں، لیکن فلاں امام یا بزرگ کا خیال اس طرح ہے۔ اس کے بعد فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سے عقیدت ہو تو علماء کو اس کا تذکرہ کھل کر کرنا چاہیے، لیکن سائل کے ذہن کو غلطی میں نہیں ڈالنا چاہیے کہ جو کچھ اسے بتایا گیا ہے، شریعت یہی ہے۔

سائل کو اجازت ہونی چاہیے کہ اگر وہ مطمئن نہ ہو تو شریعت ختم نہیں ہوئی، اس کی تلاش کے لیے اور مواقع بھی ہیں۔ مالکی، شافعی اور حنبلی بھی شریعت ہی کی تعبیرات ہیں، لیکن ان تعبیرات میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک تعبیر کو کلیتاً شریعت سمجھے یا اس کے علاوہ باقی تعبیرات کو مظنون اور اَقرب اِلی الغلط کہے، لیکن ہمارے ہاں اہلِ علم کی عادت ہے کہ ایسے سوالات کے جواب میں اپنے خیالات یا اپنے اکابر کی آراء اور اپنی فقہیات کے دفاتر کے حوالوں سے فتویٰ لکھ دیتے ہیں۔

عامی سائل یہ سمجھتا ہے سوال کا جواب آ گیا اور جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے، شریعت اور دین

یہی ہے۔ حالاں کہ یہ ایک نیک دل مجتہد کی تعبیر ہے اور اس تعبیر کے علاوہ باقی مجتہدین کی تعبیرات بھی اتنی ہی توجہ کی مستحق ہیں جیسے یہ تعبیر۔ اس ترجمانی اور دوسرے ائمۂ اجتہاد کی ترجمانی میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ یہ جمود کی دعوت ہے جو ائمۂ اجتہاد کے نام سے دی جا رہی ہے۔ دیوبند ایسی مستند درس گاہ میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس کمزور اساس کے باوجود دوسروں پر تیز اور تند فتوے دیے جاتے ہیں۔ حضرت مجدد الفِ ثانی اسی جمود کو ناپسند فرماتے تھے جس کا اثر ان کے رفقاء اور متوسلین پر کافی تھا۔ بعض ان میں سے سینے پر ہاتھ باندھتے اور رفع الیدین پر عمل کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کا مشن:

حضرت محدث دہلوی رحمہ اللہ بھی بظاہر حنفی ہونے کے باوجود اسی مشن کے داعی تھے۔ فاتحہ خلف الامام کے متعلق ظروف و احوال کے لحاظ سے ان کی کس قدر معتدل رائے ہے:

”وَإِنْ كَانَ مَأْمُومًا وَجَبَ عَلَيْهِ الْإِنْصَاتُ وَالْإِسْتِمَاعُ، فَإِنْ جَهَرَ الْإِمَامُ لَمْ يَقْرَأْ إِلَّا عِنْدَ الْإِسْكَاتَةِ، فَإِنْ خَافَتَ فَلَهُ الْخِيَرَةُ، فَإِنْ قَرَأَ فَلْيَقْرَأِ الْفَاتِحَةَ قِرَاءَةً لَا يُشَوِّشُ عَلَى الْإِمَامِ، وَهٰذَا أَوْلَى الْأَقْوَالِ عِنْدِيْ، وَبِهِ يُجْمَعُ بَيْنَ أَحَادِيْثِ الْبَابِ“ اهـ (حجة الله البالغة: ٢/ ٧)

”مقتدی کے لیے ضروری ہے کہ خاموشی سے امام کی قراءت کو سنے اور اگر امام جہر سے پڑھ رہا ہو تو سکتوں میں پڑھے۔ اور اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی کو اختیار ہے جیسے چاہے پڑھے، لیکن یہ قطعاً نہیں ہونا چاہیے کہ مقتدی امام کی قراءت میں تشویش اور خلجان کا موجب بنے۔ میرے نزدیک یہی قول بہتر ہے اور اسی طرح احادیث میں تطبیق ہو سکتی ہے۔“

انتہا پسند اہلِ حدیث اور دیوبندی ممکن ہے شاہ صاحب کے ارشاد کو پسند نہ فرمائیں، لیکن شاہ صاحب نے حنفی ہونے کے باوجود پرانے جمود کو تار تار کر دیا ہے اور عملاً ایک ایسی راہ کھول دی ہے جس سے فقہی جمود ٹوٹتا ہے اور عصبیت ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح رفع الیدین کے متعلق کس قدر دلچسپ فیصلہ فرماتے ہیں:

”وَالَّذِيْ يَرْفَعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّنْ لَا يَرْفَعُ؛ فَإِنَّ أَحَادِيْثَ الرَّفْعِ أَكْثَرُ وَأَثْبَتُ“

(حجة الله البالغة: ٢/ ٨)

''رفع الیدین کرنے والا نہ کرنے والے سے مجھے زیادہ پسند ہے، کیوں کہ رفع الیدین کی احادیث زیادہ بھی ہیں اور پختہ بھی۔''

میرا مقصد اس وقت ان مسائل کی تحقیق نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان اصحابِ احیا وتجدید نے کس حکیمانہ انداز سے جمود کو توڑا اور بحث ونظر اور فقہی مسائل میں باندازِ اجتہاد سوچنے کی دعوت دی۔ مجدد صاحب رحمہ اللہ سے لے کر شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تک یہ مقصد قدم قدم پر نکھرتا گیا۔ مقلد اور غیر مقلد دونوں ناپسندیدہ لفظ ہیں، معلوم نہیں ہنگامہ آرائی کے لیے یہ دونوں لفظ کیوں پسند کیے گئے؟ اصل حقیقت تو صرف اس قدر تھی کہ صدیوں کے فقہی جمود اور رسمی حنفیت کی جگہ آزادیِ فکر کی بنیاد رکھی جائے۔ عنوان کے طور پر وہ حنفی کہلائیں یا شافعی، لیکن اسے حق کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اگر کوئی حنفی یا شافعی اپنے مسلک کے خلاف کسی حدیث پر عمل کرنا چاہے تو حنفیت یا شافعیت کو سنت کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے آیتِ کریمہ: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ [الکہف: ۲۱] کی تفسیر میں قبور ومشاہد کے پاس مساجد کی تعمیر کا ذکر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں اپنے وقت کے مقتدر اہلِ حدیث سلفی العقیدہ عالم علامہ فاخر الٰہ آبادی کا تذکرہ کس قدر محبت آمیز الفاظ میں فرمایا:

"هٰذِهِ الْآيَةُ تَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ لِيُصَلّٰى فِيْهِ عِنْدَ مَقَابِرِ أَوْلِيَاءِ اللّٰهِ قَصْدًا لِلتَّبَرُّكِ بِهِمْ، وَقَدْ كَانَ الشَّيْخُ الْأُسْتَاذُ مُحَمَّدٌ فَاخِرٌ الْمُحَدِّثُ رَحِمَهُ اللّٰهُ يَكْرَهُ ذٰلِكَ مُسْتَدِلًّا بِمَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ أَبِي الْهَيَّاجِ... الخ"[1]

(تفسیر مظهري، سورة كهف، ص: ٢٣)

حضرت مجدد الفِ ثانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور اُن کے ابناء وتلامذہ کرام کو آپ حنفی فرمائیں یا دیوبندی، اُنھیں آپ صوفی فرمائیں یا مولوی، لیکن ان کے ہاں یہ جمود کہیں نہیں ملتا جس کی دعوت آج دیوبند، سہارنپور یا بریلی سے دی جا رہی ہے۔

[1] ''یہ آیت قبورِ اولیاء کے پاس تعمیرِ مسجد پر دلالت کرتی ہے تاکہ اس میں ان سے حصولِ تبرک کی نیت سے نماز پڑھی جائے۔ مگر شیخ استاد محمد فاخر محدث رحمہ اللہ اس استدلال کو صحیح مسلم کی حدیث کے پیشِ نظر ناپسند کرتے تھے جس میں مقابر پر تعمیر کردہ عمارت کو گرانے کا حکم ہے۔''

تحریک اہلِ حدیث یا سلفیت:

اس میں بھی شک نہیں کہ ہندوستان میں عقیدۂ سلف کی دعوت اور فقہی فروع میں حزبی جمود کے خلاف اب تک جو کچھ ہوا، اس کا سرچشمہ زیادہ تر یہی مقدس گروہ ہے۔ یقیناً اس تحریک کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم، ابن کثیر، حافظ ابو شامہ، عز بن عبدالسلام اور علمائے یمن سے بھی بہت کچھ ملا، لیکن گیارھویں صدی کے آغاز سے بارھویں کے اواخر تک یہ لٹریچر ہندوستان میں نہیں پہنچا تھا۔ کہیں خال خال اگر تھا تو وہ بھی بے پروائی اور نفرت کی نذر ہو رہا تھا۔ بے خبری کی انتہا ہے کہ مولانا عبدالحلیم، مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کے والد، ایسے باخبر عالم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو مجسمہ سمجھتے تھے۔ (حواشی ملا حسن)

اگر یہ حضرات دیوبندی مسلک اور تحریک کے بانی تصور کیے جا سکتے ہیں تو ان ایام میں تحریکِ اہلِ حدیث کا داعی بھی ان کے سوا کوئی نہیں۔ اگرچہ ظروف و حالات کی نزاکت کی وجہ سے بعض احادیث پر عمل نہیں فرما سکے، لیکن ان احادیث پر عمل کے لیے راہیں ان ہی حضرات نے ہموار فرمائی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوا ہے وہ حضرات عامل بالحدیث لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے، اس لیے کہ یہ لوگ ان کے مقاصد کی کامیابی کی عملی دلیل تھے، لیکن آج کے بعض دیوبندی بزرگ عمل بالحدیث کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی حنفیت مصلحت اور وقت کا جبری تقاضا تھا، یہاں فقہی جمود کو ائمۂ مجتہدین کی مجتہدانہ مساعی کا نعم البدل تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں یہ کوشش تھی کہ ہر قدم عمل بالکتاب و السنۃ کی طرف بڑھے، یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ علم و تحقیق اگر کہیں برائے نام آ بھی جائے تو اس پر جمود کا بپتسمہ ضروری ہے۔ وہ علم کے نام سے نہیں، بلکہ کسی عالم کے نام سے آنا چاہیے۔

تحریک کی رفتار اور اس کے مراحل:

حضرت مجدد الفِ ثانی نے جب تجدید و اصلاح کا علم ہاتھ میں لیا، اس وقت اکبر اور دارِ شکوہ کی لادینی حرکات کا غبار اُفق پر موجود تھا۔ مغل بادشاہ اس قدر غلط نہ سہی، لیکن دربار سے حرم سرا تک بدعات میں ملوث تھے۔ بعض کی دین داری رفض و تشیع کی آلایشوں سے آمیز تھی، اس لیے سنت اور اس کے حامیوں کے لیے اس ماحول میں کوئی خوش گوار مستقبل نہیں تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ حکومت، برائے نام سہی، مسلمان تھی۔ اسلام کی سرپرستی اور اس سے وابستگی کو پسند کرتی تھی، لیکن لادینی اور بدعی اعمال کی وجہ سے خاندان میں خلفشار اور باہمی رقابتیں روز بہ روز بڑھ رہی تھیں۔ علماء کو اس سے

غرض نہ تھی کہ پسِ پردہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اقتدار اسلام کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، اس لیے بادشاہوں کی نصیحت اور خیر خواہی کے سوا انھیں کوئی سروکار نہ تھا، لیکن شاہی خاندان کی رقابتیں آخر رنگ لائیں، باہمی جنگوں کی وجہ سے بیرونی مداخلت کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس لیے اس خالص دینی تحریک کے پروگرام میں اقتدار کے تحفظ اور اسے پختہ رکھنے کا مزید اضافہ کرنا پڑا۔ اب یہ تحریک دینی کے ساتھ نیم سیاسی بھی تھی۔

شاہ صاحب کی تصانیف اور مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل اہم عناصر محسوس ہوتے ہیں:

1. فقہی جمود کی جگہ وسعتِ ظرف اور رواداری پیدا کرنا۔
2. بدعات کی مخالفت اور سنت کی حمایت۔
3. قرآن اور سنت کو بلحاظِ نظام ملک پر مسلط کرنا۔
4. پوری تحریک میں رفض کے ساتھ سمجھوتے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔

شاہ ولی اللہ کے انتقال (۱۱۷۶ھ) کے بعد راہنمائی اور مسندِ درس و افتا شاہ عبدالعزیز صاحب کے سپرد کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ مغل حکومت بتدریج کمزور ہو کر قریباً مفلوج ہوگئی اور بعض دوسری طاقتوں نے ہوشیاری سے اقتدار پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، اس لیے شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کے رفقاء نے کھلے طور پر غیر مسلم متسلطین کی مخالفت شروع کی۔ اس وقت پہلا نمبر سکھوں کا تھا، دوسرا انگریزوں اور مرہٹوں وغیرہ کا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی رحلت کے بعد علم و افتا کی مسند پر ان کے بھائی شاہ رفیع الدین وغیرہ کام کرنے لگے، لیکن ردِّ بدعات اور سیاسی امور کی ذمے داری سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڈھانوی وغیرہم کے سپرد ہوگئی اور تحریک ایک خطرناک سیاسی دور میں داخل ہوگئی۔ بوریا نشین فقیروں نے سکھوں کے تہور اور انگریزی تدبیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جو چیز اب تک نظریات کی صورت میں وعظ و افتا کی زینت ہو رہی تھی، اب وہ سیف و سنان کی روشنی میں میدانِ کارزار کی زینت بن گئی۔ جہاد کی جو تلقین خطوط اور افتا میں حکمت سے کی جا رہی تھی، اب ان اقوال نے احوال و اعمال کی شکل اختیار کر لی۔

تحریکِ حریت اور مختلف دینی نظریات:

اس وقت اسلام کے نام سے چار جماعتیں ہندوستان میں موجود تھیں: اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ۔ اس تحریک کی بنیاد چوں کہ توحید و سنت پر تھی، اس لیے سید احمد شہید کے عساکر میں اہلِ حدیث اور دیوبندی مکتبِ خیال کے آدمی شامل تھے، بریلوی اور شیعہ حضرات اس میں بالکل شامل نہ تھے، بلکہ وہ کھلی مخالفت کرتے رہے، ان کے فتوے میدانِ جنگ تک پہنچتے رہے اور بد دلی اور اختلاف کا موجب بنتے رہے۔

دیوبندی سے میری مراد مدرسہ دیوبند نہیں، بلکہ وہ مکتبِ خیال ہے جس کی اشاعت کے لیے مدرسہ دیوبند کی تاسیس عمل میں آئی، یعنی کتاب و سنت کو حضرت امام ابوحنیفہ اور اُن کے تلامذہ کے نقطۂ نظر سے سمجھنا اور اس اندازِ فکر کو نظر و فکر کی اساس قرار دینا جو فقہ العراق کی تاسیس کے وقت حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے ارشد تلامذہ کے پیشِ نظر تھا، یعنی صحیح حنفی مسلک جو بدعاتِ عملی اور اعتقادی آمیزش سے پاک اور صاف ہو۔ ورنہ معلوم ہے کہ اس تحریک کے شباب و انحطاط کے دونوں وقتوں میں مدرسہ دیوبند کا منصوبہ بھی کسی کے حاشیۂ خیال میں نہ تھا۔ اس لیے دیوبندی سے مراد وہی لوگ ہیں جو فہم میں فقہائے عراق رحمہم اللہ کے مسلک کے پابند ہوں اور بدعات اور ان کے مبادی سے اُنھیں نفرت ہو۔ اس لحاظ سے حضرت مجدد الفِ ثانی اور اُن کی مجددانہ مساعی سے دو قسم کے اہلِ علم متاثر ہوئے۔ ایک گروہ نے فقہ العراق کی پابندی کے ساتھ بدعات سے پرہیز کی اور عقیدتاً وہ فقہائے عراق کی راہ کے پابند رہے۔ دوسرے گروہ نے فروعی تقلید اور فقۂ عراق کی تخصیص سے انکار کر دیا، لیکن عقیدتاً سلف صالحین کا اتباع کیا اور اعمال میں بدعات سے پرہیز کی۔ یہ دونوں راہیں سرہندی اثرات اور ولی اللہی تلقین کی پیداوار تھیں۔

سید احمد شہید کے رفقاء:

سید احمد شہید کے لشکر میں دونوں مکاتبِ فکر کے آدمی شامل تھے۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کا رجحان اہلِ حدیث کی طرف تھا۔ خود سید احمد رحمہ اللہ اور مولوی عبدالحی بڈھانوی کا رجحان حنفی مکتبِ فکر کی طرف تھا، لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ لشکر میں ان فروعی مسائل یا تقلید اور ترکِ تقلید پر کبھی باہم نزاع تک نوبت پہنچی ہو۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ نے اپنے امالی (صراطِ مستقیم) میں اتباعِ سنت کی جس طرح ترجمانی فرمائی ہے، کوئی اہلِ حدیث بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

سفرِ حج سے واپسی کے بعد یہ مقدس گروہ ہجرت کے لیے پا بہ رکاب ہوگیا۔ یہ ہجرت بھی فریضۂ جہاد اور اقامتِ دین کے لیے تھی۔ ان کی مالی اعانت بھی اسی خیال کے لوگ کرتے رہے۔ بنگال، بہار، یوپی، سی پی، سندھ اور پنجاب کے اہلِ توحید کا پورا تعاون ان لوگوں کو حاصل تھا۔ انھی مقامات سے رضا کار جاتے تھے اور یہیں سے ان کی ضروریات کے لیے روپیہ فراہم ہوتا تھا۔ یہیں ان کے سفراء کسی طمع کے بغیر ہزاروں میل کا سفر کر کے یہ روپیہ سرحد پار اپنے مرکز کو پہنچاتے تھے اور عام طور پر اس میں ایک پائی خیانت کا شبہہ نہیں ہوا۔

معرکۂ حق و باطل کی یہ کشمکش پورے اڑھائی سال جاری رہی۔ عشق اور سرمستیوں کا یہ پرشکوہ قافلہ شرارت، عیاری، غدر اور شر انگیز فتووں کی ہنگامہ آرائی اور شور وشغب میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا ہوا بالا کوٹ کے سر بہ فلک پہاڑوں میں آ کر اُتر گیا۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر سکھوں کی فوج تھی جسے غدار گجروں اور پٹھانوں کی اعانت حاصل تھی۔ پہاڑ کے دامن میں بالا کوٹ کی مسجد کے صحن اور بستی کے اطراف میں بے نوا فقیر شہادت کے انتظار میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ۲۴ر ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ر مئی ۱۸۳۱ء جمعہ کے دن دونوں لشکروں میں مقابلے کی ٹھن گئی۔ ہر چند جنگی تدبیر کے لحاظ سے یہ مقام لڑائی کے لیے موزوں نہ تھا۔ تدبیر کا فتویٰ یہی تھا کہ جنگ کے لیے حالات سازگار نہیں، لیکن عشق کو ان فتووں سے چڑ تھی۔ جمعہ کی صبح ہی کو لوگوں نے دیکھا کہ سید احمد کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ وہ کفر کی فوجوں کو سامنے دیکھ کر پیچھے ہٹنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ چناں چہ جنگ کا بگل بج گیا۔ پروانے شہادت کے شوق میں بے قراری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ٹھیک جمعہ کے وقت حضرت سید احمد اور شاہ اسماعیل یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ شہادت کے خون نے کفر کے فتووں کی سیاہی دھو کر رکھ دی۔ حق و باطل کی یہ کشمکش ایک خاص موڑ پر پہنچ کر چند ماہ کے لیے رُک گئی۔ یہ شہادت کا موڑ تھا جس کے لیے برسوں آنکھیں منتظر تھیں۔

دو مکاتبِ فکر کی علاحدگی:

ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کے بعد جماعت کی راہنمائی اور قیادت حضراتِ صادق پور کی طرف منتقل

ہوگئی۔ مولانا ولایت علی رحمہ اللہ صاحب صادق پوری نے جماعت کی تمام ذمے داریاں اپنے سر پر لے لیں، اس وقت سکھ فوج میں انگریز بطورِ ملازم یا رضا کار کام کر رہے تھے۔ یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کو اپنا مخالف سمجھتی تھیں۔ سکھ کمزور ہو رہے تھے اور انگریز حکمتِ عملی سے ملک پر قابض ہو رہے تھے۔ مجاہدین بھی دونوں کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔

مولانا ولایت علی، شاہ شہید رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر تھے، ان کے رجحانات ترکِ تقلید کی طرف تھے۔ اتباعِ سنت اور عمل بالحدیث طبیعت پر غالب تھا، اس کے بعد بالالتزام مجاہدین کی قیادت مسلسل ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی جن پر عمل بالحدیث کا شوق غالب تھا۔ آج تک جماعتِ مجاہدین پر یہی ذہن غالب ہے، لیکن فروعی مسائل کو وہاں کبھی اس قدر اہمیت نہیں دی گئی جس سے یہ مسائل محلِ نزاع قرار پائیں۔ اس کے بعد پوری جماعت میں فقہ العراق کا رجحان کم ہوتا گیا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت اکابر احناف تحریک سے دستکش ہوگئے اور جو لوگ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، وہ بھی پھر پچھلی صفوں میں چلے گئے۔ بظاہر حنفی مکتبِ فکر کا جماعت کے ساتھ نمایاں تعلق نہ رہا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ علاحدگی فقہی رجحانات کی وجہ سے تھی یا اس وقت انگریز کے ظالمانہ تشدد کی وجہ سے۔

۶ رمئی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت تک اور اس کے بعد آج تک جماعتِ مجاہدین کا نظام ساداتِ صادق پور اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ حنفی مکتبِ فکر کے لوگ نمایاں طور پر سامنے نہیں آئے۔ ۱۸۵۷ء کا معرکہ انگریز کمپنی کی ظالمانہ بداعمالیوں کا قدرتی نتیجہ تھا۔ یہ تحریک پورے ملک کی تحریک تھی، اسے احناف یا اہلِ حدیث سے کوئی خاص نسبت نہ تھی، اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے، بلکہ خیر آبادی خاندان نے اپنی پرانی غلطی کو محسوس کیا جو وہ اپنے اساتذہ اور اُن کے خاندان کے خلاف اس سے پہلے کر چکے تھے۔ مولانا خیر آبادی نے اس وقت اس ہنگامے کو جہاد قرار دیا اور انگریز کے خلاف لڑنے کا فتویٰ دیا جس کی پاداش میں اُنھیں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس تحریک میں مجاہدین نے بھی کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔

مولوی رحمت اللہ اس وقت دہلی تشریف لائے جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دم توڑ رہا تھا۔ بہادر شاہ صورتِ حالات سے مایوس تھے۔ ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ حجاز چلے گئے۔ مجاہدین کا ساتھ وہ اس لیے نہیں دینا چاہتے تھے کہ تحریک کی قیادت اہلِ حدیث کے قبضے میں چلی گئی

تھی۔ حاجی امداد اللہ صاحب کا رجحان بریلویت کی طرف تھا، لیکن طریقت میں وہ حضراتِ دیوبند کے شیخِ طریقت تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ نے ''آبِ حیات'' میں ان کا تذکرہ بڑے احترام سے فرمایا، بلکہ ''آبِ حیات'' کی اشاعت حاجی صاحب کے ایما سے ہوئی۔ اس سفر میں ''آبِ حیات'' مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بدنظمی آ گئی تھی اور اس کا مطمحِ نظر اقامتِ دین نہیں تھا، بلکہ قومی آزادی اور نیشنل قسم کی حکومت اس ہنگامے میں پیشِ نظر تھی۔ اس لیے مجاہدین نے بھی اس میں نمایاں حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ اپنی تحریک کو اپنے طے شدہ نظم کے مطابق چلاتے رہے۔ انگریز روز بہ روز پنجاب کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے سامنے ان اہلِ توحید مجاہدین کے سوا کوئی منظّم تحریک نہ تھی، اس لیے انگریز کی مخالفت اور سخت ہوگئی۔ اس نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ اور لڑائی کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر حضرت مولانا محمد قاسم نے مدرسہ دیوبند کی تاسیس فرمائی اور اپنے مسلک کی علمی خدمت پوری مستعدی سے شروع فرما دی۔ دیوبند، سہارنپور، میرٹھ وغیرہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ درسِ نظامی کی تعلیم اور حنفی مسلک کی اِعانت کے لیے پورے انہماک سے کام شروع کیا گیا۔ ان بزرگوں کی ان مخلصانہ کوششوں کے ساتھ تحریکِ جہاد کی اِعانت اور سرپرستی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ ساری ذمے داری اس وقت پٹنہ کے صادق پوری حضرات ہی اُٹھائے ہوئے تھے۔

ان حالات کا اثر:

ان حالات میں جب کہ انگریز کا اثر بڑھ رہا تھا، پرانے رفقاء علاحدگی اختیار کر چکے تھے۔ نہ صرف علاحدگی بلکہ وہ ایسے جمود کی دعوت میں مشغول ہوگئے جس کی مخالفت مجدد الفِ ثانی سے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تک تحریکِ توحید کی جان تھی۔ یہ حضرات بے شک حنفی تھے، لیکن ان میں فقہی جمود نہیں تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی وصیت ان کے سامنے تھی۔ تفہیمات (۲/ ۲۴۰) میں ہے:

''وصیت اول این فقیر چنگ زدن است بکتاب وسنت در اعتقاد وعمل و پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن واگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن و در عقائد مذہبِ قدماء اہل سنت اختیار کردن واز تفصیل وتفتیش آنچہ سلف تفتیش نہ کردند اعراض نمودن وبتشکیکاتِ معقولیان خام التفات نکردن و در فروع پیروی علماء

محدثین کہ جامع باشند میاں فقہ و حدیث کردن و دائماً تفریعاتِ فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کالائی بد بریش خاوند دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغناء حاصل نیست وسخن متقشفہ فقہاء کہ تقلید عالمی را دستاویز ساختہ تتبع کتاب و سنت را ترک کردہ اند نشنیدن و بدیشان التفات نہ کردن وقربتِ خدا جستن بدوری ایشاں۔''

''فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمسک کرے اور ان دونوں کو اپنا مشغلہ قرار دے، اور ہر دو سے کچھ حصہ روزانہ پڑھے اور اگر پڑھ نہ سکے تو چند اوراق کا ترجمہ سنے، اور عقائد میں سلف اہلِ سنت کی روش اختیار کرے اور ائمۂ سلف کی طرح موشگافیوں سے بچے اور خام کار معقولیوں کی شک آفرینیوں سے بچے، اور فرعی مسائل میں ان محدثین کا اتباع کرے جو حدیث اور فقہ دونوں سے پوری طرح واقف ہوں، اور فقہی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت پر پیش کرے، جو موافق ہو اسے قبول کرے ورنہ بالکلیہ نظر انداز کر دے۔ اُمت کو اپنے اجتہادات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہوا، اور ضدی قسم کے فقیہ حضرات، جنھوں نے بعض اہلِ علم کی تقلید کو دین کا سہارا بنا رکھا ہے اور کتاب و سنت سے اعراض ان کا شیوہ ہے، کی بات تک نہ سننا اور ان کی طرف نگاہ مت اٹھانا اور ان سے دور رہنے میں ہی خدا کا قرب تلاش کرنا۔''

ان موثرات کی وجہ سے اہلِ حدیث یا شاہ شہید کے رفقاء تین حصوں میں بٹ گئے۔ صادق پوری حضرات تحریک کی روح پر قائم تھے۔ جہاد کا علم ہاتھ میں لیے پشاور، بالاکوٹ اور ہری پور کے پہاڑوں میں سکھوں اور انگریزوں سے پٹ رہے تھے اور جہاں تک ممکن تھا، توحید و سنت کی اشاعت اور بدعات کی مخالفت کرتے تھے، لیکن درس و تدریس، فقہی مباحث اور حزبی اختلافات سے بالکل الگ تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے ان کے پاس فرصت کہاں تھی؟

دوسرے گروہ نے ائمۂ حدیث کے مسلک کے مطابق مدارس قائم کیے۔ تقلیدِ مروج اور جمود کے خلاف درس و افتا کی مجالس پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔ اس مسند پر حضرت شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے بعد حضرت شیخ الکل مولانا السید محمد نذیر حسین دہلوی صاحب بیٹھ گئے اور اس ایک مقدس شخصیت

نے اس راہ میں اتنا کام کیا جس قدر وقت کے بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم نہ کر سکے۔ یہ بہ ظاہر تحریکِ جہاد سے بالکل الگ تھے، لیکن ان کی ہمدردیاں تحریکِ جہاد کے ساتھ قائم تھیں، لیکن مصلحتاً وہ پچھلی صفوں میں چلے گئے، غالباً اس لیے کہ وہ اطمینان سے کوئی علمی کام کر سکیں اور سنتِ نبوی ﷺ کی خدمت سلفی انداز میں کر سکیں۔

میاں صاحب کے تلامذہ کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا رحیم آبادی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عین الحق اور مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی ایسے فحول اہلِ علم موجود رہے جنھوں نے تحریکِ جہاد کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تمام عمر تعاون فرمایا۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی وغیرہم خالص علمی آدمی تھے۔ تحریک کے ساتھ ہمدردیاں تھیں، لیکن زیادہ توجہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف کی طرف تھی۔ تیسرا فریق مولانا بٹالوی صاحب، یہ بہ ظاہر انگریز کے معاون تھے۔ تحریکِ جہاد کے پہلے مخالف تھے۔ تقریر و تحریر میں وہ اپنے نظریے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی تسلط کے بعد اب ان سے تعاون کرنا چاہیے۔ اب لڑنا اور حکومت کو بدگمان رکھنا صحیح پالیسی نہیں۔ وہ اس معاملے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ہم خیال تھے، لیکن وہ اس راہ میں اکیلے تھے۔ جماعتی طور پر تو ان کی کبھی حمایت نہیں کی گئی۔ انفرادی طور پر علماء سے شاید ایک آدھ آدمی ان کا ہم خیال ہو۔

حضرات دیوبند سے تعلقات:

جہاں تک سیاسی نظریات کا تعلق تھا، اکابرِ دیوبند مئی ۱۸۳۱ء کے بعد تحریکِ جہاد سے قریباً دست کش ہو گئے، پھر وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد قریباً ۱۹۱۸ء میں تحریکِ خلافت کے ساتھ پھر سیاسیات میں آئے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور مولانا حسین احمد رحمہ اللہ نے ترکی کے ساتھ تعلقات جوڑنے کی کوشش کی، لیکن ترکی ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس نے قبائے خلافت ہی اتار کر پھینک دی، اس کا اثر پوری دنیا کی اسلامی سیاسیات پر پڑا۔ ہندوستان کی مجلسِ خلافت بھی قریباً بے جان ہو کر رہ گئی۔ اس کی جگہ بتدریج کانگریس، مجلسِ احرار وغیرہ نے لے لی۔

اہلِ حدیث پر انگریز کی مخالفت کا جنون اس طرح سوار تھا کہ وہ قلتِ عدد کے باوجود ہر محاذ پر

لڑتے رہے۔ کانگریس، مجلسِ احرار، مجلسِ خلافت اور مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں میں اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہے۔ کبھی اہلِ حدیث، غیر اہلِ حدیث کا خیال ذہن میں نہیں آنے دیا۔ انگریز کی مخالفت ان کے مزاج میں سمو دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تحریکِ جہاد کے ساتھ ان کا پورا پورا تعاون تھا۔ مولانا عبدالقادر مرحوم قصوری، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا عبدالاول غزنوی مرحوم، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی مرحوم، مولانا ولی محمد فتوحی والا مرحوم اور اکبر شاہ سخانہ مرحوم سیاسی تحریکات کے شباب میں بھی سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کی امانت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔

انہی ایام میں مرحوم مولانا محمد علی قصوری اسلامیہ کالج کے چند نوجوانوں کے ساتھ سرحد سے پار نکل گئے۔ مجاہدین سے ملے اور کابل وغیرہ کی خاک چھانتے پھرے۔ رحمهم الله وتقبل أعمالهم.

یہ محض جماعتی اعمال کا مختصر سا جائزہ ہے۔ اس پرانی داستان کا استقصا نہ مطلوب ہے نہ ممکن۔ اصل مطلب ان طویل گزارشات سے حضراتِ دیوبند اور تحریک اہلِ حدیث کے جوڑ اور توڑ کا جائزہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ جہاد اور سید احمد کے سلسلے سے بظاہر علاحدگی صرف اس لیے تھی کہ انگریز نے شیعہ اور بریلوی بزرگوں کی تائید سے اہلِ توحید کے لیے وہابی کا لقب تجویز کیا۔ یہ لفظ ترکی نے موحدینِ نجد کے لیے تجویز کیا تھا۔ ترکی سے انگریزوں نے مستعار لیا۔ سچ یہ ہے کہ حضراتِ دیوبند کے لیے یہ لقب کچھ موزوں بھی تھا، اس لیے کہ حنبلیت اور حنفیت کا کچھ جوڑ ملتا ہے۔ اب تک بھی نجد میں سلفی حضرات کے علاوہ وہاں کے لوگ حنبلیت کو حنفیت سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں، لیکن معلوم نہیں یہ بزرگ اس لقب سے گھبرا کیوں گئے؟

ہمارے بعض دیوبندی دوستوں نے اہلِ حدیث کو بھی وہابیت میں شامل فرمانے کی کوشش کی، ہم اسے گو غلط سمجھتے ہیں، لیکن بحمداللہ ہمارے ہاں اس سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ نجد میں بھی آلِ شیخ کے بعض اکابر کے سوا عموماً سلفیت روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ شاہی خاندان تو مدت سے سلفی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ جہاں داری کے لیے اس قسم کی وسعت ویسے بھی ضروری ہے۔ پاکستان کو اگر اسلامی آئین کے لیے تیار ہونا ہے تو لزومِ تقلید اور فقہی فروع میں شخصی افکار پر اصرار بے حد مضر ہوگا۔ ممکن ہے اس جمود کا نتیجہ پاکستان اور ہندوستان میں اسی طرح ظاہر ہو جس طرح ترکی اور روسی ترکستان میں ظاہر ہو چکا ہے۔

وہابی کون ہے؟ اس وقت اس سے بحث نہیں، زیرِ غور یہ معاملہ ہے کہ تحریکِ جہاد سے علاحدگی کے بعد تحریکِ دیوبند میں کس قدر انقلاب آئے۔ اکابر سے اصاغر تک سیاسی اور دینی افکار نے کس قدر کروٹیں لیں۔ دیوبند کے اساتذہ اور تلامذہ، شیوخ اور مریدین میں ان افکار کی وجہ سے کس قدر کشمکش رہی۔ مولانا حسین احمد رحمہ اللہ، مولانا انور شاہ رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کے سیاسی افکار میں کس قدر اختلاف تھا۔ مولانا حسین علی صاحب مغفور، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمہ اللہ کے دینی اور تفسیری افکار میں کس قدر بُعد ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ افکار کے اس مدوجزر میں یہ فیصلہ کہ کون سے افکار دیوبندیت کی حدود میں شامل ہیں اور کون سے خارج؟

پھر اسی اِخراج وتخریج میں کون سے اصول اور اساسی حقائق کارفرما ہیں۔ ان تمام فکری، دینی اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ سب حضرات دیوبندی ہیں تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق حیاتِ برزخی کے قائلین نے کون سا جرم کیا ہے کہ انھیں اس نام سے علاحدہ کرنے کے لیے حنفیوں کے اخبارات میں مسلسل جنگ لڑی جا رہی ہے اور چند ناکردہ گناہ مخلصین کو معتوب کیا جا رہا ہے کہ وہ ان راہوں پر کیوں نہیں چلتے جن کی نشان دہی چند سیاسی قمار بازوں نے دیوبند کے عنوان سے کی ہے۔ اور تعجب ہے کہ دیوبند کے مستند حلقے برسوں سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور زیرِ لب مسکرانے سے زیادہ وہ کوئی ذمے داری محسوس نہیں فرماتے۔ تعجب اس پر ہے کہ ان سیاسی شعبدہ بازوں کو یہ اختیارات کس نے تفویض کیے ہیں کہ وہ مسندِ افتا پر بیٹھ کر مسلک سے نصب وعزل کے پروانے تقسیم فرمائیں؟!

سیاسیات میں شکست اور ناکامی کے بعد اکابرِ دیوبند نے ان حضرات کو کن مصالح کی بنا پر یہ خدمت تفویض فرمائی ہے؟ کیا یہ ساری ہنگامہ آرائی حضراتِ اکابر کی نگرانی میں ہو رہی ہے؟

۱۹۵۳ء میں اتحاد کا ان حضرات پر اس قدر سخت حملہ تھا کہ قادیانیوں کے سوا باقی ساری دنیا کو وہ متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ مولانا ابوالحسنات اور حافظ خادم حسین کی اقتدا میں نمازیں ہوتی رہیں۔ مولانا سید محمد داود غزنوی، منیر انکوائری میں ان کی نیابت فرماتے رہے اور دیوبندیت بالکل محفوظ رہی۔ محمد علی جالندھری کے ایمان میں خلل آیا نہ حضرت مولانا غلام غوث کا وضو ٹوٹا۔ اس وقت مولانا غلام اللہ خان کا روپیہ حلال تھا اور وہ دیوبندی تھے۔ اس وقت مولانا خیر محمد جالندھری ثم ملتانی کے دارالافتاء میں اس کی

ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ان اربابِ اعتزال کو دیوبندیت کے حصار سے باہر کیا جائے۔

منیر رپورٹ کی اشاعت کے بعد معاً احساس ہوا کہ دیوبندیت خطرے میں ہے۔ مولانا غلام اللہ اور سید عنایت اللہ شاہ اسے ختم کر دیں گے۔ دو سپاہی بیکار پریشان پھر رہے ہیں۔ انھیں دیوبندیت کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا جائے۔ کہیں غلام اللہ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔ اور حفاظت بھی ان سپاہیوں کے سپرد ہوئی جن کی اپنی دیوبندیت بھی مشکوک ہے۔ آخر ان بے چاروں میں کون سی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے یہ اہم ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ محمد علی بریلوی کی اقتدا کرے، مولانا ابو الحسنات کے پاؤں میں بیٹھے، اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں۔ غلام اللہ آنحضرت کو خاتم النبین اور افضل الرسل سمجھے، اسے دیوبندیت سے خارج کر دینا چاہیے۔

خرد کو کہہ رہے ہیں جنون جنون کو خرد　　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اہلِ حدیث اور دیوبندی:

گذشتہ ایام میں مولانا غلام اللہ خان کے ساتھ بیچارہ مدیر ’الاعتصام‘ بھی گرفت میں آ گیا اور اس کے ساتھ مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی نگران ’’الاعتصام‘‘ بھی۔ مولانا بھی قسمت کے دھنی ہیں۔ جن بچوں کو بطورِ رضا کار بھرتی کیا تھا، پوری توجہ سے انسانوں میں بیٹھنا، بولنا سکھایا تھا، وہ شاگرد بھی حضرت الاستاذ پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں:

إِذَا كَانَ الطَّبَائِعُ طَبَائِعَ سوءٍ　　　فَلَا أَدَبٌ يُفِيدُ وَلَا أَدِيبٌ

مسئلہ حیات النبی میں مولانا غلام اللہ خان صاحب کی رائے معقول تھی۔ ہر عقل مند اس کی تائید اور حمایت پر مجبور تھا۔ دیوبند سے مولانا عامر عثمانی نے اس کی تائید کی۔ پاکستان سے میں نے بھی اس کے متعلق ایک مبسوط مضمون لکھا جو لاہور کے ایک موقر علمی ماہوار مجلّے میں شائع ہوا۔ قریباً ایک سال بعد ضلع لاہور کی کسی جمعیت نے اسے شائع کر دیا۔ اس حق گوئی کی سزا میں راقم الحروف پر نظرِ عنایت ہو گئی۔ حیات النبی پر معقولیت سے گفتگو کی بجائے آج سے پہلے کی ایک تقریظ کہیں سے ہاتھ آ گئی، اسے بنیاد قرار دے کر پوری جماعت کو دھر لیا گیا۔ بھیڑیا بکری کو کھانا چاہتا ہے۔ اس ظلم کے لیے معقول وجہ نہ تھی، اس لیے حیلہ تراشا گیا کہ تم نے ہمیں گذشتہ سال گالیاں کیوں دی تھیں؟!

أَأَنْتَ الَّذِيُ مِنُ غَيُرِ شَيُءٍ شَتَمُتَنِي فَقَالَ: مَتىٰ ذَا؟ قَالَ: عَامَ أَوَّلِ
فَقَالَ: وُلِدُتُّ الْعَامَ بَلُ رُمُتِ غَدُرَةً فَهَاكَ فَكُلُنِيُ لَا هُنَاكَ مَأْكَلُ
(دیوانِ قیس)

یہی حال اس بحث میں بے چارے مدیر ''الاعتصام'' کا ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے ہیں، بڑے فلسفیانہ انداز سے اتحاد کا فلسفہ سمجھاتے ہیں۔ ادھر خانزادہ نے پہلی دفعہ بندوق داغنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بے چارے مدیر ''الاعتصام'' کی کون سنے، سب سے مشکل یہ ہے کہ مجرم تو میں ہوں، معذرت بیچارہ مدیر ''الاعتصام'' کر رہا ہے۔ میرا یہ حال ہے میں چھے ماہ کی پابندی کے ساتھ قلم بند بھی ہوں۔ اختلافی موضوعات پر لکھنے کی اجازت نہیں۔ ادھر ''اسلام کا پیغام'' یہ ہے کہ ''الاعتصام'' کے نگران اور جمعیت اہلِ حدیث کا ناظم دونوں گردن زدنی ہیں۔ مولوی اسحاق بے چارے فرماتے ہیں کہ سولہ سال کی بات ہے، گڑے مردے نہیں اُکھاڑنے چاہییں۔

پر لطف بات یہ ہے نزلہ عضوِ ضعیف پر گرنا شروع ہوتا ہے۔ مولوی اشرف سندھو مصنف ''نتائج التقلید'' مدیر ''الاعتصام'' کی نظر میں آ گئے۔ سارا ادب اسی غریب پر جھاڑ دیا۔ یقیناً مولوی اشرف دیہاتی ہے۔ اپنی جماعتی تفریق میں اس کے جرائم ناقابلِ عفو ہیں۔ نتائج التقلید کا لب و لہجہ یقیناً تلخ ہے۔ اس کتاب کے بعض مقامات واقعی طبع سلیم کے لیے از حد ناخوشگوار ہیں۔ لیکن مولوی محمد اشرف کے سارے عیوب مدیر ''الاعتصام'' کو اس وقت محسوس ہوئے جب مدیر ''پیغامِ اسلام'' نے انھیں اخلاق کے نیزے پر رکھ لیا۔ کاش مولانا اسحاق کبھی اس سے پہلے بھی مولوی اشرف صاحب کو یہ وعظ فرماتے۔ مولوی اشرف صاحب کی فروگذاشتوں کے باوجود وہ اس سزا کے مستحق نہیں جو مدیر ''الاعتصام'' نے ان کو اخبار کے متعدد شماروں میں دی ہے۔ مولانا غلام غوث کا قصاص مولانا سندھو سے لینا؛ یہ کہاں کا انصاف ہے؟! مولوی اشرف نے مجھے بھی جنگ کی دعوت دی ہے، لیکن میں اس کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مظلوم ہے اور انھیں الجہر بالسوء کا پورا حق حاصل ہے۔

میری تقریظ:

رہا میری تقریظ کا معاملہ[1]، میں مدیر ''الاعتصام'' کی ہمدردی اور مدافعت کے لیے ان کا شکر

[1] مولانا اشرف سندھو مرحوم کی کتاب ''نتائج التقلید'' پر تقریظ موجود ہے۔ یہ اسی مجموعے کے حصۂ تقریظات میں موجود ہے۔

گزار ہوں، لیکن میں اصولاً ان سے متفق نہیں۔ اصولاً مجھے مدیر ''پیغامِ اسلام'' یا ''ترجمانِ اسلام'' سے اتفاق ہے۔ جو چیز آج سے سولہ برس پہلے صحیح ہے، اسے آج بھی صحیح ہونا چاہیے اور جو سولہ برس قبل غلط ہے، اسے آج بھی غلط ہی ہونا چاہیے۔ مجھے اس تقریظ کی روح اور مقاصد سے آج بھی اتفاق ہے، لیکن لب و لہجے کے متعلق مجھے یاد ہے کہ مولانا اشرف سندھو نے کسی مجلس میں فرمایا تھا کہ میں نے اس میں کچھ ترمیم کی ہے۔ اگر ان کے پاس میری قلمی تقریظ کا اصل مسودہ نکل آئے تو معاملہ درست ہوسکتا ہے۔ اگر یہ لب و لہجہ میرے قلم کا ہو تو مجھے ان شاء اللہ اظہارِ افسوس میں تامل نہ ہوگا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق جس انداز میں لکھا گیا ہے، ان کے مقامِ رفیع کے بالکل منافی ہے۔ لیکن جہاں تک مولانا اشرف علی رحمہ اللہ نے اپنے خواب اور اس کی تعبیر کے سلسلے میں شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی کے متعلق لکھا ہے، وہ یقیناً شیخ الکل پر ظلم ہے۔[1]

جہاں تک اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے حضرت مولانا حکیم الامت کے لیے یہ انداز قطعاً نامناسب تھا۔ حضرت حکیم الامت علم اور عمر دونوں لحاظ سے شیخ الکل کے بچوں کے برابر تھے۔ اخلاقاً بھی ان کے لیے حضرت میاں صاحب کے متعلق ایسے خیالات کے اظہار سے پرہیز مناسب تھا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا عبدالحی لکھنوی، میاں صاحب کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تفقہ فی الدین کے معترف تھے۔ مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا مقام ان اکابر دیوبند سے زیادہ نہیں۔ خواب کوئی خدا کی وحی نہیں تھی نہ ہے۔ مولانا اس کی الٹی سیدھی تعبیر کے لیے مجبور تھے اور یہ تعبیر بھی اپنے ہی خیالات کا عکس ہے۔ مولانا اسے از قبیل احلام تصور فرماتے۔ مناسب تھا وہ تعبیر کی کوشش ہی نہ کرتے۔

غرض اس تقریظ میں بحکمِ حدیث «أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ»[2] حضرت میاں صاحب کے مقام کا احترام ملحوظ تھا۔ آیندہ بھی حضرت میاں صاحب کے خلاف کوئی قلم اور زبان اگر کھلے گی تو ہمیں معذور سمجھا جائے، ہم حضرت میاں صاحب کا احترام ان کے معاصرین اور منازعین سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اکابر دیوبند ہوں یا اعاظم بریلی، ہماری عقیدت شیخ الکل سے ہے اور ان شاء اللہ رہے گی۔ مَا دَامَ الْحَقُّ مَعَهُ.

---

[1] یہ خواب اور اس کے متعلق مولانا تھانوی کی تعبیر کے متعلق تفصیل کے لیے اسی مجموعے کی جلد چہارم ملاحظہ کریں۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٤٢) امام ابو داود رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ميمون لم يدرك عائشة"، یعنی اس کی سند منقطع ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا احترام، ان کی علمی خدمات،ان کا تصوف میں اپنا مقام ہے، لیکن میاں صاحب ایسے اکابر اہلِ حق کا حمایتِ سنت، اشاعتِ حدیث اور ان سارے معاملات میں متانت اور اعتدال ایک ایسا جوہر ہے جس میں میاں صاحب کے معاصر اور میاں صاحب کے ناقدین میں کوئی بھی ان کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ اس لیے اب بھی قطعی رائے ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر غلط ہے۔ اس چھاچھ میں روغن بھی تھا اور ٹھنڈک بھی اور شفاء لما فی الصدور بھی، مولانا نے اسے ناپسند فرمایا، یہ قسمت کی بات ہے ؎

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

مدیر ''الاعتصام'' اس میں کوئی مدافعت نہ فرمائیں۔ میاں صاحب اور ان کے علم کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔ آپ ''نتائج التقلید'' کے مولف کو مشورہ دیجیے کہ الفاظ میں کچھ تبدیلی کر دیں، مفہوم درست۔ احبابِ دیوبند کو حضرت مولانا اشرف علی کی تعبیر پر نظر ثانی کرنی چاہیے، یہ تعبیر قطعاً غلط ہے۔

حضراتِ دیوبند سے تعلق:

جہاں تک عقیدۂ توحید میں اتفاق کا تعلق ہے، حضراتِ دیوبند اصاغر ہوں یا اکابر، جب وہ اس عقیدے کے پابند ہوں، ہماری آنکھیں ان کے لیے فرشِ راہ ہیں۔ وہ ہمیں اور ہمارے اکابر کو اچھا کہیں یا برا، ہمیں ان سے محبت ہے اور اس کے لیے کوئی معاوضہ مطلوب نہیں، یہ تعلق ''اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰہِ'' کے ماتحت رہے گا اور یہ کسی پر احسان نہیں، دیانت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح سیاسی نظریات کے ماتحت جن بزرگوں نے سید شہید کی تحریک کے ساتھ اتفاق اور تعاون فرمایا، اس کے بعد ملک سے انگریز کو نکالنے اور استخلاصِ وطن کے لیے جن بزرگوں نے کوششیں کیں، وہ انتہائی احترام کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیاں قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

۱۹۳۰ء کے بعد حضرت حکیم الامت کے خلاف ابنائے دیوبند میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی، اس کی تفصیلات بحمداللہ اب تک ذہن میں ہیں۔ لب و لہجے سے اختلاف کے بعد ہماری مخلصانہ رائے ہے کہ حضرت حکیم الامت کے مخالف اسوقت حق بجانب تھے۔ شَکَرَ اللّٰہُ مَسَاعِیَهُم.

مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کا موقف اسلامی مفاد کے لحاظ سے بھی چنداں صحیح نہ تھا۔ میاں صاحب کے معاملے میں بھی ہماری رائے بالکل اسی قسم کی ہے جو اس وقت ابنائے دیوبند کی رائے

مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ کے متعلق تھی۔ اس کے لیے نہ کسی معذرت کی ضرورت ہے نہ کسی کی ناراضی سے گھبرانے کی ضرورت۔ حضرت شیخ الکل سے ہماری عقیدت کو کوئی آدمی نہیں توڑ سکتا، نہ ہم سے یہ مداہنت گوارا ہوگی۔ اس لیے مدیر "الاعتصام" کی ساری عذر داریاں بصد شکریہ واپس ہیں۔ أَمَّا حُبُّ لَيْلٰى فَلَا أَتُوْبُ.

دیوبندیت کا تجزیہ:

اعتقادی اور سیاسی تعلق کے بعد پھر شخصی تعلق رہ جاتا ہے۔ گوجرہ ضلع لائل پور میں مولوی اسماعیل شیعہ ہیں، وہ بھی دیوبندی کہلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں نوشہرہ میں مولوی سیف الرحمان غالی قسم کے رافضی ہیں، وہ بھی دیوبندی مشہور ہیں۔ گوجرانوالہ میں مولوی بشیر حسین صاحب اپنے نام کے ساتھ فاضلِ دیوبند لکھتے ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے بریلویوں سے چند قدم آگے ہیں۔ ٹیکسلا میں مولوی بشیر ہیں وہ بھی دیوبندی، یہاں قاضی نور محمد اور قاضی شمس الدین صاحب حیات النبی کے مسئلے میں برزخی حیات کے قائل ہیں۔ یہاں صرف دیوبندی نسبت سے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں شخصی حالات کے لحاظ ہی سے معاملہ ہوسکتا ہے۔

شہر گوجرانوالہ میں مولانا محمد چراغ صاحب نہایت شریف، خاموش اور بے ضرر آدمی ہیں۔ اپنے مسلک پر پختگی کے باوجود نہایت بے تعصب اور روادار بزرگ ہیں، تلمذ میں گو وہ بھی دیوبندی ہیں۔ یہاں اس وقت قدرتی طور پر تعلقات میں تفاوت ہو گا۔ اپنی صوابدید اور معلومات کی بنا پر تعلقات کے جوڑ توڑ کا فیصلہ ہو گا۔

یہاں ایک اور بزرگ ہیں وہ بھی دیوبندی ہیں، لیکن ان کے ہاں اہلِ حدیث کی اقتداء کا عقدہ لاینحل ہے۔ ان کے ہاں ڈھیلا امامت کی اہم شرائط سے ہے اور طہارت کے تمام اسباب و ذرائع سمٹ سمٹا کر ڈھیلے میں سموئے ہوئے ہیں۔ جب تک ازار بند منہ میں لے کر ڈھیلا نہ کیا جائے، امامت کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ طہارت بالکل ناتمام رہتی ہے۔ اس قسم کے عقلاء سے صرف دیوبندیت کی بنا پر معاملہ کرنا مشکل ہے۔

مدیر "الاعتصام" کا وعظ اتحاد و اتفاق کے متعلق بہت خوب ہے، مگر دیوبندی کی جب تک کوئی جامع تعریف نہ ہو، ان کے ارشاد کی تعمیل ممکن نہیں۔

حضرت قبلہ مولانا احمد علی صاحب:

طلبِ علم کے زمانے میں مولانا احمد علی صاحب لاہوری کا وعظ سنا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے، میری ایک آنکھ اہلِ حدیث ہے اور ایک آنکھ حنفی۔ لیکن اب مدت سے مولانا نے ایک آنکھ بالکل بند کر لی ہے۔ جب سے سندھ میں آنا جانا ہوا ہے، مولانا نے اہلِ حدیث سے نظر پھیر لی ہے اور پیری مریدی کے فروغ کی طرف مولانا زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ سنا ہے جمعے کے دن منبر پر یا منبر کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور مریدین حلقہ بنا کر مولانا کے ہاتھ چاٹتے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ ہم نے یہ بدعت اکابر دیوبند میں سنی ہے نہ علمائے سلف میں۔ کبھی کبھار دست بوسی تو سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن اس وضع کا تو ایک سنی المسلک کے لیے سمجھنا کافی مشکل ہے۔ اب دیوبندیت کی بنا پر تو ان مخترعات کو جواز و اباحت کی سند نہیں دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ ایک خاص رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "أَنْتُمْ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ يُقْتَدىٰ بِكُمْ" "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، لوگ تمھیں اقتداء کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"[1] کوئی ایسی خلافِ سنت بات نہیں کرنا چاہیے جس سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہو۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے سرزنش فرمائی کہ وہ پیش پیش چل رہے تھے اور لوگ ان کے پیچھے۔[2]

جب مولانا احمد علی صاحب نے اپنی روش اور عادات بدل لی ہیں تو ان پر وہ اعتماد نہیں رہنا چاہیے جو اس وقت تھا جب مولانا توحید کے داعی اور سنت کے متبع تھے۔ مجھے اپنی تقریظ کے ان الفاظ پر اصرار ہے۔ جب تک مولانا اپنی روش نہ بدلیں، اہلِ توحید و سنت کو مولانا پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

یہی حال مولانا خیر محمد صاحب کا ہے۔ وہ رحمانیہ سے الگ ہونے کے بعد اہلِ حدیث کو بے حد نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری کو یہ نفرت مولانا سے ورثے میں ملی ہے۔ مولانا کے تلامذہ میں یہ عصبیت بدرجۂ غایت ہے۔ پاکستان آنے کے بعد اس کے اظہار میں کسی قدر محتاط ہو گئے ہیں، لیکن ان کے متعلقین ان کی طرف سے ترجمانی کا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ ایسے حضرات کے معاملے میں ان کی ذاتی عادات کے لحاظ سے جہاں تک ان کے اچھے عقاید کا تعلق

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ٣٢٦)

[2] سنن الدارمي (١/ ٤٤٨)

ہے وہ قابلِ احترام ہیں، اور جہاں تعصب اور بغض بالسنّت کی راہ پر چلیں، اہلِ سنت و متبعینِ کتاب و سنت کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ تقریظ میں میری گزارشات کا یہ حصہ قابلِ توجہ ہے۔ اس پر طرفین کو توجہ دینی چاہیے۔ جس نے اس تعصب کی ابتدا کی ہے، وہی ذمے دار ہے۔ اَلْبَادِيْ أَظْلَمُ.[1]

مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی:

یہ حضرت علم اور وسعتِ معلومات کے لحاظ سے قابلِ احترام ہیں، لیکن تعصب میں آج کے متعصبین کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ان حضرت نے "شرح عقائد نسفی" پر حاشیہ لکھا ہے جس کا نام "نظم الفرائد" ہے۔ یہ کتاب مطبع انوارِ محمدی میں چھپی اور ۱۳۰۳ھ میں لکھی گئی۔ صفحہ ۱۰۲ میں امام شوکانی کی تصانیف میں غالباً ابن تیمیہ کی کسی عبارت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں تجسیم کی نفی پائی جاتی ہے اور تشبیہ سے بھاگ کر تعطیلِ صفات کی راہ اختیار کرنا غلط ہے۔ اس پر محترم محشی کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان استعمال فرماتے ہیں:

"وَخُلَفَاءُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَرْبَعَةٌ: اِبْنُ تَيْمِيَّةَ وَابْنُ الْقَيِّمِ وَالشَّوْكَانِيُّ، فَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، وَإِذَا انْضَمَّ إِلَيْهِمُ ابْنُ حَزْمٍ وَدَاوُدُ الظَّاهِرِيَّانِ صَارُوْا سِتَّةً، وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ، وَخَاتَمُ الْمُكَلَّبِيْنَ مَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ وَإِنْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ...الخ

محشی محترم کے غصے کا یہ حال ہے کہ ان بزرگوں سے کسی کو کتا کہنے کے لیے باقی کو اصحابِ کہف تصور کر لیا ہے۔ جس مسئلے پر یہ ناراضگی اور جوش آرہا ہے، اس میں ائمۂ اربعہ اور صحابہ اور تابعین اسی طرف گئے ہیں جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے رفقاء نے فرمایا ہے۔ مدیر "الاعتصام" ہی فرمائیں کہ بے چارے اہلِ حدیث ایسے بزرگوں کا کہاں تک احترام کریں اور آپ کے مواعظِ حسنہ کی تعمیل کیونکر ہو؟ یہ ایک درسی کتاب کا حاشیہ ہے۔ جو طلبہ اسے پڑھیں گے، ان کے ذہنی تاثرات ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن حزم اور داود ظاہری کے متعلق کیا ہوں گے اور ان کو گالیاں دینے کی کس قدر جرأت ہوگی اور حضرت محشی کو کس قدر اجر ملے گا؟!

یہی حضرت مولانا محمد حسن صاحب عفا اللہ عنہ ایک جگہ اہلِ حدیث کا ذکرِ خیر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

[1] "شروع کرنے والا بڑا ظالم ہے۔"

"وَخَرَجَتْ عَلَيْهِ مِنَ الزَّاوِيَةِ الْمُنْفَرِجَةِ طَائِفَةٌ كَسْبِيَّةٌ قَنُوجِيَّةٌ مُجَسِّمَةٌ فِرْعَوْنِيَّةٌ مُشَبِّهَةٌ آكِلَةٌ مِنْ أَكْسَابِ أَبْضَاعِ نِسَائِهَا مُحْدِثَةٌ ضُرَاطَ الْبِدَعِ وَفَسَائِهَا مَحْتَوِقَةُ الْوَقِيْعَةِ فِيْ أَئِمَّةِ الْأُمَّةِ وَرُؤَسَائِهَا... الخ (نظم الفرائد، ص:۱۴۱)

مغلطات کا بھی فن ہے اور ہر آدمی شاید اس فصاحت سے نہ دے سکے۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم سے مولانا کو خاص رنج ہے۔ معلوم ہوتا ہے مرحوم سے کوئی آرزو ہوگی جو پوری نہ ہوسکی۔ مولانا گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔ ایک درسی کتاب کا محشی اس طرح دماغی توازن کھو دے تو پھر انسانیت کا خدا حافظ۔ ایسے بزرگوں کے متعلق بطورِ معذرت یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابیں عام نہیں ہوئی تھیں اور جماعتِ اہلِ حدیث کا بھی اس وقت آغاز تھا، ممکن ہے مولانا کو مسلکِ اہلِ حدیث کے متعلق صحیح معلومات نہ ہوں، مگر یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کی تلخی کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ سانحہ بالاکوٹ تک تو تلخی نظر نہیں آتی۔ ذہن دو موجود تھے۔ "تنویر العینین" اور "تذکیر الاخوان" کا زمانہ "تقویۃ الایمان" سے ملتا جلتا ہے، لیکن باہم تلخی فرعی مسائل کے متعلق اہلِ حدیث کے مستند حلقوں کی طرف سے سب سے پہلی چیز "معیار الحق" ہے۔ اس میں گفتگو کا انداز بالکل علمی ہے۔ طعن و تشنیع کا نام تک نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ تلخی کی ابتدا اہلِ حدیث کی طرف سے نہیں۔ مدیر "الاعتصام" کو دیکھنا چاہیے کہ بظاہر جس فریق نے تلخی کا آغاز کیا اور پھر اب تک تلخی کر رہا ہے، بہتر تھا کہ آپ ان کو وعظ فرماتے۔ آپ نے سارا زور بے چارے مولوی اشرف پر لگا دیا۔ ایک سادہ دل آدمی تو یہی سمجھے گا کہ ایک دیہاتی بے چارا لاہوریوں کے نرغے میں پھنس گیا ہے۔ پوری طرح علم و ادب کے شکنجے میں کس کر پریشان کیا گیا اور جب بغہ سے لے کر لاہور تک ہوش مندوں نے بلاوجہ تیور بدلے تو مدیر "الاعتصام" ہنس کر ان حضرات سے بغل گیر ہوئے اور مصافحہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ سچ ہے:

صُلْتَ عَلَى الْأَسَدِ وَبُلْتَ عَنِ النَّقَدِ

اقتداء کا جواز یا عدمِ جواز:

"پیغامِ اسلام" کا اس وقت سارا زور اسی پر صرف ہو رہا ہے کہ اہلِ حدیث کی اقتدا درست نہیں۔ یہ کوئی ایسی بحث نہیں جس کے لیے مدیر "الاعتصام" یا اہلِ حدیث حضرات بے قرار ہوں۔ اگر

مولوی محمد علی جالندھری یا مولانا غلام غوث اہلِ حدیث کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھنا چاہتے، نہ پڑھیں، اہلِ حدیث مساجد کی رونق پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بحمد اللہ اہلِ حدیث مساجد میں اپنے ہی آدمی نہیں سما سکتے۔ ان دوستوں کو تکلیف دینے کی ضرورت ہی نہیں۔

طہارت اور تقلید:

طہارت نماز کے لیے ضروری ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کی نوعیت جو بھی ہو، ہر مسلمان کوشش کرتا ہے کہ وہ نماز طہارت سے ادا کرے۔ وہ اپنی بساط کے مطابق نماز طہارت ہی سے ادا کرتا ہے۔ اب جو حضرات اختلاف کو بڑھانا چاہتے ہیں وہ طہارت کے لیے ڈھیلا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ ڈھیلا طہارت کا ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ ہمارے مفتی حضرات نے اسے مقصد قرار دے لیا ہے۔ وہ جب جواز یا عدمِ جوازِ اقتداء کی بحث شروع کرتے ہیں تو طہارت کی بجائے ڈھیلے کو مقصد قرار دے لیتے ہیں، حالانکہ یہ علم و دیانت کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شخص پانی، کاغذ، کپڑے سے صفائی پر مطمئن ہو جائے تو ڈھیلے پر اصرار کرنا مضحکہ ہوگا۔ یہ تمام فقہاء کے نزدیک مسلّم ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

بعض ڈھیلے پر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ ڈھیلا کرتے وقت رانوں کو بھیڑنا اور اعضائے بول کو شکنجے میں کسنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈھیلا کرتے وقت عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ وہم پرستی ہے یا دیانت سے گریز۔ اصل مسئلے میں کسی کو نہ گریز ہے نہ اختلاف، مگر جب بحث برائے بحث کا فیصلہ ہی کر لیا جائے تو ایسے حضرات کا خدا حافظ!!

اسی قسم کا ایک فتویٰ بعض اخبارات میں مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نظر سے گزرا۔ مفتی صاحب معقول آدمی ہیں۔ اچھے بھلے سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں افتاء کے وقت ان پر کیا کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں آنے کے بعد بعض علماء نے کوٹھیاں وغیرہ بنا لی ہیں۔ فلش سسٹم بیت الخلاء بن گئے ہیں۔ قریباً ڈھیلے کا مسئلہ عملاً ختم ہو چکا ہے۔ مگر فتوؤں کی رونق کے لیے یہ حال ہے کہ ابھی ڈھیلے چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح بات لکھنے اور سمجھنے کی توفیق دے۔

اقتداء اور تقلید:

اس قسم کے فتوؤں میں تقلید اور ترکِ تقلید کا مسئلہ بھی آ گیا ہے، حالانکہ مجوزینِ تقلید کے

استدلال کی انتہا یہ ہے کہ وہ تقلید کو مجبوراً پسند فرماتے ہیں۔ ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ٤٣] کو اگر کوئی سادہ لوح تقلید کی دلیل سمجھے تو ظاہر ہے کہ لاعلمی کی مجبوری ہی کی بنا پر ہوگی۔ قیاس اور رائے کے متعلق ائمۂ اصول نے صراحت فرمائی ہے کہ یہ مردار ہے، اس کی ضرورت اس وقت ہوگی جب کتاب وسنت اور اجماع سے کوئی چیز نہ ملے:

”وَنَحْنُ نَقُوْلُ بِمَا رُوِيَ عَنْ أَئِمَّتِنَا: أَنَّ الرَّأْيَ مَيْتَةٌ، إِذَا اضْطَرَرْتَ إِلَيْهَا أَكَلْتَهَا“ (أحسن الحواشي، ص: ٨٧)

رائے کا مقام دین میں مردار کی طرح ہے۔ اس کا کھانا اضطرار اور مجبوری سے ہوگا۔ اور یہ عام اہلِ علم کی رائے کا حال ہے۔ تقلید تو ایک شخص کی رائے ہوگی، اسے لاعلمی کی مجبوری ہی سے قبول کیا جائے گا۔ ایسی اضطراری اشیاء آپ لوگ اقتداء کے جواز اور عدمِ جواز میں بطورِ بہانہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، اس کا تو کچھ لحاظ فرماتے۔ تقلید کو کوئی سمجھدار آدمی یہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ بقول مصنف احسن الحواشی آپ صحتِ اقتدا کے لیے ایسی چیز کو ضروری سمجھتے ہیں جس کی حیثیت ائمۂ اصول کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مردار کی ہے!!

سیاسی ناکامی:

اگر اس قسم کی بہکی ہوئی باتیں پٹے ہوئے اور ناکام سیاست دان کرتے تو شاید ہم اس کی پروا بھی نہ کرتے۔ جب پڑھے لکھے حلقوں سے ایسی باتیں آتی ہیں تو دکھ بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ ”پیغامِ اسلام“ مولانا احمد علی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ سب بے اعتدالیاں حضرت ہی کی نگرانی میں ہو رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولانا کی دو آنکھوں سے صرف ایک ہی آنکھ کام کر رہی ہے۔ آنکھ ہوتے ہوئے اگر کام نہ کرے تو اس کی جواب دہی مولانا ہی پر ہوگی۔ مولانا کا فرض ہے کہ دونوں آنکھیں استعمال فرمائیں۔

مولانا کو خوب معلوم ہے کہ ناکام سیاست دان کسی کے دوست نہیں۔ آپ اپنی نگرانی کو یا تو صحیح طور پر استعمال فرمائیں یا پھر نگرانی واپس لے لیں، آپ اللہ کے نزدیک بری ہو جائیں گے، مرید خوش ہوں یا نہ ہوں، ورنہ اِن حضرات کی معیت جہاں بھی پہنچی اسی نے ڈبویا۔

حاصل گزارشات:

حضراتِ دیوبند سے بعض امور میں جہاں تک اعتقادی اتفاق کا تعلق ہے، اس کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ سیاسی نظریات اور اتحادِ عمل میں احترام ہے اور ہونا چاہیے۔ فروعی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں اور یہ ناکام سیاستدان اسے کتنا ہی ابھارنے کی کوشش کریں، یہ احترام قائم رہے گا، اس کے لیے نہ ان کے جھکنے کی ضرورت ہے نہ آپ کی منتوں کی۔ یہ احترام ایسے حقائق پر مبنی ہے جسے تعبیری ہوشیاریاں ناپید نہیں کرسکتیں۔ معلوم ہے کہ نفس الامری حقائق اعتبارات کے رہین نہیں ہوتے، لیکن جہاں تک مفتی حضرات کی تعبیری شعبدہ بازیاں اور اس سے پیدا ہونے والے تلخ نتائج کا تعلق ہے اس سے جماعت متاثر ہوگی۔ جب تک دونوں طرف سے اربابِ بست وکشاد بے لگام حضرات کے منہ میں لگام نہیں دیں گے، یک طرفہ منتیں مفید نہیں ہوں گی۔

جہاں تک ناقص معلومات کا تعلق ہے طعن وتشنیع ان حضرات ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ بعض جگہ مقارنت کی وجہ سے ذاتی رنجشوں نے مذہب کا رنگ لے لیا ہے اور بلاوجہ الجہاد کی صورت اختیار کرلی۔ ایک قابلِ احترام بزرگ کی بات سنیے:

”وَلَعَمْرِيْ إِفْسَادُ هٰؤُلَاءِ الْمَلَاحِدَةِ وَإِفْسَادُ إِخْوَانِهِمُ الْأَصَاغِرُ الْمَشْهُوْرِيْنَ بِغَيْرِ الْمُقَلِّدِيْنَ الَّذِيْنَ سَمَّوا أَنْفُسَهُمْ بِأَهْلِ الْحَدِيْثِ، وَشَتَّانَ مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ، قَدْ شَاعَ فِيْ جَمِيْعِ بِلَادِ الْهِنْدِ وَبَعْضِ بِلَادِ غَيْرِ الْهِنْدِ فَخَرِبَتْ بِهِ الْبِلَادُ، وَوَقَعَ النِّزَاعُ وَالْعِنَادُ“

(الآثار المرفوعة في الأحاديث الموضوعة، ص: ٢٤٨)

”نیچریوں کے چھوٹے بھائی غیر مقلد، جو اہلِ حدیث کے نام سے مشہور ہیں، کہاں یہ لوگ کہاں اہلِ حدیث۔ یہ مسلک ہند اور بیرون ہند میں بہت پھیل گیا ہے، اس سے ملک میں فساد برپا ہوگیا ہے۔“

جہاں تک واقعات کی شہادت ہے، ان حضرت کو نواب صدیق حسن خان مرحوم سے کچھ ذاتی رنجش تھی، لیکن غور فرمائیں پوری جماعت غصے کی لپیٹ میں آگئی۔ اللهم إني أعوذ بك من الفتن ما ظهر منها و ما بطن.

جب تک یہ حضرات زبان پر کنٹرول نہ کریں، صلح کے وعظ کیا کرسکیں گے؟ گذشتہ ایام میں

ایک صاحب اپنا دلی بغض نکالنا چاہتے تھے، منہ چھوٹا تھا بڑی بات کہنا چاہتے تھے، کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے دل کا غبار نکالنے کے لیے کسی اشتہار کی آڑ لے کر جو اگلنا تھا اگل دیا اور اکابرِ جماعت کے متعلق جو لب و لہجہ اختیار کیا، انتہائی غیر محتاط اور غیر معتدل ہے۔ پھر اس پر اکابرِ دیوبند کی تقاریظ ہیں۔ بعض نے اس مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ ان رسمی اور بعض دل آزار مباحث کو حرفِ آخر کہہ دیا۔ جب تک اس قسم کی بے اعتدالیاں نہ رکیں، مدیر ''الاعتصام'' کے لجاجت آمیز وعظ خوشگوار فضا پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہر ایک صاحب سے شخصی طور پر معاملہ کیا جائے۔ اسے دیوبندی اور غیر دیوبندی کی بحث بنا کر اختلاف کی خلیج کو وسیع نہ کیا جائے۔ ایسے بزرگ اس وقت بھی موجود ہیں جو اپنے مسلک پر انتہائی پختگی کے باوجود اختلافی امور میں محتاط ہیں، مثلاً سید عنایت اللہ شاہ صاحب گجرات، مولانا حسین علی صاحب واں بھچراں، مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ مدظلہ العالی۔ یہ حضرات اختلافِ خیالات کے باوجود قابلِ صد احترام ہیں۔ ان کی روش خود ادب و احترام کی مقتضی ہے۔

مولانا احمد علی صاحب جماعت اہلِ حدیث میں اسی طرح احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عموماً اہلِ حدیث جلسوں میں انھیں بلایا جاتا، ان کی تقاریر شوق سے سنی جاتی تھیں۔ اب پیری مریدی کی ذمے داریوں نے انھیں اپنی روش بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اب ان کی تقاریر کا انداز بدل گیا ہے۔ ان کے مواعظ اور تقاریر کا انداز قریباً حافظ جماعت علی شاہ صاحب سے ملتا جلتا ہے۔ بزرگوں کے علوم کا تذکرہ وہ اس انداز سے فرماتے ہیں جیسے کوئی بریلوی بزرگ علمِ غیب کا مسئلہ بیان کر رہا ہو۔ یہ دین کا معاملہ ہے، اس میں کسی مداہنت اور دوستی کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا کی روش اس دن سے اور بھی خراب ہو گئی ہے جب سے ان کے مراسم ابن الوقت حضرات سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ ''خدام الدین'' کا علمی معیار بھی روز بروز گر رہا ہے۔ وہ کتاب و سنت یا فقہ حنفیہ کا ترجمان ہونے کے بجائے مولانا کی مدح و ستایش کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

مدیر ''الاعتصام'' سے ان تلخ اور طویل گزارشات کی اس لیے ضرورت ہوئی کہ معاملہ جماعت کی پالیسی کا تھا۔ ان مقالات کا اثر مولانا محمد اشرف سندھو کی جماعت کے عوام اور خواص پر اچھا نہیں پڑا، اس لیے امید ہے وہ اس تنقیدی تلخی کو معاف فرما دیں گے۔

قابلِ ضبط کتابیں
بریلوی حضرات سے مودبانہ گزارش

دوعملی چھوڑ دیجیے:

کسی دیوبندی جریدے کے مدیر نے ''قہر القادر'' نامی کتاب میں بدزبانی کی وجہ سے حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اسے ضبط کر لے۔ گوجرانوالہ کے ایک بریلوی جریدے نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے مزید چند کتابوں کی ضبطی کے لیے حکومت سے استدعا کی ہے۔ یہ کتابیں بعض علمائے دیوبند کی ہیں، بعض شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی، بعض سید احمد شہید رحمہ اللہ کی اور بعض شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی۔

ہم نے ''قہر القادر'' دیکھی ہے نہ باقی کتب بالاستیعاب پڑھی ہیں، البتہ حوالوں میں جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ قرآن اور سنت کے بالکل موافق اور ائمۂ سنت کے مسلّمات میں سے ہیں۔ بریلوی مدیر نے حوالوں کا اختصار کرتے ہوئے انھیں غلط بیانی اور افتراء کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

بریلوی حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ وہ دوعملی چھوڑ دیں۔ اگر ان اعتقادات اور مسائل سے ان کو دکھ ہوتا ہے اور ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو ہمیں ان سے پوری ہمدردی ہے، لیکن صحیح راہ یہ ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی ضبطی کے لیے حکومت سے مطالبہ فرمائیں!!

کتابیں بالفرض ضبط ہوگئیں، لیکن قرآنِ عزیز ضبط نہ ہوا تو آپ کے جذبات بدستور مجروح ہوتے رہیں گے۔ یہ دوعملی مناسب نہیں۔ عوام سے ڈر کر آپ قرآنِ عزیز کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے اور جو کتابیں قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہیں، ان کی ضبطی کے لیے آپ ہنگامہ بپا کر رہے ہیں!!

اس مطالبے میں کوئی استواری نہیں۔ دل کڑا کیجیے اور اصل مطالبے پر ڈٹ کر حکومت پر زور دیجیے۔ قدمائے مکہ آپ سے زیادہ دانش منداور معاملہ فہم تھے، ان کا مطالبہ بے حد صاف اور جرأت مندانہ تھا۔ یعنی:

﴿ اِئۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ ﴾ [یونس: ۱۵] (کوئی اور قرآن لاؤ یا اسے بدل دو)

اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیے، اس لیے اصل مطالبہ سامنے آنے دیجیے۔

بریلوی ذہن:

ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا اور مسرت ہوئی کہ بریلوی حضرات نے ایک معقول مطالبے کو (گو بادلِ ناخواستہ ہی سہی) قبول فرما لیا، ورنہ جہاں تک ہمارا تجربہ ہے ہمارے بریلوی دوستوں کو معقول بات سننے کی بھی عادت نہیں۔ کہنا تو بڑی بات ہے۔ ان حضرات کے ذہن علم اور عقل دونوں سے ناآشنا رہے ہیں۔

بریلوی فرقے کی عمر قادیانی حضرات سے زیادہ نہیں۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔ اس فرقے کا آغاز مولانا صاحب نے فرمایا۔ مولانا کی تصانیف سے لے کر مولانا نعیم الدین، مولانا دلدار علی شاہ تک اکابرِ جماعت کی تصانیف پر غور فرمایئے، علم و دانش کے سوا وہاں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ ان حضرات کی تصنیفات سے طعن و تشنیع کو الگ کر دیا جائے تو ایک تہائی بھی باقی نہیں رہ جائیں گی۔

اس لیے ہم بریلوی جریدے کے مدیرِ محترم کو مبارک باد عرض کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اکابر کی عادت کے خلاف ''قہر القادر'' کی ضبطی کی تجویز قبول فرما لی۔

اعتقادات کا جائزہ:

اب ہم ان اعتقادات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے بریلوی حضرات کے دل مجروح ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت سے ان نصوص کا مختصر تذکرہ بھی کریں گے جن سے ان عقائد کی تائید ہوتی ہے، تاکہ ہمارے محترم مخاطب محسوس فرمائیں کہ ان کتابوں کی ضبطی سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ ان کے مجروح دلوں کو اسی صورت اطمینان نصیب ہوسکتا ہے کہ قرآنِ عزیز کے تیس پارے اور سننِ صحیحہ کے دفاتر ضبط ہوں یا صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں!!

پہلا عقیدہ:

1 ''تقویۃ الایمان'' (ص: ۲۲) کی عبارت سے جو مطلب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا

گیا ہے اور اس میں جس طرح قطع و برید کی گئی ہے، اسلامی شرافت اور دیانت کے خلاف ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا فرمان یہ ہے:

''چابیاں جس کے پاس ہوں، خزانہ اسی کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جب چاہے خزانہ صرف کرسکتا ہے۔ جب غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں تو غیب کے خزانے بھی اسی کے قبضہ میں ہوں گے۔''

شاہ صاحب رحمہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ علومِ غیبیہ کا استحضار اور ان پر کلی تصرف؛ یہ اللہ کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ علوم نہ کسی کو عطا فرمائے ہیں نہ کسی کو بالذات حاصل ہیں۔ جزوی طور پر اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، جس کو چاہے عطا فرما دیتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ یہ عقیدہ آپ کو ناگوار اور ناپسند ہے، اس لیے آپ کے جذبات مجروح ہوسکتے ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآنِ عزیز شاہ صاحب رحمہ اللہ کی پوری پوری تائید فرماتا ہے؟!

① ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ﴾[1] [الأنعام: ٥٩]

''مفاتح'' اسم آلہ اور ظرف دونوں کی جمع ہے، اس کا معنی چابی اور خزانہ دونوں ہوسکتے ہیں۔ یہ جمع کثرت کے اوزان سے ہے جس کا مدلول وہ کلی علوم ہیں جن کا احاطہ انسان کے لیے محال ہے۔ ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ غیب کے خزانے اس کے پاس ہیں اور ان کا علم صرف اسی کو ہے۔ استثناء نفی کے بعد آتا ہے جس کا مفاد حصر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ آیت کا عموم ذاتی اور عطائی دونوں کو شامل ہے۔ اب تحریفِ معنوی کا ارتکاب وہ حضرات کریں گے جو عطائی کو مستثنیٰ کرنے کی کوشش کریں گے!

② نیز فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [النمل: ٦٥]

''آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انھیں حساب کے لیے کب اٹھایا جائے گا؟''

---

[1] ترجمہ: ''اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

اس آیت میں ﴿ اِلَّا ﴾ نفی کے بعد آیا ہے، اس کا منطوق بھی حصر ہے، یعنی اللہ کے لیے غیب کو ثابت فرمایا اور غیر سے نفی فرمائی۔

③ ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۸۸]

''ان سے کہہ دو! میں اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں غیب جانتا تو میں کثرت سے خیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ میں اہلِ ایمان کے لیے صرف نذیر اور بشیر ہوں۔''

بریلوی مدرسۂ فکر کے جذبات اس سے یقیناً مجروح ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی ذمے داری شاہ شہید رحمہ اللہ پر نہیں، بلکہ رب العزت اور قرآن عزیز پر ہے، اس لیے بارگاہِ ایزدی میں عرض فرمائیے کہ ﴿ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ﴾ یہ قرآن بدل دو، ہمیں اس قرآن کی ضرورت نہیں یا کوئی اور قرآن لے آؤ!! جب تک یہ مطالبہ منظور نہ کرا لیا جائے، کسی کتاب کی ضبطی مفید نہیں ہو گی۔ کتاب و سنت پر نظر رکھنے والے اور توحید کے عاشق کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے، جس سے آپ کے جذبات مجروح ہوتے رہیں گے۔ آپ کی یہ ناتمام مساعی جذبۂ توحید کی سرمستیوں کو کم نہیں کر سکیں گی۔ ع

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اس لیے مناسب ہے، ساری بریلوی دنیا مل کر قرآنِ عزیز کا کوئی علاج کرے!!

② اس میں صفحہ (۵۵) کے حوالے سے آپ نے فرمایا ہے: ''اللہ کے مکر سے ڈرنا چاہیے۔''

آپ کو لفظِ مکر کی اضافت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف کھٹک رہی ہے، یہ تکلیف آج سے چند سال قبل پنڈت دیانند کو بھی ہوئی تھی۔ (ستیارتھ پرکاش، ۱۴ سملاس، ص: ۶۹۰)

لفظِ مکر کی لغوی تشریح بھینس کے سامنے بین بجانے کے برابر ہے۔ آپ حضرات ادبی ذوق سے محروم ہیں۔ آپ کے ہاں غالباً وہ پرزہ ہی ناپید ہے جس سے ادبی لطافت کا احساس ہوتا ہے،

لیکن قرآنِ عزیز کا کیا کیجیے گا، وہ فرماتا ہے:

① ﴿ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٥٤]

''ان لوگوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ کا مکر بہترین رہا۔''

② ﴿ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٩٩]

''خسارہ پانے والے ہی اللہ کے مکر سے بے خوف ہوتے ہیں۔''

③ ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [النمل: ٥٠]

''ان لوگوں نے مکر کیا، ہم نے مکر کیا، لیکن وہ بے شعور تھے۔''

④ ﴿ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ﴾ [الرعد: ٤٢] ''تمام تر مکر اللہ کے لیے ہے۔''

قرآنِ عزیز میں مکر کا جو بھی مفہوم لیں گے، وہی وہابیوں اور دیوبندیوں کی طرف سے سمجھ لیجیے! اصل مرض آپ کے لیے قرآن ہے۔ جیسے ہو سکے اسے ضبط کرائیے!!

③ صفحہ (٦) سے صفحہ (٩) تک آپ نے تقویۃ الایمان کے مختلف اقتباسات پر رنج کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ اپنی رائے میں مختار ہیں، لیکن سچ عرض کروں، اگر خدا تعالیٰ سے تھوڑا بہت تعلق بھی باقی ہو تو ان صفحات میں توحید کا ایک سمندر ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں، آپ کی وجہ سے میں نے ان صفحات کو بار بار پڑھا۔ سبحان اللہ! کتنا مدلل اور کس قدر پر لطف کلام ہے! میرے جیسے خشک مزاج آدمی پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ نے یہاں بھی اختصار کو خیانت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ پورا کلام نقل فرما دیتے تو آپ کو اپنی رائے پر ندامت ہوتی۔ آپ نے جو ذلیل الفاظ شاہ شہید رحمہ اللہ کے متعلق استعمال کیے ہیں، آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرتا اور آپ کے اَتباع بھی غلطی سے بچ جاتے۔ آپ کا نظریہ پڑھ کر ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ [البقرة: ٢٦] کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب خدا کا کلام بعض طبائع کے لیے گمراہی کا موجب ہو جاتا ہے تو شہید رحمہ اللہ بچارا کون ہے؟

شہید رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ شرک صرف یہی نہیں کہ دو برابر کے خداؤں پر یقین رکھا جائے، بلکہ کسی انسان کو حاضر ناظر، عالم الغیب، متصرف جاننا، حق تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کسی دوسرے میں تصور کرنا، یہ خیال کرنا کہ کسی کی وجاہت یا محبت سے اللہ تعالیٰ متاثر ہوتا ہے اور اسے سفارش قبول کرنا

ضروری ہو جاتا ہے؛ یہ بھی شرک ہے۔ ذاتِ حق کی صفاتِ خاصہ نہ کسی میں ذاتی طور پر پائی جاتی ہیں، نہ عطا و توہّب سے ان میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک ہوسکتا ہے۔ الفاظ کی کھینچ تان سے تھوڑا ہٹ کر سوچیے، اس سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

قدمائے عرب کے عقائد کا قرآنِ حکیم نے جہاں تذکرہ فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ بالاستقلال متعدد الٰہوں کے قائل نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم، تصرف، الوہیت اور صفات میں وہ اپنے اولیاء کو خدا کا عطائی شریک سمجھتے تھے اور یہ سارے پاپڑ وہ اس لیے بیلتے تھے کہ اس سے ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور ان بزرگوں کی شفاعت سے ان کے مقاصد پورے ہوں:

① ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ۳]

''ہم ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔''

② ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس: ۱۸] ''اللہ کے پاس یہ ہمارے سفارشی ہیں۔''

قرآن عزیز نے اس عذر کو قبول نہیں فرمایا، بلکہ اس عقیدے کو شرک ہی فرمایا اور انھیں ملامت کا مستحق سمجھا۔

آپ کی طرف سے اہلِ توحید پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ بتوں کی آیات کو انبیاء اور اولیاء اللہ پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ (رضائے مصطفیٰ، ص: ۲، کالم: ۱)

اولاً: تو گزارش ہے کہ کافر، مشرک یا اولیاء اللہ کسی کا نام نہیں۔ یہ صفات ہیں، جن کا فیصلہ عمل ہی سے ہوتا ہے۔

دوم: آیات میں بتوں کی تصریح نہیں۔ آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ کوئی آیت بتوں کو دلائیں اور کوئی ولیوں کو عنایت فرمائیں؟

سوم: الفاظ جب عام ہوں تو انھیں کسی دور کے ساتھ خاص کر دینا، اس کا ٹھیکیدار آپ کو کس نے بنایا ہے؟

قرآن کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟ وہ تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۳۱]

''ان لوگوں نے اپنے علماء اور فقیروں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو، انھیں یہ حکم تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔''

یہ مولوی، فقیر اور حضرت مسیح علیہ السلام بت تو نہیں تھے۔ یہ تو عالم، ولی اور نبی ہی تھے، اور یہ ربوبیت اطاعت اور انقیادِ احکام اور حلال وحرام کے لحاظ سے تھی۔ یہاں تقلیدی جمود کو شرک فرمایا، جو آج کل زیادہ تر بریلوی فرقے ہی میں پایا جاتا ہے۔

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [مریم: ۹۳]

''آسمان اور زمین کے سب بزرگ اللہ کے سامنے غلام بن کر حاضر ہوں گے۔''

کسی پڑھے لکھے آدمی سے دریافت فرمایئے: ''مَن'' اور ''ما'' میں کیا فرق ہے؟

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [یونس: ۱۸]

''اللہ کے سوا ان چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان دے سکتی ہیں، نہ فائدہ اور یہ انھیں اپنا سفارشی کہتے ہیں۔''

یہاں معبودوں کو ''مَا'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا معبود بت ہو یا ولی، مولوی ہو یا پیغمبر، جن ہو یا پری، بھوت ہو یا پریت، پیپل ہو یا کیکر؛ یہ عبادت شرک ہوگی، جو ایسا کرے مشرک۔

اب قرآن تو تقویۃ الایمان کے مصنف کی تائید فرماتا ہے، آپ کے دل مجروح ہوتے ہیں تو استغاثہ قرآن کے خلاف ہونا چاہیے، بچارے شہید رحمہ اللہ کو گالیاں دینے سے کیا فائدہ؟!

۴ بت بھی تو اولیاء اللہ اور بزرگوں ہی کے تھے۔ لات، منات، سواع، یغوث، یعوق، نسر اپنے وقت میں بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ ہی تو تھے۔[1]

(ترمذی، بخاری، ابن کثیر، خازن، ابن جریر، تفسیر عزیزی، مظہری وغیرہ)

یہ فلسفہ بیان فرما دیجیے! جب ولی کا بت بن جائے تو اس کی عبادت شرک بن جاتی ہے اور جب ولی کی قبر بن جائے تو شرک جائز ہوجاتا ہے!!

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٦) تفسير ابن كثير (٤/ ٥٤٨)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ایسے اولو العزم انبیاء؛ جب ان کے بت بنا دیے جائیں تو ان کی عبادت شرک ہو جائے اور قرآن مجید کی آیات کا انطباق ان پر درست ہو جائے اور یہ روح بے تصرف ہو کر رہ جائے، نہ لڑکا دے سکے نہ لڑکی، نہ روٹی دے نہ پانی، لیکن جب خواجہ ہجویری اور خواجہ عطار پر قبہ بن جائے تو ان کو سجدہ کرنا زمین بوسی قرار پائے اور مرادیں دینے لگیں، ان کے پاس لڑکے لڑکیوں کا سٹاک سمجھا جائے اور ان کی روح مریدوں کے گھروں تک ان کا تعاقب کرتی پھرے اور بعض اوقات تو نیند تک حرام کر دے۔ یہ تصرف روح میں ہے یا پتھر اور قبر میں؟

اگر تصرف روح میں ہے تو بت اور قبر کا حکم یکساں ہونا چاہیے۔ یہ دونوں جگہ بے قرار رہے اور مریدوں کے ہاں گھر گھر پھرتی رہے اور قرآن کی ان آیات کے لیے، جن میں شرک سے روکا گیا ہے، کوئی اور محمل تلاش کر لیا جائے۔

اگر روح کی قوت پتھر کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے یا اس کے اختیارات واپس لے لیے گئے ہیں تو سنگِ مرمر کی قبروں کا کیا حکم ہے؟ ان ولیوں کی روح سے بھی کچھ بن آتا ہے یا نہیں؟ یا قبر کے پتھر اور بت کے پتھر میں بھی کچھ فرق ہے؟ کیا نبی یا ولی کا بت بن جانے کے بعد اس کی نبوت یا ولایت واپس لے لی جاتی ہے؟

صاحبِ تقویۃ الایمان کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ قبر اور بت دونوں کی عبادت کو شرک سمجھتے ہیں۔ دونوں پر نذر و نیاز چڑھانا حرام سمجھتے ہیں اور آیاتِ توحید اور نفی عن الشرک کو دونوں مقام پر ناطق سمجھتے ہیں۔ آپ کے ہاں شرک کے معاملے میں بتوں اور قبروں میں فرق ہے، اس کا معمّا حل فرمائیے!!

بدبودار غلط بیانی:

بریلوی مدیر نے شاہ شہید پر تہمت لگائی ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر فرماتے ہوئے باقی ''ایمانیات'' سے روکا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ شاہ شہید رحمہ اللہ کی عبارت کا قطعاً یہ مفاد نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈریے، افتراء کبیرہ گناہ ہے۔ ﴿ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾ [النحل: ۱۰۵]

دوسری غلط بیانی:

صفحہ (۷) کے ایک حوالے میں آپ نے لکھا ہے کہ شاہ شہید رحمہ اللہ بارادہ ایصالِ ثواب اور نذر

وغیرہ کو بھی شرک سمجھتے ہیں۔ یہ قطعاً غلط ہے اور شاہ صاحب پر تہمت اور ضمیر کی چوری۔ یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ''ایصالِ ثواب کے لیے'' فقرہ آپ نے قوسین میں کر دیا ہے۔ لوگوں سے آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کو جھوٹا نہ کہیں، لیکن ایک ولی پر تہمت لگانے سے آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا! ﴿ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ ﴾ [المائدۃ: ٨]

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کسی عبارت سے آپ ''ایصالِ ثواب'' کو شرک ثابت کر دیں تو آپ کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف فرمائے جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ اہلِ حق اور اولیاء اللہ پر اِفتراء کرتے ہیں۔

دوسرا عقیدہ:

حضرت شہید رحمہ اللہ نے قبر کے لیے تعبدی سفر کو ناپسند فرمایا۔ وہ اسے حج کے مماثل سمجھتے ہیں اور ایسے سفروں کو غیر مشروع سمجھتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں میں الٹے پاؤں چلنا فطرتِ انسانی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جب تک شرعاً کسی مقام کی حرمت ثابت نہ ہو، اپنی طرف سے اس کی حرمت اور شرافت کا دعویٰ کرنا شاہ صاحب رحمہ اللہ واقعی اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ اگر بریلوی حضرات کو اس سے دُکھ ہوتا ہے تو آپ کی ذاتی رائے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تین مساجد کے علاوہ عبادت اور ثواب کے لیے سفر نہ کیا جائے۔ «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ»[1] صحیح حدیث ہے۔ مقتدر ائمہ سے یہ عقیدہ منقول ہے، جیسے: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن قیم، ابن تیمیہ، شوکانی، محمد بن اسماعیل امیر یمانی، علامہ آلوسی صاحب جلاء العینین، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ۔ البتہ بعض اہلِ علم کی رائے اس کے خلاف ہے، ان کے ہاں یہ سفر درست ہے۔ اس وقت ہمارا مطلب کسی مسلک کی ترجیح نہیں، بلکہ یہ گزارش کرنا مطلوب ہے کہ یہ مسئلہ فقہی ہے، اس میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مسائل میں تکفیر یا فتویٰ بازی کہاں درست ہے؟

اسی طرح الٹے پاؤں چلنا فطری وضع کے خلاف ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الملک: ٢٢]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١٣٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٩٧)

''اوندھا چلنے والا ہدایت پر ہے یا سیدھا چلنے والا؟''

قدرت نے منہ اور پاؤں کا رخ ایک طرف رکھا ہے۔ جو اُلٹے پاؤں چلتا ہے وہ فطرت سے بھی جنگ کرتا ہے۔

شاہ شہید رحمہ اللہ سیدھی بات فرمائیں، آپ کو وہ ناگوار ہوتی ہے۔ آپ کی اس ناگواری کا علاج نہ دیوبندی کر سکتے ہیں اور نہ حکومت۔ آپ کی قدرت سے جنگ ہے اور ناراضگی شاہ صاحب رحمہ اللہ پر!!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قابلِ عزت کون ہے؟ کوئی ایک واقعہ بتائیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بعد اُلٹے پاؤں چلے ہوں؟ آپ حضرات سوچیں! آپ کو ہر اچھی بات بری کیوں معلوم ہوتی ہے؟ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الٹا چلنے کا حکم دیا ہے، وہاں حکم کی پابندی پر کسی کو اعتراض نہیں۔

پیغمبر کو سجدہ:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پیغمبر کو سجدہ کرنا شرک ہے۔ بریلوی حضرات نے شاہ صاحب پر اعتراض کیا کہ آدم کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ حالانکہ شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب (ص: ۴۲، مطبوعہ لاہور) دے دیا ہے۔ اس وقت اس کی اجازت ہو گی، اب نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہر قسم کے سجدے غیر اللہ کے لیے حرام قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ اور مخلوق:

شاہ صاحب فرماتے ہیں: ہر مخلوق، بڑا ہو یا چھوٹا، وہ اللہ تعالیٰ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔ (ص: ۱۵)

بات سیدھی ہے، مگر ٹیڑھی عقل کا یہ حال ہے کہ وہاں پہنچ کر ہر چیز ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ ہمارے بریلوی دوست مخلوق کی وکالت کرتے ہیں کہ مخلوق کی توہین ہو گئی اور یہ توہین شاہ شہید رحمہ اللہ نے کی۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾ [مریم: ۹۳]

''آسمان اور زمین کے سب لوگ اللہ کے سامنے ذلیل ہو کر پیش ہوں گے۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [الفاطر: ۱۵]

''اے لوگو! تو سب محتاج ہو، بے نیاز صرف اللہ ہے۔''

بریلوی حضرات کا مقابلہ قرآن سے ہے اور اللہ تعالیٰ سے! دیکھیے ان کی کوششوں سے قرآن کب ضبط ہو؟!

مختار یا اختیار:

شاہ صاحب نے تقویۃ الایمان میں کسی جگہ لکھا ہے کہ مختارِ مطلق صرف اللہ ہے۔ مخلوق نبی ہوں یا ولی، عالم ہوں یا جاہل؛ کسی کے اختیار میں کچھ نہیں، جو ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ انبیاء، صلحاء کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہی ہے جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمائی۔ واقعی کسی مردے یا زندہ کو پکارنا فائدہ نہیں دیتا۔ یہ پکار بے کار ہے۔ یہ لوگ کسی کے نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّمَآ أَدْعُوا رَبِّي وَلَآ أُشْرِكُ بِهِۦٓ أَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ ٱللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِۦ مُلْتَحَدًا ﴾

[الجن: ۲۰ تا ۲۲]

''ان سے کہہ دو! میں صرف اللہ سے مانگتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں سمجھتا، مجھے تمھارے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں، مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ اس کے سوا میرے لیے کوئی پناہ کی جگہ ہے۔''

﴿ قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ﴾ [یونس: ۴۹]

''میں اپنے نفع اور نقصان کا بھی مالک اور مختار نہیں ہوں۔''

پورے قرآن مجید میں یہ مضمون بھرا پڑا ہے۔ یقیناً قرآنِ مجید کا یہ طریقِ بیان آپ حضرات کے لیے دلخراش ہے۔ آپ کے اعتقادات کو اس سے گزند پہنچتا ہے، اس لیے اگر پورا قرآن ممکن نہ ہو تو آپ کو کم از کم سورت اخلاص، معوذتین، سورت کافرون، سورت نوح، سورت جن، سورت نحل، سورت یوسف وغیرہ کی ضبطی کے لیے کوشش کرنا چاہیے!!

اس کوشش میں اگر آپ حضرات کامیاب ہو گئے تو تقویۃ الایمان مع کتاب التوحید خود بخود ختم ہو جائے گی۔ مولانا رشید احمد، اشرف علی، شاہ شہید، محمد بن عبدالوہاب تو بچارے ناقل ہیں۔ جب اصل ضبط ہو گیا، نقل خود بخود ضبط ہو جائے گی۔ آپ کے ہاں ولیوں اور بزرگوں کی کمی نہیں، ان کی

وساطت سے کوشش فرمائیے کہ قرآنِ عزیز کے یہ دل خراش حصے یوں ہی منسوخ ہو جائیں!!

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

آنحضرت ﷺ کی عظمت اور بڑائی:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: انسان آپس میں سب بھائی ہیں۔ جو بڑا بزرگ ہے وہ بڑا بھائی ہے، سو اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجیے۔ (ص: ٦٧)

پھر فرمایا: اولیاء، انبیاء، امام، امام زادے، پیر، شہید، یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وہ سب انسان ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی، مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی، وہ بڑے بھائی ہوئے۔ ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا ہے۔ (ص: ٦٧)

آنحضور ﷺ نے خود فرمایا:

«اُعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَأَكْرِمُوا أَخَاكُمْ»[1] (مشكوة المصابيح)

''یعنی رب کی عبادت اور اپنے بھائی (آنحضرت ﷺ) کی عزت کرو۔''

قرآنِ عزیز نے بھی انبیاء علیہم السلام کو بھائی سے تعبیر فرمایا:

① ﴿ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ﴾ [الأعراف: ٦٥] (ہود علیہ السلام عاد کے بھائی)

② ﴿ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ﴾ [الأعراف: ٧٣] (صالح علیہ السلام قومِ ثمود کے بھائی)

شاہ صاحب نے ان کی برتری اور راہنمائی کی وجہ سے ان کو بڑا بھائی فرمایا ہے۔

③ ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ١٠] (مومن بھائی ہیں)

ایمانی اخوت کے لحاظ سے بھی اہل اللہ اور انبیاء بڑے اور بزرگ ہیں، اس لیے کہ ہم لوگوں کو ایمان اور ہدایت ان کی وجہ سے ملے ہیں، اس لیے وہ بڑے ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ہمارے پیغمبر ﷺ سارے جہان کے سردار ہیں، اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ الخ

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی شان کے متعلق فرمایا ہے: اللہ کی شان یہ ہے کہ ایک آن میں ایک ''کن'' سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبریل علیہ السلام اور محمد کے برابر پیدا کر

[1] مسند أحمد (٦/ ٧٦) اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔

دے اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے۔ (ص:۴۴)

سبحان اللہ! کس قدر ایمان افروز ارشادات ہیں! ایک مومن موحد کا اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے، اس نے آسمان، زمین اور ساری کائنات کو پیدا کیا، پھر فرمایا:

﴿ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴾ [البقرۃ: ۱۱۷]

''یعنی وہ جب کسی امر کا فیصلہ فرمائے تو اسے کن کہہ کر پیدا کر دیتا ہے۔''

مومن موحد، جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے، ان توحید آمیز کلمات سے اس کے ایمان کو تازگی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر اس کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔حضرات اولیائے کرام بھی مقامِ توحید کو ٹھیک اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح شاہ شہید رحمہ اللہ نے فرمایا۔

شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (م ۷۴۷ھ) ۳۵ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

''گر خواہد در ہر لحظہ صد ہزار چوں محمد ﷺ بیافریند و ہر نفسے از انفاسِ ایشاں مقام قاب قوسین دہد جلال او ذرہ زیادہ نگردد و اگر خواہد در ہر نفسے ہزار چوں فرعون بیافریند تا دعوی ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ﴾ کنند و از جمال و کمالِ او ذرہ کم نہ گردد۔'' (ص: ۹۶)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہر لمحہ آنحضرت ﷺ فداہ ابی و امی کی طرح بلند مرتبہ ہزاروں پیدا فرمائے اور ہر گھڑی میں انھیں قاب قوسین کے مقام مرحمت فرمائے، اس کے جلال و جبروت میں ایک ذرہ کا اضافہ نہیں ہوگا اور اگر وہ چاہے تو ہر سانس میں ہزاروں فرعون پیدا فرمائے جو ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ﴾ کا دعویٰ کریں تو اس کے حسن و جمال میں ذرہ بھر کمی نہیں آئے گی۔''

پھر فرماتے ہیں:

''واگر خواہد ہر کہ در روئے زمین کافرے و مشرکیست در دریائے رحمت غرق کند از صفتِ قہر او ذرہ کم نگردد و اگر خواہد ہر کہ در عالم نبی و ولی است ہمہ را در یک سلسلۂ قہر کشد خالداً و مخلداً در عذاب الیم بدارد از صفت رحمت او ذرہ کم نگردد'' (مکتوبات: ۹۷)

''اگر وہ چاہے تو دنیا کے تمام کفار و مشرکین کو اپنی رحمت کے سمندر میں غوطہ دے دے تو

اس کی صفتِ قہر سے ایک ذرہ بھی کم نہ ہوگا اور اگر چاہے تو تمام انبیاء اور اولیاء کو اپنے قہر میں مبتلا کر دے اور ہمیشہ کے لیے دردناک عذاب میں گرفتار فرما دے تو اس سے اس کی رحمت میں بھی قطعاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

کس قدر بے ادبی ہے!! (معاذ اللہ)

بریلوی حضرات کے عقائد کو ضرور ان کتابوں سے نقصان ہوگا، ان کے عقائد مجروح ہوں گے۔ اگر حکومتِ پاکستان واقعی ان حضرات کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ان کتابوں کے ساتھ قرآنِ عزیز اور سنت کے دفاتر اور اہلِ سنت صوفیوں کی کتابوں کا بھی بندوبست کرے، تاکہ بچارے بریلوی آرام کی نیند سو سکیں۔ ان بچاروں کی پریشانی واقعی قابلِ صد ہزار رحم ہے!!

آخر میں تقویۃ الایمان کے متعلق فرمایا ہے:

''ساری کی ساری کتاب میں اسی قسم کی گستاخی اور بیباکی کا مظاہرہ ہے اور شانِ رسالت ونبوت کا انکار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک فتنہ ہے جس کی نحوست نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ اور اتفاق واتحاد کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور اس کے باعث جگہ جگہ فتنہ برپا ہے۔''
(رضائے مصطفیٰ)

کتاب میں گستاخی وغیرہ تو قطعاً نہیں، البتہ حفظِ مراتب کی تلقین کھلے طور پر کی گئی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اولیاء کو انبیاء کا مقام مت دو اور انبیاء کو اللہ تعالیٰ کا مقام دے کر اللہ کو اپنے مقام سے معطل نہ کرو۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کتاب سے بریلوی مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور بریلویت ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔

شاہ شہید رحمہ اللہ کی آواز واقعی سخت ہے۔ عالم اور مجدّد میں یہی فرق ہے کہ علماء اپنی آواز سے بولتے ہیں، مجدّد وقت کی آواز ہوتا ہے۔ وہ اس آواز سے بولتا ہے وقت جس کا تقاضا کرتا ہے۔ بریلوی حضرات کو شکایت تو خیر ہے ہی، بعض اہلِ حدیث اور دیوبندی علماء نے بھی تقویۃ الایمان کے لب و لہجے کو سخت سمجھا۔ یہ حضرات صلح کل اور عافیت کوش ہیں، انھیں معلوم نہیں اگر شہید رحمہ اللہ آپ کی آواز سے بولتے تو ان کی آواز بھی آپ حضرات کی طرح بے اثر ہوتی!

شہید رحمہ اللہ کی آواز نے بہروں کو سنایا، گونگے بولنے لگے۔ جو آنکھوں سے معذور تھے وہ اس کی برکت سے دیکھنے لگے۔ حیران دلوں کو اس سے اطمینان نصیب ہوا۔ فقیروں، قبروں، درختوں،

پیروں، ملاؤں کی پرستش سے اللہ تعالیٰ نے انھیں مخلصی عنایت فرمائی۔ اس لیے واقعی بریلوی گھروں میں اختلافات بڑھ گئے۔ باپ، بیٹا، میاں، بیوی، بھائی بھائی سے جدا ہوگئے۔ وہی ہوا جو علم و بصیرت کی روشنی میں جہالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج کے طلوع سے رات کے اندھیروں پر جو گزرتی ہے وہی بریلوی حضرات پر گزری۔ علم و بصیرت کی آمد نے یہاں کی دنیا بدل دی۔

قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا:

﴿ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ [یونس: ۹۳]

''بنی اسرائیل میں اختلاف تب پیدا ہوا جب علم و بصیرت نے ڈیرے ڈال دیے، اب ان کا فیصلہ قیامت ہی کو ہوگا۔''

جب حق کا حملہ باطل کی بستیوں پر ہوتا ہے تو اس کا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ باطل پرستوں میں انتشار رونما ہوتا ہے۔ حرص و آز اور درہم و دینار، دہن و کام کے بندے جب اپنا مفاد خطرے میں دیکھتے ہیں تو اس کی حفاظت کے لیے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ انتشار، پریشانی اور سراسیمگی ہوتا ہے۔ یہی اثر قرآنِ عزیز اور آنحضرت کی آمد نے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل پر کیا، جس کا اعتراف ابوجہل نے محاربہ بدر سے پہلے ان لفظوں سے کیا: ''إِنَّ مُحَمَّداً شَتَّتَ أَمْرَ الْعَرَبِ'' [1]

یہی حال شاہ شہید رحمہ اللہ کی آواز سے ہند کے شرکستان میں ہوا۔ مدیرِ محترم کی رائے سے ہمیں اتفاق ہے کہ تقویۃ الایمان کی آمد سے بریلوی سنت اور بریلوی جماعت کے متوسلین میں انتشار پیدا ہوا، لیکن یہ قصور تقویۃ الایمان کا نہیں۔ یہ ''نحوست'' علم و بصیرت سے ظاہر ہوئی، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا سے علم و دانش کو ضبط کر لیا جائے، اخلاص و دیانت کو نظر بند کر دیا جائے، حق و صداقت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ یقیناً بریلوی حضرات کو اس سے آرام ملے گا!!

﴿ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ۲۲]

''آنکھوں کا بے نور ہونا چنداں مضر نہیں، سب سے بڑی مصیبت دلوں کی بربادی ہے۔''

ما شكل أن القيود غل الأرجل   إن القيود على العقول فتاك الشكل

اگر حکومت عقل و دانش، اخلاص و دیانت اور علم و بصیرت کو ضبط کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے تو

[1] تاریخ دمشق (۳۸/۲۴۳)

اہلِ توحید بسر وچشم تیار ہیں۔ ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی[1]

لیکن بریلوی حضرات کو یقین ہونا چاہیے کہ حکومت آپ کی آرزو کو پورا کرنے پر قادر نہیں، اس میں یہ ہمت ہی نہیں کہ وہ قدرت کے اٹل قانون کا مقابلہ کرے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [النحل: ۹۳]

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتے، تم سب ایک جماعت ہوجاتے، لیکن اس کی مشیت اس دنیا میں یہ ہے کہ اہلِ ہدایت اور گمراہ دونوں یہاں بسیرا رکھیں اور تمھارے اعمال کی بابت تم سے آخرت میں سوال جواب ہوں گے۔''

مٹی میں ملنا:

آنحضرت ﷺ نے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

«أَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِي أَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهُ؟» فَقُلْتُ: لَا فَقَالَ: «فَلَا تَفْعَلُوْا»[2] (مشكوة المصابيح)

''بتاؤ! جب تم میری قبر پر گزرو گے تو کیا تم اس پر سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا: قطعاً نہیں، اس پر فرمایا: پھر زندگی میں بھی مجھے سجدہ نہ کرو۔''

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تشریحی نوٹ میں فرمایا ہے:

''میں ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدے کے لائق ہوں؟''

مٹی میں ملنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں: قبر میں دفن ہونا، کیونکہ قبر مٹی ہی میں بنائی جاتی ہے۔ یہ معنی بالکل درست ہے۔ آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے بعد جسمِ اطہر کو سپردِ خاک فرمایا گیا۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہمیں آنحضرت ﷺ کی موت کا اس وقت یقین آیا جب قبر کھودتے وقت ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔[3] اس معنی سے جو آدمی دفن ہوتا ہے وہ مٹی میں مل جاتا

---

[1] ''تمھاری خنجر آزمائی کے لیے دوستوں کا سر حاضر ہے۔''

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۴۰) اس کی سند میں ''شریک بن عبداللہ نخعی'' ضعیف ہے۔

[3] موطأ الإمام مالك (۱/ ۲۳۱)

ہے، یہی مفہوم یہاں قرینِ قیاس ہے، چونکہ حدیث میں قبر ہی کا ذکر ہے۔

پھر یہ اثر منقطع ہے۔ اگر اس کا مطلب جسم کا مٹی ہو کر مٹی میں مل جانا ہے تو یہ معنی غلط ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کا یہ مطلب نہیں۔ ان کا مطلب قبر میں دفن ہونا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ ایسے عالم سے یہ غلطی کیسے ہوسکتی ہے جبکہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ»[1] (مشکوۃ المصابیح)

''انبیاء کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام ہے۔''

تاہم اگر شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مطلب یہی سمجھا جائے تو بداہتاً غلط ہے۔ شاہ صاحب انسان ہیں، بھول سکتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ معصوم نہیں۔

کتاب التوحید:

تقویۃ الایمان کو کتاب التوحید کا ترجمہ کہنا تو قطعاً غلط ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ دعوت ایک ہی ہے جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے دی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو الفاظ کی بحث بے سود ہے۔ حقیقت کا اعتراف کیجیے۔ الفاظ کا انتخاب وقت کے لحاظ سے مولف کے اجتہاد پر موقوف ہوتا ہے۔ اپنے مخاطب کی قوتِ فکر کے مطابق اسے الفاظ پسند کرنے پڑتے ہیں، یہ اس کی نیت کا مسئلہ ہے۔ مجھے کتاب التوحید بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اندازہ یہ ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کا ماحول اسماعیل بن عبدالغنی کے ماحول سے کافی مختلف تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کے قلم اور تلوار دونوں کا رخ ایک ہی طرف رہا، اس کے قلم کو شکوہ نہیں کہ تلوار نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن شاہ شہید رحمہ اللہ کے قلم کو یہ بجا شکوہ ہے کہ اسماعیل کی تلوار نے قلم کو تنہا چھوڑ دیا۔ تلوار ہمیشہ سکھوں اور انگریزوں سے مخاطب رہی اور اسماعیل کے قلم کو بعض اوقات دونوں ڈیوٹیاں دینی پڑیں۔ دونوں ذمے داریاں بقدرِ امکان اٹھانی پڑیں۔

اگر شاہ شہید رحمہ اللہ کی تلوار کا رخ کچھ دیر بریلی اور بدایوں کی طرف ہوجاتا اور قلم کو اس طرح تلوار کی رفاقت نصیب ہوجاتی تو ان حلوے کے شیروں کو قلم سے شکوہ نہ ہوتا۔ مصیبت تو یہی تھی کہ سکھ اور انگریز دونوں بریلی اور بدایوں کی پشت پر تھے، اس لیے قلم کا محاذ تلوار کے محاذ سے زیادہ سخت تھا اور اسماعیل کے قلم نے جس زمین کو فتح کیا وہ تلوار کے میدان سے زیادہ سنگ لاخ تھے۔

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٧٤)

جو سپاہی بیک وقت چار محاذوں پر لڑ رہا ہو، اس کی تلخ نوائیوں کا شکوہ دیوبند سے ہو یا بریلی سے، بدایوں سے ہو یا دہلی سے، بے انصافی ہے۔ ؎

گفتگوئے عاشقاں در بابِ رب　　　جذبۂ عشق است نے ترکِ ادب[1]

شہید رحمہ اللہ کی مشکلات کا جائزہ لبِ جو بیٹھ کر کر لینا بے انصافی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ بریلی اور بدایوں کے حریف اور دیوبند اور دہلی کے رفقاء اس معاملے میں خاموش ہو جائیں۔ ”إِنَّمَا يَعْرِفُ الْبَلَاءَ مَنْ بِهِ يُبْتَلٰى“۔ جو لوگ وقت پر مفید نہیں ہو سکے، وہ مضر کیوں ہوں؟

کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے تقابل کی بحث بے سود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ان کے اعمال کی بہتر جزا دے۔ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[2] [البقرة: ١٣٤]

صراطِ مستقیم:

”صراطِ مستقیم“ کے مصنف شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نہیں ہیں، جیسے کہ کتاب کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ یہ دراصل سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ارشادات ہیں جن کی ترجمانی فارسی زبان میں شاہ شہید رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے فرمائی۔ اس کتاب کے کل چار باب ہیں۔ پہلا اور چوتھا باب شاہ شہید رحمہ اللہ نے لکھا، دوسرا اور تیسرا باب حضرت مولانا عبدالحی نے رقم فرمایا اور اسی فارسی ترجمانی کے بعد حضرت سید احمد رحمہ اللہ کو سنا کر اس امر کی تسکین فرمائی کہ ان کا مقصد ادا ہو گیا۔

اس لیے اس کتاب کو شاہ شہید رحمہ اللہ کی تصنیف کہنا غلط ہے۔ سید شہید رحمہ اللہ کی تصدیق کے بعد اس کے الفاظ اور معنی کی ذمے داری ترجمان حضرات سے زیادہ سید احمد رحمہ اللہ پر پڑتی ہے۔ بریلوی حضرات اسے شاہ شہید رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ واقع میں غلط ہے۔ بریلی مدیر نے قابلِ ضبط کتابوں کا تذکرہ کرتے وقت اسے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف ظاہر کیا ہے۔ یہ غلط بیانی ہے۔

تحریکِ حریتِ فکر اور حریتِ وطن اور تحریکِ اعتصام بالسنۃ اسی تحریک کے اہم اجزا تھے جو

---

[1] ”عاشقوں کی گفتگو رب تعالیٰ کے بارے جذبۂ عشق ہے، ترکِ ادب نہیں ہے۔“

[2] ترجمہ: ”یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔“

گیارھویں صدی کے اواخر سے آج تک مختلف محاذوں پر کام کرتی رہی۔ اس کے بانی یقیناً سید احمد شہید رحمہ اللہ تھے، لیکن اس کے روحِ رواں شاہ شہید رحمہ اللہ تھے۔ جب تک شاہ شہید زندہ رہے، تحریک کے ہر حصے میں سید صاحب کے ساتھ پیش پیش رہے۔ شہادت کے بعد اس کی تمام تر ذمے داریاں پٹنوی خاندان نے سنبھال لیں۔ یہ حضرات شاہ شہید رحمہ اللہ سے زیادہ متاثر تھے اور کھلے اہلِ حدیث تھے، اس لیے ہندوستان کے اہلِ بدعت، سکھوں اور انگریزوں نے ہر گناہ کو (ان کے خیال سے) شاہ شہید رحمہ اللہ اور جماعتِ اہلِ حدیث پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک حوالے کی وجہ سے پوری کتاب شاہ شہید رحمہ اللہ کے نام لگا دی گئی، حالانکہ یہ حوالہ دوسرے باب میں ہے جو مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کے قلم کا مرہونِ منت ہے، شاہ شہید رحمہ اللہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے دوسرا اور تیسرا باب من وعن لکھ دیا، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں فرمائی۔ یہ اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض کیا گیا، اعتراضات سے طبیعت پر بحمداللہ کوئی بار نہیں۔

شاہ شہید رحمہ اللہ کے علم وفضل کے اعتراف کے باوجود ہم ان کا مقام ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ سے کم سمجھتے ہیں۔ ائمہ مجتہدین کے ارشادات کو جب من وعن قبول نہیں کیا جاتا تو ان بزرگوں کی ہر بات کی ذمے داری ہم پر کیوں عائد ہوگی؟ نہ شاہ اسماعیل معصوم ہیں، نہ سید احمد، نہ مولانا عبدالحی رحمہم اللہ۔

اصل کتاب کے متعلق گزارشات:

صراطِ مستقیم تصوف کی کتاب ہے۔ تصوف پر دو دور گزر چکے ہیں، ایک دور قرونِ خیر کا، تمام صحابہ اور عموماً تابعین اور ائمہ اسلام صوفی تھے، ان کے ہاں تصوف زہد وورع، دنیا سے ایک گونہ بے رغبتی کا نام ہے۔ یہاں نہ چلہ کشی ہے نہ دم کشی کی ورزشیں، نہ طویل مراقبے؛ یہاں ان تمام کمیوں اور سارے خلا کو پاٹنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی صحبت یا اس زمانے کا قرب کفایت کرتا ہے۔ جہاد اور دوسرے اعمال کی وجہ سے یہ دور ان مصنوعی اور مصطلح ورزشوں سے مستغنی رہا۔ عَمَّهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ، وَأَدْخَلَهُمْ بُحْبُوحَةَ الْجَنَّةِ.

مصطلح تصوف:

قرونِ وسطی میں تصوف زمانۂ نبوت سے بہت دور آ گیا۔ اس دوری کے سبب سے نبوت کی برکات کا اثر کم ہوتا گیا۔ اس وقت اہلِ علم نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کچھ وظائف اور کچھ

مراقبے وضع فرمائے۔ بعض کوائف کے اظہار اور تفہیم کے لیے کچھ اصطلاحات وضع فرمائیں اور اس سلسلے میں اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی رہبانیت سے بھی استفادہ کیا۔ یہ چیزیں اس وقت دین نہیں سمجھی جاتی تھیں، بلکہ ضرورتاً ان سے استفادہ کیا گیا۔ قلب پر ان کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا، اس پر مفید نتائج مرتب ہوئے۔ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ امام غزالی ایسے یگانۂ روزگار نے نظامیہ کی صدر مدرسی سے مستعفی ہوکر دمشق کے جنگلوں میں پناہ لی اور اس تنہائی اور خلوت میں مصطلح راہوں سے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور یہ راہ فلسفہ اور کلام کی راہ سے ان کے لیے زیادہ اطمینان کا موجب ہوئی۔ یہ راہ سنت نہ سہی، فی الجملہ مفید تھی، بشرطیکہ ان ورزشوں کو محض ذریعہ سمجھا جائے، دین اور شریعت تو نہ تصور کیا جائے۔

دکان داری:

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں تصوف نے بزنس اور دکان داری کی صورت اختیار کر لی ہے اور تصوف کے پردے میں زنا کاری، حرام خوری اور منشیات کی تجارت ہو رہی ہے۔ یہ دین کے قائد، زہد اور ترکِ دنیا کے راہنما؛ گندی قسم کے دنیا پرست ہیں۔ یہاں بیعت اور خانقاہ اور وجد و حال کی مجالس دکان کے سامان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ عوام کو دھوکا دینے کے لیے یہ سب ہم رنگِ زمین جال ہیں۔ بریلوی حضرات میں تو اس سلسلے نے انتہائی ذلیل صورت اختیار کر لی ہے۔ پیر کا فسق و فجور دیکھ کر بھی دم مارنے کی اجازت نہیں دی جاتی، گویا یہاں پہنچ کر امر بالمعروف کی ساری ذمے داریاں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ تصوف مستحدث ہے، اس کا نہ شرعاً احترام ہے نہ آبرو، بلکہ اگر اس ملک میں اسلامی اور شرعی قانون رائج ہوتو یہ لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح تادیب اور تعزیر کے مستحق قرار پائیں۔

کتاب ''صراط مستقیم'' قرونِ وسطی کے تصوف کی یادگار ہے۔ اس میں مختلف قسم کے اوراد، مشقیں اور تصوف کی اصطلاحات پر گفتگو فرمائی گئی ہے۔ سید شہید رحمہ اللہ نے اس پر بہت سی بدعات کی اصلاح بھی فرمائی ہے۔ تصورِ شیخ ایسی مشرکانہ بدعات سے روکا ہے، تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ تصوفِ مسنون ہے، اس لیے سید صاحب رحمہ اللہ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے انتہائی عقیدت کے باوجود اس کے پورے الفاظ کی ذمے داری لینا مشکل ہے۔

اخلاق کی اصلاح:

یہ ایک علمی کتاب ہے۔ اخلاق کی اصلاح کے لیے بہترین مجموعہ ہے۔ دینی ذہن اور شریعت کے ساتھ رابطے کے لیے نہایت اچھی کتاب ہے، اس سے بہترین اخلاق کی تلقین ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کے ضبط کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ تصوف کی گہرائیوں میں جا کر اس سمندر نے ایسے موتی پیدا کیے ہیں جن کو پیر پرستی کا عادی عامی ذہن پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ مناسب تو یہ تھا کہ اسے کند ذہن اور جہالت نواز حضرات سے چھپایا جاتا، مگر اس کا کیا علاج کہ پریس نے اسے حدیثِ محفل بنا کر رکھ دیا، اس لیے ہر کس و ناکس اس کے متعلق اظہارِ خیال کے لیے آمادہ ہوگیا، چنانچہ ہمارے بریلوی حضرات نے اسے الزام اور استدلال دونوں طریق سے استعمال کیا۔ اب بریلوی مدیر نے مشورہ دیا ہے کہ یہ کتاب بھی ضبط کر دی جائے اور اس کی اشاعت ''قہر القادر'' کے ساتھ ممنوع قرار دی جائے۔

اصل شبہہ:

سید صاحب رحمہ اللہ نے نماز میں حضورِ قلب پر زور دیا ہے اور مختلف وساوس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ وساوس کے لیے علاج تجویز فرمائے ہیں، اس ضمن میں سید صاحب رحمہ اللہ نے ایک نکتہ پیدا فرمایا ہے، وہ یہ کہ معمولی قسم کی ذلیل چیز کا خیال اگر دل میں آجائے تو اسے رفع کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان حقارت سے اسے نظر انداز کر سکتا ہے، لیکن قابلِ عزت و احترام بزرگوں کی طرف دل کی مشغولیت بڑھ جاتی ہے، اسے روکنے میں دقت ہوگی، اس کا احترام اس کے دفاع میں حائل ہوگا، دل نماز سے ہٹ کر اس طرف مشغول ہوجائے گا، اس سے نماز میں خلل واقع ہوگا۔ وہ ہر کس و ناکس کے تصور کو گاؤ وخر سے تعبیر فرماتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ مقامِ تعبد میں دل کو پوری یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا چاہیے، یہاں نہ معمولی خیالات کے لیے گنجایش ہونی چاہیے نہ انبیاء و اولیاء کا تصور مقامِ تعبد میں حائل ہونا چاہیے، بلکہ غایت احترام کی وجہ سے بزرگوں کی طرف دھیان کا جانا نماز اور حقیقتِ عبادت کے لیے زیادہ مضر ہے۔

مسئلہ صاف ہے۔ مثبت طریق پر بریلوی حضرات کو سمجھانے کی بے حد کوشش ہوئی اور پورے

یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے علماء سمجھتے ہیں کہ جو فرمایا گیا ہے حقیقتاً درست ہے۔

وہ عوام اور جہلاء کو بدگمان کرنے کے لیے اسے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خواص کو اس کی حقیقت معلوم ہے کہ اس میں کچھ نہیں۔ اس لیے مثبت طور پر میں اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا، میں الزامی طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کند ذہن اور شرارت پسند طبائع کے لیے عموماً یہ طریق مفید ثابت ہوتا ہے، اس طرح ان کی قوتِ فکر بیدار ہو جاتی ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ سید احمد صاحب نے گاؤ وخر اور انبیاء اور اولیاء کے خیالات کا تقابل کیا ہے اور انبیاء کے خیال کو گاؤ وخر سے نماز میں زیادہ مضر سمجھا ہے۔ ایک عامی ذہن کو واقعی یہ تقابل کھٹکتا ہے۔

"الأشباہ والنظائر" فقہ کی مسلّمہ کتاب ہے۔ بریلوی حضرات اسے پورے یقین اور اعتماد سے مانتے ہیں، اس میں مرقوم ہے:

"وَلَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّي إِلٰى مُصْحَفٍ، وَقَرَأَ مِنْهُ، فَسَدَتْ صَلَاتُهُ، لَا إِلٰى فَرْجِ امْرَأَةٍ بِشَهْوَةٍ" (ص: ٤٣٤)

"یعنی نمازی قرآن کو دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی، عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔"

قاضی خاں فرماتے ہیں:

"إِذَا قَرَأَ الْمُصَلِّي مِنَ الْمُصْحَفِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ فِي قَوْلِ أَبِي حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ، وَلَوْ نَظَرَ إِلٰى فَرْجِ الْمُطَلَّقَةِ طَلَاقًا رَجْعِيًّا شَهْوَةً، يَصِيْرُ مُرَاجِعًا، وَلَا تَفْسُدُ صَلَاتُهُ" (١/ ١١١ مصری)

یعنی اگر مطلقہ رجعیہ کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو رجوع ہو جائے گا، نماز فاسد نہیں ہو گی۔

"وَكَذَا لَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّي إِلٰى فَرْجِ امْرَأَةٍ بِشَهْوَةٍ، حَرُمَتْ عَلَيْهِ أُمُّهَا وَابْنَتُهَا، وَلَا تَفْسُدُ صَلَاةٌ فِي رِوَايَةٍ" (١/ ١١١ مصر)

"اگر آدمی کسی عورت کی شرمگاہ شہوت سے دیکھے تو اس کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن نماز فاسد نہیں ہو گی۔"

"وَلَوْ نَظَرَ إِنْسَانٌ مِنْ تَحْتِ الْقَمِيْصِ (أَيْ عَوْرَةَ الْمُصَلِّيْ) لَا تَفْسُدُ صَلَاتُهٗ"

(ص: ۱۱۱)

"اگر آدمی قمیص کے نیچے سے نمازی کی شرمگاہ دیکھے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

"وَلَوْ قَبَّلَتِ الْمُصَلِّيْ امْرَأَةٌ وَلَمْ يَشْتَهِهَا لَمْ تَفْسُدْ صَلَاتُهٗ" (۱/ ۱۱۱)

"عورت کسی نمازی کا بوسہ لے لے اور اسے شہوت نہ آئے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔"

ان ملفوظات پر غور کرنے سے چند چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

1. یہاں قرآنِ حکیم کی قراءت کا تقابل عورت کی شرمگاہ، مرد کی شرمگاہ اور عورت کے بوسے سے کیا گیا ہے۔
2. فتویٰ یہ دیا گیا ہے کہ قرآن پڑھنے سے نماز فاسد ہوتی ہے، شرمگاہ کی زیارت سے نماز نہیں ٹوٹتی۔
3. شرمگاہ پر نظر سے رجوع اور حرمتِ مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے، مگر نماز پر کوئی اثر نہیں ہوا اور قرآن کا اثر فوراً نماز پر ہوتا ہے اور نماز فاسد ہو جاتی ہے۔
4. عورت مرد کا بوسہ لے تو عدمِ اشتہا کی صورت میں نماز پر اثر نہیں پڑے گا۔

"لَمْ يَشْتَهِهَا" کی قید قابلِ غور ہے۔ اگر کسی پڑھے لکھے دیوبندی نے آپ کو سمجھا دیا تو شاید شہید رحمہ اللہ کے متعلق بدگوئی سے آپ کو نجات مل جائے گی۔

مولانا اشرف علی اور دیگر علمائے دیوبند کی کتابوں کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ آپ کا سارا زور تقویۃ الایمان پر تھا، اس کے متعلق اختصار سے عرض کر دیا گیا۔ وَلَوِ اسْتَزَدْتُمْ فَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ.

دل کی فکر:

کسی مسلم کا دِل دکھانا شرعاً جرم ہے۔ «اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ» اہلِ حدیث نے بحمد اللہ اس ادبِ شرعی کو آپ حضرات کے متعلق ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ آپ حضرات کی زبان درازیوں کو بھی اکثر برداشت کیا۔ اگر کہیں کوئی تلخی ہوئی ہو تو بطور قصاص ہوئی ہوگی۔ ابتداء ان شاء اللہ کبھی نہیں ہوئی۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ بعض دل ہوتے ہی مجروح ہیں، اس لیے وہ افتادِ طبیعت کے لحاظ سے دکھے رہتے ہیں۔ درد اور علالت ان کی طبیعت بن چکا ہوتا ہے۔ ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ [البقرۃ: ۱۰] ایسے دلوں کا لحاظ واقعی مشکل ہوتا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنی نرمی فرمائی۔ یہاں فرعون کا دل ضرور دُکھے گا۔ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام اور نمرود اور آزر کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ ایسے دلوں کا درد سے بچانا ہمارے بس میں نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فداہ ابی و امّی ۔ کا معاملہ اہلِ مکہ سے اسی نوعیت کا ہے۔ آپ ہی غور فرمائیں، ایسے دلوں کا کیا کیا جائے۔ بعض دل پیدا ہی بیمار ہوتے ہیں۔ قرآنِ عزیز کا ارشاد ہے:

﴿ لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ ﴾ [الحج: ٤٦]

جب دل پیدائشی طور پر بصیرت سے محروم ہوں تو اس کا علاج کون کرے اور اس کے درد کا مداوا کیوں کر ہو۔ اس لیے ادباً گزارش ہے کہ دل کی فکر کیجیے۔ بیمار دلوں کو شکوہ اپنی ذات سے ہونا چاہیے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ صبر سے حق کی کڑواہٹ کو برداشت کیا جائے اور اہلِ حق کے بظاہر تلخ اور ترش مواعظ کو سُننے اور ان پر غور کی عادت ڈالے۔ ائمہ سنت کی مصنفات کو پڑھے۔ قرآن اور دفاتر میں توحید کے اسباق پر بار بار غور کرے اور اہلِ توحید کے پاس بیٹھے اور ان کی نصیحتوں کو سنے۔ یہی صحیح علاج ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ؎

اَلۡجَهۡلُ دَاءٌ قَاتِلٌ وَشِفَاءُهٗ أَمۡرَانِ فِيۡ التَّرۡكِيۡبِ مُتَّفِقَانِ
نَصٌّ مِّنَ الۡقُرۡآنِ أَوۡ مِنۡ سُنَّةٍ وَطَبِيۡبُ ذٰلِكَ الۡعَالِمُ الرَّبَّانِيُّ
(قصیدۂ نونیہ)

"جہالت مہلک مرض ہے اور اس کا علاج دو چیزوں سے مرکب ہے: قرآن اور سنت کی نصوص، اور عالمِ ربانی کے مفید مشورے۔"

میری رائے ہے کہ قرونِ متوسطہ کے مصنوعی تصوف اور فقیروں کی بے دلیل اور خود ساختہ کہانیوں سے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو یہ دل کا عارضہ ہوا ہے۔

﴿ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴾ [الزمر: ٤٥]

"جب صرف اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دلوں پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ جب توحید کے علاوہ کوئی تذکرہ ہو تو وہ خوش وخرم نظر آتے ہیں۔"

آپ حضرات عموماً مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین صاحب وغیرہ اور جاہل

صوفیوں کے قصے پڑھتے ہیں، ان سے قلب کی حالت اور خراب ہوتی ہے۔ اگر میرا یہ اندازہ درست ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے میری تشخیص بالکل صحیح ہے، میری ادباً گزارش ہے کہ آپ اہلِ توحید کی کتابوں کی ضبطی کی کوشش نہ فرمائیں، بلکہ سب سے پہلے بریلوی حضرات کی تصانیف سے بالکلیہ پرہیز فرمائیں اور قرآنِ عزیز، کتبِ صحاح، فقہ اکبر مع شرح علی القاری و ابی الحسن الماتریدی، عقیدۂ طحاویہ مع شرحہ لابن ابی العز، تصانیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم و عقیدۂ صابونیہ، شرح عقیدۂ اصفہانیہ، الفرقان بين أولياء الشيطان وأولياء الرحمان، اقتضاء الصراط المستقيم، مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين وغيره ذلك طبیعت پر جبر فرما کر ائمۂ سنت اور ائمۂ حدیث کی تصانیف کا مطالعہ فرمائیں۔ چند دنوں میں ان شاء اللہ حالت درست ہو جائے گی اور آپ یقین فرمائیں گے کہ تقویۃ الایمان وغیرہ کتب کی ضبطی کا مطالبہ چنداں مفید نہ تھا اور جن دلوں کو ان سے دکھ ہوتا ہے وہ دراصل تندرست دل نہیں ہیں۔

مجھے آپ کا مضمون ''قابلِ ضبط کتابیں'' پڑھ کر تعجب ہوا۔ آپ صحت کو مرض اور مرض کو صحت تصور فرما رہے ہیں۔ میں نے یہ گزارشات خیر خواہی اور نصیحت کے طور پر لکھی ہیں۔ میرا مقصد طعن و تشنیع نہیں۔ مَیں خود اس راہ سے گزر چکا ہوں اور آپ کے احساسات کو سمجھتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، مجھے آپ کی نیت پر شبہ نہیں۔ مجھے شکوہ اس مزاج سے ہے جو غلط ماحول کی وجہ سے آپ پر مسلّط ہو چکا ہے اور طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نیکی اور فہمِ صحیح کی توفیق عطا فرمائے۔

علاج اور پرہیز:

میں نے اپنی گزارشات میں علاج اور پرہیز دونوں کا ذکر کیا ہے۔ قرآنِ عزیز اور ائمۂ سنت کی تصنیفات اصل علاج ہے۔ اور طماع صوفیوں اور اہلِ بدعت کی تصانیف سے اجتناب پرہیز ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ بریلوی حضرات میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بہت بڑے مسلّمہ عالم ہیں اور اپنی کتابوں میں وہ تصوف کا بھی دَم بھرتے ہیں۔ ملفوظات اور فتاویٰ اور دوسری ان کی تصنیفات میں اس کا مواد ملتا ہے، لیکن آپ ان کی تصنیف ''وصایا شریف'' میں ان کی وصیت پڑھیں جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند لمحے قبل لکھوائی تھی۔ جس شخص کا یہ حال ہو کہ مرتے وقت موت کی ہچکیوں میں بھی کچوڑیاں، فیرنی، سموسے، کھیر، گھی کے پکوڑے اور چٹنیاں۔ اس کے علاوہ کام و دَہن

کی تواضع جس کے دماغ پر محیط ہو، ان حضرات میں خلوص وللّٰہیت کہاں سے آ سکے گی اور ان کی کتابوں سے توحید کیسے ملے گی جہاں دنیا کی لذّتیں اتنا اثر کر چکی ہوں۔ عشقِ الٰہی اور محبتِ نبوی کا ٹھکانا کس طرح ہوگا......! جس راہ کا یہ حال ہو کہ ؎

در رہ عشق است اوّل منزلے ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر

[مال و جان کی قربانی اور اپنی خواہش ترک کر دینا عشق کے راستے کی پہلی منزل ہے]

اس راہ میں یہ دنیا پرست اور شکم پرور حضرات راہنمائی کے فرائض کیسے انجام دیں گے اور پیٹ کے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں نورِ نبوّت کی روشنی کیوں کر کارگر ہوگی؟ یہ چیز تو علمائے یہود کی سمجھ میں آ گئی تھی:

﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۸۸]

یعنی انھوں نے کہا: ہمارے دلوں پر غلاف ہے، بلکہ ان پر کفر کی وجہ سے اللہ کی لعنت ہے۔ انھیں ایمان کم ہی نصیب ہوگا۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور۔ ۲۷/ ستمبر، ۴، ۱۱، ۱۸/ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدایش اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اسلام کے مزاج کا تقاضا ہے کہ وہ اشخاص سے زیادہ ان کارناموں کی عزت کرتا ہے جو کسی بڑے شخص سے صادر ہوں، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ ہدی رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی کسی بڑے آدمی کا جنم دن یا موت کا دن منانے کی کوشش نہیں فرمائی۔ اس رسم کی اسلام میں اگر کچھ اہمیت ہوتی تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیدایش کے دن ضرور ہی منائے جاتے۔

عوام نے پیدایش کے دن کو میلاد سے تعبیر کیا اور موت کے دن کو عرس کا نام دیا، لیکن یہ رسم صدیوں بعد بنائی گئی، اور عموماً ایسی رسوم کا اہتمام وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں ان سے کچھ نہ کچھ مالی فائدہ ہوتا ہو۔ عوام بے چارے عقیدت کی وجہ سے خسارے ہی میں رہتے ہیں۔

ابتدائے اسلام سے اکابرِ اسلام کی پیدایش اور موت کے دن منانے کا اہتمام کیا جاتا تو شاید سال کا کوئی دن بھی کسی میلاد شریف یا عرس شریف سے خالی نہ ہوتا۔ امت میں بحمد اللہ پاک لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ اگر ان کے واقعات اور حوادث کو بطورِ ایام منایا جاتا تو یقیناً بہت سے ضروری اور اچھے کاموں کے لیے وقت ہی نہ بچتا۔ سارا وقت مرنے والوں کے احترام اور اہتمام میں گزر جاتا۔ زندوں کی اصلاح اور تعمیر کے لیے شاید ہی تھوڑا بہت وقت نکلتا۔ رجال، سیرت اور وفیات کی کتابوں میں اپنے اکابر کے تذکرے پڑھیے اور پھر ملاحظہ فرمائیے، کیا ان سب حضرات نے اعراس اور موالید کے اہتمام فرمائے؟ شاید گداگر اور ملاّ حضرات تو اس کاروبار کو کر گزریں کہ انھیں اس سے کافی حد تک معاشی سہولتیں میسر آجاتی ہیں، لیکن عامۃ المسلمین کے لیے اس میں بے کاری اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ رسم اہلِ اسلام میں غیر مسلم قوموں کی تقلید سے آئی۔ مغربی قومیں غالباً پیدایش کے دن مناتی ہیں، مگر مشائخ اور اکابر کے مرنے پر ان کے ہاں بھی عرس کا کوئی انتظام نہیں۔ عرس کی رسم شاید ہندوؤں میں بھی نہ ہو۔ یہ صرف دکاندار قسم کے متاخر صوفیوں نے ایجاد کی جس کا نتیجہ قبر پرستی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

محفلِ میلاد:

یہ وہ چیز ہے جسے ان حضرات نے کفر اور اسلام میں فرق کرنے والی شے تصور کیا ہے کہ جو اس رسم میں شریک نہ ہو، اسے ابلیس کا ساتھی سمجھتے ہیں۔ آج کل یہ رسم بھی غیر مسلم فرقوں کی نقالی میں منائی جا رہی ہے۔ قرونِ خیر اور ائمۂ اسلام سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کم علم ملّا اسے غیر مسلموں کی تقلید ہی میں مناتے ہیں۔

حافظ ابو شامہ (متوفی ٦٦٣ھ) نے "الباعث على إنكار البدع والحوادث" میں فرمایا:

"أَوَّلُ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِالْمُوْصَلِ: الشَّيْخُ عُمَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُلَّا أَحَدُ الصَّالِحِيْنَ الْمَشْهُوْرِيْنَ، وَبِهِ اقْتَدىٰ صَاحِبُ أَرْبَلَ"

یعنی سب سے پہلے میلاد منانے کا فعل ملا عمر بن محمد نے، جو مشہور نیک آدمی تھا، شروع کیا اور اسی کی پیروی صاحب اربل نے کی۔

واضح رہے یہ بدعت قریباً ٦٠٤ھ میں ایجاد ہوئی۔ ملا عمر بن محمد موصل کے رہنے والے تھے۔ اربل موصل کے قریب ہے، یہاں کے رئیس ابو سعید مظفر الدین ابو الحسن علی بن سبکتگین نے اسے بہت نمایاں کیا اور اس بدعت کو بڑا فروغ دیا۔ مورخ ابن خلکان ملک مظفر الدین کو کبوری کے بہت ہی ممنون معلوم ہوتے ہیں کہ انھوں نے اسے کافی پھیلا کر ذکر کیا ہے اور اس کے محاسن میں لکھتے ہیں:

"لَمْ يَكُنْ لَهُ لَذَّةٌ سِوَى السَّمَاعِ فَإِنَّهُ كَانَ لَا يَتَعَاطىٰ الْمُنْكَرَ" (ابن خلکان: ٢/ ٢٣٦)

''وہ سماع سے محظوظ ہوتا تھا اور برائیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔''

اس کے بعد ابن خلکان نے محفلِ میلاد کا مبسوط تذکرہ مزے لے لے کر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اوائلِ محرم میں بغداد، موصل، جزیرہ، سنجار، نصیبین اور عجم کے شہروں سے فقیہ، صوفی، واعظ، قاری اور شاعر آنے شروع ہو جاتے تھے اور ملک مظفر الدین ان کے لیے چار چار پانچ پانچ منزل لکڑی کے خیمے لگواتا تھا۔ سب سے بڑا خیمہ بادشاہ کا ہوتا۔ باقی ارکانِ دولت کے خیمے ہوتے اور اوائلِ صفر میں انھیں سجایا جاتا۔ مغنی اور ڈراما کرنے والے، مختلف قسم کے کھلاڑی یہاں فروکش ہوتے اور لوگ کاروبار ترک کر کے ان محفلوں میں مشغول ہو جاتے۔ بادشاہ ہر خیمے کے پاس سے عصر کے بعد گزرتے، گانا سنتے اور ڈرامے دیکھتے۔

تمام رات گانا سننے کے بعد صبح شکار کے لیے چلے جاتے اور میلاد ایک سال ۸ ربیع الاول کو مناتے اور ایک سال ۱۲ ربیع الاول کو۔ یہ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت میں اختلاف ہے۔ پھر اونٹ اور گائے اور بکریاں سجا کر نکالتے اور ان پر طبل اور گانے بجانے کا سامان لاد کر میدان میں لے آتے، پھر انھیں ذبح کر کے پکانا شروع کر دیتے۔ پھر میلاد کی رات سماع کی محفلیں گرم ہوتیں اور شمعیں جلائی جاتیں۔ میلاد کی صبح صوفی صاحبان کو قطاروں میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر خلعتوں کے بگچے رکھ دیتے اور بادشاہ لکڑی کے خیمہ لگانے والوں اور صوفی صاحبان اور ان کے ساتھ فوجوں کا نظارہ دیکھتے۔ (۲/ ۴۳۷)

اس بادشاہ کے عہد میں ابو الخطاب عمرو بن دحیہ بن خلیفہ نے ایک کتاب "التنویر في مولد السراج المنیر" لکھی جس میں موضوعات اور اکاذیب جمع کیے اور ایک ہزار روپیا انعام پایا۔

یہ کوکبوری جب حلوہ یا کوئی میوہ کھاتے تو بقیہ ان صوفی فقراء اور شیوخ کو بھیج دیتے اور اکیلے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مظفر الدین کوکبوری کا انتقال ۶۳۰ھ میں ہوا۔ یہ بدعت ساتویں صدی ہجری کے شروع میں یا چھٹی صدی کے آخر میں شروع ہوئی۔ حافظ ابن کثیر نے ۶۳۰ھ کے واقعات میں مظفر الدین کوکبوری کے تذکرے میں وہاں کے بعض مصارف کا ذکر کیا ہے، پانچ ہزار جانور بھنا ہوا، دس ہزار مرغی، ایک لاکھ پرند، تیس ہزار پلیٹ حلوہ شریف اور بڑے بڑے صوفی صاحبان اس محفل میں شریک ہوتے۔ ظہر سے صبح تک قوالی ہوتی۔ صوفی صاحبان قوالی سنتے اور ناچتے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: مظفر الدین اس محفل پر ہر سال تیس ہزار دینار صَرف کرتے تھے۔[1]

کوکبوری "سنت":

مروجہ محفلِ میلاد آنحضرت ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں، البتہ اس کو مظفر الدین کوکبوری اور ملا عمر بن محمد کی سنت سمجھنا چاہیے، نیز یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس میں مزید کچھ اضافے ہوئے ہوں گے۔ کوکبوری نے تو اتنا کرم کیا کہ شہر سے باہر میدان میں یہ میلا رچایا، جس کا جی چاہا چلا گیا، جس نے ناپسند کیا، نہ گیا۔ اب بازاروں کا چکر کاٹنا، یہ اضافہ غالباً مرحوم عبدالمجید قرشی مقیم پٹی نے کیا۔ اور ہمارے ملا حضرات نے آنحضرت ﷺ کی مسجد کی شبیہ اور قوالیوں کے ساتھ فلمی گانوں کا اضافہ کر کے

[1] البدایة والنهایة (۱۳/ ۱۳۷)

اس تماشے کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ حکومت نے ملا حضرات کے لیے کھانے کا تو انتظام نہیں کیا، البتہ اسے جاہل امیروں کے سپرد کر کے خود الگ ہوگئی، اور صورت یہ ہوگئی ہے کہ کوکبوری سنت پر عمل فرماتے ہوئے اس میں ناچ اور رقص کا اور اضافہ ہوگیا اور بڑے بڑے سفید ریش ملا صاحبان بیل گاڑیوں پر تشریف رکھے ہوئے ناچتے اور رقص کرتے ہیں!!

دور اندیش اہلِ علم:

اس پر جہاں گوشت اور حلوے کے عاشق کوکبوری سنت پر عمل کرتے ہوئے اربل کی اس محفل میں شکم پروری کے لیے پہنچے تھے، وہاں دور اندیش اور سنتِ نبوی پر عمل کے عاشق اس ہنگامۂ لحم وحلوے کے خلاف تنقید کا بھی فرض انجام دے رہے تھے، مثلاً: علامہ ابن الحاج اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور علامہ شاطبی مولف ''الاعتصام'' وغیرہم رحمہم اللہ۔

امام ابوعبداللہ محمد بن محمد بن محمد العبدری (المتوفی ۷۳۷ھ) المعروف بابن الحاج نے اس بدعت کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے اور ساتویں صدی کے اواخر تک محفلِ میلاد کے ضمن میں جس قدر بدعات رونما ہوچکی تھیں، ان کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے:

''فَصْلٌ فِيْ الْمَوْلِدِ: وَمِنْ جُمْلَةِ مَا أَحْدَثُوْهُ مِنَ الْبِدَعِ مَعَ اعْتِقَادِهِمْ أَنَّ ذٰلِكَ مِنْ أَكْبَرِ الْعِبَادَاتِ وَإِظْهَارِ الشَّعَائِرِ: مَا يَفْعَلُوْنَهُ فِيْ شَهْرِ رَبِيْعِ الْأَوَّلِ مِنَ الْمَوْلِدِ، وَقَدِ احْتَوىٰ عَلىٰ بِدَعٍ وَمُحَرَّمَاتٍ جُمْلَةً، فَمِنْ ذٰلِكَ اسْتِعْمَالُهُمُ الْمَغَانِيْ، وَمَعَهُمْ آلَاتُ الطَّرَبِ مِنَ الطَّارِ الْمُصَرْصَرِ وَالشَّبَابَةِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا جَعَلُوْهُ آلَةً لِلسَّمَاعِ...'' (المدخل لابن الحاج: ۱/ ۲٦۱)

''لوگوں کی پیدا کردہ بدعات سے ایک بدعت محفلِ مولد بھی ہے جسے یہ ربیع الاول میں رچاتے ہیں اور محفلِ قوالی کے علاوہ طنبور طار اور دوسرے گانے بجانے کے آلات استعمال کرتے ہیں جو محرمات میں شامل ہیں۔''

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''وَقَدْ تَقَدَّمَ أَنَّهُ إِذَا أَطْعَمَ الْإِخْوَانَ لَيْسَ إِلَّا بِنِيَّةِ الْمَوْلِدِ، إِنَّ ذٰلِكَ بِدْعَةٌ''

''بعض لوگ اس گانے بجانے کے بجائے قراء اور فقراء کو کھانا کھلاتے ہیں، لیکن یہ کھانا

مسکین کی خدمت کے ارادے سے نہیں، بلکہ مولد کی نیت سے ہوتا ہے، لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔"

"بعض لوگ اس دن بخاری پڑھتے ہیں۔ گو حدیث پڑھنا پڑھانا عمل ہے، لیکن خاص اسی دن میں اس نیت سے کیا جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔"

"بعض لوگ بعض رسوم اور مسرت کے مواقع پر اپنے دوستوں کو تنبول کے طور پر روپے دے دیتے ہیں۔ اب واپس مانگتے شرماتے ہیں تو وہ محفلِ میلاد کے بہانے سے اپنا روپیا وصول کرتے ہیں۔"

اس کے بعد ابن الحاج نے مولد کے بہانے سے جمع زر کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں اور ان سب کو بوجوہ حرام اور گناہ لکھا ہے۔ (ص: ۲۸۰)

اس کے علاوہ بھی بہت سے علماء نے اس عمل کو بدعت اور حرام لکھا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر دی جائے گی۔

معلوم ہو چکا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز ۶۰۴ھ میں یہ بدعت شروع ہوئی۔ صدی ختم ہونے تک اس میں بیسیوں قسم کے منکرات پیدا ہو گئے اور پھر برسوں تک یہ بدعت متروک رہی۔ اب انگریز کے آخری دور میں ہندوؤں کے بزرگوں کے جنم دن کی تقلید میں اسے پھر سے شروع کیا گیا۔ حکومت نے لاعلمی کی وجہ سے اسے دین کا مسئلہ سمجھ کر اس میں نیم سا تعاون کیا۔ اب ملاّ حضرات نے پھر اسی پیٹ کے دھندے کو اپنا کر پیٹ اور محفل کی رونق کا سامان مہیا کر دیا ہے، حالانکہ آج کل اس میں اور مفاسد پائے جا رہے ہیں، مثلاً: عورتوں کی بے آبروئی اور فواحش کی گرم بازاری، اس طرح یہ محفل بدکاری کا پیش خیمہ بن رہی ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ عقیدت کے نام پر فسق و فجور کو رواج دیا جا رہا ہے۔

کم علم ملاّ حضرات اپنے انتقامی جذبات کی تسکین بھی اسی بہانے سے کر لیتے ہیں۔ بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر اہلِ توحید کی مساجد اور مجالس کے سامنے ہنگامہ آرائی کر کے بداخلاقی کا ثبوت دیتے ہیں اور یہ سب کچھ حکومت کے تعاون کی آڑ میں ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک یہ فعل بدعت ہے، اس میں کتنی بھی تقدیس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، میں اسے گناہ سمجھتا ہوں، لیکن ہم ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں جس کے حکّام اور اربابِ اقتدار

اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ یہاں ان بدعات کو اسلام پسندی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، پھر اس میں فواحش کا ارتکاب ہوتا ہے اور ہم ان کو بجبر روکنے پر قادر نہیں۔

اندریں حالات اصل مطالبہ تو ہمارا یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومتِ پاکستان کو اسلام کے خلاف سب چیزیں بند کر دینی چاہئیں، لیکن عوام اگر اپنے کم علم مولویوں کے بہکاوے میں آکر ان غیر اسلامی اشغال و اعمال کو ''اسلامی'' قرار دینے پر ہی مصر ہیں تو حکومت میں پڑھے لکھے لوگ بھی آخر موجود ہیں، انھیں اصل حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرانے کے لیے انتظامیہ کی مشینری کو حرکت میں لانا چاہیے، لیکن ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار کو مذکورہ بالا ظاہر و باہر بات کا موجودہ حالات میں باور کرانا سخت مشکل ہے، اس لیے پچھلے دنوں میں نے ایک پریس کانفرنس بلا کر نفسِ مسئلہ سے قطع نظر صرف معاشرتی نقطۂ نظر سے اربابِ اقتدار کو جھنجھوڑنے کی غرض سے چند تجاویز پیش کیں، جن سے مقصد یہ تھا کہ اس گناہِ عظیم کو کسی وجہ سے حکومت اگر فوری طور پر روک نہیں سکتی تو اس کو کم از کم اپنے اور ہر شریف آدمی کے نقطۂ نگاہ ہی سے دیکھنا چاہیے کہ اس میں بدعات کے ساتھ شرک اور فواحش کی دن بہ دن کثرت ہوتی جا رہی ہے اور بہت سی قومی دولت بھی ضائع کی جا رہی ہے، سرِدست اس پر ہی قدغن لگائی جائے۔

نیز ان بدعاتِ شنیعہ سے بدکاری اور عریانی کے ان نئے رجحانات کو بھی خارج کیا جائے، تاکہ برائی کے دلدادہ اور بدقماش افراد کو کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکے۔ علاوہ ازیں ان بدعات کی تبلیغ و اشاعت ایسے انداز سے جاہل ملاؤں کا ایک طبقہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں میں تفرقہ بڑھتا ہے اور فرقہ وارانہ تعصب کی آبیاری ہوتی ہے اور ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کے مصداق برائی کی تہوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اولاً تو پریس نے ہم سے تعاون نہیں کیا اور جس نے کیا بھی تو اس نے میری تجاویز کو ایسے عجیب و غریب انداز میں شائع کیا جو میرا مقصد نہ تھا، جس سے بہت مغالطے پیدا ہوگئے۔ خود ہمارے اپنے آرگن نے ان تجاویز کی اشاعت میں نہ صرف یہ کہ احتیاط نہیں کی، بلکہ اس میں غلطیاں بھی کیں۔ مثلاً ''الاعتصام'' میں میری طرف منسوب بیان میں لکھا کہ ''پہلے قوالی نہیں ہوتی تھی۔'' حالاں کہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، کوکبوری صاحب نے، جو اول المبتدعین تھے، قوالی اور قوالی جیسی حرکتوں کو محافلِ میلاد میں لازم رکھا جسے وہ شوق سے سنتا تھا۔

اس ضمن میں میری رائے بالکل واضح ہے کہ عوام کے سامنے میلاد کی محفلوں کے بدعت ہونے کی وضاحت تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے ضرور کی جائے، اور بحمد اللہ ہماری جماعت نے بالخصوص ہمیشہ کی ہے، لیکن جو لوگ اس بدعت کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوں تو ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ خدا کے لیے فواحش، عریانی، قومی دولت کے ضیاع اور تفرقہ پردازی سے تو یہ ''عاشقانِ رسول'' ان محفلوں کو بچائے رکھیں!! ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور۔ ۴ر ستمبر ۱۹۶۴ء)

مسلک اہلِ حدیث کے بارے میں

چند اہم سوالات

اور

ان کے جوابات

مسلک اہلِ حدیث کے بارے میں جناب عبدالحق صاحب بی اے، ایل ایل بی نے چند اہم استفسارات شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی خدمت میں ارسال کیے تھے۔ آپ نے ان کے نہایت تسلی بخش جوابات دیے ہیں جنھیں ہم افادۂ قارئین کی خاطر شائع کر رہے ہیں۔

ادارہ

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور

۳/جون ۱۹۶۶ء

سوالات

① مسلک اہلِ حدیث کی (بحیثیتِ فقہی مذہب) تعریف کیا ہے؟ مختصر اور جامع الفاظ میں تحریر فرمایئے۔
② مسلک اہلِ حدیث کی ''اصولِ فقہ'' کی کتاب کون سی ہے؟ کتاب کا نام اور مصنف کا نام تحریر فرمایئے۔
③ اہلِ حدیث کے اصول فقہ کون سے ہیں؟
④ مذہبِ اہلِ حدیث کے مجتہدین کون سے ہیں جن کی فقہ اہلِ حدیث میں جامع تصانیف موجود ہوں؟
⑤ مذہب اہلِ حدیث میں مجتہدین کے کتنے اقسام ہیں اور ہر قسم کے لیے کون سے اوصاف ضروری و لازمی ہیں؟
⑥ مذہب اہلِ حدیث میں مفتی کے لیے کیا شرائط ہیں؟ کیا مجتہد ہونا ضروری ہے؟
⑦ ہند و پاکستان میں ایسے کتنے علماء موجود ہیں جن کو مسلک اہلِ حدیث کا مجتہد مانا جاتا ہو؟ نام اور پتا تحریر فرمائیں۔
⑧ کیا مسلک اہلِ حدیث کی فقہ مدون اور مرتب صورت میں موجود ہے؟ اگر ہے تو اس فقہ کی تدوین کن حضرات نے کی اور کب ہوئی؟ فقہ اہلِ حدیث کی کوئی جامع کتاب موجود ہو تو اس کا نام اور مصنف کا نام تحریر فرمائیں۔
⑨ کیا ایسی مرتب اور مدون فقہ اہلِ حدیث پر ہمیشہ عمل کرتے رہنا عامی کے لیے حنفی شافعی بنے رہنے کے تو مترادف نہیں ہے؟ ایسے مقلد اور حنفی شافعی میں کیا فرق ہے؟
⑩ مسلک اہلِ حدیث کی فقہ اگر مرتب و مدون نہیں ہے تو علمائے اہلِ حدیث اجتہادی مسائل میں جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ سکتی ہے، کیسے فتویٰ دیتے ہیں؟ یا کسی امام فقہ کے قول و اجتہاد پر فتویٰ دیتے ہیں؟ اگر دوسری صورت ہے تو کیا یہ اس امامِ فقہ کی تقلید کروانی نہیں ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو کیا ایسا کرنے سے امت میں وہ نظم اور یکجہتی قائم رہ سکتی ہے جو ایک مسلکِ معین کی اتباع میں نصیب ہوتی ہے؟ کیوں کہ مختلف علمائے اہلِ حدیث کا ذاتی اجتہاد باہم دگر مختلف

ہوسکتا ہے۔ کیا ایسا کرنے سے اختلاف اور تفرقہ بڑھ تو نہیں جائے گا؟

11 ایک اہلِ حدیث عالمِ دین کے ذاتی اجتہاد اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی مدون اور مرتب فقہ میں سے کون سی چیز عمل کرنے کے لیے افضل ہے؟ اگر عامی اجتہادی مسائل میں ان ائمہ میں سے کسی ایک امامِ فقہ کی اتباع کرتا ہے تو کیا ایسا آدمی عامل بالحدیث نہیں ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ اپنے امام کے خلافِ قرآن و حدیث مسائل کو چھوڑ دینے کے لیے بھی تیار ہو؟

نوٹ: کتاب معیار الحق مصنفہ سید نذیر حسین محدث دہلوی میں مندرجہ تقلید کے چار اقسام نظر میں رکھیں۔

12 کیا علمائے اہلِ حدیث ہر فقہی مسئلہ کے لیے قرآن مجید یا حدیث شریف سے نصِ صریح پیش کرتے ہیں جیسا کہ ابن حزم ظاہری کا معمول بتایا جاتا ہے؟ نیز اہلِ حدیث اور ظاہریوں کے مسلک میں کیا فرق ہے؟

13 اگر مذکورہ بالا سوال کا جواب اثبات میں ہے تو براہِ کرم ہر فقہی مسئلہ کے لیے صریح آیات و احادیث پیش کرنے کا اعلان فرمائیں تاکہ مخالفین کو اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے۔

14 اگر جواب نفی میں ہے تو پھر آپ کو فقہی مسائل کے بارے میں ایسا اجتہادی فتویٰ مخالفین کو پیش کرنا ہوگا جو ائمۂ اربعہ میں سے کسی سے منقول نہ ہو۔ نیز قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو اور علمائے اہلِ حدیث کا مفتیٰ بہ قول بھی ہو۔ اگر آپ ائمۂ مجتہدین کے کسی قول کو موافقِ قرآن و احادیث پا کر اس پر فتویٰ دیں گے تو پھر آپ کو اس قول کا ماخذ قرآن و حدیث سے ضرور پیش کرنا ہوگا، ورنہ اس مسئلہ میں اسی امام کی اندھی تقلید ہوگی (بخلاف اتباع کے) جو آپ کے نزدیک خود ان ائمۂ مجتہدین کے قول کہ "دلیل کے بغیر ہمارے قول پر فتویٰ دینا حرام ہے وغیرہ" کے مطابق جائز ہیں۔

والسلام

عبدالخالق

کندہ کوٹ

جوابات

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکتوب گرامی سے مسرت ہوئی کہ آپ قانون کے ساتھ شغف کے باوجود مذہب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ سوالات سے ظاہر ہے کہ ان فقہی اختلافیات میں بھی آپ کے مطالعے کا انداز مناظرانہ ہے۔ آپ نے سوالات کی ترتیب میں قانون اور مناظرہ دونوں کو ملحوظ رکھا ہے، نیز سوالات اس ذہن کی غمازی کرتے ہیں کہ اہلِ حدیث کو آپ ایک ایسا فرقہ سمجھتے ہیں جو ائمہ اجتہاد کی ضد ہے اور شاید ہر مسئلے میں ان سے الگ ہے۔ آج کل دیوبند اور بریلی سے جس طرح جمود کی دعوت دی جا رہی ہے اور متاخرین شوافع بھی قریباً اسی انداز سے دعوت دیتے ہیں اس سے تو اہلِ حدیث کو کلی اختلاف ہے۔ ہم اس جمود کو واقعی قطعاً پسند نہیں کرتے بلکہ اس جمود کو اسلام کی دعوتِ عام کے بھی خلاف سمجھتے ہیں۔ ایک انصاف پسند طالب علم ان حضرات کی اس تعصب آمیز دعوت سے یہی نتیجہ اخذ کرے گا جو جناب نے اخذ کیا ہے۔

لیکن فی الحقیقت اہلِ حدیث کی دعوت عام اور جامع ہے۔ اس میں مذاہب اربعہ اور دیگر ائمہ اجتہاد کی فقہی مساعی بھی شامل ہیں۔ اس دعوت کا مقصد یہ ہے کہ ان مقدس مساعی کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور انھیں کتاب اللہ اور سنت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور ان اختلافات کی تطبیق اور ترجیح کے وقت ائمہ سلف رحمہم اللہ کی روش کو سامنے رکھا جائے۔ مروجہ فقہوں سے اہلِ حدیث کو جزوی طور پر یقیناً اختلاف ہے لیکن ائمہ اجتہاد کے علوم و آثار سے تحقیقی استفادہ تحریک کا اساسی مقصد ہے۔ یعنی فقہی جزئیات یا اختیار علم و بصیرت کی بنا پر عمل میں آئے۔ اس کے باوجود ان مختلف نظریات کو گوارا کرنا اور ائمہ کے علوم کا احترام اور ان سے استفادہ اس تحریک کی روح ہے۔

اس بنیادی اور اجمالی گزارش کے بعد استفسارات کے جواب ملاحظہ فرمائیں:

① مسلک اہلِ حدیث ایک ایسی دعوت ہے جس کی بنیاد اصول اور فروع یعنی عقائد اور اعمال میں ظاہر کتاب و سنت اور ائمہ سلف یعنی صحابہ کرام کی روش پر ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کے

بعد کسی شخصیت کے نام پر دعوت کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔

② اصول فقہ میں "الرسالة للإمام الشافعي"، "روضة الناظر لابن قدامة"، "إرشاد الفحول للشوكاني"، "حصول المأمول لصديق حسن"، "الإحكام لابن حزم"، "الإحكام للآمدي"، "التوضيح و التلويح لتفتازاني"، "كشف الأسرار"، "شرح أصول بزدوي"، "قواعد الأحكام لعز بن عبد السلام"، "القواعد لابن رجب"، "القواعد والفوائد الأصولية لعلي بن عباس البعلي (۸۰۳ھ)"، "القواعد النورانية لابن تيمية"، اور "موافقات للشاطبي" وغیرہ۔ وہ رسائل جو قدمائے احناف کی کتابوں میں اصول کی حیثیت سے بیان ہوئے ہیں، جیسے مسلم الثبوت وغیرہ۔ متاخرینِ حنفیہ ملا جیون، شاشی وغیرہ کی تصانیف محققانہ نہیں۔ کاتب چلپی حنفی نے کشف الظنون میں فرمایا:

''سب سے پہلے اصولِ فقہ پر معتزلہ اور اہلِ حدیث نے لکھا لیکن ان کی کتابوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ معتزلہ عقائد میں ہمارے مخالف ہیں اور اہلِ حدیث فروع میں۔''[1]

اصولِ فقہ میں اختلاف خاص نوعیت کا ہے۔ فن کے ماہر اس سے غلطی نہیں کھا سکتے۔ اس کے علاوہ بھی اہلِ حدیث نے اصولِ فقہ میں کافی ذخیرہ جمع فرمایا۔ ہر حق پسند آدمی کو اس میں دقت محسوس ہوتی ہے، اس لیے کہ امام صاحب رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف کے تلامذہ عام طور پر اعتزال کا شکار ہو گئے۔ قاضی عیسیٰ بن ابان، بشر مریسی، سرخسی، کرخی کم وبیش معتزلہ سے متاثر ہیں۔ جو لوگ اعتزال سے متاثر نہیں ان کی روش اصول میں چنداں غلط نہیں۔ اس موضوع میں تفصیلاً لکھنا وقت چاہتا ہے، نیز یہ مسئلہ تدریسی ہے، اخباری نہیں۔

③ نمبر ۲ سے اس کا جواب کافی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد پہلے جواب میں آ چکا ہے۔

④ مجتہدین میں کوئی بٹوارا نہیں۔ مذاہبِ اربعہ کے مجتہدین اہلِ حدیث کے بھی امام اور مجتہد ہیں۔ ائمۂ حدیث بخاری، مسلم، ابو داود، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن جریر طبری، ابو عبدالرحمٰن اوزاعی، ابو یوسف، محمد، یہ سب اہلِ حدیث کے مجتہد ہیں۔ البتہ حق کسی میں محصور نہیں، نہ کسی کو مقامِ نبوت ملا ہے نہ مقامِ عصمت حاصل ہے۔ غزارتِ علم کے باوجود غلطی ممکن بھی ہے اور واقع بھی۔ اس

[1] كشف الظنون (١/ ٨١)

لیے کسی کے اجتہادات واجب القبول نہیں ہو سکتے اور نہ واجب الاتباع۔

5. مجتہدین کی تقسیم کوئی شرعی مسئلہ نہیں۔ ﴿ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴾ [يوسف: ٧٦] کے مطابق اصطلاحی الفاظ وضع کر لیے گئے ہیں۔ تقلید کی حفاظت کے لیے یہ اغلال وسلاسل بنائے گئے ہیں تاکہ ان کے محققانہ اختلافات کو ترکِ تقلید کا نام نہ دیا جا سکے، ورنہ یہ سب اساتذہ اور تلامذہ دلائل کی بنا پر باہم اختلاف فرماتے تھے اور ایک دوسرے کی تقلید سے بے نیاز تھے۔ رحمة الله عليهم.

6. مفتی کے لیے ضروری ہے وہ کم از کم آیاتِ احکام اور احادیثِ احکام کو جانتا ہو۔ مذاہبِ علماء پر اس کی نظر ہو۔ عربیت سے آشنا ہو۔ اصولِ فقہ، اصولِ حدیث پر اس کی فی الجملہ نظر اور اس کے ساتھ با عمل اور متقی ہو۔ اجتہاد ضروری نہیں۔

7. مجتہدین کی مردم شماری نہ پہلے کبھی ہوئی نہ اب اس کی ضرورت۔ علمی فیوض، تدریس و تذکیر سے خود بخود مقام متعین ہو جاتا ہے۔ مسلمہ مجتہدین کو ان کی زندگی میں ان کے اقران اتنے بڑے نہیں سمجھتے تھے جس قدر مقام اب ان کو حاصل ہے۔ اہلِ حدیث علماء کا بھی یہی حال ہے۔ مولانا سید نذیر حسین، مولانا شمس الحق، مولانا شرف الحق ڈیانوی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کو شاید آنے والے لوگ امام سمجھیں اور مجتہد ماننے لگیں۔ میں اس معاملے میں قطعاً مردم شماری یا مجتہد شماری کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

آپ قانون کے طالب علم ہیں۔ مجتہد شماری سے پہلے اس اصطلاح کے مفہوم پر غور فرمائیں۔ مجتہد کو اصطلاحاً جن علوم کا مکلّف قرار دیا گیا ہے اس لحاظ سے تو صحابہ میں کوئی مجتہد معلوم نہیں ہوتا بلکہ تابعین میں بھی کسی کو مجتہد کہنا مشکل ہے حتی کہ مسلمہ ائمۂ اجتہاد ان مصطلح راہوں سے مقامِ اجتہاد پر فائز نہیں ہوئے۔ عجیب یہ ہے کہ یہ اصطلاحی پابندیاں ائمۂ اجتہاد پر وہ حضرات عائد فرما رہے ہیں جو خود مجتہد نہیں! آنحضرت ﷺ نے سچ فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا»[1]

---

[1] دیکھیں: صحيح البخاري (٥٠) صحيح مسلم (٩) مسند الشاميين (٣/ ٣٤٥) یعنی قیامت کی ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی۔

اربابِ تقلید ائمۂ اجتہاد کے لیے اجتہاد کی راہیں تجویز فرماتے ہیں، پھر یکم محرم ۴۰۱ ہجری سے اجتہاد کو کلیتاً بند فرماتے ہیں حالانکہ علوم اجتہاد اب بھی موجود ہیں!!

”وَلٰكِنْ مِنْ عَصْرِ أَرْبَعِ مِائَةٍ مِنَ الْهِجْرَةِ النَّبَوِيَّةِ ـعَلٰى صَاحِبِهَا أَزْكٰى الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُـ قَالَ الْعُلَمَاءُ الْأَعْلَامُ كَمَا يُنْقَلُ عَنْ عُلَمَاءِ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّ بَابَ الْاِجْتِهَادِ قَدِ انْسَدَّ مِنْ ذٰلِكَ التَّارِيْخِ“ (رساله حميديه، ص: ۳۲۸)

علمائے حنفیہ نے فرمایا کہ چوتھی صدی کے ختم ہوتے ہی اجتہاد کا دروازہ مقفل ہوگیا۔

ہم جب مجتہد کی تقلید ہی پسند نہیں کرتے، ہم مجتہد شماری کی سردردی کیوں کریں؟ ہمیں قرونِ خیر کا ایک غریب مسلمان تصور فرمائیے جو اپنے وقت کے علماء سے بلاتعینِ شخص مسائل دریافت کرتا ہے اور اپنے فہم اور بساط کے مطابق ان پر عمل کرتا ہے۔ نہ وہ تقلید کو واجب سمجھے نہ مجتہد کی تلاش میں نکلے۔

8. مروجہ مذاہب کی فقہیں ہماری ہیں۔ ہم بلاتخصیص وقت کے تقاضوں اور اپنے فہم کے مطابق قرآن وسنت کی راہنمائی میں ان پر عمل کرتے ہیں۔ ان سے مسائل انتخاب کرتے ہیں۔ ایک فقہ کا تعین اصل مرض ہے جس نے تقلید کی بندشوں کو مضبوط کیا اور فکر ونظر، فہم وشعور کے دروازوں کو مقفل کیا۔ ”زاد المعاد“، ”نيل الأوطار“، ”فتح الباري“، ”بدور الأهلة“، ”دليل الطالب إلى أرجح المطالب“، فتاوی وغیرہ کافی کتابیں اس فقہی نہج پر لکھی گئیں لیکن تقلید نہ ہونے کی وجہ سے وہ مروجہ فقہوں کا مقام حاصل نہیں کرسکیں۔ نہ حاصل ہی ہونا چاہیے۔ علماء کو اپنے علم کے مطابق تحقیق کرنی چاہیے۔ عوام کو بلاتخصیص علما کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جس طرح قرونِ خیر میں لوگ کرتے رہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

”وَبَعْدَ الْقَرْنَيْنِ حَدَثَ فِيْهِمْ شَيْءٌ مِنَ التَّخْرِيْجِ غَيْرَ أَنَّ أَهْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ لَمْ يَكُوْنُوْا مُجْتَمِعِيْنَ عَلَى التَّقْلِيْدِ الْخَالِصِ عَلٰى مَذْهَبٍ وَّاحِدٍ وَالتَّفَقُّهِ لَهُ، وَالْحِكَايَةِ لِقَوْلِهِ، كَمَا يَظْهَرُ مِنَ التَّتَبُّعِ، بَلْ كَانَ فِيْهِمُ الْعُلَمَاءُ وَالْعَامَّةُ، وَكَانَ مِنْ خَبَرِ الْعَامَّةِ أَنَّهُمْ كَانُوْا فِي الْمَسَائِلِ الْاِجْتِمَاعِيَّةِ الَّتِيْ لَا اخْتِلَافَ فِيْهَا بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ، أَوْ جُمْهُوْرِ الْمُجْتَهِدِيْنَ لَا يُقَلِّدُوْنَ إِلَّا صَاحِبَ الشَّرْعِ، وَكَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ صِفَةَ الْوُضُوْءِ، وَالْغُسْلِ وَالصَّلَاةِ،

وَالزَّكَاةِ، مِنْ آبَائِهِمْ وَمُعَلِّمِيْنَ بُلْدَانِهِمْ فَيَمْشُوْنَ حَسْبَ ذٰلِكَ، وَإِذَا وَقَعَتْ لَهُمْ وَاقِعَةٌ اِسْتَفْتَوْا فِيْهَا أَيَّ مُفْتٍ وَجَدُوْا مِنْ غَيْرِ تَعْيِيْنِ مَذْهَبٍ، وَكَانَ مِنْ خَبَرِ الْخَاصَّةِ أَنَّهُ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيْثِ مِنْهُمْ يَشْتَغِلُوْنَ بِالْحَدِيْثِ فَيَتَخَلَّصُ إِلَيْهِمْ مِنْ أَحَادِيْثِ النَّبِيِّ ﷺ وَآثَارِ الصَّحَابَةِ مَا لَا يَحْتَاجُوْنَ مَعَهُ إِلٰى شَيْءٍ آخَرَ... الخ" (حجة الله البالغة: ١/ ١٢٢)

یعنی دوسری صدی کے بعد تخریج کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا لیکن چوتھی صدی تک لوگ تقلید پر جمع نہیں ہوئے تھے، نہ ایک مذہب کی تقلید اور اس پر تفقہ کا خیال اور چرچا ہوا تھا۔ اس وقت علما بھی تھے اور عوام بھی۔ عوام کا یہ حال تھا کہ اتفاقی مسائل اپنے بزرگوں اور اپنے شہر کے علماء سے دریافت کرتے اور صرف آنحضرت ﷺ کا اتباع فرماتے، جیسے وضو، نماز، زکاۃ کے متفقہ مسائل۔ جب کوئی خاص حادثہ ہوجاتا تو بلا تعیینِ مذہب کسی مفتی سے دریافت فرما لیتے، خواص کا یہ حال تھا کہ غور وفکر کے بعد ایسے احادیث و آثار ان کو مل جاتے جن کی وجہ سے کسی دوسری چیز کی انھیں ضرورت ہی نہ رہتی۔

یہ صحیح اسلام کی صورت ہے۔ اس کے ہوتے کسی جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ موجودہ فقہوں پر بلا تعیین عمل کیا جائے۔ لوگوں کو ایک مذہب کی پابندی پر خواہ مخواہ تنگ نہ کیا جائے تو مسلکِ اہلِ حدیث کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔

اسی نہج پر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (۷۵۱ھ) کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

"فَإِنَّا نَعْلَمُ بِالضُّرُوْرَةِ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِيْ عَصْرِ الصَّحَابَةِ رَجُلٌ وَّاحِدٌ اتَّخَذَ رَجُلًا مِنْهُمْ يُقَلِّدُهُ فِيْ جَمِيْعِ أَقْوَالِهِ، فَلَمْ يُسْقِطْ مِنْهَا شَيْئًا، وَأَسْقَطَ أَقْوَالَ غَيْرِهِ فَلَمْ يَأْخُذْ مِنْهَا شَيْئًا، وَنَعْلَمُ بِالضُّرُوْرَةِ أَنَّ هٰذَا لَمْ يَكُنْ فِيْ عَصْرِ التَّابِعِيْنَ، وَلَا تَابِعِي التَّابِعِيْنَ، فَلْيُكَذِّبْنَا الْمُقَلِّدُوْنَ بِرَجُلٍ وَّاحِدٍ سَلَكَ سَبِيْلَهُمُ الْوَخِيْمَةَ فِي الْقُرُوْنِ الْفَضِيْلَةِ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَإِنَّمَا حَدَثَتْ هٰذِهِ الْبِدْعَةُ فِي الْقَرْنِ الرَّابِعِ الْمَذْمُوْمِ عَلٰى لِسَانِهِ ﷺ" (أعلام الموقعين: ١/ ٢٢٢)

"ہم یقیناً جانتے ہیں کہ ایک آدمی بھی اس وقت اس طرح کا مقلد نہیں تھا جو ایک ہی

شخص کے تمام مسائل کو قبول کرے اور باقی علماء کے فتووں کو رد کر دے۔ اور ہمیں یقیناً معلوم ہے کہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کا بھی یہی حال تھا۔ ایک ایسے آدمی کا پتا دے کر حضرات مقلدین ہماری تکذیب کریں جو اس ناہموار راہ پر چل رہا ہو۔ یہ بدعت چوتھی صدی کی پیداوار ہے۔ جس کی آنحضرت ﷺ نے مذمت فرمائی ہے۔''

ان گزارشات سے آپ پوری طرح سوچ لیں کہ مجتہدین کی تقسیم، اصولِ فقہ کی تقسیم کا تصور کہاں سے پیدا ہوا۔ یہ صرف تارِ عنکبوت کا ایک حصار ہے جو تقلید شخصی کی کمزور عمارت کو بچانے کے لیے بنایا گیا، جس سے آپ جیسا قانون کا طالب بھی متاثر ہونے سے نہیں بچ سکا۔ مجھے تعجب ہے آپ کا ذہن اس سوال کی طرف منتقل کیوں کر ہوا۔

(9) اس کا جواب قریباً نمبر ۸ میں ہو چکا ہے۔ واقعی اگر ان مخصوص فقہوں کی طرح فقہ اہلِ حدیث کی پابندی واجب قرار دی جاتی تو یہ بھی تقلید ہی ہوتی۔

(10) میں نے عرض کیا ہے سابقہ ساری فقہیں قابلِ عمل ہیں۔ ظروف واحوال کے لحاظ سے اہلِ علم ان سب پر بلا تخصیص عمل کریں گے۔ فروعی اختلافات کو گوارا کرنے کی عادت ڈالیں گے، اس سے قرونِ خیر کی وحدت قائم ہو گی۔ یہ نزاع تقلید کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے تنگ نظری اذہان پر محیط ہو چکی ہے۔ بیماری کا نام صحت سمجھ لیا گیا ہے۔ آپ اس جامد اختلاف کا نام یکجہتی فرماتے ہیں۔ عجیب ہے!

جب چاروں مذاہب ''حق پر ہیں'' اور دنیا میں موجود ہیں تو یکجہتی جناب نے کہاں سے سمجھی؟ بلکہ چار جہتی کو تو حق سمجھ کر گوارا کیا گیا ہے۔ اگر اس میں مسلک اہلِ حدیث کو بھی اسی طرح گوارا کر لیا جائے تو یہ مصطلح یکجہتی پھر بھی قائم رہے گی، ذرا اس میں وسعت ہو جائے گی۔ کاش حضرات علمائے کرام اسے گوارا کریں۔ پہلی بیماری مروج تقلید ہے۔ دوسری بیماری گوارا نہ کرنے کی عادت۔ غرض اس وجوب اور پابندی کو آپ ختم کر دیں ساری دقتیں دور ہو جائیں گی۔ بعض نظریاتی دقتیں عمل سے خود بخود دور ہو جائیں گی بلکہ اس صدی کے سفر میں بہت کچھ درست ہو چکا ہے۔ اختلافِ رائے کو گوارا فرمائیے، تفرقہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اختلاف اور تفرقہ میں الف تفسیری نہیں بلکہ فقہی اختلاف رہنا چاہیے اور تفرقہ کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔

⑪ اجتہاد کسی عالم کا ہو، اسے کتاب و سنت پر پیش ہونا چاہیے۔ اگر کتاب و سنت میں صراحت موجود نہ ہو تو عوام کو کسی کے اجتہاد کا پابند نہ کیجیے۔ جس پر حسبِ مصالح عمل کرے اس پر کوئی ملامت اور ضیق نہ ہونی چاہیے۔ عوام بہر حال علماء کی طرف رجوع کریں گے۔ انھیں عادت ڈالنی چاہیے کہ مشہور مجتہدین یا متعارف فقہوں کے بجائے شریعت یا کتاب و سنت کے نام سے مسائل دریافت کریں اور علماء انھیں اپنی صوابدید کے مطابق جواب دیں۔ اگر مقلد قرآن و حدیث کے خلاف مسائل چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے تو یہ تقلید کی قابلِ برداشت اور مناسب ترین صورت ہے۔ میاں صاحب رحمہ اللہ نے اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اسے گوارا فرمایا ہے۔ تجربے کی بنا پر یہ ضروری استفتا مخصوص فقہوں کے بجائے شریعت کی بنا پر ہونا چاہیے۔ میاں صاحب نے ''معیار'' کے اس مقام میں اصلاح فرما دی تھی۔[1]

⑫ ابن حزم قیاس کے بالکل منکر ہیں۔ اہلِ حدیث قیاس کو مانتے ہیں۔ نظائر کے حکم میں مساوات کو مانتے ہیں لیکن اگر قیاس کہیں قرآن و سنت سے متصادم ہو جائے تو اہلِ حدیث نصوص کو مقدم سمجھتے ہیں۔ مدتِ رضاع احناف کے نزدیک ڈھائی سال اور خمر کا سرکہ بنانا نصوص کے خلاف ہے۔[2] اس میں نصوص مقدم ہوں گی۔

⑬ اس کا جواب نمبر ۱۲ میں آ چکا ہے۔ قیاس نصوص کے تابع ہو تو قابلِ قبول ہے، اس لیے ہر پیش آمدہ مسئلہ کے متعلق کسی نئے اعلان کی ضرورت نہیں۔

⑭ سابقہ گزارشات کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ فرضی شقیں جناب کی قانون دانی کی مرہون ہیں۔

کوشش تو یہی ہے کہ ائمہ کرام کے جو اقوال اختیار کیے جائیں حضرات ائمہ کے ارشاد کے مطابق ان کے ماخذ پر نظر ہو۔ اس کے باوجود قصورِ نظر کا اعتراف ہے۔ فہم میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ماخذ نہ ملے تو کوئی اور راہ اختیار کرنی پڑے۔

قلتِ فرصت کے باوجود انتہائی اختصار سے جوابی گزارشات آپ کے حسب الحکم ''الاعتصام'' میں

---

① تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاویٰ نذیریہ (۱/۱۷۲)

② دیکھیں: [البقرة: ۲۳۳] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۹۸۳)

بھیج رہا ہوں۔ امید ہے بعد ملاحظہ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے۔

یہ ملحوظ رہے کہ مناظرانہ انداز سے ان مباحث کو طول نہیں دینا چاہتا نہ اتنی فرصت ہی ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ان مباحث میں کوئی چیز بھی حرفِ آخر نہیں سمجھی جا سکتی اور مزید در مزید بسط اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اعلام الموقعین مترجم مل جائے تو ملاحظہ فرمالیں۔ اگر عربی زبان پر عبور ہو تو اعلام، ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ، احکام ابن حزم وغیرہ کتب ملاحظہ فرمائیں۔

والسلام

محمد اسماعیل، گوجرانوالہ

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۳/ جون ۱۹۶۶ء)





UMM UL QURA PUBLICATIONS

Sialkot Road, Lodhi Town Gujranwala

0092 321 6466422